اُردُو ترجمہ

کشف المحجوب

احمد ربّانی ایم۔اے

اُردُو ترجمہ

کشف المحجوب

منقولہ حضرت خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ، بسال ۶۶۴ھ

جو

پروفیسر ڈاکٹر مولوی مُحمّد شفیع (ستارۂ پاکستان)

سابق پرنسپل اورینٹل کالج، لاہور ـــ و ـــ صدر اُردُو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، لاہور

کے کتب خانے میں محفوظ ہے

مترجم

ایف ـ ڈی ـ گوہر

بسعی و اہتمام

احمد ربّانی ایم اے

مطبوعہ ۱۹۷۲

نام کتاب — (ترجمہ اردو) کشف المحجوب

مترجم — ایف۔ ڈی۔ گوھر

طابع و ناشر — احمد ربانی ایم۔اے

مطبع — مزدور پرنٹنگ پریس، رائل پارک لاہور

کاتب — (حکیم) محمد شفیع۔ادارہ کتابت چوک دال گراں۔ لاہور

قیمت — ۲۵ روپے

ملنے کا پتہ — احمد ربانی ۲۴ مین روڈ۔ لاہور

تفصیل مضامین

غلط نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۰	۴	زینۃٌ	زینۃً
۳۵	۱۵	بِان	بَان
۳۵	آخری	حقیقَۃً	حقیقَۃٌ
۲۴۸	۱۵	لیعبدونَ	لیعبدونِ
۲۶۵	۱۲	لیُھْلک	لِیَھْلک

محمد شفیع کاتب - ادارہ کتابت چوک دال گراں - ریلوے روڈ لاہور

پیش لفظ

اس سے پیشتر ۱۹۶۸ء میں "کشف المحجوب" کے فارسی متن کو قارئین کرام کی خدمت میں پیش کر چکا ہوں۔ مذکورہ فارسی متن اس قدیم ترین نسخہ کی رُو سے شائع کیا گیا ہے جو حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کے دست مبارک کا لکھا ہوا ہے اور یہ نسخہ والد مرحوم کی لائبریری کے نوادرات میں سے ہے۔ کتاب شائع ہونے کے بعد میرے بہت سے کرم فرماؤں نے بارہا اس بات کی فرمائش کی کہ اس کا عام فہم اردو ترجمہ شائع کرنے کا اہتمام بھی کیا جائے۔ اردو ترجمہ کرانے کی چند در چند وجوہات تھیں۔ سب سے پہلی یہ کہ مذکورہ نسخے کا متن ان تمام نسخوں کے متنوں سے کافی حد تک مختلف ہے جو قبل ازیں لاہور (پاکستان) سمرقند (ترکستان) اور ماسکو (روس) سے چھپ چکے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس سے پہلے "کشف المحجوب" کے جس قدر اردو ترجمے شائع ہوئے ہیں ان میں سے کسی کی زبان سراسر عام فہم نہیں ہے اور مشکل الفاظ تو کیا اکثر اصطلاحوں کا یا تو ترجمہ کیا ہی نہیں گیا یا وہی فارسی الفاظ ترجمے میں شامل کر دیئے گئے ہیں جس سے ایک عام قاری اصل کتاب میں بیان شدہ تصوّف کے بعض مسائل کو سمجھنے سے قاصر ہی رہتا ہے۔ پھر تصوّف کی بعض اصطلاحیں چونکہ بہت دقیق اور مسائل کے گوناگوں پہلو اپنے اندر لیے ہوئے ہوتی ہیں اس لیے کسی نے اُن سے کچھ سمجھا تو کسی دوسرے نے کچھ اور۔ ان وجوہات کی بنا پر ہم نے اپنے ایک دوست جناب فضل دین گوہر کو جو صوفیانہ طبع کے شاعر بھی ہیں اس کتاب کا اردو ترجمہ کرنے کی زحمت دی۔ انھوں نے بڑی جانفشانی سے یہ کام سرانجام دیا اور جہاں تک ہو سکا ہر پیچیدہ بات کا سادہ و سلیس اردو زبان میں مفہوم بیان کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔

مسودہ مکمل ہونے پر ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان، صدر شعبہ اردو حیدر آباد نے اس پر ایک تنقیدی نظر ڈالی اور بعض مفید مشورے دیئے۔ ان کے بعد اصل کتاب میں مذکور آیات و احادیث و دیگر عربی عبارات کے ترجمے کو میرے استاد مولانا فضل دین صاحب نے تنقیحی نظر سے دیکھا اور متعدد مقامات پر ترجمے کی عبارتوں کو صحیح کیا۔ اس کے بعد پورے ترجمے کو میرے محترم دوست ڈاکٹر میاں محمد بشیر حسین اور مولانا مذکور نے مل کر دقّتِ نظر سے دیکھا۔ میں اُن سب حضرات کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔

حاشیہ پر فارسی نسخہ کے صفحات کے نمبر درج کیے ہوئے ہیں تاکہ قاری کو پڑھتے وقت دقّت نہ ہو۔

داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت بہاؤ الدین کے مفصّل حالات اردو زبان میں فارسی نسخہ کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں۔ اس لیے انھیں دوبارہ چھاپنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔

۱۲ ستمبر ۱۹۷۲ء

احمد ربانی

۴۲ بیڈن روڈ۔ لاہور

حرفے از مترجم

کشف المحجوب کا نادر فارسی نسخہ جو مسٹر احمد ربانی صاحب کی سعیِ جمیلہ سے منظرِ عام پر آیا متعدد خصوصیات کا حامل ہے۔ بازار میں دستیاب کتاب سے سرسری مقابلہ کیا گیا تو عام نسخہ میں ایک ہزار سے زائد فاحش اغلاط اور بے شمار تصرفات اور زوائد سامنے آئے۔ قابلِ اعتنا تراجم سر بسر ناقابلِ اعتبار دکھائی دیے۔ راقم الحروف نے نسخۂ نادرہ منقولہ حضرت بہاؤ الدین ذکریاؒ کو بہمہ وجوہ کامل اور صحیح پایا۔ اس نادر کتاب کا عام فہم اور سلیس ترجمہ ارباب ذوق کی تسکین کے لیے اشد ضروری تھا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ جو کام میں نے اپنے ذمّے لیا تھا اس سے سبکدوش ہو رہا ہوں اور بصد اخلاص و عقیدت حضرت مخدوم علی ہجویری قدس اللہ سرہٗ العزیز کے شاہکار عظیم کا اردو ترجمہ پیش کر رہا ہوں۔

ع شادم از زندگیِ خویش کارے کردم

ایف۔ ڈی گوھر غفرلہٗ

(ریٹائرڈ ڈپٹی چیف اکونٹس افیسر)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

رَبَّنَا آتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا۔ الحمد لله الذی کشف لاولیائه بواطن ملکوته وقشع لاصفیائه سرایر جبروته واراق دم المحبین بسیف جلاله واذاق سر العارفین روح وصاله۔ هو المحی لموات القلوب بانوار ادراکه والمنعش لها بواحة روح المعرفة بنشر اسمائه والصلوة علی رسوله محمد وعلی اله واصحابه وازواجه۔

"اے ہمارے پروردگار ہم پر اپنی رحمت کاملہ نازل فرما اور ہمارے اعمال کو نیکیوں سے آراستہ کر۔ تمام تعریف اس ذاتِ پاک کے لیے ہے جس نے اپنے اولیاء کے لیے عالمِ ملکوت کے راز کھول دیئے اور اپنے برگزیدہ بندوں کو اسرارِ جبروت سے آشنا کیا۔ اپنے محبت کرنے والوں کا خون جلال کی شمشیر سے بہایا۔ اپنے پہچاننے والوں کو وصال کی مسرتوں سے نوازا۔ وہی اپنی بلندی اور بے نیازی کے نور سے مردہ دلوں کو زندہ کرتا ہے وہی اپنی معرفت اور اپنے اسمائے بلند کی خوشبو سے قلوب کو گرماتا ہے۔ خدا کی رحمت ہو رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر، ان کی آل، ان کے اصحاب اور ان کی ازواج مطہرات پر۔ ص ۲

علی بن عثمان بن ابی علی الجلابی الغزنوی ثم الہجویری نے کہا کہ اے طالبِ صادق باری تعالیٰ تجھے سعادت نصیب کرے میں نے استخارہ کیا۔ اور دل میں نمودار ہونے والی ہر غرض سے منہ پھیرا اور تیری استدعا پر (اللہ تعالیٰ تجھے نیک بخت بنائے) تیار ہو کر تیری مراد کے مطابق اس کتاب کو مکمل کرنے کا ارادہ کیا اور اس کا نام "کشف المحجوب" رکھا تیرا مقصد ظاہر ہوا اور تیرے مطلب کی بات اس کتاب کو مقسوم ہوئی۔ میں باری تعالیٰ سے اس کی تکمیل کے لیے مدد اور توفیق کا طالب ہوں اور گفتار و کردار میں اپنی طاقت اور بساط سے براءت کا اظہار کرتا ہوں۔ سب توفیق اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

فصل

ص ۳ — میں نے کتاب کے شروع میں اپنا نام تحریر کیا ہے اس سے دو چیزیں مراد ہیں۔ ایک خاص لوگوں سے متعلق ہے اور دوسری عوام سے۔ عوام سے متعلق تو یہ ہے کہ جب علم سے بے بہرہ لوگ دیکھتے ہیں کہ کسی کتاب پر مصنف کا نام ثبت نہیں تو افترا پردازی سے کام لے کر وہ اسے اپنی تصنیف ظاہر کرتے ہیں اس طرح اصلی مصنف کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ جمع، تالیف اور تصنیف سے مراد یہی ہوتی ہے کہ مصنف کا نام زندہ رہے پڑھنے والے اور علم کا ذوق رکھنے والے اسے دعائے خیر سے یاد کریں۔ یہ حادثہ مجھے دوبار پیش آیا۔ ایک بار تو میرے اشعار کا دیوان کسی نے مانگا اور لے گیا۔ اس کے سوا میرے پاس کوئی اور نسخہ نہ تھا۔ اس نے دیوان کو بالکل بدل دیا میرا نام اس پر سے مٹا دیا اور میری تمام محنت کو برباد کر دیا اللہ اُسے معاف کرے۔ دوسری بار میں نے ایک کتاب طریق تصوّف پر "منہاج الدین" تصنیف کی (اللہ تبارک و تعالیٰ اسے رواج دے) ایک مدعی نااہل نے جس کا نام میں ظاہر کرنا نہیں چاہتا، میرا نام اُس پر سے مٹا دیا اور لوگوں میں مشہور کر دیا کہ یہ اس کی تصنیف ہے۔ خاص لوگوں نے جو اس کی قابلیت اور علمی بے بضاعتی سے واقف تھے اس کی جسارت کا مذاق اڑایا۔ باری تعالیٰ نے اس پر نحوست طاری کی اور اس کا نام طالبان حق کی فہرست سے مٹا دیا۔

— اور جہاں تک خاص لوگوں کی بات ہے تو اُن سے متعلق یہ ہے کہ جب وہ دیکھتے ہیں کہ کسی کتاب کا مصنّف اس علم اور اس فن کا عالم اور محقق ہے تو وہ اس کے حقوق کی پوری رعایت رکھتے ہیں اور کتاب کا مطالعہ کرنے اور اُسے یاد رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اس طرح کتاب لکھنے والے کا مقصد بطریق احسن پورا ہو جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بہتر جاننے والا ہے۔

فصل

میں نے اوپر استخارہ کا ذکر کیا تھا اس کا مطلب آداب خداوند تعالیٰ کو ملحوظ رکھنا ہے۔ باری تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی اُمت کے لیے فرمایا: فَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ (قرآن پڑھتے وقت اللہ کی جناب سے شیطان مردود کے وسوسوں سے پناہ مانگو) استعاذت۔ استخارت اور استعانت کا — مطلب مدد مانگنا، اپنے کاموں کو سپرد خدا کرنا اور مختلف مصائب سے نجات حاصل کرنا ہے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے

صحابہ کرام سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم استخارہ کی ترغیب فرماتے جیسے مذکورہ آیت میں استعاذہ کی تاکید آئی ہے۔ انسان جانتا ہے کہ کسی چیز کی کامیابی اس کی اپنی تدبیر اور بساط پر منحصر نہیں بلکہ باری تعالیٰ کی ذات پاک اس کی بہتری جانتی ہے۔ نیکی اور بدی سب اسی کے تابع فرمان ہے اور ہر چیز پہلے ہی مقدر ہو چکی ہے اس لیے ہر چیز اسی ذات کے سپرد کر دینا چاہیے۔ یہ لازم ہے کہ اسی کی استعانت طلب کی جائے اور اسی کی رضا پر سر تسلیم خم کیا جائے تاکہ اس کا فضل و کرم نفس کی رعونت اور شر کو نابود کر دے اور ہر کام میں کامیابی اور کامرانی شامل حال رہے۔ ہر کام کے آغاز میں استخارہ ضروری ہے تاکہ باری تعالیٰ آفات و خطرات سے اور فساد و لغزش سے محفوظ رکھے وباللہ التوفیق (اور سب توفیق اللہ کی طرف سے ہے۔

فصل

اور یہ جو میں نے کہا کہ دل میں نمودار ہونے والی ہر غرض سے میں نے منہ پھیرا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کام میں بھی کوئی نفسانی غرض کارفرما ہو اس میں برکت نہیں رہتی اور دل راہ مستقیم سے بھٹک کر دنیا کے کاموں میں مشغول ہو جاتا ہے۔ اس کی دو ہی صورتیں ہیں یا نفس کی غرض پوری ہو جاتی ہے یا نہیں ہوتی۔ اگر غرض پوری ہو جائے تو یہ چیز اس کی ہلاکت کا باعث بنتی ہے کیونکہ دوزخ کی چابی نفسانی خواہشات کی تکمیل ہے۔ اگر غرض پوری نہ ہو تو اس کا بوجھ بہت حد تک اس کے دل سے دور ہو جاتا ہے۔ یہی اس کی نجات ہے۔ درحقیقت نفسانی اغراض کو ختم کر دینا ہی بہشت کے دروازے کی چابی ہے۔ باری تعالیٰ نے فرمایا: وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (جس نے نفسانی خواہشات کو روکا ضرور جنت اس کی جائے رہائش ہوگی) نفسانی خواہشات کی کارفرمائی یہ ہے کہ کسی کام میں باری تعالیٰ کی رضا مدِنظر نہ ہو اور نہ ہی اپنے نفس کو عذاب سے بچانے کی خواہش ہو۔ رعونتِ نفسانی کی کوئی حد نہ رہے اور درماندگی نفس کو نظرانداز کر دیا جائے۔ اس کتاب میں مناسب جگہ پر اس بارے میں علیحدہ باب آئے گا انشاء اللہ تعالیٰ۔

فصل

اور میں نے جو یہ بات کہی کہ تیری استدعا پر تیار ہو کر تیری مراد کے مطابق اس کتاب کو مکمل کرنے کا ارادہ کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ تو نے مجھے سوال کا جواب بہم پہنچانے کے قابل سمجھ کر اپنا سوال پوچھا اور اس کتاب کے لیے استدعا کی تو مستفید ہونا چاہتا تھا اس لیے مجھ پر واجب ہوا کہ تیرے سوال کا کماحقہ، جواب مہیا کروں۔ تیرے سوال کی پوری گہرائی کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے پورے عزم اور نیت کی ضرورت ہے تاکہ جواب حسبِ سوال

مرتب ہو سکے۔ ابتدائے کار میں بندہ کا ارادہ نیّت سے وابستہ ہوتا ہے۔ دورانِ کار اگر کوئی خلل واقع ہو تو بندہ معذور ہوتا ہے اس لیے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نِیَّۃُ الْمُؤْمِنِ خَیْرٌ مِّنْ عَمَلِہٖ (مومن کے لیے (ابتدا کی) نیّتِ خیر عمل (بے نیّت) سے بہتر ہے۔

نیّت کا امورِ انسانی میں بہت دخل ہے اور اس کی بیّن دلیل یہ ہے کہ انسان بوجہ نیّت اکثر ڈگمگا جاتا ہے گو بظاہر کوئی اثر نظر نہ آئے۔ اگر کوئی شخص بغیر نیّتِ روزہ عرصہ تک بھوکا رہے تو کسی ثواب کا مستحق نہیں۔ اگر روزہ کی نیّت ہو تو بغیر کسی ظاہری اثر کے مقربِ حق ہو۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی شہر میں داخل ہو تو وہ شہر میں مقیم نہیں سمجھا جا سکتا جب تک نیّتِ اقامت نہ کرے۔ اگر نیّتِ اقامت ہو تو یقیناً مقیم سمجھا جائے گا۔ اس قسم کی مثالیں بے شمار ہیں۔ مختصر یہ کہ ہر کام کی ابتدا میں نیت خیر کرنا ضروری ہے واللہ اعلم (اور اللہ بہتر جاننے والا ہے)

فصل

اور یہ جو میں نے کہا کہ اس کتاب کا نام میں نے "کشف المحجوب" رکھا ہے مقصد یہ ہے کہ کتاب کے نام ہی سے اس کا مفہوم ظاہر ہو جائے اور اہلِ بصیرت جب نام سنیں تو انہیں معلوم ہو جائے کہ موضوعِ کتاب کیا ہے۔ معلوم ہونا چاہیئے کہ سوائے اولیائے کرام کے جو بارگاہِ حق کے مقرب ہوتے ہیں لوگ حقیقت آشنا نہیں ہوتے۔ چونکہ یہ کتاب راہِ حقیقت کو نمایاں کرتی ہے۔ تحقیق امور کی شرح کرتی ہے اور بشریت کے پردوں کو اٹھاتی ہے۔ اس کا نام "کشف المحجوب" ہی ہونا چاہیئے تھا۔ اور حقیقت میں کشف، محجوب کی (چھپی ہوئی چیزوں کی) ہلاکت ہے جس طرح حجاب مکاشف کی (نمایاں چیزوں[1] کی) نزدیکی کو دوری کی تاب نہیں ہوتی اور دوری کو نزدیکی کی طاقت نہیں۔ سرکہ میں جو جاندار پیدا ہو سرکہ سے باہر زندہ نہیں رہ سکتا۔ سرکہ سے باہر کا جاندار سرکہ میں مرجاتا ہے۔ اسرار و معانی کی تلاش بہت دشوار ہے بجز ان لوگوں کے جن کا مقصدِ حیات یہی ہو۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کُلٌّ مُّیَسَّرٌ لِّمَا خُلِقَ لَہٗ (باری تعالیٰ نے ہر کسی کو جس مقصد کیلئے پیدا کیا ہے اس کا سامان بہم پہنچایا ہے)

حجاب دو ہیں۔ ایک رینی یہ کبھی دور نہیں ہوتا۔ دوسرا غینی جو بہت جلد ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ کچھ لوگ بالطبع محجوب ہوتے ہیں اور وہ حق و باطل میں تمیز نہیں کرتے۔ کچھ لوگوں کا حجاب وصفی یعنی عارضی ہوتا ہے۔ وہ جویائے حق ہوتے ہیں اور باطل سے گریز کرتے ہیں۔ حجاب ذاتی یعنی رینی کبھی نہیں اٹھتا۔ رین، ختم اور طبع کے معنی ایک ہی ہیں۔ چنانچہ باری تعالیٰ نے فرمایا: کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ " بلکہ ان کے اعمال کی وجہ سے اُن کے

---

[1] چھپی ہوئی چیزوں کا ظاہر ہونا اور ظاہر چیزوں کا چھپ جانا گویا ان کا ہلاک ہونا ہے۔

دلوں پر زنگ لگ چکا ہے۔" پھر اُس کا حکم اس طرح بیان فرمایا: اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ۔ "جن لوگوں نے کفر کیا برابر ہے آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں۔ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔" پھر اس کی وجہ اس طرح بیان فرمائی خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ "اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی۔" اور یہ بھی فرمایا طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ حجابِ صفتی جسے غینی کہتے ہیں وہ کسی نہ کسی وقت دور ہو جاتا ہے جبلت کا بدلنا یعنی ذاتی حجاب ارینی کا اٹھنا شاذ بلکہ از روئے مشاہدہ ناممکن ہے۔ لیکن صفتی عوارض بدل سکتے ہیں۔ مشائخ کرام نے رین اور غین کے معانی بیان کرنے میں نازک نکات بیان کیے ہیں چنانچہ جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: الرّین من جملۃ الوطنات والغین من جملۃ الخطرات "رین وطنات کی قبیل سے ہے اور غین خطرات کی قسم ہے۔" وطن پائیدار ہوتا ہے اور خطر عارضی۔ پتھر سے شیشہ نہیں بنایا جا سکتا چاہے دنیا بھر کے شیشہ گر جمع ہو جائیں، اس کے برعکس اگر آئینہ زنگ سے آلودہ ہو جائے تو صیقل سے صاف ہو جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ظلمت پتھر کی جبلت ہے اور روشنی آئینہ کی۔ آئینہ کی اصلیت قائم رہتی ہے اور اس کی عارضی صفت یعنی زنگ دور ہو جاتا ہے۔ میں نے اس کتاب کو اس لیے لکھا کہ یہ ان دلوں کے زنگ کو دور کرے جو حجاباتِ غینی میں مبتلا ہوں مگر نورِ حق کی جھلک ان کے اندر موجود ہو۔ اس کتاب کو پڑھنے کی برکت سے حجابِ غینی اٹھ جائے اور حقیقت کی راہ روشن ہو جائے۔ جن لوگوں کی سرشت انکارِ حق اور اختیارِ باطل ہے۔ وہ اس کی مدد سے راستہ نہیں پائیں گے اور ان کو مشاہداتِ حق نصیب نہیں ہوں گے والحمد للہ علی نعمۃ العرفان "اور سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے عرفان کی نعمت عطا فرمائی۔"

فصل

اور یہ جو میں نے کہا کہ تیرا مقصد ظاہر ہوا اور تیرے مطلب کی بات اس کتاب کو مقسوم ہوئی اس سے مراد یہ تھی کہ جب تک سائل کا مقصد ظاہر نہ ہو کوئی چیز حاصل نہیں ہو سکتی۔ سوال اکثر مشتبہ ہوتے ہیں اور چونکہ جواب سے مشتبہ چیزیں حل نہیں ہوتیں اس لیے کوئی مفید مطلب چیز بھی حاصل نہیں ہوتی اور میں نے جو یہ بات کہی کہ تیرے مطلب کی بات اس کتاب کو مقسوم ہوئی اُس سے مقصد یہ ہے کہ جامع سوال کا جواب بھی جامع ہوتا ہے اگر سائل اپنے سوال کے درجات سے کماحقہٗ واقف ہو۔ علاوہ ازیں مبتدی کے لیے تفصیل کی ضرورت ہوتی ہے اور اقسام و حدود کا بیان بھی لازمی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تجھے سعادت نصیب کرے تیری غرض یہی تھی کہ میں جواباً تفصیل سے بیان کروں اور بیان کو کتاب کی شکل دوں وباللہ التوفیق "اور توفیق اللہ کی طرف سے ہے۔"

فصل

اور میں نے جو یہ کہا کہ میں اللہ تعالیٰ سے توفیق اور مدد مانگتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سوائے خدا کی ذات کے بندہ کا کوئی مددگار نہیں۔ وہی ہے جو اس کو نیک اعمال کی توفیق دیتا ہے۔ توفیق سے مراد اعمالِ نیک میں تائیدِ ایزدی حاصل ہونا ہے۔ کتاب و سنّت توفیقِ الٰہی کے وجود صحت پر شاہد ہیں اور امّت اس پر متفق۔ سوائے معتزلہ اور قدریہ جماعتوں کے جو لفظ توفیق کو بے معنی سمجھتے ہیں۔ اس طریقت کے مشائخ کے ایک گروہ کا قول ہے:
التوفیقُ ھوالقدرةُ علی الطاعة عند الاستعمال "توفیق طاعت اور بندگی پر قادر ہونے کا نام ہے"۔
جب بندہ حکمِ خداوندی پر چلتا ہے تو اس کو باری تعالیٰ کی طرف سے قوت اور مدد عطا ہوتی ہے۔ وہ پہلے کی نسبت ترقی پاتا ہے ہر حال میں اور ساعت بساعت۔ انسان کی ہر حرکت اور سکون کا خالق خدائے تعالیٰ ہے جو طاقت اسے بندگی پر آمادہ کرتی ہے اسی کا نام توفیق ہے۔ یہ کتاب اس مسئلہ پر بحث کرنے کی چیز نہیں اس کا مطلب کچھ اور ہے۔ میں بارِ دیگر تیرے مقصد کی بات چھیڑتا ہوں اور قبل اس کے کہ بیان شروع کروں تیرے سوال کو بعینہٖ تحریر کرتا ہوں اس کے بعد کتاب کا آغاز کروں گا وباللہ التوفیق "اور سب توفیق اللہ ہی کی طرف سے ہے"۔

قال السائل وھو ابوسعید الھجویری سائل یعنی ابوسعید الہجویری نے کہا آپ بیان فرمائیں

صُورتِ سوال طریقِ تصوّف کی حقیقت۔ اہلِ تصوّف کے مقامات کی کیفیّت ان کے مختلف راستوں اور قولوں کی توضیح اور نیز مطلع فرماویں ان کے اشارات اور رموز سے۔ خدائے تعالیٰ کی محبت کا حال اور اس کے ظہور کی دلوں میں کیفیت بھی واضح کریں۔ یہ بھی بیان فرماویں کہ عقل اس کی ماہیت سمجھنے سے کیوں قاصر ہے؟ نفس اس کی حقیقت معلوم کرنے سے کیوں نفور ہے؟ اور روح کو اس کی تعریف سے کیوں راحت ہے؟ یہ اور باقی تمام چیزیں جو اس معاملہ سے تعلق رکھتی ہیں۔

قال المسئول وھو علی بن عثمان الجلابی رحمۃ اللہ علیہ مسئول یعنی علی بن عثمان الجلابی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ ہمارے اس زمانے میں علم تصوّف کی حقیقت کھوکھلی ہو کر رہ گئی ہے۔ بالخصوص اس دیار میں جہاں لوگ حرص، ہوس میں مبتلا ہیں اور تسلیم و رضا کے راستہ سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ علمائے زمانہ اور مدعیانِ وقت نے اس کی صورت مسخ کر رکھی ہے۔ ایسے دور میں ہمت ایسی چیز کی کرنی چاہیے جسے زمانہ کے ہاتھ نے نہ چھوا ہو اور سوائے

خاصانِ حق کے تمام اہلِ ارادت اس سے منقطع ہوں اور تمام اہلِ معرفت کی معرفت اس سے خارج ہو۔ خاص و عام فقط لفظی عبارت پر اکتفا کرتے ہیں اور حقیقت کو حجاب در حجاب رکھنے کے دلدادہ ہیں۔ تحقیق سے روگرداں ہو کر تقلید کے پرستار ہیں۔ تحقیق ان کی دنیا سے مفقود ہے۔ عوام اس صورتِ حال کو پسند کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم حق شناس ہیں۔ خواص خوش ہیں کیونکہ اس صورتِ حال کی وہ دل میں تمنا رکھتے ہیں، نفس میں حاجت اور سینہ میں میلان۔ وہ اپنے اشغال کو شوقِ رویتِ باری اور سوزِ محبت سے تعبیر کرتے ہیں۔ مدعی خود اپنے دعوے کے باعث پورے معانی سے محروم ہوئے۔ مریدوں نے مجاہدہ سے منہ پھیر لیا۔ بے کار وہم و خیال کا نام مشاہدہ رکھ دیا۔ میں نے اس سے پہلے کتب تصنیف کیں جو تمام ضائع ہو گئیں۔ جھوٹے دعویداروں نے ان میں سے بعض چیزیں لوگوں کو شکار کرنے کے لیے چن لیں اور باقی چیزوں کو ملیا میٹ کر دیا یہ اس لیے کہ صاحبِ طبع لوگ حسد و انکار کو بھی نعمتِ خداوندی سمجھتے ہیں۔ ایک دوسری جماعت کے لوگ بیٹھے مگر نہ پڑھ سکے اور نہ معنی سمجھ سکے صرف عبارت کو پسند کیا تاکہ اسے لکھیں۔ یاد کریں اور کہتے پھریں کہ ہم علمِ تصوف و معرفت بیان کر رہے ہیں یہ ان کی عین بدبختی ہے۔ در اصل علمِ تصوف کے رازکبریتِ احمر کی طرح قابلِ قدر ہیں اور کبریتِ احمر جب حاصل ہو جائے تو کیمیا ہوتی ہے اور اس کی ایک چٹکی بہت سے تانبے اور کانسی کو زرِ خالص بنا دیتی ہے۔ الغرض ہر شخص وہ دوا طلب کرتا ہے جو اس کے درد کے موافق ہو اس کے علاوہ اسے کچھ نہیں چاہیئے چنانچہ کسی بزرگ نے کہا ہے ؎

فَکُلُّ مَنْ فِی فُؤادِہٖ وَجْعٌ   یَطْلُبُ شَیْئاً یُوَافِقُ الوَجَعَا

"جس کے دل میں درد ہوتا ہے۔ وہ اپنے درد کے موافق دوا طلب کرتا ہے۔"

جس کے مرض کا علاج حقیر سی چیز ہو اس کو مروارید اور مرجان کی ضرورت نہیں کہ شلیثا اور دوار المسک میں ملا کر کھائے۔ یہ بات بہت زیادہ قابلِ قدر ہے کیونکہ ہر شخص کا حصہ مقرر ہے۔ آج سے قبل اس علم سے بے بہرہ جاہلوں نے مشائخ کرامؒ کی کتابوں کے ساتھ کیا کیا؟ جب یہ اسرار کے خزانے ان کے ہاتھ لگے تو معانی ان کی سمجھ میں نہ آئے اور انہوں نے وہ کتابیں ٹوپیاں سینے والے جہلا کے سامنے ڈال دیں تاکہ وہ ٹوپیوں کے استر بنائیں۔ اور ناپاک جلد سازوں کو دے دیں تاکہ وہ شعرِ ابونواس اور ہزلِ جاحظ کے دیوانوں کی جلدیں کریں۔ لامحالہ جب بادشاہ کا شاہین کسی بڑھیا کی کٹیا کی دیوار پر جا بیٹھا تو اس کے بال و پر کٹ گئے۔ خداوند عزوجل نے ہمیں ایسے دور میں پیدا کیا ہے جس میں لوگ ہوا و ہوس کو شریعت کہتے ہیں۔ طلبِ جاہ، طلبِ حکومت اور تکبر کو عزت اور علم جانتے ہیں خلقِ خدا سے ریاکاری کو خوفِ خدا گردانتے ہیں۔

اور کینہ کو دل میں چھپا رکھنے کو حلم و بردباری۔ لڑائی کرنے کو مناظرہ۔ جنگ اور حماقت کو عظمت۔ منافقت کو زہد۔ ہوس کو سلوک اور ہذیانِ طبع کو معرفت، دل کی دھڑکن اور نفس کی تاویلات کو محبت۔ الحاد کو فقر۔ جحود و انکار کو تزکیہ، زندقہ و بے دینی کو فنا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت چھوڑ دینے کو طریقت اور زمانے میں آفت پھیلانے کو معاملت سمجھتے ہیں، یہاں تک کہ اربابِ حقیقت مغلوب ہو کر رہ گئے اور وہ ہر طرف چھا گئے۔ جس طرح پہلے دور میں آلِ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت پر آلِ مروان غلبہ پا گئے تھے۔ کیا خوب کہا ہے اس اربابِ حقائق کے بادشاہ اور تحقیق و دقائق کے سردار ابوبکر الواسطی رحمۃ اللہ علیہ نے ابتلینا بزمان لیس فیہ آداب الاسلام ولا اخلاق الجاھلیۃ ولا احکام ذوی المروۃ "ہماری آزمائش ایسے زمانے میں ہے جس میں نہ آدابِ اسلام ہیں نہ اخلاقِ جاہلیت اور نہ اربابِ مروۃ کے احکام"۔ متنبی نے بھی عین اسی کے موافق کہا ہے

لحا اللہ ذی الدنیا مناخا لراکب ❊ فکل بعید الھم فیھا معذب

تو سمجھ (خدا تجھے قوت عطا کرے) کہ میں نے اس عالم کو اسرارِ خداوندی کا مقام پایا۔ موجودات کو اس کی ودیعتوں کا امین سمجھا اور ثابت الوجود اشیاء کو اس کے دوستوں کے حق میں حاملِ لطائف دیکھا۔ جوہر، عرض، عناصر، اجرام، اجسام اور طبائع سب اسرار کے لیے حجاب ہیں اور مقامِ توحید میں ان چیزوں میں الجھنا شرک کے برابر ہے۔ باری تعالیٰ نے اس عالم کو حجاب در حجاب رکھا ہے۔ ہر طبیعت اپنی استطاعت کے مطابق طمانیت حاصل کرتی ہے اور اپنے اوپر توحید کی طرف سے پردہ گرا لیتی ہے۔ اور ارواح اس دنیا میں مزاج زندگی کے مطابق بو گشتہ ہو کر اس کے قرب کے باعث اپنے مقامِ نجات سے دور بھٹک جاتی ہیں۔ اسرارِ ربانی عقل و ادراک کے لیے مشکل ہو جاتے ہیں اور قربِ حق کی لطافتیں روپوش ہو جاتی ہیں۔ آدمی اپنی غفلت کی تاریکیوں کی وجہ سے اپنی ہی ہستی میں الجھ جاتا ہے اور خصوصیت کے درجات کے معاملے میں اپنے حجابات میں کھو جاتا ہے۔ چنانچہ باری تعالیٰ نے کہا: وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ "قسم ہے وقت کی انسان یقیناً گھاٹے میں ہے"۔ اور نیز فرمایا: اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَھُوْلًا "تحقیق آدمی بڑا ظالم اور جاہل ہے"۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: خلق اللہ الخلق فی ظلمۃ ثم القی علیہ نورا "اللہ نے مخلوق کو تاریکی میں پیدا کیا پھر اس پر نور ڈالا"۔ پس یہ حجاب اس کی جبلت میں ہے جو بمطابقِ طبع اور حسبِ تصرفِ عقل حائل ہوتا ہے۔ لامحالہ وہ جہالت پسند اپنے اس حجاب کا دل دادہ واقع

ہوا ہے ایسا کہ جمالِ کشف سے بے خبر۔ تحقیق اسرارِ خداوندی سے روگرداں۔ چوپایوں کے مقام پر فروکش۔ اپنے مقام سے اکھڑا ہوا۔ خوشبوئے توحید سے ناآشنا۔ جمالِ احدیّت سے محروم۔ ذوقِ توحید سے بے نصیب، تحقیق و مشاہدہ سے برگشتہ اور رضائے خداوندی چھوڑ کر دنیا کی حرص میں مبتلا۔ اس کے نفسِ حیوانی نے جو حیاتِ حقیقی سے دور ہے نفسِ ناطقہ کو مغلوب کر دیا اور اس کی جملہ حرکت، طلب حیوانیت تک محدود ہو کر رہ گئی ہے، سوائے کھانے، سونے اور اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے اسے کسی چیز کی خبر نہیں۔ باری تعالیٰ نے اپنے دوستوں کو ان تمام چیزوں سے بچنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ۔ "اے پیغمبر ان کو چھوڑ دیجیے۔ کھائیں اور فائدہ اٹھائیں اور اپنی آرزوؤں کو طول دیں یہ عنقریب جان جائیں گے۔" ان کی طبع کا رفرما نے سرِّ حق ان کی نگاہوں سے پوشیدہ کر دیا۔ عنایت و توفیق کے بجائے ان کے نصیب میں ناامیدی اور خلفشار ہے۔ وہ تمام نفسِ امّارہ کے فرمانبردار ہیں اور نفسِ امّارہ ایک بہت بڑا حجاب اور برائی اور بدی کا سرچشمہ ہے۔ باری تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ۔ "تحقیق نفسِ امّارہ برائی کی ترغیب دیتا ہے۔ اب میں کتاب شروع کرتا ہوں اور مقامات و حجابات سے متعلق تیرے مقصد کو ظاہر کرتا ہوں اور بیانِ لطیف مرقوم کرتا ہوں۔ اہلِ علم و فن کی تحریروں کی تشریح لکھتا ہوں۔ مشائخ کرامؒ کے کلام سے کچھ اس میں شامل کرتا ہوں۔ چند اچھی حکایات کی بھی مدد لیتا ہوں تاکہ تیری مراد پوری ہو۔ اگر علمائے ظاہر وغیرہ بھی اس کو پڑھیں تو ان کو معلوم ہو کہ طریقِ تصوف کا درخت مضبوط ہے اور اس کی شاخیں پھل دار، تمام اہلِ تصوّف صاحبِ علم ہوئے ہیں۔ اپنے مریدوں کو علم سے بہرہ ور کرتے رہے ہیں اور ان کو تحصیلِ علم پر مداومت کرنے کی تاکید فرماتے رہے ہیں۔ وہ کبھی حرص و ہوا اور لہو و لعب میں مبتلا نہیں ہوئے اور کبھی لغویت کے راستے پر نہیں چلے۔ مشائخ طریقت میں سے بہت سے علماء نے کتابیں تصنیف کی ہیں اور اپنی لطیف تحریروں سے اسرارِ ربّانی پر دلائل سے روشنی ڈالی ہے وباللہ التوفیق "اور سب توفیق اللہ کی طرف سے ہے۔"

پہلا باب

اثباتِ علم

ص ۱۱/۱۴

خداوند تعالیٰ نے علماء کی تعریف میں فرمایا اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُ "تحقیق اُس کے بندوں میں عالم لوگ ہی اللہ سے ڈرنے والے ہیں"۔ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَۃٍ "طلب علم ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے"۔ نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ بِالصِّیْنِ "علم حاصل کرو اگرچہ چین میں ہو"۔

جاننا چاہیئے کہ علم کا میدان بہت وسیع ہے اور عمر مختصر۔ اس لیے تمام علوم کا حاصل کرنا فرض نہیں مثلاً علم نجوم۔ علم طب۔ علم حساب اور عجائبات عالم کا علم وغیرہ۔ صرف اتنا علم حاصل کرنا ضروری ہے جتنا شریعت سے متعلق ہو مثلاً علم نجوم اتنا کہ رات کے عالم میں تعیّنِ اوقات ہو سکے۔ طب صرف اس قدر کہ صحت کی حفاظت ہو سکے اور حساب اتنا کہ علمِ فرائض کے لیے ضروری ہو یا مدّتِ عدّت کا تعیّن کرنے میں معاون ہو۔ مختصر یہ کہ علم وہی فرض ہے جس پر عمل ہو سکے۔ باری تعالیٰ نے ان لوگوں کی برائی بیان فرمائی ہے جو بے نفع علم کے لیے سرگرداں ہوں فرمایا: وَیَتَعَلَّمُوْنَ مَا یَضُرُّھُمْ وَلَا یَنْفَعُھُمْ "اور سیکھتے ہیں وہ چیز جو ان کو نقصان پہنچائے اور نفع نہ دے"۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ چاہا اور فرمایا: "اَعُوْذُبِکَ مِنْ عِلْمٍ لَّا یَنْفَعُ" (اے رب) میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس علم سے جو نفع نہ دے۔ "پس تھوڑے علم پر زیادہ عمل ہو سکتا ہے"۔ اور علم کو ہمیشہ عمل کے دوش بدوش ہونا چاہیئے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اَلْمُتَعَبِّدُ بِلَا فِقْہٍ کَالْحِمَارِ فِی الطَّاحُوْنَۃِ "بے علم عبادت کرنے والا خراس کے گدھے کی مانند ہے"۔ ہر چند وہ گھومتا ہے مگر اپنے مقامِ آغاز سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اور اس سے کوئی راہ طے نہیں ہو پاتی۔ میں نے عوام کا ایک گروہ ایسا دیکھا ہے جو علم کو عمل پر فضیلت دیتا ہے اور دوسرا گروہ ایسا ہے جو عمل کو علم پر ترجیح دیتا ہے۔ یہ دونوں عقیدے باطل ہیں۔ کیونکہ عمل بغیرِ علم کسی طرح بھی عمل کہلانے کا مستحق نہیں۔

ص ۱۱/۱۵

عمل وہی صحیح ہوتا ہے جو علم کی روشنی میں حاصل ہو اور ایسے ہی عمل سے بندہ ثواب کا حق دار ہوتا ہے جیسے کہ نماز، نماز نہیں ہوتی جب تک نماز قائم کرنے والے کو ارکانِ طہارت کا علم۔ پانی کی پہچان۔ قبلہ کی واقفیت۔ نیتِ نماز کی کیفیت اور ارکان نماز کا علم نہ ہو۔ غرض جب عمل کی بنیاد ہی علم پر ہے تو ان دونوں میں تفریق محض جہالت ہے۔ اسی طرح علم کی عمل پر فضیلت سمجھنا بھی غلطی ہے۔ کیوں کہ علم بے عمل کو علم نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ باری تعالیٰ نے فرمایا نَبَذَ فَرِیْقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ کِتٰبَ اللّٰہِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ کَاَنَّهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ "اہل کتاب میں سے ایک فریق نے اللہ کی کتاب کو پسِ پشت ڈال دیا گویا کہ انہیں علم ہی نہیں"۔ عالمِ بے عمل کو علماء سے خارج گردانا اس لیے کہ علم کا سیکھنا، یاد رکھنا اور یاد کرنا بھی شاملِ عمل ہے اور اس سے آدمی ثواب حاصل کرتا ہے اور اگر عالم کا علم اس کے کام اور کسب میں ظاہر نہ ہوتا تو وہ کسی ثواب کا حق دار نہ ہوتا۔ یہ دو گروہوں کے اقوال ہیں ایک وہ جو دنیوی جاہ و مرتبت کو علم سے وابستہ سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ صحیح برتاؤ کی طاقت نہیں رکھتے۔ یہ درحقیقت علم سے بے بہرہ ہوتے ہیں عمل کو علم سے جدا رکھتے ہیں۔ نہ علم رکھتے ہیں نہ عمل ایک کہتا ہے "علم، گفتار نہیں بلکہ عمل کی ضرورت ہے دوسرا کہتا ہے علم چاہیے عمل کی ضرورت نہیں۔ ابراہیم ادھم رضی اللہ عنہ سے حکایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے راہ میں ایک پتھر دیکھا اس پر لکھا ہوا تھا کہ مجھے پلٹ کر پڑھو میں نے پلٹا اس پر لکھا تھا: "لَا تَعْمَلُ بِمَا تَعْلَمُ فَکَیْفَ تَطْلُبُ مَا لَا تَعْلَمُ" "تو اپنے علم پر عمل نہیں کرتا تو پھر جس چیز کا تجھے علم نہیں وہ کیوں طلب کرتا ہے"۔ اس چیز پر کاربند ہو جس کا تجھے علم ہے تاکہ اس کی برکت سے تجھے وہ چیز بھی حاصل ہو جائے جس کا تجھے علم نہیں۔ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا: هِمَّةُ الْعُلَمَاءِ الدِّرَایَةُ وَهِمَّةُ السُّفَهَاءِ الرِّوَایَةُ "علماء کی ہمت درایت یعنی عقل کے ذریعہ حاصل کرنا ہوتی ہے اور جاہلوں کی بضاعت روایت یعنی محض نقل کرنا"۔ کیوں کہ اہلِ جہالت علماء سے دور ہوتے ہیں۔ جو علم سے دنیا کی عزت اور مرتبہ چاہتا ہے عالم نہیں ہوتا، کیونکہ دنیوی جاہ و مرتبت جہالت کے متعلقات سے ہے اور علم کے لیے یہ بلند ترین مقام ہے کہ اگر علم نہ ہو تو انسان پر لطائفِ خداوندی کا کوئی راز ظاہر نہیں ہوتا اور جب علم موجود ہو تو آدمی ہر مقام کے مشاہدہ اور مرتبہ کا سزاوار رہتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب "اور اللہ بہتر جاننے والا ہے۔"

فصل

معلوم ہونا چاہیے کہ علم دو ہیں۔ علم خداوند تعالیٰ اور علم بندہ۔ بندے کا علم خدا کے علم کے سامنے ہیچ ہے۔

خدا کا علم اس کی صفت ہے اُس کی ذات سے قائم اور اس کے اوصاف کی کوئی انتہا نہیں۔ ہمارا علم ہماری صفت ہے ہماری ذات پر منحصر، اور ہمارے اوصاف محدود ہیں۔ باری تعالیٰ نے فرمایا: وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا "اور نہیں دیا گیا تم کو علم مگر تھوڑا"۔ الغرض علم صفاتِ مدح سے ہے اور اس کی حد صرف معلومات کے دائرے اور تعینات کے حلقے تک ہے۔ علم کی حدود کا بہترین تصور یہ ہے کہ اَلْعِلْمُ صِفَةٌ يَّصِيْرُ الْجَاهِلُ بِهَا عَالِمًا "علم ایک ایسی صفت ہے جو جاہل کو عالم بناتی ہے"۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ "اور اللہ کافروں کا احاطہ کرنے والا ہے"۔ اور یہ بھی فرمایا۔ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ "اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے"۔ اللہ تعالیٰ کا علم ایک ہے جس سے وہ تمام موجودات۔ معدومات اور خلق کو جانتا ہے اس علم میں کوئی اس کا شریک نہیں یہ بٹ نہیں سکتا اور نہ ہی اس کی ذات پاک سے جدا ہو سکتا ہے۔ ترتیبِ کائنات اس کے علم کی دلیل ہے۔ کیونکہ فعل محکم فاعل کا مقتضی ہوتا ہے۔ اس کا علم اسرارِ کائنات پر حاوی ہے اور اظہار پر محیط۔ طالبِ حق کو چاہیئے کہ اپنے ہر کام میں باری تعالیٰ کو شاہد و ناظر سمجھے۔

ص ۱۳/۱۲

حکایت: کہتے ہیں بصرہ میں ایک رئیس تھا وہ اپنے باغ میں گیا۔ وہاں اس کی نظر اپنے ملازم کی بیوی پر پڑی۔ ملازم کو کسی کام کے بہانے باہر بھیج دیا اور عورت سے کہا دروازے بند کر دو۔ عورت نے کہا میں نے سب دروازے بند کر دیئے مگر ایک جو بند نہیں ہو سکتا۔ رئیس نے پوچھا وہ دروازہ کونسا ہے؟ عورت نے جواب دیا جو ہمارے اور خدا کے درمیان ہے۔ رئیس بہت پشیمان ہوا اور توبہ کی۔

حاتم اصم رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے چار چیزوں کا علم حاصل کیا اور تمام دنیا کے علوم سے رہائی پائی اُن سے پوچھا گیا کونسی چار چیزوں کا علم ہے؟ کہا اوّل یہ کہ میں نے یہ جانا کہ میرا رزق مقدر ہے اور کم یا زیادہ نہیں ہو سکتا اس طرح طلبِ زیادت سے نجات پائی۔ دوم یہ کہ میں نے یہ جانا کہ خدا تعالیٰ کا مجھ پر حق ہے اور وہ میرے سوا کوئی ادا نہیں کر سکتا میں اس حق کو ادا کرنے میں مشغول ہو گیا۔ سوم یہ کہ میں نے یہ جانا کہ میرا ایک طالب ہے یعنی موت جس سے مفر نہیں میں نے اس کو پہچان لیا۔ چہارم یہ کہ میں نے یہ جانا کہ میرا ایک خدا ہے میرے حال سے پوری طرح واقف۔ میں اُس سے شرمسار رہا اور ناشائستہ افعال سے بچا۔ جب بندہ کو علم ہو کہ خدائے پاک ناظر ہے تو اس سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہیں ہوتی جس کے باعث روزِ قیامت شرمندہ ہونا پڑے۔

فصل

بندہ کا علم اُمورِ خدا اور اس کی معرفت سے متعلق ہونا چاہیے اور فرض وہ علم ہے جو وقت کے عین مطابق ہو اور وقت پر کام آئے۔ علم کو ظاہری اور باطنی طور پر دو حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں یعنی اصول اور فروع۔ اصول کا ظاہر قولِ شہادت اور اس کا باطن تحقیقِ معرفت ہے اسی طرح فروع کا ظاہر درستیٔ معاملات اور اس کا باطن درستیٔ نیت ہے یہ سب ایک دوسرے کے بغیر تام نہیں ہو سکتے حقیقتاً باطن کے بغیر ظاہر منافقت ہے اور ظاہر کے بغیر باطن زندقہ ظاہرِ شریعت بغیر باطن کے ناقص ہے اور باطن بے ظاہر ہوس۔

علمِ حقیقت کے تین ارکان ہیں۔ اوّل ذاتِ خداوند تعالیٰ اور اس کی وحدانیت کا علم اور اس کے ساتھ کسی چیز کی مشابہت کی نفی۔ دوم خدائے تعالیٰ کی صفات اور اس کے احکام کا علم اور سوم اس کے افعال اور ان کی حکمتوں کا علم۔ اسی طرح علمِ شریعت کے بھی تین ارکان ہیں: اوّل کتاب، دوم سنّت اور سوم اجماعِ امّت۔

اور ذات و صفات اور افعالِ خداوندی کے علم کے ثبوت میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ "پس جان لے کہ کوئی معبود نہیں مگر اللہ"۔ نیز ارشاد فرمایا: فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ "پس جان لو کہ اللہ تمہارا مالک ہے"۔ نیز فرمایا: اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ "کیا تو نے نہیں دیکھا تیرے رب نے سائے کو کیسے دراز کیا"۔ نیز فرمایا: اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ "کیا وہ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے کہ کس انداز پر پیدا کیا گیا"۔ اسی طرح کی اور بہت سی آیات ہیں جن میں افعالِ خداوندی پر غور کر کے صفاتِ باری تعالیٰ کو سمجھنے پر زور دیا گیا ہے۔ نیز پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَنْ عَلِمَ اَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى رَبُّهٗ وَاَنِّيْ نَبِيُّهٗ حَرَّمَ اللّٰهُ تَعَالٰى لَحْمَهٗ وَدَمَهٗ عَلَى النَّارِ "جس نے اللہ تعالیٰ کو رب جانا اور مجھے اُس کا پیغمبر تسلیم کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کا گوشت اور خون دوزخ کی آگ پر حرام کر دیا"۔ علمِ ذاتِ خداوندی کی شرط یہ ہے کہ عاقل و بالغ یہ جانے کہ حق تعالیٰ کی ذات قدیم، بے حد اور بغیر حدود موجود ہے۔ نہ کسی جگہ اور نہ کسی جہت کے ساتھ مخصوص۔ اُس کی ذات باعثِ آفت نہیں۔ اُس کی مخلوق میں کوئی اس جیسا نہیں۔ اُس کے نہ بیوی ہے نہ اولاد۔ اور جو کچھ تیرے وہم میں صورت پذیر ہو سکے یا خرد کے دائرۂ اختیار میں سما سکے۔ وہ اس کا خالق اور قائم رکھنے والا پروردگار ہے اس نے فرمایا لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ "کوئی شے اس کے مثل نہیں وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے"۔ اس کی صفات کا علم یہ ہے کہ آدمی جان لے کہ اس کی صفات اس طرح اس کی ذات کے ساتھ موجود ہیں کہ یہ صفات

نہ اس کی ذات ہیں اور نہ اس کی ذات کا جزو اور حصہ ہیں۔ وہ ان صفات کے ساتھ موجود اور قائم ہے اور ہمیشہ رہنے والا ہے اور یہ صفات ہیں جیسے علم۔ قدرت۔ حیات و ارادت۔ سمع۔ بصر۔ کلام اور بقا۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ "تحقیق وہ جاننے والا ہے دلوں کی باتوں کا"۔ نیز ارشاد فرمایا۔ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ "اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔ نیز فرمایا "وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ" اور وہ سننے اور دیکھنے والا ہے نیز فرمایا: فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ "وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے"۔ نیز فرمایا هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ "وہ زندہ اور قائم ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں"۔ نیز فرمایا: قَوْلُهُ الْحَقُّ وَلَهُ الْمُلْكُ "اس کی بات سچی ہے اور سلطنت اسی کی ہے"۔ رہا اس کے افعال کے اثبات کا علم تو وہ یہ ہے کہ وہ مخلوقات اور ان کے افعال کا پیدا کرنے والا ہے۔ عدم اس کے حکم سے ہستی کی شکل میں نمودار ہوا ہے۔ وہ خیر و شر۔ نفع اور نقصان کا پیدا کرنے والا ہے چنانچہ ارشاد فرمایا: اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ "اللہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے"۔ احکامِ شریعت کے اثبات پر دلیل یہ ہے کہ تو جانے کہ اللہ کی طرف سے خلافِ عادت معجزوں کے ساتھ رسول آئے اور ہمارے رسول محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے سچے پیغمبر ہیں اور ان کے معجزات بہت ہیں جو کچھ انہوں نے غیب و شہود سے بیان فرمایا برحق ہے۔ شریعت کا پہلا رکن کتاب اللہ ہے جیسا کہ خدائے عزّ و جلّ نے فرمایا: فِيْهِ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ "اس کتاب یعنی قرآن کریم میں محکم آیات ہیں وہ اصل کتاب ہیں"۔ دوسرا رکن سنت ہے جیسا کہ فرمایا: وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا "تمہیں جو رسول کی طرف سے عطا ہوا ہے اسے لے لو اور جس چیز سے وہ منع کریں اسے چھوڑ دو"۔ تیسرا رکن اجماعِ امت ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لَا تَجْتَمِعُ اُمَّتِيْ عَلَى الضَّلَالَةِ عَلَيْكُمْ بِالسَّوَادِ الْاَعْظَمِ "میری امت گمراہی پر متفق نہیں ہوگی تم بڑے گروہ کی پیروی کرو"۔ الغرض احکام حقیقت بہت زیادہ ہیں اور سب کو جمع کرنا کسی کے بس کی بات نہیں کیونکہ لطائفِ خداوندی لامحدود ہیں۔

فصل

ص ۱۵/۲

جان لے کہ ملحدوں کا ایک گروہ (ان پر اللہ کی لعنت ہو) سوفسطائی کہلاتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہمیں کسی چیز کا صحیح علم نہیں اور علم خود کوئی چیز نہیں۔ ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ تمہارا یہ خیال کہ کسی چیز کا علم درست نہیں۔ درست ہے یا غلط؟ اگر ان کا جواب ہو کہ درست ہے تو یہی علم کا اثبات ہے۔ اگر وہ کہیں کہ

غلط ہے تو غلط چیز کی بنا پر معارضہ کرنا امر محال ہے اور ایسے آدمی کے ساتھ بات کرنا حماقت ہے۔ اور ملحدوں کا ایک گروہ جو اس جماعت سے تعلق رکھتا ہے اس بات کا دعویدار ہے کہ ہمارا علم کسی چیز پر درست نہیں اترتا اس لیے علم کا ترک کرنا اُسے ثابت کرنے سے بہتر ہے۔ یہ ان کی حماقت اور جہالت ہے کیونکہ ترکِ علم صرف دو صورتوں میں ہو سکتا ہے۔ یا علم سے یا جہالت سے۔ علم تو علم کی نفی نہیں کر سکتا اور علم سے ترکِ علم ممکن نہیں باقی رہی صرف جہالت سو جہالت ہی علم کی نفی کر سکتی ہے اور جہالت ہی کی بنا پر علم کو ترک کیا جا سکتا ہے۔ جاہل قابلِ مذمت ہے اور جہالت کفر و باطل کی ایک صورت ہے۔ کیونکہ حق، جہالت سے بے تعلق ہے یہ نظریہ جملہ مشائخ کرام کے مسلک کے خلاف ہے۔ جب ملحدوں کا یہ قول عام لوگوں تک پہنچا تو انہوں نے اسے اپنایا اور پکار اٹھے کہ جملہ اہلِ تصوّف اسی روش پر ہیں۔ اُن کا اعتقاد ڈگمگا گیا۔ اور وہ حق و باطل میں تمیز کرنے سے عاری ہو گئے۔ ہم اب ان سب کو سپردِ خدا کرتے ہیں۔ وہ اپنی گمراہی میں بھٹکتے پھریں۔ اگر دین ان کا ساتھ دیتا تو شاید ان کو بہتر تصوّف کی توفیق ہوتی۔ وہ راستبازی کے دامن کو نہ چھوڑتے۔ دوستانِ حق کو اس نظر سے نہ دیکھتے اور اپنے حق میں قدرے احتیاط سے کام لیتے۔ اگر کچھ ملحد اہلِ تصوّف کا طریقہ اس خیال سے اختیار کر لیں کہ وہ ان کی بدولت اپنے ذاتی مصائب سے نجات پائیں اور ان کی عزت و توقیر کے سایۂ عاطفت میں زندگی بسر کریں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ سب اہلِ تصوّف کو اس رنگ میں رنگا ہوا سمجھا جائے اور ان کے معاملہ میں کھلم کھلا بحث و مباحثہ کر کے ان کی عزت و شان کو پاؤں تلے روندا جائے۔ مُصنّف کہتا ہے کہ مجھے ایک ایسے علم کے دعویدار سے مناظرہ کرنے کا اتفاق ہوا جس نے کلاہِ تکبّر کو عزت کا نام دے رکھا تھا۔ ہوا و ہوس کی متابعت کو سنّتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور شیطان کی ہمرکابی کو آئمہ کرامؒ کی سیرت سمجھ رکھا تھا۔ دورانِ مناظرہ اس نے کہا ملحدوں کے بارہ[۱۲] گروہ ہیں اور ان بارہ[۱۲] میں سے ایک گروہ اہلِ تصوّف کے اندر موجود ہے۔ میں نے کہا اگر ایک اہلِ تصوّف میں ہے تو باقی گیارہ[۱۱] گروہ تم لوگوں میں سے ہیں۔ اہلِ تصوّف ایک گروہ سے بخوبی بچ سکتے ہیں تمہارے لیے باقی گیارہ[۱۱] گروہوں سے بچنا محال ہے۔

ص ۱۶/۲۱

یہ تمام مصائب زمانہ کے افتراق سے پیدا ہوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے اس قوم کے درمیان اپنے اولیائے کرامؒ کو مستور و پوشیدہ کر رکھا ہے۔ اور مخلوق میں وہ قوم اُن کے فیض سے محروم اور مہجور ہے۔ کیا خوب کہا ہے اس پیروں کے پیر اور مریدوں کے آفتاب علی بن بندار الصیرفی رحمۃ اللہ علیہ نے فَسَادُ الْقُلُوْبِ عَلٰی حَسَبِ

فَسَادِ الزَّمَانِ وَاَهْلِہٖ" دلوں کا فساد زمانہ اور اہلِ زمانہ کے فساد کے مطابق ہوتا ہے۔" آگے چل کر ہم اس گروہ کے منکروں کی باتوں کا ذکر کریں گے تاکہ ان لوگوں کو اس سے تنبیہ ہو جن کے کاموں میں اللہ تعالیٰ کی سچی عنایت شامل ہے وَبِاللّٰہِ التَّوْفِیْقُ" اور توفیق اللہ کی طرف سے ہے۔"

فصل

محمد بن فضل البلخی رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً نے فرمایا: اَلْعُلُوْمُ ثَلٰثَۃٌ عِلْمٌ مِّنَ اللّٰہِ وَعِلْمٌ مَّعَ اللّٰہِ وَعِلْمٌ بِاللّٰہِ" علم تین ہیں۔ (۱) علم من اللہ (۲) علم مع اللہ (۳) اور علم باللہ۔ علم باللہ علمِ معرفت ہے جس کے ذریعہ سب انبیاء اور اولیاء نے باری تعالیٰ کو جانا جب تک اس علم کو مخصوص طریقوں سے سکھایا نہ جائے اس وقت تک اس کے ذریعے خدا کو نہیں جانا جا سکتا کیونکہ اس علم کے بغیر خدا کو پانے کا کوئی دوسرا ذریعہ موجود نہیں۔ اور بندہ کا علم معرفتِ حق کے لیے علت اور سبب نہیں بلکہ اس کی معرفت بھی خدا ہی کی ہدایت اور توفیق سے ہے۔ اور علم من اللہ علمِ شریعت ہے کہ وہ باری تعالیٰ کی طرف سے حکماً دیا گیا اور اس کا مکلف بنایا گیا ہے۔ اور علم مع اللہ مقامات۔ طریقِ حق اور درجاتِ اولیائے کرام کے بیان سے متعلق ہے۔ الغرض معرفت بغیر شریعت درست نہیں ہوتی اور شریعت کی کارفرمائی اظہارِ مقامات کے بغیر صحیح نہیں اترتی۔ ابو علی ثقفی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اَلْعِلْمُ حَیَاۃُ الْقَلْبِ مِنَ الْجَھْلِ وَنُوْرُ الْعَیْنِ مِنَ الظُّلْمَۃِ" علم دل کی حیات ہے مرگِ جہالت سے اور آنکھ کا نور ایمان ہے کفر کی ظلمت و تاریکی سے۔" جس کو علمِ معرفت نہیں اس کا دل جہالت کے ہاتھوں مرچکا ہے اور جس کو علمِ شریعت نہیں اس کا دل نادانی کے مرض میں مبتلا ہے۔ کفّار کا دل مردہ ہوتا ہے کیونکہ وہ معرفتِ خداوندی سے محروم ہیں۔ اہلِ غفلت کا دل بیمار ہوتا ہے کیونکہ وہ باری تعالیٰ کے احکام سے نابلد ہیں۔ ابوبکر وراق ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مَنِ اکْتَفٰی بِالْکَلَامِ مِنَ الْعِلْمِ دُوْنَ الزُّھْدِ فَقَدْ تَزَنْدَقَ وَمَنِ اکْتَفٰی بِالْفِقْہِ دُوْنَ الْوَرَعِ فَقَدْ تَفَسَّقَ" جس نے علمی گفتگو کو بغیر زُہد اختیار کیے کافی سمجھا وہ بے دین ہوا اور جس نے فقہ کو بغیر تقویٰ کے اپنایا فاسق ہوا۔" جو علم توحید کا زبانی علمبردار ہو اور اس کی ضد یعنی شرک وغیرہ سے دستبردار نہ ہو زندقہ کا مرتکب ہے اور جو علم شریعت و فقہ کو بغیر عمل حاصل کرے فاسق ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ عمل اور مجاہدہ کے بغیر محض توحید جبر ہے۔ اور موحّد قول کے اعتبار سے جبری اور فعل کی رو سے قدری ہوتا ہے تاکہ اس کی روش جبر اور قدر کے بین بین درست رہے۔ اس چیز کی حقیقت وہی ہے جو اُن بزرگ (یعنی ابوبکر وراق ترمذی) رحمۃ اللہ علیہ

نے فرمائی کہ اَلتَّوحِیدُ دُونَ الجَبرِ وَ فَوقَ القَدرِ "توحید جبر کے نیچے اور قدر سے اوپر ہے"۔ جو کوئی علم توحید کو بغیر عمل محض زبانی پسند کرتا ہے اور اس کے مخالف افکار یعنی شرک وغیرہ سے منہ نہیں پھیرتا زندیق ہو جاتا ہے۔ فقہ کے لیے احتیاط اور تقویٰ ضروری ہے اور جو کوئی بغیر تقویٰ و پرہیزگاری صرف علم فقہ و شریعت کو کافی سمجھے اور رخصتوں، تاویلات اور شبہات کے تعلق میں ڈوب جائے یا بغیر کسی اصول کے محض اپنی سہولت کے لیے اجتہاد کرنے والوں کے گرد گھومنا شروع کر دے وہ بہت جلد فسق و بدکاری کا شکار ہو جاتا ہے اور یہ صورت صرف غفلت سے پیدا ہوتی ہے۔ اور شیخ المشائخ یحییٰ ابن معاذ الرازی رحمۃ اللہ علیہ نے خوب فرمایا: اِجتَنِب صُحبَۃَ ثَلٰثَۃِ اَصنَافٍ مِنَ النَّاسِ العُلَمَآءِ الغَافِلِینَ وَالقُرَّاءِ المُدَاھِنِینَ وَالمُتَصَوِّفَۃِ الجَاھِلِینَ "پرہیز کرو تین قسم کے لوگوں سے: غافل علماء سے۔ خوشامدی قاریوں سے اور جاہل صوفیوں سے"۔ غافل علماء وہ ہوتے ہیں جو دنیا کو اپنا قبلہ دل بنا لیتے ہیں اور شریعت سے راہ آسان تلاش کر کے بادشاہوں اور ظالموں کی پرستش شروع کر دیتے ہیں۔ ان کے دروازوں کی خاک چھانتے ہیں۔ لوگوں کی امارت کو اپنی سجدہ گاہ بناتے ہیں۔ اپنی عقل و دانش کے "تکبر" میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اپنے کلام کی باریکیوں پر "شیفتہ"، اماموں اور استادوں پر زبان دراز، بزرگانِ دین سے برہم۔ لاف زنی میں مشغول۔ اگر دونوں جہان ان کے ترازو کے پلڑے میں ڈال دیئے جائیں تو معلوم نہ ہوں۔ کینہ اور حسد اُن کا مذہب ہے۔ یہ سب کچھ علم کے دائرہ سے باہر ہے۔ علم تو وہ صفت ہے کہ جس سے تمام جہالت ختم ہو جاتی ہے۔ "قُرّاءِ مداھن" وہ لوگ ہوتے ہیں کہ اگر کوئی کام ان کی ہوس کے مطابق ہو تو وہ اس کی تعریف کے پُل باندھ دیتے ہیں۔ اور اگر مخالف ہو تو اس کی مذمت شروع کر دیتے ہیں۔ چاہے وہ حق و صداقت پر مبنی ہو۔ اپنی کارگذاری کا جاہ و حشمت کی صورت میں صلہ چاہتے ہیں اور برے کاموں پر بھی لوگوں کی تعریف کرتے ہیں۔ جاہل صوفی وہ ہوتا ہے جو صحبتِ پیر سے محروم ہو اور اس نے کسی بزرگ سے کسب ادب نہ کیا ہو، لوگوں کے درمیان اچھل پڑا ہو، بغیر زمانہ کی سختی برداشت کیے اور سبز پوش بن گیا ہو اپنی کور چشمی سے۔ وہ اہلِ تصوّف کی مجلس میں سما جاتا ہے اور پاسِ حرمت چھوڑ کر مسرت و انبساط میں مستغرق ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی حماقت کی وجہ سے سب کو اپنے جیسا خیال کرتا ہے اور اس طرح حق و باطل کی تمیز کا دروازہ اس کے لیے بند ہو جاتا ہے۔ پس یہ تین گروہ ہیں جن کو انہوں نے صاحب توفیق لوگوں کے لیے بیان کیا اور اپنے مریدوں کو ان کی صحبت سے منع فرمایا۔ اس لیے کہ وہ سب کے سب اپنے دعووں میں جھوٹے اور اپنے روِیّہ میں ناقص ہیں۔ اور ابو یزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: عَمِلتُ فِی المُجَاھَدَۃِ ثَلٰثِینَ سَنَۃً فَمَا وَجَدتُ

ص ۱۷/۲۴
ص ۱۸/۲۴

شَیْئًا اَشَدَّ عَلَیَّ مِنَ الْعِلْمِ وَمُتَابَعَتِہٖ فرماتے ہیں میں نے تیس سال مجاہدہ کیا مگر مجھے کوئی مشقت علم حاصل کرنے اور اس پر عمل کرنے سے زیادہ سخت نہ معلوم ہوئی۔ الغرض آگ پر چلنا آسان ہے گر علم کے مطابق عمل کرنا مشکل۔ جاہل کے لیے ہزار بار پل صراط کو طے کرنا ایک علمی مسئلہ کو سیکھنے سے زیادہ آسان ہے۔ فاسق کے لیے ایک مسئلہ کو عملی جامہ پہنانا جہنم میں قیام کرنے سے زیادہ مشکل ہے۔ المختصر تجھے علم سیکھنا چاہیئے اور اس میں کمال حاصل کرنا چاہیئے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ انسانی علم کا کمال علمِ خداوندی کے سامنے جہالت ہے۔ پس اس قدر جان کہ جان کر تو کچھ نہیں جانتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی بندگی کے علم سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور بندگی و عاجزی بندہ اور خداوند کے درمیان ایک عظیم پردہ ہے اسی موضوع پر کسی نے کہا ہے ؎

اَلْعِجْزُ عَنْ دَرْكِ الْاِدْرَاكِ اِدْرَاكٌ وَالْوَقْفُ فِیْ طُرُقِ الْاَخْیَارِ اِشْرَاكٌ

"اس کی حقیقت پوری طرح معلوم کر لینے سے عاجزی ہی درحقیقت ادراک یعنی اس کا معلوم کر لینا ہے لیکن اسے بالکل نہ معلوم کرنا اور نیکوں کے راستے میں جستجو نہ کرنا اور رک جانا شرک ہے۔"

ص ۱۹/۲۵

جو علم حاصل نہیں کرتا اور اپنی جہالت پر اڑا رہتا ہے مشرک ہوتا ہے اور جو سیکھتا ہے اور اپنے کمالِ علم میں معنی کا ظہور دیکھتا ہے اس کا غرورِ علم ٹوٹ جاتا ہے وہ جان لیتا ہے کہ اس کا علم اس کی عاقبت کے علم میں عاجزی کے سوا کچھ نہیں۔ اور باری تعالیٰ کی جناب میں نام کی کوئی حقیقت نہیں۔ حصولِ علم کے بعد یہ عجز و انکساری تحصیلِ علم کا حاصل ہے۔

دوسرا باب

اثباتِ فقر

ص ۲۵

معلوم ہونا چاہیئے کہ خدا کی راہ میں درویشی کا مقام بہت بلند ہے اور درویشوں کی بڑی عزت و توقیر آئی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ لِلْفُقَرَاءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ "(حجرات) ان درویشوں کے لیے ہے جو اللہ کی راہ میں محصور اور بند ہوں زمین میں گھومنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں۔ جاہل و ناواقف لوگ ان کی بے نیازی کے باعث انہیں دولتمند سمجھتے ہیں۔" نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا "اللہ نے ایک مثال دی کہ مثلاً ایک غلام ہے جو کسی کی ملکیت میں ہے اُسے اپنی کسی کسب کی ہوئی چیز پر قدرت نہیں۔" نیز ارشاد فرمایا: تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا۔ "ان کے پہلو بسترِ استراحت سے دور رہتے ہیں وہ اپنے رب کو پکارتے ہیں امید و بیم کے عالم میں۔"

نیز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فقر اختیار کیا اور فرمایا: اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِيْ مِسْكِيْنًا وَّاَمِتْنِيْ مِسْكِيْنًا وَّاحْشُرْنِيْ فِيْ زُمْرَةِ الْمَسَاكِيْنِ "اے خدا مجھے مسکین کی زندگی عطا کر، مسکین کی موت دے اور حشر کے دن مسکینوں کی جماعت میں اُٹھا۔" نیز آپ نے یہ بھی فرمایا کہ حشر کے دن باری تعالیٰ فرمائیں گے: اُدْنُوْا مِنِّيْ اَحِبَّائِيْ فَيَقُوْلُ الْمَلٰئِكَةُ مَنْ اَحِبَّاؤُكَ فَيَقُوْلُ اللّٰهُ فُقَرَاءُ الْمَسَاكِيْنِ "مجھ سے میرے محبت کرنے والوں کو قریب کر دیں فرشتے پوچھیں گے تجھ سے محبت کرنے والے کون ہیں پس اللہ کا ارشاد ہوگا فقراء مساکین"۔ اس موضوع پر متعدد آیات و احادیث موجود ہیں اور اتنی مشہور ہیں کہ از راہ ثبوت دہرانے کی ضرورت نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مہاجر درویش تھے جو حق تعالیٰ کے آداب بندگی اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح پیروی حاصل کرنے کے لیے مسجد نبوی میں بیٹھے رہتے تھے۔ یہ لوگ تمام مشاغل سے کنارہ کش تھے ہر مباحثہ سے روگرداں تھے۔ اور اپنی روزی کے لیے رازقِ مطلق

ص ۲۶

کو کفیل سمجھتے تھے اور اسی پر توکّل کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے مصاحبت کرنے پر مامور تھے اور ان کے
قیام کا انتظام فرماتے۔ چنانچہ خدائے عزّ وجلّ نے فرمایا: وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ
يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ " اور دور نہ رکھیے ان لوگوں کو جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اور صرف اسی کی خوشنودی کا
ارادہ رکھتے ہیں"۔ اور نیز فرمایا: وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا " اور اپنی آنکھیں ان
کی طرف سے نہ پھیر لیجیے کیا آپ دنیاوی زندگی کی زینت چاہتے ہیں"۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جہاں کہیں بھی ان
میں سے کسی کو دیکھتے تو فرماتے۔ میرے ماں باپ ان پر نثار کہ باری تعالیٰ نے ان کی وجہ سے مجھ پر عتاب فرمایا۔ الغرض
باری تعالیٰ نے فقراء کو بہت بلند مقام عطا فرمایا ہے اور بہت بڑے درجہ سے نوازا ہے۔ کیوں کہ یہ لوگ اسباب
ظاہری و باطنی سے دستبردار ہو کر بجان و دل حقیقی مسبب الاسباب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ فقر ان کے لیے
باعثِ فخر ہوتا ہے۔ فقر جانے پر نہ وہ آہ و زاری کرتے ہیں اور نہ اس کی موجودگی پر خوش ہوتے ہیں۔ وہ فقر کو سینے
سے لگائے رکھتے ہیں اور اس کے مقابلے میں ہر چیز کو حقیر سمجھتے ہیں۔ مگر یاد رہے فقر کا ایک ظاہری طریق ہے اور اس طریق
کا اساس مفلسی اور بے چارگی ہے۔ دوسرا پہلو حقیقت کا ہے جو اقبال و اختیار پر مبنی ہے۔ جس نے ظاہری طریق پر اکتفا
کیا اسے کوئی نفع نہ ملا اور بالآخر اس نے اس سے منہ پھیر لیا۔ اور جس نے حقیقت حاصل کر لی وہ موجودات سے
روگرداں ہوا اور تمام ماسوا کی نفی کرتا ہوا دیدارِ کلّی سے سرفراز ہوا۔ مَنْ لَّمْ يَعْرِفْ سِوٰى رَسْمِهٖ لَمْ يَسْمَعْ
سِوٰى اِسْمِهٖ " جس نے فقر کو رسم تک محدود سمجھا اس نے فقر کے نام کے سوا کچھ نہ سنا"۔ فقیر دراصل وہی ہے
جس کی ملکیت میں کوئی شے نہ ہو۔ اور کسی شے کے حاصل ہونے سے اسے کوئی فرق نہ پڑے۔ نہ متاعِ دنیا کی
موجودگی پر وہ اپنے آپ کو غنی محسوس کرے اور نہ ہی متاع دنیا کے فقدان پر اپنے آپ کو محتاج سمجھے۔ اس کی
نگاہِ فقر میں متاعِ دنیا کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہو۔ تہی دستی کے عالم میں اسے زیادہ مسرّت ہوتی ہے۔ کیونکہ بقول مشایخ
تنگ دستی سے دل کو زیادہ فراغت نصیب ہوتی ہے۔ مال و متاع فقیر کے لیے سموم ہوتا ہے۔ اسی لیے درویش کسی چیز کو
اپنی ملکیت میں نہیں رکھتا اور نہ ہی کسی چیز کی محبت میں خود کو گرفتار ہونے دیتا ہے"۔ دوستانِ حق کی زندگی باری تعالیٰ کی عنایاتِ
ظاہری و باطنی پر منحصر ہوتی ہے اس غدّار اور فاجر دنیا کے سروسامان پر نہیں۔ دنیا کا مال و متاع راہِ تسلیم و رضا میں
رکاوٹ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ حکایت ہے کہ ایک بادشاہ کو کسی درویش سے ملاقات کا اتفاق ہوا۔ بادشاہ

فقیر

ص ۲/۱

نے کہا مجھ سے کچھ طلب کرو۔ درویش نے جواب دیا میں اپنے غلاموں کے غلام سے کچھ طلب نہیں کرنا چاہتا۔ بادشاہ نے کہا یہ کیسے؟ درویش نے کہا میرے دو غلام ہیں جو تیرے مالک ہیں حرص اور آرزو۔ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اَلْفَقْرُ عِزٌّ لِاَهْلِهٖ "فقر فقراء کے لیے باعثِ عزت ہے"۔ جو چیز اہل کے لیے باعثِ عزت ہوتی ہے وہ نااہل کے لیے وجہِ ذلت ہوتی ہے۔ اہلِ فقر کی عزت اسی میں ہے کہ اپنے ظاہر کو لغزش سے اور باطن کو خرابی سے محفوظ رکھے۔ نہ اس کا جسم معصیت اور لغزش سے ملوث ہو اور نہ اس کی قلبی کیفیت میں خلل اور آفت رونما ہو۔ کیونکہ اس کا ظاہر ظاہری نعمتوں سے مالا مال ہوتا ہے اور اس کا باطن باطنی نعمتوں کا سرچشمہ۔ اس کا جسم روحانی اور دل ربانی ہوتا ہے خلقت سے بے نیاز اور آدمیوں سے بے تعلق۔ کیونکہ تمام خلقت اور انسان اس کی نظر میں خود محتاج ہیں نہ اس عالم میں اس عالم کی دولت سے وہ غنی ہوتا ہے اور نہ اس عالم میں اس عالم کی دولت سے۔ اور دونوں جہان اس کی ترازو میں مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں ہوتے۔ اس کا ایک سانس دونوں عالم میں نہیں سما سکتا۔

فصل

ص ۲۲/۲۸

مشائخ رحمہم اللہ میں فقر و غنا کے درمیان افضلیت کے بارے میں اختلاف ہے۔ باری تعالیٰ کی ذات پاک غنی ہے اور وہ سب اوصاف میں کامل ہے۔ یحییٰ بن معاذ الرازی، احمد بن ابی الحواری، حارث المحاسبی، ابوالعباس بن عطا، رویم بن محمد اور ابوالحسن بن شمعون اور متاخرین میں سے شیخ المشائخ ابوسعید فضل اللہ بن محمد المیہنی رحمہم اللہ اس بات پر متفق ہیں کہ غنا کو فقر پر فوقیت حاصل ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ باری تعالیٰ کی ذاتِ پاک غنی ہے اور فقر شانِ ایزدی سے بہت بعید ہے۔ جس دوست میں دوست کی صفت موجود ہو وہ زیادہ کامل ہوتا ہے بمقابلہ اس دوست کے جو دوست کی صفت سے عاری ہو۔ مگر یہ صفتی اشتراک فقط اسمی ہے معنوی نہیں۔ کیونکہ معنوی شرکت کا مطلب مشابہت ہے۔ باری تعالیٰ کی صفات قدیم ہیں اور انسانی صفات مُحْدَث اس لیے یہ دلیل باطل ہوئی۔

میں علی بن عثمان الجلابی کہتا ہوں کہ غنی کا لفظ صرف باری تعالیٰ کی ذات کو شایان ہے خلقت اس لفظ کے قابل نہیں ان کے لیے لفظ فقر درست ہے۔ اور اس لفظ کو باری تعالیٰ سے کوئی نسبت نہیں۔ جیسے آدمی کو ہم لوگ مجازاً غنی کہتے ہیں۔ وہ درحقیقت غنی نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کا غنا اسباب کی موجودگی پر منحصر ہے۔ اسباب قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ مسبب الاسباب کا محتاج ہے اور مسبب الاسباب صرف خدا کی ذاتِ پاک ہے جس کے غنا کے لیے سبب

کی ضرورت نہیں۔ اس صفت میں انسانی شرکت باطل ہے جس طرح باری تعالیٰ کی عین ذات میں شرکت روا نہیں۔ اُس کی کسی صفت میں بھی شرکت روا نہیں ہے۔ اور جب کسی صفت میں بھی شرکت روا نہیں تو اسم یا نام میں بھی روا نہیں۔ ہاں رہ گئی تسمیہ یعنی نام دینے کی بات تو یہ صرف خدا اور مخلوق کے درمیان نشان دہی کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا غنا یہ ہے کہ وہ سب سے بے نیاز ہے۔ جو چاہے کرتا ہے۔ اس کے ارادوں میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔ اس کی قدرت کے سامنے کسی کا زور نہیں چلتا۔ وہ عیاں چیزوں کو بدلنے اور مختلف الفطرت اشیاء کو پیدا کرنے پر قادر ہے۔ یہ صفت اس کی ازلی ہے اور ابدالآباد تک رہے گی۔ بخلاف اس کے مخلوق کا غنا یہ ہے کہ اسبابِ معیشت مہیا ہوں۔ مسرت میں بسر ہو رہی ہو۔ کسی آفت کا سایہ نہ ہو اور اطمینانِ نفر کا سامان موجود ہو یہ سب چیزیں حدث کے تحت آتی ہیں یعنی ان کا اوّل و آخر فنا ہے اور تغیر ان کی فطرت ہے۔ یہ طلب اور حسرت کا سرمایہ ہیں اور عجز و ذلت ان کا انجام ہے، غرض یہ کہ انسان کے لیے یہ نام (غنا) مجازی ہے اور باری تعالیٰ کے لیے حقیقی۔ خداوند تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ "اے لوگو تم فقیر ہو اللہ کے روبرو اور اللہ غنی اور قابلِ توصیف ہے" اور نیز فرمایا: وَاللّٰهُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ "اللہ غنی ہے اور تم فقیر ہو۔"

نیز عوام کا ایک گروہ کہتا ہے کہ ہم صاحبِ دولت کو ایک درویش سے بہتر سمجھتے ہیں کیونکہ باری تعالیٰ نے اُسے دونوں جہان میں صاحبِ نصیب پیدا کیا ہے اور مال و دولت کے ساتھ اُس پر احسان کیا ہے۔ اس گروہ نے غنا سے کثرتِ مال، حصولِ مراد اور خواہشاتِ نفسانی کی تکمیل مراد لی ہے اور اس پر یہ دلیل پیش کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے غنا پر شکر کرنے کا حکم دیا اور فقر پر صبر کرنے کا۔ اور ظاہر ہے کہ صبر مصیبت پر ہوتا ہے اور شکر نعمتوں پر اور نعمتیں بہرحال مصیبت سے بہتر ہوتی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ خدا نے نعمت پر شکر کا حکم دیا اور شکر کو نعمت کی زیادتی کا سبب قرار دیا۔ پھر فقر پر صبر کا حکم فرمایا اور صبر کو قرب کی زیادتی کا ذریعہ گردانا اور فرمایا: لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّكُمْ "اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں زیادہ دوں گا"۔ اور یہ بھی فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ "بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے" ہر وہ شخص جو ایسی نعمت پر شکر کرے جس کی بنیاد غفلت پر ہو ہم اُس کی غفلت پر غفلت زیادہ کریں گے۔ اور ہر وہ شخص جو ہر ایسے فقر پر صبر کرے جس کی بنیاد آزمائش پر ہے ہم اُس کے قُرب پر قُرب زیادہ کریں گے۔ رہی وہ غنا جسے مشائخ فقر سے بہتر سمجھتے ہیں تو اس سے اُن کی مراد وہ نہیں جسے عوام غنا کہتے ہیں اس لیے کہ عوام کے نزدیک

ص ۲۳/۲۹

ص ۲۳/۳۰

نعمت پالینا غنا ہے جب کہ مشائخ کے نزدیک نعمتیں دینے والے کو پالینا غنا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ وصل کا حاصل ہونا ایک چیز ہے اور غفلت کا پالینا ایک دوسری چیز۔ اور شیخ المشائخ ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلْفَقْرُ هُوَ الْغِنَاءُ بِاللّٰهِ فقر ہر معاملے میں اللہ ہی کو کافی سمجھنے کا نام ہے اس سے مراد مشاہدۂ حق کا کشفِ ابدی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مکاشف کے لیے امکانِ حجاب ہے اگر اس صفت یعنی غنا کے باوجود صاحبِ مشاہدہ محجوب ہو جائے تو کیا وہ مشاہدہ کا محتاج ہوگا یا نہیں؟ اگر یہ کہو کہ نہ ہوگا تو یہ محال ہے اور اگر یہ کہو کہ ہوگا تو میں کہتا ہوں کہ جب احتیاج ہو گئی تو لفظِ غنا ساقط ہو گیا۔ نیز اللہ کی ذات میں غنا اسی شخص کے لیے ممکن ہے کہ قائم الصفت اور ثابت المراد (غیر فانی) ہو اور اس کا مقصود ناقابلِ تغیر ہو۔ حرفِ مقصود کا قیام اور اوصافِ آدمیت کا اثبات غنا کے لیے درست نہیں اور انسان بالذات غنا کے قابل نہیں۔ اس لیے کہ بشریت عین نیازمندی ہے اور احتیاج ناپائیداری کی علامت ہوتی ہے۔ لہٰذا باقی الصفت (جس کی صفات ہمیشہ باقی رہیں یعنی خدا) غنی ہے اور فانی الصفت (جس کی صفات فانی ہوں یعنی انسان) کسی نام کے لائق نہیں۔ پس اَلْغَنِیُّ مَنْ اَغْنَاهُ اللّٰهُ "غنی وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے غنی کیا"۔ اس لیے کہ غنی باللہ فاعل ہے اور اَغناہ اللہ مفعول اور فاعل بذاتِ خود قائم ہوتا ہے جبکہ مفعول اپنے فاعل کا محتاج ہوتا ہے پس اپنے ساتھ اقامت صفتِ بشریت ہے اور اقامت بفیضِ حق صفتِ بشریت کی فنا۔ اور میں کہ علی بن عثمان الجلابی رضی اللہ عنہ ہوں کہتا ہوں کہ حقیقی غنا کو اقامتِ صفات سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ انسانی صفات کی نسبت یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ وہ مذموم اور زوال پذیر ہوتی ہیں۔ مزید براں ان صفات کی فنا پر بھی یہ لفظ عاید نہیں ہوتا کیونکہ فنا پذیر ہر چیز کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ اور جس چیز کی صفات فنا ہو جائیں اس پر نہ فقر کا نام بولا جا سکتا ہے نہ غنا کا۔

ص ۲۴
۳۱

جملہ مشائخ اور اکثر عوام فقر کو غنا پر فضیلت دیتے ہیں۔ کیونکہ قرآن و حدیث میں فقر کی فضیلت آئی ہے۔ اور اسی پر اکثر امت کا اتفاق ہے۔ اور میں نے حکایات میں دیکھا کہ ایک موقعہ پر حضرت جنیدؒ اور حضرت ابن عطار رحمہما اللہ کے درمیان اس مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی۔ ابن عطار دلیل بیان فرما رہے تھے کہ غنی لوگ زیادہ فضیلت والے ہیں کہ قیامت کے دن ان کو اپنی دولت کا حساب دینا ہوگا اور حساب کے دوران وہ خطابِ حق سے بلاواسطہ فیضیاب ہوں گے۔ اگر عتاب ہوگا تو محبوب کی طرف سے اہلِ محبت کو عتاب ہوتا ہے۔ حضرت جنیدؒ نے فرمایا کہ جہاں اغنیاء سے حساب طلب ہوگا وہاں فقراء سے عذر طلب ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ عذر حساب سے بہت اونچا مقام رکھتا ہے۔ اس میں ایک عجیب نکتہ ہے۔ حقیقی

محبت میں عذر بیگانہ پن ظاہر کرتا ہے اور عتاب یگانگت کے خلاف ہوتا ہے۔ اہلِ محبت دونوں چیزوں کو موجبِ آفت سمجھتے ہیں۔ کیونکہ عذر محبوب کے حکم کی بجاآوری میں کوتاہی کے سلسلے میں ہوتا ہے کہ جب وہ اپنا حق طلب کرے یہ عذر پیش کرے اور عتاب اس کوتاہی کی بنا پر ہوتا ہے جو فرمانِ دوست میں ہو۔ اس وقت وہ دوست اس کوتاہی پر اسے عتاب کرتا ہے اور یہ دونوں محال ہیں۔ جملہ امور میں فقرا صبر اور صاحبِ دولت شکر کرتے ہیں اور حقیقی دوستی میں دوست نہ تو دوست سے کوئی چیز طلب کرتا ہے اور نہ دوست فرمانِ دوست کو ٹالتا ہے۔ ظَلَمَ مَنْ سَمّٰی ابْنَ اٰدَمَ اَمِیْرًا وَقَدْ سَمَّاہُ رَبُّہٗ فَقِیْرًا "ظلم کیا اس نے جس نے ابنِ آدم کو امیر کہا حالانکہ باری تعالیٰ نے اس کا نام فقیر رکھا ہے"۔ جس کا نام اللہ تعالیٰ کی طرف سے فقیر ہے وہ امیر بھی ہو تو فقیر ہے۔ ہلاک ہوا وہ شخص جس نے تخت و تاج کے بل بوتے پر اپنے آپ کو امیر سمجھا۔ امیر لوگ صاحبِ صدقہ ہوتے ہیں اور فقیر لوگ صاحبِ صدق۔ اور ہرگز صاحبِ صدق، صاحبِ صدقہ کی طرح نہیں ہوتا۔ درحقیقت سلمانؓ کا فقر سلیمانؑ کے غنا سے کم نہیں ہے۔ ایوبؑ کو عالمِ صبر میں اللہ نے فرمایا نِعْمَ الْعَبْدُ "وہ اچھا بندہ ہے" اور سلیمانؑ کو استحکامِ سلطنت میں بھی یہی فرمایا نِعْمَ الْعَبْدُ "وہ اچھا بندہ ہے"۔ جب خدائے رحمٰن کی رضا حاصل ہو گئی تو فقرِ سلمانؓ، غنائے سلیمانؑ ہی کی طرح ہو گیا۔

ص ۲۵/۳۲

حکایت: مصنف کہتا ہے۔ میں نے استاد ابوالقاسم قشیریؒ کو کہتے سنا کہ لوگ فقر و غنا میں بحث و تمحیص کرتے ہیں اور اپنے لیے ایک چیز اختیار کر لیتے ہیں۔ میں وہ چیز اختیار کرتا ہوں جو باری تعالیٰ کو پسند ہو اور وہ مجھے اس پر استقامت دے۔ اگر وہ مجھے صاحبِ دولت بنائے تو میرے قدم نہ ڈگمگا جائیں۔ اور اگر وہ مجھے فقیر رکھے تو میں حرص و ہوس میں مبتلا ہو کر اس کے راستہ سے نہ ہٹ جاؤں۔ فقر اور تونگری دونوں ہی خدا کی نعمتیں ہیں۔ تونگری غفلت کے باعث آفت ہو جاتی ہے اور فقر لالچ اور حرص کے باعث۔ گو قولاً دونوں عمدہ چیزیں ہیں لیکن عملاً مختلف ہیں۔ فقر ماسوا سے دل فارغ ہونے کا نام ہے اور غنا غیر کے ساتھ مشغولیتِ دل کا۔ اگر فراغتِ دل میسر ہو تو نہ فقر غنا سے بہتر ہے اور نہ غنا فقر سے۔ غنا کثرتِ متاع کا نام ہے اور فقر قلتِ متاع کا اور تمام متاع کا مالکِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہے جب طالب ملکیت کو ترک کر دے تو وہ شرک سے محفوظ ہو جاتا ہے اور وہ دونوں ناموں سے بے نیاز ہو جاتا ہے:

فصل

مشائخ طریقت کے اس موضوع پر بہت سے اقوال ہیں اور میں اس کتاب میں بقدرِ گنجائش نقل کرتا ہوں۔

۳۳

متاخرین میں سے ایک نے کہا: لَیْسَ الْفَقِیْرُ مَنْ خَلَا مِنَ الزَّادِ اِنَّمَا الْفَقِیْرُ مَنْ خَلَا مِنَ الْمُرَادِ"
فقیر تہی دست کو نہیں کہتے کہ اُس کے پاس متاع اور زاد نہ ہو بلکہ فقیر وہ ہے جس کا دل خواہشات سے خالی ہو
مثلاً اگر خدا کسی کو دولت عطا کرے اور وہ اس کی حفاظت کا ارادہ کرے تو وہ غنی ہے۔ اور اگر وہ اس دولت
کو ترک کرنے کا ارادہ کرے تو بھی غنی ہے کیونکہ ان دو میں سے ہر ایک مِلکِ غیر میں تصرّف ہے۔ اور فقر ترکِ حفاظت
و ترکِ تصرّف کا نام ہے۔ یحییٰ بن معاذ الرازیؒ نے فرمایا: عَلَامَةُ الْفَقْرِ خَوْفُ الْفَقْرِ "فقر کی نشانی فقر زائل ہونے کا
خوف ہے۔" فقر صحیح ہونے کی علامت یہ ہے کہ بندہ کمالِ ولایت، قیامِ مشاہدہ اور فنائے صفت و بے خودی کے باوجود
ڈرتا ہے۔ زوالِ فقر سے ڈرتا رہے۔ کمالِ فقر یہ ہے کہ آدمی ایسے مقام پر پہنچ جائے کہ اسے انقطاع عن اللہ کا ڈر نہ رہے۔
اور رویم ابن محمد فرماتے ہیں رحمۃ اللہ علیہ: مِنْ نَعْتِ الْفَقِیْرِ حِفْظُ سِرِّهٖ وَصِیَانَةُ نَفْسِهٖ وَاَدَاءُ فَرَائِضِهٖ
"ایک فقیر کی خصوصیات سے ہے: اُس کے باطن کی نگہداشت، اُس کے نفس کی حفاظت اور اُس کے فرائض کی ادائیگی۔"
فقیر کی شان یہ ہے کہ اُس کا باطن دنیاوی اغراض سے محفوظ ہو، اس کا نفس آفت و شر سے بچا ہُوا ہو اور فرض احکام
اس پر جاری ہوں جو کچھ اُس کے قلب پر گذرے زبان اُس کے اظہار میں مخل نہ ہو اور جو کچھ زبان پر ظاہر ہو اپنے
قلب کو اس میں زیادہ مشغول نہ کرے اور اس کا اتنا زیادہ غلبہ ہو کہ کسی شے کے گذارنے میں رکاوٹ نہ پیدا کرے۔ اور یہ
بشری تقاضوں کے زائل ہونے کی علامت ہے کہ بندہ سرّی اور جہری طور پر راجع بحق ہو گیا ہے۔ بشر حافی رحمۃ اللہ
علیہ فرماتے ہیں: اَفْضَلُ الْمَقَامَاتِ اِعْتِقَادُ الصَّبْرِ عَلَی الْفَقْرِ اِلَی الْقَبْرِ
"زندگی بھر صبر پر قائم رہنا افضل مقامات میں سے ہے"۔ درویشی پر مداومت، صبر کا اعتقاد اور یہ صبر کرنا اور
اعتقاد کرنا منجملہ بندہ کے مقامات سے ہے اور فقر فنائے مقامات ہے۔ اس لیے فقر پر صبر کا مطلب اعمال و افعال کی
بے مائیگی اور انسانی اوصاف کی بیخ کنی ہے۔ ظاہری معنی اس قول کے فقر کا غنا پر افضل ہونا اور اس کا اعتقاد کرنا ہے کہ
میں فقر کے طریقہ سے ہرگز روگردانی نہ کروں گا۔

ص ۲۶ / ۳۴

شبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلْفَقِیْرُ مَنْ لَا یَسْتَغْنِیْ بِشَیْءٍ دُوْنَ اللّٰهِ "فقیر وہ ہے جو اللہ کے سوا
کسی چیز سے غنا نہیں طلب کرتا"۔ فقیر بجز خدا کے کسی چیز سے راحت نہیں پاتا۔ کیونکہ اس کا کوئی اور مقصدِ حیات
نہیں ہوتا۔ لفظی مطلب یہ ہے کہ کوئی اُس کی ذات کے بغیر غنی نہیں ہو سکتا اور اس کو پالینا ہی غنا ہے۔ ہمارا

محبت میں عذر بیگانہ پن ظاہر کرتا ہے اور عتاب یگانگت کے خلاف ہوتا ہے۔ اہلِ محبت دونوں چیزوں کو موجبِ آفت سمجھتے ہیں۔ کیونکہ عذر محبوب کے حکم کی بجاآوری میں کوتاہی کے سلسلے میں ہوتا ہے کہ جب وہ اپنا حق طلب کرے یہ عذر پیش کرے اور عتاب اُس کوتاہی کی بنا پر ہوتا ہے جو فرمانِ دوست میں ہو۔ اُس وقت وہ دوست اُس کوتاہی پر اُسے عتاب کرتا ہے اور یہ دونوں محال ہیں۔ جملہ امور میں فقرا صبر اور صاحبِ دولت شکر کرتے ہیں اور حقیقی دوستی میں دوست نہ تو دوست سے کوئی چیز طلب کرتا ہے اور نہ دوست فرمانِ دوست کو ٹالتا ہے۔ ظَلَمَ مَنْ سَمّٰی اِبْنَ اٰدَمَ اَمِیْرًا وَقَدْ سَمَّاہُ رَبُّہٗ فَقِیْرًا "ظلم کیا اُس نے جس نے ابن آدم کو امیر کہا حالانکہ باری تعالیٰ نے اس کا نام فقیر رکھا ہے۔" جس کا نام اللہ تعالیٰ کی طرف سے فقیر ہے وہ امیر بھی ہو تو فقیر ہے۔ ہلاک ہُوا وہ شخص جس نے تخت و تاج کے بل بوتے پر اپنے آپ کو امیر سمجھا۔ امیر لوگ صاحبِ صدقہ ہوتے ہیں اور فقیر لوگ صاحبِ صدق۔ اور ہرگز صاحبِ صدق، صاحبِ صدقہ کی طرح نہیں ہوتا۔ درحقیقت سلمانؓ کا فقر سلیمانؑ کے غنا سے کم نہیں ہے۔ ایوبؑ کو عالمِ صبر میں اللہ نے فرمایا نِعْمَ الْعَبْدُ "وہ اچھا بندہ ہے" اور سلیمانؑ کو استحکام سلطنت میں بھی یہی فرمایا نِعْمَ الْعَبْدُ "وہ اچھا بندہ ہے"۔ جب خدائے رحمٰن کی رضا حاصل ہوگئی تو فقرِ سلمانؓ، غنائے سلیمانؑ ہی کی طرح ہوگیا۔

ص ۲۵/۳۲

حکایت: مصنف کہتا ہے۔ میں نے استاد ابوالقاسم قشیریؒ کو کہتے سُنا کہ لوگ فقر و غنا میں بحث و تمحیص کرتے ہیں اور اپنے لیے ایک چیز اختیار کر لیتے ہیں۔ میں وہ چیز اختیار کرتا ہوں جو باری تعالیٰ کو پسند ہو اور وہ مجھے اس پر استقامت دے۔ اگر وہ مجھے صاحبِ دولت بنائے تو میرے قدم نہ ڈگمگا جائیں۔ اور اگر وہ مجھے فقیر رکھے تو میں حرص و ہوس میں مبتلا ہو کر اُس کے راستہ سے نہ ہٹ جاؤں۔ فقر اور تونگری دونوں ہی خدا کی نعمتیں ہیں۔ تونگری غفلت کے باعث آفت ہو جاتی ہے اور فقر لالچ اور حرص کے باعث۔ گو قولاً دونوں عمدہ چیزیں ہیں لیکن عملاً مختلف ہیں۔ فقر ماسوا سے دل فارغ ہونے کا نام ہے اور غنا غیر کے ساتھ مشغولیتِ دل کا۔ اگر فراغتِ دل میسّر ہو تو نہ فقر غنا سے بہتر ہے اور نہ غنا فقر سے۔ غنا کثرتِ متاع کا نام ہے اور فقر قلّتِ متاع کا اور تمام متاع کا مالکِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہے جب طالب ملکیت کو ترک کر دے تو وہ شرک سے محفوظ ہو جاتا ہے اور وہ دونوں ناموں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

فصل

مشائخ طریقت کے اس موضوع پر بہت سے اقوال ہیں اور میں اس کتاب میں بقدرِ گنجائش نقل کرتا ہوں۔

ص ۲۵/۳۳

متاخرین میں سے ایک نے کہا: لَيْسَ الْفَقِيْرُ مَنْ خَلَا مِنَ الزَّادِ إِنَّمَا الْفَقِيْرُ مَنْ خَلَا مِنَ الْمُرَادِ "
فقیر تہی دست کو نہیں کہتے کہ اُس کے پاس متاع اور زاد نہ ہو بلکہ فقیر وہ ہے جس کا دل خواہشات سے خالی ہو
مثلاً اگر خدا کسی کو دولت عطا کرے اور وہ اس کی حفاظت کا ارادہ کرے تو وہ غنی ہے۔ اور اگر وہ اس دولت
کو ترک کرنے کا ارادہ کرے تو بھی غنی ہے کیونکہ ان دو میں سے ہر ایک مِلکِ غیر میں تصرف ہے۔ اور فقر ترکِ حفاظت
و ترکِ تصرف کا نام ہے۔ یحییٰ بن معاذ الرازیؒ نے فرمایا: عَلَامَةُ الْفَقْرِ خَوْفُ الْفَقْرِ "فقر کی نشانی فقر زائل ہونے کا
خوف ہے"۔ فقر صحیح ہونے کی علامت یہ ہے کہ بندہ کمالِ ولایت، قیامِ مشاہدہ اور فنائے صفت و بے خودی کے باوجود
ڈرتا ہے۔ زوالِ فقر سے ڈرتا رہے۔ کمالِ فقر یہ ہے کہ آدمی ایسے مقام پر پہنچ جائے کہ اسے انقطاع عن اللہ کا ڈر نہ رہے۔
اور رویم ابن محمد فرماتے ہیں رحمۃ اللہ علیہ: مِنْ نَعْتِ الْفَقِيْرِ حِفْظُ سِرِّهٖ وَصِيَانَةُ نَفْسِهٖ وَاَدَاءُ فَرَائِضِهٖ
"ایک فقیر کی خصوصیات سے ہے: اُس کے باطن کی نگہداشت، اُس کے نفس کی حفاظت اور اُس کے فرائض کی ادائیگی"۔

فقیر کی نشان یہ ہے کہ اُس کا باطن دنیاوی اغراض سے محفوظ ہو، اس کا نفس آفت و شر سے بچا ہوا ہو اور فرض احکام
اس پر جاری ہوں جو کچھ اُس کے قلب پر گذرے زبان اُس کے اظہار میں مخل نہ ہو اور جو کچھ زبان پر ظاہر ہوا اپنے
قلب کو اس میں زیادہ مشغول نہ کرے اور اس کا آنا زیادہ غلبہ ہو کہ کسی شے کے گذارنے میں رکاوٹ نہ پیدا کرے۔ اور یہ
بشری تقاضوں کے زائل ہونے کی علامت ہے کہ بندہ سری اور جہری طور پر راجع بحق ہو گیا ہے۔ بشر حافی رحمۃ اللہ
علیہ فرماتے ہیں: اَفْضَلُ الْمَقَامَاتِ اِعْتِقَادُ الصَّبْرِ عَلَى الْفَقْرِ اِلَى الْقَبْرِ
"زندگی بھر صبر پر ثابت قدم رہنا افضل مقامات میں سے ہے"۔ درویشی پر مداومت، صبر کا اعتقاد اور یہ صبر کرنا اور

ص ۲۶/۳۴

اعتقاد کرنا منجملہ بندہ کے مقامات سے ہے اور فقر فنائے مقامات ہے۔ اس لیے فقر پر صبر کا مطلب اعمال و افعال کی
بے بائگی اور انسانی اوصاف کی بیخ کنی ہے۔ ظاہری معنی اس قول کے فقر کا غنا پر افضل ہونا اور اس کا اعتقاد کرنا ہے کہ
میں فقر کے طریقہ سے ہرگز روگردانی نہ کروں گا۔

شبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلْفَقِيْرُ مَنْ لَا يَسْتَغْنِيْ بِشَيْءٍ دُوْنَ اللّٰهِ "فقیر وہ ہے جو اللہ کے سوا
کسی چیز سے غنا نہیں طلب کرتا"۔ فقیر بجز خدا کے کسی چیز سے راحت نہیں پاتا۔ کیونکہ اس کا کوئی اور مقصدِ حیات
نہیں ہوتا۔ لفظی مطلب یہ ہے کہ کوئی اُس کی ذات کے بغیر غنی نہیں ہو سکتا اور اس کو پا لینا ہی غنا ہے۔ ہمارا

وجود خدا سے جدا ہے۔ جدائی کو دور کیے بغیر اسے پایا نہیں جا سکتا یعنی غنا حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہمارا وجود ہی پردہ حائل
ہے اس کو دور کیا جائے تو غنا حاصل ہو۔ اہلِ حقیقت کے نزدیک یہ نکتہ بہت باریک اور دقیق ہے۔ اور اس معنی کی
حقیقت یہ ہے کہ اَلْفَقِیْرُ لَا یَسْتَغْنِیْ عَنْہُ "فقیر کبھی فقر سے مستغنی نہیں ہوتا" یعنی فقیر وہ ہے کہ اُسے ہرگز
غنا نہیں ہوتا اور یہ وہی بات ہے جو اُس بزرگ نے کہی یعنی خواجہ عبداللہ انصاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہمارا غم
واندوہ دائمی ہے۔ ہماری آرزو کبھی منزل آشنا نہیں ہوتی اور ہماری کلیت اس دنیا و آخرت میں اختتام پذیر نہیں ہوتی
کسی چیز کو حاصل کرنے کے لیے ہم جنسیت ضروری ہے اور خدا جنس سے بالاتر ہے۔ اس کی ذات سے روگردانی
کے لیے غفلت کی ضرورت ہے اور غفلت درویش سے بعید ہے تو کتنا کٹھن کام ہے اور راہی کے لیے کیسی مشکل
دوستی اُس کی کوشش سے جس کے دیدار کی راہ نہ کھلے اور جس کا وصال مخلوق کے دائرۂ امکان سے باہر ہو۔ فنا کی
تبدیلی صورت نہیں اور بقا کو تغیر روا نہیں۔ فانی کبھی باقی نہیں ہوتا کہ تیرا وصل ہو جائے نہ باقی فانی ہوتا ہے کہ تیرا قرب
ہو جائے۔ اُس کے محبت کرنے والوں کا کام مسلسل محنت ہے۔ انہوں نے اپنی تسلی دل کے لیے خوبصورت الفاظ
وضع کر لیے ہیں۔ اور آرامِ جاں کے لیے مقامات۔ منزلیں اور راستے مقرر کر لیے ہیں۔ مگر ان کے الفاظ ان کی ذات
تک محدود رہتے ہیں اور ان کے مقامات ان کی جنس تک اور حق تعالیٰ مخلوق کے اوصاف و احوال سے منزہ اور
پاک ہے۔ اور ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: نَعْتُ الْفَقِیْرِ السُّکُوْنُ عِنْدَ الْعَدَمِ وَالْبَذْلُ
عِنْدَ الْوُجُوْدِ وَقَالَ اَیْضًا الْاِضْطِرَابُ عِنْدَ الْوُجُوْدِ "فقیر کی صفت یہ ہے کہ کچھ نہ ہو تو پُر آرام رہے، کچھ
موجود ہو تو خوب خرچ کرے۔ نیز فرمایا کہ اگر اُس کے پاس کچھ موجود ہو تو بے چین اور مضطرب رہے" جب نہ ملے
خاموش رہے جب ملے تو دوسرے کو اپنے سے زیادہ مستحق جانے اور اُس پر خرچ کرے مثلاً اگر طعام کی خواہش ہو
اور نہ ملے تو دل کو سکون رہے جب ملے تو اپنے سے بہتر حق دار کی نذر کر دے۔ یہ بہت بڑا کام ہے۔ اس کے دو
مطلب ہیں۔ اول یہ کہ کسی چیز کی عدم موجودگی میں دل کا سکون رضا ہے اور موجودگی میں اس کو تقسیم کر دینا محبت۔
راضی برضا ہونا قابلِ خلعت بنانا ہے اور خلعت قربت کا نشان ہے اور صاحب محبت خلعت سے دستبردار رہتا ہے
کیونکہ خلعت میں نشانِ فرقت و جدائی بھی ہے۔ دوم یہ کہ کچھ نہ ملنے پر دل کا سکون اس امید پر ہوتا ہے کہ کچھ ملے گا
جب کچھ مل جاتا ہے تو ملنے والی چیز ذاتِ باری تعالیٰ سے جداگانہ ہوتی ہے اور کوئی چیز ماسویٰ ذاتِ باری اہل کی

ص ۲۷/۳۵

تسلّی کا باعث نہیں بن سکتی۔ اور وہ اس سے دست بردار ہو جاتا ہے اور یہ وہی مفہوم ہے جسے شیخ المشائخ ابو القاسم جنید بن محمد ابن الجنیدؒ نے اپنے اس قول میں اس طرح ادا فرمایا: اَلْفَقْرُ خُلُوُّ الْقَلْبِ عَنِ الْاَشْکَالِ "فقر دل کو ہر شکل سے خالی کرنے کا نام ہے"۔ جب دل ہر شکل سے خالی ہو اور وجود شکل غیر اللہ ہو تو پھر دستبردار ہونے کے سوا کیا چارہ ہے۔ شبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلْفَقْرُ بَحْرُ الْبَلَاءِ وَبَلَاءُہٗ کُلُّہٗ عِزٌّ "فقر دریائے بلا ہے اور اس کی جملہ بلائیں اور آزمائشیں عزّت ہیں"۔ عزّت مقسوم غیر ہے کیونکہ جو عین بلا میں مبتلا ہو اُسے عزت کی کیا خبر۔ جب تک

ص ۲۷/۳۶

وہ بلا کو فراموش نہ کرے اور اپنے خالق کی طرف رجوع نہ کرے یہ ہو تو بلا سراسر عزّت میں بدل جاتی ہے۔ اس کی عزّت کامل وقت اور اس کا وقت کامل محبّت اور اس کی محبّت کامل مشاہدہ یہاں تک کہ طالب کا دماغ غلبۂ خیال کے باعث کامل محلّ دیدارِ الٰہی بن جاتا ہے۔ اور وہ بغیر آنکھ دیکھنے والا بن جاتا ہے اور بغیر کان کے سننے والا بن جاتا ہے تو کیا شان ہے محبوب کی دی ہوئی صعوبت کو برداشت کرنے کی۔ فی الحقیقت یہ صعوبت عزّ و شرف ہے اور اس کے مقابلے میں نعمت ایک ذلّت ہے۔ کیونکہ عزت اس چیز میں ہے جو بندہ کو حضورِ حق میں لے جائے اور ذلّت اُس میں جو اسے دور لے جائے۔ فقر کی صعوبت نشانِ حضوری ہے اور غنا کی راحت علامتِ بے حضوری: جسے حق تعالےٰ کی حضوری حاصل ہے وہ عزّت والا ہے اور جسے بے حضوری ہے وہ ذلیل ہے۔ ہر وہ صعوبت جو مشاہدہ اور قربتِ حق کا باعث ہو قابلِ قبول ہے اور جنیدؒ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یَا مَعْشَرَ الْفُقَرَاءِ اِنَّکُمْ اِنَّمَا تُعْرَفُوْنَ بِاللّٰہِ وَتُکْرَمُوْنَ لِلّٰہِ فَانْظُرُوْا کَیْفَ تَکُوْنُوْنَ مَعَ اللّٰہِ اِذَا خَلَوْتُمْ بِہٖ "اے گروہ درویشاں لوگ تمہیں باخدا سمجھتے ہیں اور خدا کے نام پر تمہاری عزت کرتے ہیں دیکھو خلوت کی حالت میں تم اس سے کس کیفیت میں ہوتے ہو"۔ یعنی جب خلقت تمہیں درویش سمجھتی ہے اور تمہیں حق پرست جانتی ہے تو تم حق درویشی کس طرح ادا کرتے ہو اگر لوگ تمہیں تمہارے دعویٰ کے خلاف کسی اور نام سے پکاریں تو تمہیں برا نہیں ماننا چاہیئے کیونکہ تم بھی اپنے دعویٰ کی صداقت کے ساتھ انصاف نہیں کرتے۔ کمترین درجہ کا آدمی وہ ہے جسے لوگ سچا درویش تصوّر کریں۔ اور وہ درویش نہ ہو۔ اچھا وہ ہے جسے خلق صاحبِ فقر سمجھے اور وہ صاحبِ فقر ہو اور عزیز ترین انسان وہ ہے جسے خلقت درویش نہ سمجھے اور وہ حقیقت میں درویش ہو۔ اس شخص کی مثال جو درویش نہ ہو اور لوگ اسے درویش خیال کریں اس آدمی کی ہے جسے طبیب ہونے کا دعویٰ ہو۔ بیماروں کو دوا دے اور جب خود بیمار ہو تو کسی اور طبیب

ص ۲۸/۳۷

کا محتاج ہو۔ وہ آدمی جسے خلقت درویش سمجھے اور وہ درویش ہو اس طبیب کی مثل ہے جو طبیب ہونے کا دعویدار ہو لوگوں کو دوا دے اور جب خود بیمار ہو تو اس کو کسی اور طبیب کی ضرورت نہ ہو اور وہ اپنا علاج خود کر سکے وہ شخص جسے لوگ درویش نہ سمجھتے ہوں اور فی الحقیقت درویش ہو اس طبیب کی طرح ہے جسے لوگ طبیب نہ مانتے ہوں اور وہ لوگوں سے بے نیاز ہو کر اچھی غذا۔ مفرح شربت اور معتدل ہوا سے اپنی صحت کو برقرار رکھنے پر وقت صرف کرتا ہو تا کہ بیمار نہ ہو۔ لوگوں کی نظر سے وہ او جھل ہوتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ اَلْفَقْرُ عَدَمٌ بِلَا وُجُوْدٍ "فقر عدم بلا وجود ہے"۔ اس قول کی تشریح ناممکن ہے کیوں کہ معدوم چیز کا وجود ہی نہیں ہوتا اور تشریح اسی چیز کی ہو سکتی ہے جس کا وجود ہو۔ بظاہر اس قول کا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ فقر کوئی شے نہیں۔ اور یہ غلط ہے۔ سالکانِ راہِ حق کی تشریحات اور اقوال بے بنیاد چیز سے متعلق نہیں ہو سکتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اصلیت کا انکار مدِ نظر نہیں بلکہ انکار اس آفت کا ہے جو اصلیت کو مسخ کر دے۔ تمام انسانی صفات باعثِ آفت ہیں جب آفت کو دور کیا جائے تو نتیجہ فنائے صفات ہو گا اور فنائے صفات مقصود کو حاصل کرنے یا اس سے دستبردار ہونے کے ذرائع کو ختم کر دیتی ہے۔ اصلیت تک پہنچنے کا راستہ مسدود ہو تو اصلیت کی فنا نظر آتی ہے۔ اور آدمی قعرِ مذلّت میں گر جاتا ہے۔

مجھے فلسفیوں کے ایک گروہ سے ملنے کا اتفاق ہوا جو اس قول کے معانی سمجھے بغیر خندہ بر لب تھے اور اسے غلط تصوّر کرتے تھے۔ ایک اور جماعت ایسے جھوٹے دعویداروں کی بھی تھی جو احمقانہ اس قول کی صداقت پر یقین رکھتے تھے اور اصل حقیقت سے بے خبر تھے۔ دونوں گروہ بر خود غلط تھے ایک لاعلمی کی وجہ سے منکر دوسرا حماقت کی وجہ سے سرگرداں۔ دراصل اہلِ تصوّف کے لیے "عدم" اور "فنا" سے مراد آلاتِ مذموم کو ختم کر دینا اور کسی عمدہ صفت کو حاصل کرنے کی کوشش میں بُرے نشانات کو مٹا دینا ہے۔ سامانِ طلب کے وجود میں فنا ہو جانا نہیں۔

ص ۲۹/۳۸

درویشی اپنے تمام معانی میں عارضی فقر ہے اور تمام آلات و اسباب سے بے گانہ۔ تاہم درویش گذرگاہِ اسرارِ ربّانی ہے۔ جب تک وہ خود امور کو حاصل کرتا ہے ہر امر اس کا اپنا فعل ہوتا ہے اور معانی کو اس کی ذات سے نسبت ہوتی ہے جب وہ تحصیل حاصل سے رہا ہو جائے تو اس کا کوئی فعل اس کی ذات سے منسوب نہیں ہوتا۔ پھر وہ راہبر نہیں رہتا رہگذر ہو جاتا ہے۔ یعنی اُس پر جو کچھ گذرتا ہے وہ از خود کسی سمت نہیں چلتا۔ نہ کسی چیز کو اپنی طرف جذب کرتا ہے

نہ کسی چیز کو اپنی ذات سے دور پھینکتا ہے۔ صرف اصلیّت اس پہ اثر انداز ہوتی ہے۔

میں نے بعض بر خود غلط اربابِ تصوّف کو دیکھا جنہیں مُدّعیانِ اربابُ اللّسان کہنا چاہیئے۔ وہ اپنی خام خیالی میں اصلِ فقر سے منکر تھے اور ان کی حقیقت سے روگردانی اُنہیں اوصافِ فقر کی تردید پر آمادہ کرتی تھی۔ وہ صداقت اور اصلیت کی تلاش سے قاصر تھے اور اپنی اس برائی کو فقر اور صفا کا نام دیتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سوائے اپنے بے بنیاد خیالات کے ہر چیز کو غلط قرار دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ ان میں ہر ایک کم و بیش فقر سے بے بہرہ تھا۔ وہ اصل اس بات یعنی فقر کا پندار آدمی کے لیے کمالِ ولایت کا نشان ہوتا ہے اور اس کی آرزو اور اس بات کی تہمت بھی آخری مطمحِ نظر۔ تاہم عینِ حقیقت کے مطابق معنی کی آرزو کرنا مقامِ کمال ہے۔ طالبانِ حق کی راہ پر چلنا۔ ان کے مقامات کا طے کرنا اور ان کی عبارات کو سمجھنا ضروری ہے تاکہ مجلس خواص میں کوئی عامی اور جاہل نہ رہ جائے۔ عام اصولوں سے بے خبر آدمی اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ فروعات سے ناآشنا آدمی کو کم از کم اصولوں کا سہارا ہوتا ہے۔ اصول سے بے خبر کا کوئی سہارا نہیں ہوتا۔ میں نے یہ سب کچھ ازراہِ حوصلہ افزائی بیان کیا تاکہ تم روحانی سفر اختیار کر سکو اور آدابِ سفر کو کسی جگہ نظر انداز نہ کرو۔

س ۲۱/۳۶

اب میں تصوّف کے باب میں اہلِ تصوّف کے کچھ اصول، رموز اور اشارات بیان کروں گا۔ پھر اہلِ حق کے حالات پھر مشائخ متصوّفہ کے مختلف مذاہب کا ذکر کروں گا۔ آگے چل کر میں تصوّف کے اقسام، علم اور قوانین سے متعلق کچھ لکھوں گا اور پھر تا بقدر اہلِ تصوّف کے آداب و رموز بیان کروں گا تاکہ پڑھنے والوں پر حقیقت کا انکشاف ہو وَبِاللّٰہِ التَّوفِیقُ اور سب توفیق اللہ کی طرف سے ہے ؛

تیسرا باب

تصوّف

ص ۳۱/۳۹

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا "اور اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ اُن سے کلام کریں تو وہ سلام کر کے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔" اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ سَمِعَ صَوْتَ اَهْلِ التَّصَوُّفِ فَلَا یُؤْمِنُ عَلٰی دُعَائِهِمْ کُتِبَ عِنْدَ اللّٰهِ مِنَ الْغَافِلِیْنَ "جس نے اہل تصوّف کی آواز سنی اور اسے نہ مانا بارگاہِ حق میں وہ غافلوں میں شمار ہوا۔" لوگوں نے لفظِ تصوّف کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے اور کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ صوفی کو اس لیے صوفی کہا جاتا ہے کہ وہ صوف یعنی پشم وغیرہ کا لباس پہنتا ہے۔ دوسری جماعت کہتی ہے صوفی صفِ اوّل میں ہوتا ہے اس لیے صوفی کے نام سے موسوم ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ صوفیاء نے اصحابِ صفّہ کی محبّت اختیار کی اس لیے صوفی کہلائے۔ بعض دیگر لوگوں کا خیال ہے لفظِ صوفی صفا سے مشتق ہے۔ اور ہر کسی کے طریقت کی تحقیق اور ان معانی میں بیشتر لطائف ہیں۔ یہ تشریحات لفظ صوفی کی لغوی صورت کو روشن کرنے سے قاصر ہیں گو ہر ایک تشریح کے ساتھ دقیق استدلال موجود ہے۔

ص ۳۱/۴۰

"صفا" مسلّمہ طور پر قابلِ قدر ہے اور اس کا اُلٹ "کدر" ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ذَهَبَ صَفْوُ الدُّنْیَا وَبَقِیَ کَدَرُهَا "دنیا کی صفائی جاتی رہی اور میل باقی رہ گیا۔" اشیاء کے لطیف حصّے کا نام "صفا" ہے اور کثیف کو "کدر" کہتے ہیں۔ چونکہ اہل تصوّف اپنے اخلاق اور معاملات کو صاف رکھتے ہیں اور قلبی آفات سے بری ہوتے ہیں اس لیے صوفی کہلاتے ہیں۔ اس فرقہ کے لیے یہ لفظ "اسم علم" کی حیثیت رکھتا ہے۔ صوفیائے کرام کا عزّ و وقار اس سے بلند ہے کہ اُن کے معاملات میں کوئی چھپی ہوئی چیز ہو کہ ان کے اسم کو کسی لفظ سے مشتق ہونے کی ضرورت ہو لیکن اس زمانے میں اللہ تعالیٰ نے بہت سے لوگوں کو تصوّف اور اہل تصوّف سے محجوب اور دور کر رکھا ہے۔

اور اسرارِ تصوّف ان کے دلوں سے چھپا رکھے ہیں۔ چنانچہ بعض کا خیال ہے۔ تصوّف صرف ظاہری زہد و اتقار تک محدود ہے بغیر کسی باطنی کیفیت کے بعض کہتے ہیں کہ تصوّف ایک ظاہر داری کا طریق ہے اور اس کی اصل اور بنیاد کچھ نہیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے اہلِ ھزل اور علمائے ظاہر کا نقطہ نظر قبول کر لیا ہے جو صرف ظاہر کو مدنظر رکھتے ہیں اور تصوّف کی اصل حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کیے بغیر اسے قابلِ طعن گردانتے ہیں۔ عوام الناس نے ان کی اندھا دھند تقلید کرتے ہوئے تزکیۂ قلب سے روگردانی اختیار کی اور اپنے سلف رحؒ اور صحابۂ کرامؓ کے احکام کو پسِ پشت ڈال دیا۔

ے اِنَّ الصَّفَا صِفَةُ الصِّدِّيقِ　　اِنْ اَرَدْتَ صُوفِيًا عَلَى التَّحْقِيقِ

اگر تو کامل صوفی دیکھنا چاہتا ہے تو ابو بکر صدیق رضؓ کو دیکھ کہ اصل صفا ان میں تھی۔

صفا کی اصل بھی ہے اور فرع بھی۔ اصل یہ ہے کہ دل اغیار سے خالی ہو اور فرع یہ ہے کہ دل اس فریب دینے والی دنیا سے منقطع ہو۔ یہ دونوں حضرت صدیق اکبرؓ کی صفتیں ہیں ابو بکر عبد اللہ بن ابی قحافہ رضی اللہ عنہ کہ وہ اہلِ طریقت کے امام ہیں۔ اُن کا دل اغیار سے اس قدر تہی تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال پر تمام صحابۂ کرامؓ شکستہ دل تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شمشیر نکالی اور اعلان کیا جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت یہ کہے گا کہ وہ وفات پا گئے ہیں اس کا سر قلم کر دوں گا۔ صدیق اکبرؓ باہر آئے اور بآوازِ بلند کہا "اَلَا مَنْ عَبَدَ مُحَمَّدًا فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ وَمَنْ عَبَدَ رَبَّ مُحَمَّدٍ فَاِنَّهٗ حَیٌّ لَا یَمُوْتُ" متنبہ رہو کہ جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بندگی کی تو وہ رحلت فرما گئے اور جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رب کی بندگی کی تو وہ زندہ ہے اور اس کو موت نہیں۔" پھر یہ آیت پڑھی: "وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ" اور نہیں ہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم مگر رسول اور ان سے پہلے بھی رسول ہو گذرے ہیں تو یہ اگر رحلت فرما جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو کیا تم الٹے قدم لوٹ جاؤ گے"۔ جو فانی اشیاء کا دلدادہ ہوتا ہے فانی فنا ہو جاتا ہے۔ اور اس کی جملہ محنت اکارت جاتی ہے اور جو خدائے باقی کے حضور میں رہے وہ باقی بہ بقا ہوتا ہے۔ جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بشریت کی نظر سے دیکھا اس کے دل سے تعظیم ان کی رحلت کے ساتھ ہی ختم ہو گئی اور جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بچشمِ حقیقت دیکھا۔ اس کے لیے ان کی موجودگی اور رحلت یکساں تھی کیونکہ دونوں حالتیں باری تعالیٰ کی ذات سے منسوب ہیں۔ صدیق اکبرؓ نے حالات سے منہ پھیر کر حالات کے خالق کو سامنے رکھا نی الحقیقت

ص ۳۲/۴۱

حالات، خالقِ حالات کے حکم سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ صدیق اکبرؓ نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم آپ کی شایانِ شان کی۔ اپنا دل بجز خدا کسی چیز سے وابستہ نہ کیا اپنی نظر کو خلقت سے بچایا بقولِ کسے مَنْ نَظَرَ اِلَی الْخَلْقِ هَلَكَ وَمَنْ رَجَعَ اِلَی الْحَقِّ مَلَكَ "جس نے مخلوق کو دیکھا ہلاک ہُوا اور جس نے حق کو دیکھا مالک ہُوا"۔ کہ مخلوق کی طرف دیکھنا نشانِ ہلاکت ہے اور حق کی طرف دیکھنا نشانِ بادشاہت۔ اور صدیق اکبرؓ کا متاعِ دنیا سے انقطاع یہ تھا کہ انہوں نے اپنا تمام مال ومنال راہِ خدا میں دے دیا۔ اور خود ایک کمبل اوڑھ کر حضور رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم میں آگئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: مَا خَلَّفْتَ لِعِيَالِكَ "اپنے بال بچوں کے لیے کیا چھوڑا"۔ فَقَالَ اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ "کہا اللہ اور اللہ کا رسول"۔ یعنی دو خزانے بے انتہا اور نہ ختم ہونے والے۔ پوچھا گیا۔ عرض کی خدا کی محبت اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی۔ جب دل صفاتِ دنیا سے خالی ہوگیا۔ میں نے اس کی کثافت سے بھی ہاتھ دھولیے۔ یہ صوفی صادق کی علامات ہیں۔ اس چیز کا انکار حقیقت سے منکر ہونے کے برابر ہے۔ اور ایک صریح کج بحثی ہے۔

ص ۳۳ / ۴۲

میں نے اوپر بیان کیا کہ صفا، کدر کی ضد ہے۔ کدر صفات انسانی میں شامل ہے۔ صحیح معنوں میں صوفی وہ ہے جو کدر یعنی کثافت سے دست بردار ہوجائے۔ زنانِ مصر پہ استغراق مشاہدۂ یوسف علیہ السلام اور آپ کے نظارۂ جمال کے دوران بشریت غالب آگئی۔ اور وہ مادیت سے ہٹ کر روحانیت میں محو ہوگئیں۔ جب یہ غلبہ انتہا کو پہنچا تو غلبہ سفلی سے آگے نکل گئیں اور ان کی نظر حضرت یوسفؑ سے ہٹ کر فنا انسانیت کی طرف گئی اور وہ پکار اٹھیں مَا هٰذَا بَشَرًا "یہ انسان نہیں ہیں"۔ اُن کا اشارہ حضرت یوسفؑ کی طرف تھا اور درحقیقت بیان اپنی کیفیت کا تھا اور اسی لیے مشائخ طریقت رحمہم اللہ نے فرمایا ہے: لَيْسَ الصَّفَاءُ مِنْ صِفَاتِ الْبَشَرِ لِاَنَّ الْبَشَرَ مَدَرٌ وَالْمَدَرُ لَا يَخْلُوْ مِنَ الْكَدَرِ "صفا انسانی صفات سے نہیں کیونکہ انسان مٹی کا پتلا ہے اور مٹی کثافت سے خالی نہیں"۔ مطلب یہ کہ صفا کی نسبت افعال سے نہیں اور ازروئے مشاہدہ بشریت کو زوال ہے کہ وہ بالکل ختم ہوجائے اور صفا کو افعال و احوال سے تعلق نہیں اور یہ نام و القاب سے بالاتر ہے اَلصَّفَاءُ صِفَةُ الْاَحْبَابِ وَهُمْ شُمُوْسٌ بِلَا سَحَابٍ "صفا دوستانِ حق کی صفت ہے جو ایسے خورشید کی مانند ہیں جس پر ابر نہ ہو"۔ چونکہ صفا نشانِ محبت ہے اور محبت کرنے والے اپنی صفات کو نذرِ فنا کر کے صرف محبوب کی صفات پر جیتے ہیں۔ اربابِ حال کی نظر

ہیں ان کی مثال روشن آفتاب کی سی ہے۔ حبیبِ خدا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب حارثہؓ کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: عَبْدٌ نَوَّرَ اللّٰهُ قَلْبَهٗ بِالْاِیْمَانِ " وہ ایسا بندہ ہے جس کا دل اللہ نے نورِ ایمان سے روشن کیا ہے۔" اُسی نور کے فیض سے اس کا چہرہ چاند کی طرح تابندہ ہے اور وہ نورِ ربّانی کا پیکر ہے۔ بقول کسے ؎

ضیاء الشمس والقمر اذا استنوکا   انموذج من صفاء الحبّ والتوحید اذا اشتکا

"سورج اور چاند کا ملاپ توحید اور صفا کا اتحاد ہے۔" یہ ٹھیک ہے کہ صفا و توحیدِ خداوندی کے نور کے سامنے چاند اور سورج کی روشنی بے کار ہے اور دونوں کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا مگر دنیا میں چاند اور سورج سے زیادہ روشن کوئی چیز نہیں۔ آنکھ جلوۂ آفتاب و ماہتاب کی متحمل نہیں۔ جب آفتاب اور ماہتاب اوجِ کمال پر ہوں۔ تو آنکھ آسمان کو دیکھتی ہے اور دل نورِ معرفت، توحید اور محبّت کے ذریعے عرش کو دیکھتا ہے اور دوسرے عالم کے کوائف سے واقفیت حاصل کرتا ہے۔ تمام مشائخ اس پر متفق ہیں کہ جب بندہ مقامات کی قید سے رہائی حاصل کرلیتا ہے اور احوال کی کثافتوں سے آزاد ہوجاتا ہے اور تغیّر و تبدّل کی دنیا سے بے نیاز ہوجاتا ہے اور تمام پسندیدہ احوال کے ساتھ موصوف ہوجاتا ہے اور وہ جملہ اوصاف سے جدا ہوجاتا ہے یعنی اپنی کسی پسندیدہ صفت پر نظر کرکے اُس کے ہاتھوں قید نہیں ہوتا اور اس کو نہیں دیکھتا اور اس پر مغرور نہیں ہوتا تو اس کا حال ادراک کی گرفت سے باہر ہوجاتا ہے اور اس کا وقت وسوسوں کے تصرّف سے محفوظ ہوجاتا ہے۔ بارگاہِ ایزدی میں اس کی حضوری نہ ختم ہونے والی ہوتی ہے۔ اور اس کا وجود ظاہری اسباب سے بے نیاز ہوجاتا ہے۔ لِاَنَّ الصَّفَا حُضُوْرٌ بِلَا ذِهَابٍ وَّوُجُوْدٌ بِلَا اَسْبَابٍ "کیونکہ صفا نام ہے ایسی حضوری کا جو زائل نہ ہو اور ایسے وجود کا جو بلا اسباب ہو۔" جہاں غیبت رونما ہو وہاں حضور نہیں رہتا۔ اور جب اسباب وجہِ حصولِ مدّعا ہوں تو آدمی صاحبِ حصول تو کہلائے گا واجد یعنی صاحبِ حال نہیں۔ جب یہ مقام نصیب ہو تو وہ دنیا اور عقبٰی کے لیے فنا ہوکر فقدانِ بشریّت کی بنا پر ربّانی ہوجاتا ہے۔ سونا اور مٹّی اس کی نگاہوں میں برابر ہوجاتا ہے۔ اور وہ احکام جو اوروں کے لیے دشوار ہوں اس کے لیے آسان ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ حضرت حارثہؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے آپؐ نے فرمایا: کیف اصبحت یا حارثہ قال اصبحتُ مومناً باللہ حقاً فقال اُنظُر ما تقول یا حارثۃ ان لکل شیٍٔ حقیقۃ فما حقیقۃ ایمانک فقال عرفت نفسی عن الدنیا فاستوی عندی حجرھا و

ذھبہا وفضّتہا ومدرھا فاسہرت لیلی واظمأت نہاری حتّٰی صرت کانی انظر الی عرش ربّی بارزاً وکانّی انظر الی اھل الجنّۃ یتزاورون فیہا وکانّی انظر الی اھل النار یتعادون و فی روایۃ یتغاوزون۔ الحدیث۔ "تجھ پر صبح کا ظہور کیسے ہُوا اے حارثہ؟ انہوں نے جواب دیا میں صبح کو اللہ پر ایمان لایا اور سچّا ایمان۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے حارثہ اچھی طرح سمجھ لو کیا کہہ رہے ہو ہر شے کی ایک حقیقت ہوتی ہے تو تیرے ایمان کی کیا حقیقت ہے؟ انہوں نے جواب دیا میں نے دنیا سے منہ موڑ کر اپنے آپ کو پہچانا پس اس کا پتھر، سونا، چاندی اور مٹّی میری نظر میں برابر ہُوا۔ میں رات بھر جاگا اور دن پیاس میں گذارا یہاں تک کہ مجھے محسوس ہُوا کہ میں اپنے رب کریم کا عرش دیکھ رہا ہوں اور نیز یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ اہل بہشت ایک دوسرے سے مل رہے ہیں اور اہل جہنّم ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے ہیں۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عَرَفْتَ فَالْزَمْ قَالَہَا ثَلٰثًا۔" اے حارثہ تو نے پہچان لیا۔ اسی کو لازم پکڑ کہ حقیقت سوائے اس کے نہیں آپ نے یہ تین بار فرمایا۔

ص ۳۵/۴۵

صوفی کا لفظ کامل اور محقق اولیائے کرام پر عاید ہوتا ہے۔ مشائخ میں سے کسی نے کہا ہے: من صفاہ الحبّ فھو صافٍ ومن صفاہ الحبیب فَھُوَ صُوْفِیٌّ۔ "جو محبّت کے ساتھ مصفّا ہو وہ صافی ہے اور جو دوست میں محو و مستغرق اور غیر دوست سے بری ہو وہ صوفی ہے۔" لفظ صوفی کسی اور لفظ سے مشتق نہیں۔ کیونکہ تصوّف کا مقام اس تکلّف سے بالاتر ہے۔ اشتقاق کے لیے جنس کی ضرورت ہے۔ موجودات کی ہر چیز کثیف ہے، اور صفا کی ضد ہے۔ کوئی چیز اپنی ضد سے مشتق نہیں ہو سکتی۔ صوفیائے کرام کے لیے تصوّف کے معانی سورج سے زیادہ روشن ہیں اور کسی عبارت یا اشارت کے محتاج نہیں لِاَنَّ الصُّوْفِیَّ مَمْنُوْعٌ عَنِ الْعِبَارَۃِ وَالْاِشَارَۃِ۔ "صوفی عبارت و اشارہ سے بری ہے۔" چونکہ صوفی تشریح سے باہر ہے تمام لوگ اس کی شرح کرنے والوں میں ہیں چاہے حصولِ معنٰی کے وقت اس لفظ کی عظمت کا ان کو علم ہو یا نہ ہو۔ ان میں جو اہل کمال ہوں "صوفی" کہلاتے ہیں۔ اور ان کے متعلقین اور طالبوں کو "متصوّف" کہتے ہیں۔ تصوّف بابِ تفعّل سے ہے اور تفعّل میں تکلّف واقع ہونے کا مفہوم مضمر ہے۔ یہ جڑ کی شاخ ہے (فرع) اور اس کا معنوی اور نحوی فرق صاف ظاہر ہے اَلصَّفَاءُ وِلَایَۃٌ لَھَا اٰیَۃٌ وَّ رِوَایَۃٌ وَالتَّصَوُّفُ حِکَایَۃٌ لِلصَّفَاءِ بِلَا شِکَایَۃٍ "صفا ولایت ہے جس کے نشانات و روایات ہیں

ص ۳۵/۴۶

اور تصوّف اس صفا کی حکایت بے شکایت ہے"۔ صفا کے معنی روشن اور ظاہر ہیں تصوّف اسی کی حکایت ہے۔ اہل صفا تین جماعتوں میں تقسیم ہوسکتے ہیں (۱) صوفی (۲) متصوّف (۳) مستصوّف۔ صوفی کی انا فنا ہو جاتی ہے۔ حق اس کی زندگی ہوتی ہے۔ وہ آلاتِ بشریت سے آزاد ہوتا ہے اور صحیح معنوں میں حقیقتِ حقائق سے واقف ہوتا ہے۔ متصوّف وہ ہے جو اس مقام کو مجاہدہ سے حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اور اس کوشش میں صوفیاء کی مثال سامنے رکھ کر اپنے آپ کو درست کرنے میں مصروف ہو۔ مستصوّف وہ ہے جو روپے پیسے۔ طاقت اور دنیوی جاہ حاصل کرنے کے لیے صوفیاء کی نقالی کر رہا ہو اور پہلی دونوں صورتوں سے بے خبر ہو۔ چنانچہ کہا گیا ہے: اَلْمُسْتَصَوِّفُ عِنْدَ الصُّوفِيَّةِ كَالذُّبَابِ وَعِنْدَ غَيْرِهِمْ كَالذِّئَابِ "مستصوّف صوفیاء کے نزدیک مکھی کی طرح حقیر ہوتا ہے اور عام لوگوں کے لیے بھیڑیے کی طرح"۔ الغرض صوفی صاحب وصول، متصوّف صاحب اصول اور مستصوف صاحب فصول ہوتا ہے۔ جسے وصل نصیب ہوا اس نے اپنے مقصود کو حاصل کرنے میں تمام دیگر مقاصد سے ہاتھ دھو لیے۔ جو اصل کے قابل تھا وہ راہِ طریقت کے احوال پر ثابت قدم رہا اور اس کے لطائف سے بہرہ اندوز ہو کر مستحکم ہوا۔ جسے فصل یعنی جدائی مقدر تھی ہر شائستہ چیز سے نامراد رہا۔ ظاہر داری میں کھو گیا۔ حقیقت سے محجوب رہا۔ اور اسی حجاب نے اسے وصل اور اصل سے محروم کر دیا۔ مشائخ طریقت نے اس بارے میں بہت سے لطیف اور دقیق نکات پیدا کیے ہیں۔ سب کو معرضِ بیان میں لانا محال ہے۔ البتہ چند ایک انشاء اللہ بیان کروں گا تاکہ پڑھنے والے زیادہ استفادہ کر سکیں۔ وَبِاللّٰهِ التَّوْفِيْقُ "اور سب توفیق اللہ کی طرف سے ہے"۔

ص ۳۶/۴۷

ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلصُّوْفِيُّ اِذَا نَطَقَ بَانَ نُطْقُهٗ مِنَ الْحَقَائِقِ وَاِنْ سَكَتَ نَطَقَتْ عَنْهُ الْجَوَارِحُ بِقَطْعِ الْعَلَائِقِ "صوفی وہ ہے کہ جب گفتگو کرے تو اس کی گفتگو سراسر بیانِ حقائق ہو اور جب خاموش ہو تو اس کا عمل اور فعل شارح حال ہو اور اس کے منقطع العلائق یعنی ماسویٰ اللہ سے کٹا ہوا ہونے پر صاد ہو"۔ یعنی وہ کوئی ایسی چیز نہیں کہتا جو اس میں خود موجود نہ ہو۔ اس کا سب کلام اصل کے مطابق ہوتا ہے اور سب کے سب افعال قطع علائق کا مرقع ہوتے ہیں۔ کلام حق اور افعال فقر۔

اور جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلتَّصَوُّفُ نَعْتٌ اُقِيْمَ الْعَبْدُ فِيْهِ قِيْلَ نَعْتٌ لِلْعَبْدِ اَمْ لِلْحَقِّ فَقَالَ نَعْتُ الْحَقِّ حَقِيْقَتُهٗ وَنَعْتُ الْعَبْدِ رَسْمٌ "یعنی تصوف ایک وصف ہے جس میں

آدمی کا قیام ہے لوگوں نے کہا وصف خدا کا یا انسان کا؟ حضرت جنیدؒ نے کہا اس کا اصل تو خدا کا وصف ہے ظاہری قیام وصف انسانی ہے۔ مطلب یہ کہ تصوّف کا اصل انسانی صفات کی فنا ہے جو باری تعالیٰ کی صفات کے دوام سے واقع ہوتی ہے۔ اور اس لیے تصوّف وصفِ خدا تعالیٰ ہے گو رسمی طور پر تصوّف آدمی سے مستقل مجاہدۂ نفس طلب کرتا ہے اور یہ استقلالِ مجاہدہ انسانی وصف ہے۔ اسی مطلب کو دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ حقیقی توحید میں انسانی صفات کا کلّی فقدان ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ مستقل نہیں ہوتے اور ان کا ہونا محض رسمی ہوتا ہے ان کو دوام نہیں کیونکہ باری تعالےٰ ان کا خالق ہے اور وہی ان کا مالک ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ مثلاً حق تعالیٰ نے بندہ کو روزہ کا حکم دیا اور روزہ دار کو صائم کا نام دیا۔ رسماً اگرچہ روزہ انسان کا ہے مگر حقیقتاً خدا کا۔ چنانچہ باری تعالیٰ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ۔ "روزہ میرا ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا۔" اس کی تمام مخلوق اسی کی ملکیت ہے۔ انسان کے ساتھ کسی چیز کی نسبت رسمی ہوتی ہے حقیقی نہیں۔

ص ۳۶/۴۸

ابو الحسن نوریؒ نے فرمایا اَلتَّصَوُّفُ تَرْکُ کُلِّ حَظِّ النَّفْسِ "تصوّف ہر قسم کے حظِّ نفس سے دستبرداری کا نام ہے۔" یہ دو طرح ہے رسماً اور حقیقتاً۔ مثلاً اگر کوئی ترکِ حظ کرے اور وہ ترک میں بھی حظ محسوس کرے یہ رسم ہے اگر حظ خود اسے ترک کر دے تو یہ حظ کی فنا ہے اور عینِ مشاہدہ ہے۔ ترکِ حظ انسان کا فعل ہے اور فنائے حظ خدائے تعالیٰ کا۔ انسانی فعل رسم ہے اور خدائے مطلق کا فعل حقیقت۔ حضرت نوریؒ کا یہ قول جنیدؒ کے محولہ بالا قول کی تشریح کرتا ہے۔ ابو الحسن نوریؒ نے یہ بھی کہا: اَلصُّوْفِیَّۃُ ھُمُ الَّذِیْنَ صَفَتْ اَرْوَاحُھُمْ فَصَارُوْا فِی الصَّفِّ الْاَوَّلِ بَیْنَ یَدَیِ الْحَقِّ۔ "صوفی وہ ہیں جن کی روحیں بشریت کی کثافت سے پاک اور آفتِ انسانی سے صاف ہوں جو ہوا و ہوس سے آزاد ہوں اور صف اوّل میں اور درجۂ اعلیٰ پر حق آرمیدہ اور از خلق رمیدہ ہوں۔ اور نوریؒ نے نیز کہا:

ص ۳۷/۴۹

الصُّوْفِی الَّذِیْ لَا یَمْلِکُ وَلَا یُمْلَکُ "صوفی وہ ہے جو کسی چیز کا مالک نہ ہو اور کوئی چیز اس کی مالک نہ ہو۔ اس کا مطلب عین فنا ہے۔ فانی صفت والا نہ مالک ہے نہ مملوک۔ کیونکہ ملکیت کا اطلاق موجودات پر ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ صوفی متاعِ دنیا اور زینتِ عقبیٰ کی کسی چیز کو قبضۂ اختیار میں نہیں لیتا اور خود کو اپنے نفس کی ملکیت اور محکوم نہیں سمجھتا۔ وہ دوسروں پر حکمرانی نہیں کرتا تاکہ کوئی دوسرا اسے محکوم نہ سمجھے۔ صوفیاء کے اس قول میں ایک نکتہ کی طرف اشارہ ہے جسے فنائے کلّی کہتے ہیں۔ ہم اس سے متعلق انشاء اللہ آئندہ کچھ تحریر کریں گے تاکہ یہ چیز واضح ہو جائے کہ

اس میں کیا غلطی سرزد ہوئی ہے۔

ابنِ جلاّ کہتے ہیں: اَلتَّصَوُّفُ حَقِیْقَۃٌ لَا رَسْمَ لَہٗ "تصوف حقیقت ہے اور اس میں کوئی رسم نہیں"۔ کیونکہ رسم انسانی وصف ہے۔ اور انسانی معاملات سے متعلق ہے اور حقیقت باری تعالیٰ کے لیے ہے۔ چونکہ تصوف انسانی دنیا سے منہ پھیرنے کا نام ہے اس میں رسم کو دخل نہیں۔ ابو عمرو دمشقی کہتے ہیں: اَلتَّصَوُّفُ رُؤْیَۃُ الْکَوْنِ بِعَیْنِ النَّقْصِ بَلْ غَضُّ الطَّرْفِ عَنِ الْکَوْنِ "تصوف کارگاہِ حیات کو ناقص دیکھنا ہی نہیں بلکہ کارگاہِ حیات سے آنکھیں پھیر لینے کا نام ہے۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی اوصاف فنا ہو جاتے ہیں کیونکہ آنکھیں اشیائے عالم کو دیکھتی ہیں اور جب اشیائے عالم سے منہ پھیر لیا تو گویا آنکھیں اور قوتِ بینائی کا وصف بھی غائب ہو گیا/ جب ظاہر سے آنکھیں بند کر لی جائیں تو روحانی بصارت قائم رہتی ہے۔ اپنی ذات کو نظرانداز کرنے والا نگاہِ حق سے دیکھتا ہے/ عالمِ ظاہر کا نظارہ کرنے والا دراصل اپنی ذات کی تلاش کرتا ہے۔ اس کا فعل اپنا ہوتا ہے اور محض اپنی کارکردگی کا اظہار کرتا ہے۔ وہ کسی حالت میں بھی اپنی ذات سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اپنی خامی تو نظر آتی ہے مگر وہ آنکھیں بند کر لیتا ہے اور نہیں دیکھتا/ بہر کیف آنکھ ایک پردہ ہے اور نظر ہی محجوب رکھتی ہے۔ برخلاف اس کے عالمِ ظاہر کو نہ دیکھنے والا دیکھتا تو نہیں مگر حجاب میں بھی نہیں ہوتا۔ یہ ایک اہلِ طریقت اور اربابِ معانی کا مسلّمہ اصول ہے مگر یہاں اس کی تشریح کی ضرورت نہیں۔

ص ۳۸/۵۰

ابوبکر شبلیؒ فرماتے ہیں: اَلتَّصَوُّفُ شِرْکٌ لِاَنَّہٗ صِیَانَۃُ الْقَلْبِ عَنْ رُؤْیَۃِ الْغَیْرِ وَلَا غَیْرَ "تصوف شرک ہے کیونکہ یہ غیر کو دیکھنے سے دل کو بچانے کا نام ہے اور غیر اللہ کا کوئی وجود ہی نہیں"۔ بالفاظ دیگر اثباتِ توحید میں غیر کا تخیّل شرک ہے۔ غیر اللہ کا تصوّر دل میں کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ اور جب یہ صورت ہے تو غیر کے تخیّل سے دل کو محفوظ رکھنے کی کوشش بے معنیٰ ہے

حصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلتَّصَوُّفُ صَفَاءُ السِّرِّ مِنْ کُدُوْرَۃِ الْمُخَالَفَۃِ "تصوف دل اور سِرِّ حق کو مخالفت کی کدورت سے محفوظ رکھنے کا نام ہے"۔ مطلب یہ ہے کہ دل کو مخالفتِ حق سے بچائے کیونکہ دوستی موافقت کا نام ہے اور موافقت ضد مخالفت ہے۔ دوست اس عالم میں ہمیشہ فرمانِ دوست کے تابع ہوتا ہے جب ہم آہنگی ہو تو مخالفت کا کیا کام۔

محمد بن علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم نے فرمایا: اَلتَّصَوُّفُ خُلُقٌ فَمَنْ زَادَ عَلَیْکَ فِی الْخُلُقِ زَادَ عَلَیْکَ فِی التَّصَوُّفِ۔

"تصوّف نیک خوئی و خوش اخلاقی ہے۔ جو زیادہ نیک خو ہو وہ زیادہ صوفی ہوتا ہے"۔ نیک خوئی کی دو صورتیں ہیں۔ خدا کے ساتھ اور بندوں کے ساتھ۔ خدا کے ساتھ نیک خوئی اس کے احکام کی پابندی ہے۔ بندوں کے ساتھ نیک خوئی یہ ہے کہ صرف خدا کے لیے ان سے میل جول برقرار رکھا جائے۔ یہ دونوں صورتیں طالب سے متعلق ہیں۔ کیونکہ باری تعالیٰ کی ذات اقدس انسانی فرمانبرداریوں یا انسانی برگشتگی سے بے نیاز ہے اور دونوں کا انحصار توحید خداوندی کے عرفان پر ہے۔

ص ۳۸/۵۱ مرتعش رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: اَلصُّوْفِیُّ لَا یَسْبِقُ هِمَّتُهٗ خُطْوَتَهٗ اَلْبَتَّةَ "صوفی وہ جس کی فکر اس کے قدم کے ساتھ لامحالہ برابر ہو"۔ مطلب یہ کہ ہر چیز حاضر ہو۔ جہاں تن ہو وہیں دل ہو اور جہاں دل ہو وہیں تن ہو۔ جہاں قول ہو وہیں پر قدم ہو اور جہاں قدم ہو وہیں پر قول ہو۔ یہ حضوری بلاغیبت ہے۔ اس کے برعکس بعض کہتے ہیں کہ صوفی اپنی ذات سے غائب اور حضورِ حق میں حاضر ہوتا ہے۔ یہ درست نہیں۔ وہ اپنی ذات میں بھی حاضر ہوتا ہے اور حضورِ حق میں بھی۔ ویسے اس قول کا مطلب جمع الجمع یعنی مکمل وصل ہے کیونکہ جب تک اپنا احساس موجود ہو اپنی ذات سے غائب ہونا ناممکن ہے۔ اپنا احساس مٹ جائے تو حضورِ حق حاصل ہوتا ہے۔ ان معنوں میں یہ قول خصوصیت سے شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے قول سے ملتا ہے جنہوں نے کہا: اَلصُّوْفِیُّ لَا یَرٰی فِی الدَّارَیْنِ مَعَ اللّٰهِ غَیْرَ اللّٰهِ "صوفی وہ جو دو جہان میں بجز ذاتِ خدا کسی چیز کو نہ دیکھے"۔ مختصر یہ کہ انسان کی ہستی غیر ہے اور جب وہ کسی غیر کو نہیں دیکھتا تو گویا اپنی ذات کو نہیں دیکھتا اور اس کا احساس بالکل خالی ہو جاتا ہے چاہے اس کی نفی کی جائے یا اثبات۔

اور جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اَلتَّصَوُّفُ مَبْنِیٌّ عَلٰی ثَمَانِ خِصَالٍ (۱) اَلسَّخَاءُ (۲) وَالرِّضَاءُ (۳) وَالصَّبْرُ (۴) وَالْاِشَارَةُ (۵) وَالْغُرْبَةُ (۶) وَلَبْسُ الصُّوْفِ (۷) وَالسِّیَاحَةُ (۸) وَالْفَقْرُ۔ اَمَّا السَّخَاءُ فَلِاِبْرَاهِیْمَ وَاَمَّا الرِّضَاءُ فَلِاِسْمٰعِیْلَ وَاَمَّا الصَّبْرُ فَلِاَیُّوْبَ وَاَمَّا الْاِشَارَةُ فَلِزَکَرِیَّا وَاَمَّا الْغُرْبَةُ فَلِیَحْیٰی وَاَمَّا لَبْسُ الصُّوْفِ فَلِمُوْسٰی وَاَمَّا السِّیَاحَةُ فَلِعِیْسٰی وَاَمَّا الْفَقْرُ فَلِمُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَعَلَیْهِمْ اَجْمَعِیْنَ۔ یعنی تصوّف کی بنا آٹھ خصایل پر ہے جو آٹھ پیغمبروں کی اقتدا ہے۔ سخاوت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کہ انہوں نے اپنے بیٹے کو فدا کیا۔ رضا میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کہ انہوں نے برضائے

ص ۳۹/۵۲ خداوندی اپنی جانِ عزیز کو پیش کیا۔ صبر میں حضرت ایوب علیہ السلام کہ انہوں نے غیرتِ خداوندی پر صبر کیا اور

کیڑوں کی مصیبت برداشت کی۔ اشارت میں حضرت زکریا علیہ السلام کہ جن کے لیے باری تعالیٰ نے فرمایا: اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا "تین دن لوگوں سے بات مت کرو مگر اشارے سے"۔ اور نیز فرمایا: اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا "جب اس نے اپنے رب کو چپکے سے پکارا"۔ غربت میں یحییٰ علیہ السلام کہ وہ اپنے وطن میں بھی اپنوں سے بے گانہ تھے۔ صوف پوشی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کہ ان کا تمام لباس اون کا تھا۔ سیر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہ وہ راہِ خدا میں اتنے مجرد اور تنہا تھے کہ سامانِ زندگی میں سے صرف پیالہ اور کنگھی رکھتے تھے اور جب دیکھا کہ ایک آدمی ہاتھ سے پانی پی رہا ہے تو پیالہ پھینک دیا اور جب دیکھا کہ ایک شخص انگلیوں سے بال درست کر رہا ہے تو کنگھی بھی پھینک دی۔ فقر میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ اللہ جل شانہٗ نے روئے زمین کے سب خزانوں کی چابیاں عطا فرمائیں اور حکم دیا کہ محنت و مشقت چھوڑ کر شان و شوکت سے بسر کرو مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کی کہ باری تعالیٰ میں خزانے نہیں چاہتا۔ مجھے ایک روز سیر ہو کر کھانے کو دے اور دوسرے روز بھوکا رکھ۔ یہ اصول راہ طریقت میں بہترین ہے۔

حصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اَلصُّوْفِيُّ لَا يُوْجَدُ بَعْدَ عَدَمِهٖ وَلَا يَعْدِمُ بَعْدَ وُجُوْدِهٖ "صوفی وہ ہے جس کی فنا کو ہست نہیں اور جس کی ہست کو فنا نہیں"۔ یعنی جو اسے حاصل ہو وہ اسے کھوتا نہیں اور جو اس کا کھو جائے اسے حاصل نہیں کرتا۔ بالفاظ دیگر اس کی یافت نایافت نہیں ہوتی اور نایافت کبھی یافت نہیں بنتی۔ یا اثبات بلا نفی ہو گی یا نفی بلا اثبات۔ ان تمام اقوال کا لب لباب یہ ہے کہ صوفی تمام عوارضاتِ انسانی سے بری ہوتا ہے اس کے جسمانی احساسات ختم ہو جاتے ہیں اس کے تعلقات ہر چیز سے منقطع ہوتے ہیں یہاں تک کہ راز بشریت نمایاں ہو جاتا ہے اور اس کی اصلیتِ ذات مجتمع ہو جاتی ہے اور وہ اپنی ذات میں اپنے آپ قائم ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال دو پیغمبروں میں نمایاں نظر آتی ہے۔ ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام جن کی حضوری میں کبھی انقطاع نہیں آیا چنانچہ انہوں نے کہا: رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ "اے اللہ میرے سینے کو فراخ فرما"۔ دوسرے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم جن کی توحید میں ذرہ برابر کمی نہ تھی۔ چنانچہ ان سے کہا گیا: اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ "کیا ہم نے آپ کے سینے کو فراخ نہیں کیا"۔ ایک طرف آرائش و زینت طلب کی گئی دوسری طرف بلا درخواست آراستگی عطا فرمائی گئی۔

ص ۴۰ / ۵۳

علی بن بندار الصیرفی النیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلتَّصَوُّفُ اِسْقَاطُ الرُّؤْیَۃِ لِلْحَقِّ ظَاھِرًا وَّبَاطِنًا "صوفی وہ ہے جو ہر ظاہر و باطن سے بے نیاز ہمیشہ چشم بحق ہو۔" چنانچہ اگر تو ظاہر کو دیکھے تو رحمت حق کے آثار تو نظر آئیں گے مگر جملہ آثار رحمت حق کے سامنے مچھر کے پر کے برابر بھی معلوم نہیں ہوں گے اور لامحالہ تو ظاہر سے رو گرداں ہو جائے گا۔ اس طرح اگر تو باطن پر نظر کرے تو امدادِ حق کے نشانات تو نظر آئیں گے۔ مگر امدادِ حق کے مقابل یہ نشانات ایک دانے کے برابر قیمت نہیں رکھتے لامحالہ تو باطن سے بھی منہ پھیرے گا اور تجھ پہ روشن ہو جائے گا کہ ہر چیز کی مالک حق تعالے کی ذاتِ پاک ہے اور یہ ادراک ثابت کر دے گا کہ تو خود کچھ بھی نہیں۔

محمد بن احمد المقری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: اَلتَّصَوُّفُ اِقَامَۃُ الْاَحْوَالِ مَعَ الْحَقِّ "تصوف باری تعالیٰ کے ساتھ اقامتِ حال کا نام ہے" یعنی حالات صوفی کو اس کے حال سے برگشتہ نہیں کر سکتے اور غلط راستے پر نہیں ڈال سکتے۔ کیونکہ جس کا دل خالقِ حالات سے وابستہ ہو اسے حالات مقام استقامت سے نہیں ہٹا سکتے اور وہ راہِ حق سے نہیں بھٹک سکتا۔

فصل

معاملات سے متعلق اقوال میں ابو حفص حدّاد نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے: اَلتَّصَوُّفُ کُلُّہٗ اٰدَابٌ لِکُلِّ وَقْتٍ اَدَبٌ وَّلِکُلِّ مَقَامٍ اَدَبٌ وَّلِکُلِّ حَالٍ اَدَبٌ فَمَنْ لَزِمَ اٰدَابَ الْاَوْقَاتِ بَلَغَ مَبْلَغَ الرِّجَالِ وَمَنْ ضَیَّعَ الْاٰدَابَ فَھُوَ بَعِیْدٌ مِّنْ حَیْثُ یَظُنُّ الْقُرْبَ وَمَرْدُوْدٌ مِّنْ حَیْثُ یَظُنُّ الْقَبُوْلَ "تصوف مکمل ادب ہے، ہر وقت مقام اور حال کے لیے ادب ہے، جو کوئی اوقات کے ادب کو مدنظر رکھے وہ مقام آدمیت پر سرفراز ہوتا ہے اور جو ادب کو ضائع کرے وہ نزدیکی اور قبولیت سے دور جا پڑتا ہے اور مردود ہو جاتا ہے۔" یہ قول ابوالحسن نوری کے قول سے قریب ہے کہ انہوں نے کہا: لَیْسَ التَّصَوُّفُ رُسُوْمًا وَّلَا عُلُوْمًا وَّلٰکِنَّہٗ اَخْلَاقٌ "تصوف رسوم و علوم نہیں بلکہ اخلاق ہے۔ اگر رسوم میں داخل ہوتا تو مجاہدہ سے حاصل ہو جاتا اگر علوم کا حصّہ ہوتا تو تعلیم سے میسّر آ جاتا۔ یہ فی الحقیقت اخلاق میں شامل ہے۔ جب تک تو اپنے اندر تلاش نہ کرے جب تک اس کے معاملات کو تو خود ٹھیک نہ کرے اور خود اس کا انصاف نہ کرے ہرگز دستیاب نہیں ہو سکتا۔ رسوم اور اخلاق میں فرق یہ ہے کہ رسم ظاہر دار کا عمل ہوتا ہے جو کسی مقصد کے پیشِ نظر ظہور پذیر ہوتا ہے۔ حقیقت سے خالی ہوتا ہے اور اس کی صورت اور اصلیت میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اخلاق میں وہ عمل شامل ہیں جو قابلِ تعریف ہوتے ہیں اور ان میں کوئی ظاہر داری مقصد یا فریب نہیں ہوتا۔ ان کی صورت

اور اصلیت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

ص ۴۱/۵۵ مرتعش رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اَلتَّصَوُّفُ حُسْنُ الْخُلُقِ "تصوف نیک خلق کا نام ہے" یہ تین طرح ہے۔ پہلے یہ کہ احکامِ خداوندی کو بغیر ریا اور نمائش کے پورا کرے۔ دوسرے خلقت میں بڑوں کی عزت کرے، چھوٹوں کے ساتھ محبت سے پیش آئے اور برابر کے لوگوں سے انصاف برتے اور کسی سے عوض و معاوضہ کی توقع نہ رکھے۔ تیسرے خود ہوا و ہوس اور شیطانی رجحانات سے پرہیز کرے۔ یہ تینوں امور درست ہو جائیں تو انسان نیک خو ہے۔ یہ جو کچھ بیان ہوا وہی ہے کہ کسی نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ اخلاقِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کچھ ارشاد فرمائیں تو حضرت عائشہ رض نے فرمایا قرآن پڑھو۔ خدا نے اس میں فرمایا ہے: خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ "معاف کرنے کی خصلت اختیار کریں۔ اچھی بات کا حکم دیں اور جاہلوں سے کنارہ کش رہیں"۔ مرتعش رحمۃ اللہ علیہ نے نیز فرمایا: هٰذَا مَذْهَبٌ كُلُّهُ جِدٌّ فَلَا تَخْلِطُوهُ بِشَيْءٍ مِنَ الْهَزْلِ "یہ کوشش اور سوچ بچار کا راستہ ہے اس میں ہزل اور مسخرے پن کو شامل نہ کرو"۔ ظاہر پرستوں کے پیچھے نہ لگو اور ان کی کورانہ تقلید کرنے والوں سے پرہیز کرو۔ جب عام لوگ ان ظاہر پرستوں کو ناچتے گاتے دیکھتے ہیں یا جب وہ ان عوام کو درباروں میں نوازشات اور طعام کے نوالوں پر لڑتے نظر آتے ہیں تو عوام تمام اولیائے کرام سے بد عقیدہ ہو جاتے، سب کو موردِ الزام قرار دیتے اور کہتے ہیں کہ یہ ہے تصوّف اور یہ ہیں تصوف کے اصول۔ پہلے زمانے کے صوفیائے کرام بھی اسی قسم کے ہوں گے۔ کہنے والوں نے یہ سمجھنے کی کوشش نہ کی کہ وقت فتنہ ہے اور زمانہ آفات کا گھر۔ حرص بادشاہ کو ظلم پر آمادہ کر دیتا ہے۔ طمع ایک عالم کو بدکاری و زنا میں ڈال دیتا ہے۔ ریا زاہد کو منافقت کی راہ دکھاتی ہے۔ اسی طرح ہوس و ہوا

ص ۴۲/۵۶ صوفیاء کو رقص و سرود میں ڈال دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے اہل طریقت برباد ہو جاتے ہیں۔ طریقت برباد نہیں ہوتی۔ اسی طرح اگر کچھ لوگ ہزلیات کو پاک و صاف چیزوں میں شامل کر دیں تو پاک و صاف چیزیں ہزل ہو کر نہیں رہ جاتیں۔

ابو علی قزوینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلتَّصَوُّفُ هُوَ الْاَخْلَاقُ الرَّضِيَّةُ "تصوّف اخلاق پسندیدہ کا نام ہے۔ پسندیدہ کار انسان وہ ہے جو ہر حال میں حق تعالیٰ کی پسند پر گامزن ہو۔ اسی کو راضی برضا کہتے ہیں۔

ابوالحسن نوری فرماتے ہیں: اَلتَّصَوُّفُ هُوَ الْحُرِّيَّةُ وَالْفُتُوَّةُ وَتَرْكُ التَّكَلُّفِ وَالسَّخَاءُ وَبَذْلُ الدُّنْيَا

"تصوّف آزادی کا نام ہے۔ اور آزادی ہوس کی قید سے ہوتی ہے۔ فتوّت یا جواں مردی یہ ہے کہ انسان قطع علائق کرے۔ ترکِ تکلّف یہ ہے کہ اپنے متعلقات اور حصے کے لیے کوشاں نہ ہو اور سخاوت یہ ہے کہ دنیا کو اہل دنیا کے لیے چھوڑ دے۔"

ابوالحسن بوشنجہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلتَّصَوُّفُ اَلْیَوْمَ اِسْمٌ وَلَا حَقِیْقَةٌ وَقَدْ کَانَ حَقِیْقَةً وَلَا اِسْمٌ "تصوّف آج کل نام ہے بغیر حقیقت کے اور اصل میں یہ حقیقت ہے بغیر نام کے۔" صحابہ کرامؓ اور سلف رحمہم اللہ کے زمانے میں یہ نام نہیں تھا ایک حقیقت تھی سب پر ساری و طاری آج کل صرف نام ہے بے حقیقت۔ یعنی پہلے معاملہ معروف تھا اور ظاہر داری مجہول۔ اب معاملہ مجہول ہے اور ظاہر داری معروف۔

یہ سب کچھ مشائخ کے اقوال سے تحقیق اسبابِ تصوّف کے متعلق بیان ہوا تاکہ خدا تجھے سعادت دے۔ اور راہِ طریقت تیرے لیے کھل جائے اور تو منکرانِ طریقت سے پوچھ سکے کہ انکارِ تصوّف سے ان کی مراد کیا ہے؟ اگر صرف اسم سے انکار ہے تو خیر اور اگر معنیٰ سے انکار ہے تو اس کا مطلب مکمل شریعتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام اخلاقِ ستودہ کا انکار ہے۔ تجھے خدا وہ سعادت نصیب کرے جو اولیائے کرام کے حصّے میں آتی ہے۔ میں تجھے وصیت کرتا ہوں کہ ان خیالات کی کما حقہٗ پاسداری کر۔ شرطِ انصاف پوری کر۔ مکر و ریا سے پرہیز کر اور صوفیائے کرام پر اعتقاد صاف رکھ۔ وَبِاللّٰهِ التَّوْفِیْقُ "اور سب توفیق اللہ کی طرف سے ہے۔"

ص ۴۲، ۵۱

چوتھا باب

خرقہ پوشی

جان لے کہ خرقہ پوشی اہلِ تصوّف کا شعار ہے اور خرقہ پوشی سنّت ہے اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : عَلَیْکُمْ بِلُبْسِ لِبَاسِ الصُّوْفِ تَجِدُوْنَ حَلَاوَۃَ الْاِیْمَانِ فِیْ قُلُوْبِکُمْ "لباسوں میں تمہارے لیے لباسِ صوف ہے تاکہ تم دلوں میں ایمان کی حلاوت محسوس کرو"۔ نیز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ایک صحابی نے کہا : کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَلْبَسُ الصُّوْفَ وَیَرْکَبُ الْحِمَارَ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لباسِ صوف پہنتے اور گدھے کو سواری کے لیے کام میں لاتے"۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا : لَا تُضَیِّعِی الثَّوْبَ حَتّٰی تُرَقِّعِیْہِ "کپڑا ردّ نہ کر جب تک اس پر پیوند نہ لگ چکے ہوں"۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے پاس خرقہ تھا جس میں تیس ۳۰ پیوند لگے ہوئے تھے۔ اور نیز فرماتے تھے اچھا کپڑا وہ ہے جس کا معاوضہ کم ہو۔ ان کے متعلق ہی مشہور ہے کہ ان کے پیراہن کی آستینیں انگلیوں کے برابر ص ۴۳/۵۸ نہیں۔ اگر کبھی بڑا پیراہن پہننے کا اتفاق ہوتا تھا تو آستینوں کے سرے پھاڑ کر انگلیوں کے برابر کر لیتے تھے۔ رسول علیہ السلام کو خدائے عزّ وجلّ کا حکم آیا : وَثِیَابَکَ فَطَہِّرْ ای فَقَصِّرْ "اپنا لباس پاک کر یعنی مختصر کر۔"

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں میں نے ستّر ۷۰ یارانِ بدر کو دیکھا کہ خرقۂ صوف پہنتے تھے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خلوت میں خرقۂ صوف پہنتے تھے۔ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو کمبل پہنے ہوئے دیکھا جس میں پیوند لگے ہوئے تھے

امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور امیر المومنین حضرت علی کرّم اللہ وجہہ و ہرم بن حیان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اویس قرنی رضی اللہ عنہ کو خرقۂ پشمین میں دیکھا کہ جس پر پیوند لگے ہوئے تھے۔ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ، مالک دینار

اور سفیان ثوری رحمہم اللہ سب خرقہ پوش تھے۔ امام عالم ابو حنیفہ کوفی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے اور یہ روایت محمد بن علی حکیم ترمذی کی کتاب "تاریخ المشائخ" میں درج ہے۔ کہ وہ ابتدا میں خرقہ صوف پہنتے تھے اور عزلت گزیں تھے۔ اسی دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم خواب میں دیکھا۔ انھوں نے فرمایا تجھے عوام میں مل کر رہنا چاہیئے کیونکہ تیرے ذمہ احیائے سنت کا فریضہ ہے۔ امام اعظمؒ نے گوشہ نشینی کو ترک کر دیا۔ مگر کبھی بیش قیمت لباس زیب تن نہیں کیا۔ داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ جو محقق صوفی ہو گذرے ہیں خرقہ صوف پہنتے تھے۔ ابراہیم ادھمؒ امام اعظمؒ کے پاس پیوند دار خرقہ صوف پہن کر آئے۔ اہل محفل نے حقارت اور بے قدری کی نظر سے دیکھا۔ امام اعظمؒ نے فرمایا یہ ہمارا سردار ابراہیم ادھم ہے۔ حاضرین نے کہا آپ کبھی مذاق نہیں کرتے۔ ابراہیم کو سرداری کس طرح ملی؟ حضرت امامؒ نے فرمایا مستقل بندگی سے۔ وہ ہمیشہ بندگیٔ حق میں مصروف رہا اور ہم بندگیٔ نفس میں۔ یہاں تک کہ وہ ہمارا سردار ہو گیا۔

اگر اس زمانے میں کچھ لوگ خرقہ پہنتے ہیں۔ اور اپنی عادات میں پاکیزہ نظر آتے ہیں مگر ان کا مقصد صرف جاہ طلبی اور شہرت پسندی ہے۔ ان کا باطن ظاہر سے مختلف ہے تو ممکن ہے انبوہ کثیر میں مردِ حق بھی ہو۔ ہر جماعت میں صحیح مقتدی کم ہی ہوا کرتے ہیں۔ اور عام لوگوں کی نظر میں تو ہر وہ شخص صوفی ہو جاتا ہے جس میں کوئی ایک علامت بھی صوفی ہونے کی موجود ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ" جو کسی قوم سے مشابہت رکھے وہ اسی قوم میں شامل سمجھا جاتا ہے۔" مگر کچھ لوگ صرف رسومِ ظاہری پر نظر رکھتے ہیں اور کچھ صفائے باطن کو پرکھتے ہیں۔

تصوف کے طالب چار گروہوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں:

۱۔ وہ لوگ جو صوفیا کے صفائے باطن۔ لطافتِ طبع۔ اعتدالِ مزاج اور خوبیٔ کردار سے متاثر ہو کر ان میں شامل ہوتے ہیں۔ محقق اہل تصوف کا قرب اور ان کے مدارج دیکھتے ہیں اور یہ امید لے کر بڑھتے ہیں کہ ان کو بھی مقام نصیب ہو ان کی ابتدا کشفِ احوال۔ ترکِ خواہشات اور مجاہدۂ نفس سے ہوتی ہے۔

۲۔ وہ لوگ جن کی درستیٔ تن۔ سکونِ قلب اور صحتِ دل انہیں اہلِ تصوف کے حالاتِ ظاہر کو دیکھنے کی توفیق عطا کرے اور وہ یہ دیکھیں کہ صوفیا پابندِ شریعت ہیں آدابِ اسلام کے پابند ہیں اور خوبیٔ معاملات سے آراستہ ہیں۔ ان کے

ص ۴۴

دل میں اقتدار کا شوق پیدا ہوا اور وہ راہِ حق اختیار کریں ان کی ابتدا مجاہدہ اور خوبیٔ عادات سے ہوتی ہے۔

۳۔ وہ لوگ جو انسانیت۔ اخلاق حسنہ اور سلامتیٔ طبع کے زیرِ اثر صوفیائے کرام کے افعال کا مطالعہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ کیسے بڑوں کا ادب کرتے ہیں۔ چھوٹوں پر شفقت کرتے ہیں اور برابر کے لوگوں کو دوست سمجھتے ہیں۔ نیز وہ کس طرح دنیوی منفعت کے خیالات سے کوئی تاثر نہیں لیتے اور ہمیشہ اس چیز سے مطمئن رہتے ہیں جو ان کو میسّر ہو۔ یہ لوگ صوفیا کی انجمن میں باریابی حاصل کرتے ہیں اور دنیا کی تمناؤں کے سنگلاخ راستوں کی دشواریاں آسان کرتے ہوئے اخیار اور نیکوکاروں میں شامل ہو جاتے ہیں۔

۴۔ وہ لوگ جن کی حماقت اور روحانی کمزوری جن کی حبِ مرتبہ بغیر استطاعت کے اور خواہش عظمت بغیر علم کے ان کو اس مغالطہ میں مبتلا کر دیتی ہے کہ صوفیا کرام کا ظاہر ہی سب کچھ ہے۔ جب کبھی وہ صوفیا کی انجمن میں آتے ہیں تو انہیں مدارات اور رواداری کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ حالانکہ صوفیاء کو علم ہوتا ہے کہ یہ لوگ حق نا آشنا ہیں اور کبھی سالکِ طریقت ہونے کی کوشش نہیں کرتے۔ عام لوگ ان کی توقیر کرتے ہیں گویا کہ وہ فی الحقیقت اولیاء اللہ ہیں۔ در اصل ان کا مقصد صوفیاء کا لباس پہن کر اپنی کج اندامی کو چھپانا ہوتا ہے۔ ان کی مثال کتابوں سے لدے ہوئے گدھے کی سی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ۭ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۔

آج کل ایسے لوگوں کی کثرت ہے۔ لازم یہ ہے کہ جو کچھ یہ کرتے ہیں۔ اس سے پرہیز کیا جائے۔ قبولِ طریقت کی ہزار کوشش کے باوجود یہ ضروری نہیں کہ طریقت تجھے قبول کرے کیونکہ اس کے لیے سوزِ دروں کی ضرورت ہے خرقہ پوشی کی نہیں راز آشنا کے لیے قبائے درویشی عبا کے برابر ہے۔ جسے طریقت اپنا لیتی ہے اس کی قبا گویا عبا ہے۔ بیگانہ راہ کے لیے خرقۂ صوف بدبختی کا فرمان اور روزِ قیامت کی شقاوت کا اعلان ہوتا ہے۔ ایک پیرِ بزرگ سے پوچھا گیا: لِمَ لَا تَلْبَسُ الْمُرَقَّعَۃَ؟ قَالَ مِنَ النِّفَاقِ اَنْ تَلْبَسَ لِبَاسَ الْفِتْيَانِ وَلَا تَدْخُلَ فِيْ حَمْلِ اَثْقَالِ الْفُتُوَّةِ۔ "آپ خرقہ کیوں نہیں پہنتے؟ انہوں نے جواب دیا۔ یہ فریب کاری ہے کہ صوفیاء کا لباس تو پہن لیا جائے مگر تصوّف کا بوجھ اٹھانے کی ہمت نہ ہو۔" پس اگر اس لباس کا مقصد یہ ہے کہ باری تعالیٰ کے سامنے کوئی خاصانِ حق میں شمار ہو تو یہ کج فہمی ہے۔ کیونکہ اس کی ذاتِ پاک لباس کی قید کے بغیر بھی سب کچھ جانتی ہے۔ اگر لوگوں میں نمائش مدِ نظر ہے تو سچے ہونے کی صورت میں ریاکاری ہے اور جھوٹے

ص ۲۵/۶۱

ہونے کی صورت میں منافقت۔ یہ راہ بڑی دشوار اور پُرخطر ہے۔ معرفتِ حق کا مقام لباس ظاہری سے بہت اونچا ہے۔
اَلصَّفَا مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی اِنْعَامٌ وَاِکْرَامٌ وَالصُّوْفُ لِبَاسُ الْاَنْعَامِ "صفا انعام و اکرام خداوندی ہے اور اُونی کپڑا
چوپایوں کا لباس ہے"۔ پس لباس فریب کاروں کے لیے فریب ہو کر رہ جاتا ہے۔ کچھ لوگ صوفیاء کی قربت تلاش
کرتے ہیں اور بظاہر ان کی صورت اختیار کر لیتے ہیں صرف اس خیال سے کہ دنیا ان کو صوفیائے کرام میں شامل سمجھے
مشائخ طریقت اپنے مریدوں کو خرقہ پوشی کی تلقین کرتے رہے ہیں اور خود خرقہ پوشی اختیار کرتے رہے ہیں۔ مقصد یہ تھا
کہ وہ مخلوق میں ممتاز رہیں اور لوگ ان کی پاسبانی کریں۔ اگر ان کا ایک قدم بھی خلاف اٹھے تو ہر طرف سے طعن و ملامت
شروع ہو جائے۔ اگر وہ اپنے لباس میں رہ کر گناہ کرنا چاہیں تو لوگوں کی شرم کے باعث نہ کر سکیں۔ الغرض خرقہ اولیائے
حق کے لیے زینت ہے۔ عوام اس سے عزت حاصل کرتے ہیں اور خواص ذلّت۔ عوام کی عزت یہ ہے کہ جب وہ
خرقہ پوش ہوں تو لوگ ان کی عزت کریں۔ خواص کی ذلّت یہ ہے کہ لوگ انہیں خرقہ پوش دیکھ کر عوام کی طرح خیال
کریں اور انہیں قابلِ ملامت سمجھیں۔ پس عوام کے لیے خرقہ نعمت ہے اور خواص کے لیے مصائب کے خلاف جوشن
یعنی زرہ بکتر ہے۔ عوام میں سے اکثر مضطرب ہوتے ہیں کیونکہ ان کا ہاتھ کسی اور چیز پر نہیں پڑتا اور نہ کوئی جاہ و مرتبہ
حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے وہ لباس صوف کو دولت جمع کرنے کا آلہ بنا لیتے ہیں۔ خواص ترکِ ریاست کرتے ہیں ذلّت
کو عزت پر ترجیح دیتے ہیں اور بلا کو نعمت کے مقابلہ میں اختیار کرتے ہیں۔ اَلْمُرَقَّعَۃُ قَمِیْصُ الْوَفَاءِ لِاَھْلِ الصَّفَاءِ
وَسِرْبَالُ السُّرُوْرِ لِاَھْلِ الْغُرُوْرِ "خرقہ لباسِ وفا ہے اہلِ صفا کے لیے اور جامہ سُرور ہے اہلِ غرور کے لیے"۔ ص ۴۶/۶۲
اہلِ صفا لباس صوف پہن کر دو جہان سے علیحدہ اور سامانِ جہان سے منقطع ہو جاتے ہیں۔ اہلِ غرور اس طرح حق سے محجوب
اور نیکی سے دور ہو جاتے ہیں۔ الغرض ہر ایک کے لیے نیکی کی ایک جہت اور کامیابی کا ایک سبب ہے۔ اور ان کی
مراد اس سے ایک خاص شے ہے جو ایک کے لیے صفا اور پاکیزگی ہے، دوسرے کے لیے عطا اور بخشش خداوندی اور
تیسرے کے لیے غطا اور پردۂ حجاب۔ درویشوں کو امید ہوتی ہے کہ باہمی حسن صحبت اور محبت سے تمام کی نجات
ہو گی۔ کیونکہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ اَحَبَّ قَوْمًا فَھُوَ مِنْھُمْ "جو کسی گروہ سے محبت کرے وہ اسی
گروہ میں شمار ہوتا ہے"۔ کسی جماعت سے محبت کرنے والے قیامت کے دن اسی جماعت میں ہوں گے، مگر
ضرورت اس بات کی ہے کہ دل سے طلبِ حق کرے اور رسومِ ظاہری سے دور رہے کیونکہ جو ظاہر میں الجھ کر

رہ جاتا ہے کبھی حقیقت کو نہیں پہنچ سکتا۔ آدمیت کا وجود ربوبیت کا حجاب ہے اور حجاب حال و مقام کے حصول کے
بغیر ختم نہیں ہوتا۔ حجاب ختم ہونے کا نام ہی صفا ہے۔ فانی صفت کے لیے کوئی لباس اختیار کرنا محال ہے اور اپنے آپ کو
بہ تکلف آراستہ کرنا ناممکن ہے۔ دوسرے لفظوں میں جب صفتِ فنا پیدا ہو جائے اور اندرونی آفات سے نجات مل جائے تو صوفی
کہلانا یا نہ کہلانا برابر ہے۔

خرقہ یا پیوند والے لباس کی شرط یہ ہے کہ اس کا مقصد صرف سہولت اور ہلکا پن ہو۔ جہاں کہیں سے کپڑا پھٹ جائے
وہاں پیوند لگائے۔ مشائخ رضی اللہ عنہم کے اس بارے میں دو[2] قول ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ پیوند لگانے میں کسی
ترتیب کی ضرورت نہیں جہاں سے سوئی گذرے پیوند لگا لینا چاہیے اور اس میں تکلف نہیں کرنا چاہیے۔ دوسرے گروہ کے
مطابق پیوند لگانے میں ترتیب اور قاعدہ کی شرط ہے۔ ترتیب کو مدِ نظر رکھنا اور صحیح انداز میں تکلف کرنا معاملاتِ فقر
میں شامل ہے اور معاملے کی درستی اصل درستی کی دلیل ہے اور میں نے کہ علی ابن عثمان الجلابی ہوں طوس میں حضرت ابوالقاسم
گرگانی رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا کہ درویش کے لیے کم از کم کس چیز کی ضرورت ہے جس کے باعث لفظِ فقر کے لیے
اسے سزاوار سمجھا جائے۔ فرمایا تین چیزیں جن میں کمی نہیں ہو سکتی۔ اوّل یہ کہ اُسے معلوم ہو کہ صحیح پیوند کس طرح لگایا جاتا
ہے۔ دوئم یہ کہ صحیح بات کو کیسے جانا جاتا ہے۔ سوئم یہ کہ صحیح قدم کس طرح اٹھایا جاتا ہے۔ جب یہ بات ہو رہی تھی
تو درویشوں کا ایک گروہ میرے ساتھ موجود تھا۔ جب اُٹھ کر باہر آئے تو ہر شخص بجائے خود گرگانیؒ کے قول میں
تصرف کر رہا تھا۔ جہلاء کی ایک جماعت کو یہ تشریح پسند آئی کہ فقر صرف اس قدر ہے کہ پیوند لگانے میں مہارت
ہو۔ زمین پر سیدھا پاؤں مارنے کی مشق ہو اور یہ گمان ہو کہ صاحبِ فقر حقائقِ طریقت کو سمجھنے کی قابلیت رکھتے
ہیں۔ مجھے اس سردار یعنی گرگانیؒ سے قلبی تعلق تھا اور میں یہ گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ ان کی کہی بات کی بے قدری ہو
میں نے کہا آؤ مل کر اس معاملے پر بات چیت کریں اور ہر شخص اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ جب میری باری آئی تو
میں نے کہا کہ صحیح پیوند وہ ہوتا ہے جو فقر کے لیے لگایا جائے زینت کے لیے نہیں جو پیوند فقر کے لیے لگایا جاتا
ہے وہ سیدھا ہوتا ہے چاہے بظاہر سیدھا معلوم نہ ہو۔ صحیح بات وہ ہوتی ہے جو خلوصِ دل سے کی جائے نہ کہ وہ
جو اکراہ و جبر سے ہو۔ اس پر طیبِ خاطر سے عمل کیا جائے نہ سبک سری سے اور اسے دل و جان سے سمجھا جائے نہ
استدلال سے۔ صحیح قدم وہ ہے جو عالمِ وجد میں اٹھایا جائے اور اس میں کھیل تماشے کا شائبہ نہ ہو۔ بعض لوگوں نے یہ

ص ۴۷/۴۸

ص ۴۸/۶۵

بات گرگانی رحمہ تک پہنچائی انہوں نے فرمایا: "اَصَابَ عَلِیٌّ خَیَّرَہُ اللّٰہُ" اللہ علی کو نیکی دے اُس نے صحیح بات کی۔ اہل تصوّف خرقہ پوشی کو دنیا کے بوجھ کم کرنے اور فقر میں خلوص پیدا کرنے کے لیے اختیار کرتے ہیں۔ صحیح روایات میں آیا ہے کہ جب حضرت عیسٰے علیہ السلام آسمان پر اٹھائے گئے تو وہ خرقہ صوف پہنے ہوئے تھے۔ ایک شیخ نے بیان کیا کہ میں نے حضرت عیسٰے علیہ السلام کو خواب میں دیکھا خرقہ صوف زیبِ تن تھا جس کے ہر پیوند سے نور نمایاں تھا میں نے پوچھا یہ نور کیسا ہے؟ حضرت عیسٰے علیہ السلام نے فرمایا اللہ کی عنایات کا نور ہے میں نے ہر پیوند از راہِ ضرورت لگایا تھا۔ باری تعالیٰ نے ہر اس ایذا کے عوض جو میرے دل کو پہنچی مجھے نور عطا فرمایا میں نے ماوراء النہر میں اہل ملامت میں سے ایک بزرگ کو دیکھا جو کوئی ایسی چیز کھاتا پیتا نہیں تھا جو عام طور پر لوگوں کو میسر ہیں۔ اس کی خوراک وہ چیزیں تھیں۔ جو عام لوگ پھینک دیتے ہیں۔ مثلاً ساگ پات۔ کڑوا کدو۔ گلی سڑی گاجریں وغیرہ۔ اس کی پوشاک ان چیتھڑوں پر مشتمل تھی جو وہ اِدھر اُدھر سے جمع کر کے پاک کر لیتا تھا اور گدڑی بنا لیتا تھا۔ مرو الرود میں متاخرین میں سے ایک بزرگ صاحبِ حال و کردار تھے۔ ان کے مصلّے اور ٹوپی میں کئی پیوند لگے ہوئے تھے۔ اور اُن کے اندر بچھوؤں نے بچّے دے رکھے تھے۔ میرے پیرِ طریقت نے چھپّن[۵۶] برس تک ایک ہی لباس زیبِ تن رکھا اور اُس پر ہر بار پیوند لگاتے رہے۔ اہلِ عراق کی حکایات میں ہے کہ دو[۲] درویش تھے ایک صاحب مشاہدہ دوسرے صاحب مجاہدہ۔ ایک صرف وہ چیتھڑے پہنتے تھے جو حالتِ وجد میں درویشوں کے جسم سے علیحدہ ہو جاتے تھے دوسرے فقط وہ پیوند پہنتے تھے جو عالمِ استغفار میں درویشوں کے لباس سے پھٹ کر گر جاتے تھے۔ اس طرح ان کی ظاہری حالت

ص ۴۸/۶۶

ان کی باطنی کیفیت کے دوش بدوش تھی۔ اسے کہتے ہیں ناموسِ حال کی پاسداری۔ شیخ محمد بن خفیف رضی اللہ عنہ نے بیس برس تک سخت ٹاٹ پہنا۔ اور ہر سال چار مرتبہ چلّہ کشی کرتے تھے اور ہر چلّے کے دوران روزانہ علمی باریکیوں پر تصنیف کا کام سرانجام دیتے تھے۔ ان کے زمانے میں موضع پارس میں محمد بن زکریا نامی ایک محقق عالمِ حقیقت و طریقت تھے جو خرقہ نہیں پہنتے تھے۔ شیخ محمد رح سے کسی نے دریافت کیا کہ خرقہ پوشی کی شرط کیا ہے اور یہ کام کسے زیب دیتا ہے؟ شیخ نے فرمایا خرقہ پوشی کی شرط وہی ہے جو محمد بن زکریا سفید لباس میں بجا لاتا ہے اور یہ لباس اسی کو زیبا ہے۔

فصل

صوفیاء کے لیے اپنی روش کو ترک کرنا خلافِ طریقت ہوا کرتا ہے۔ اگر اس دور میں اہلِ تصوّف لباسِ صوف کم

پہنتے ہیں تو اس کی دو وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ اُون ٹھیک نہیں رہی۔ کیونکہ اُون والے جانور حملہ آوروں کی دستبرد کی نذر ہو گئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ لباسِ صوف بدعت پسند لوگوں نے اختیار کر لیا ہے اور اہلِ بدعت کے خلاف چلنا بہتر ہوتا ہے۔ چاہے بظاہر سنّت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

صوفی لوگ پیوند لگانے میں تکلّف برتنے کو جائز سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ان کا وقار دنیا میں بلند ہو چکا ہے ہر کس و ناکس ان کی نقالی پر اتر آیا ہے اور خرقہ پوشی کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔ وہ بُرے افعال کے مرتکب ہوتے ہیں اور صوفیار کو ان کی نسبت سے شرمندگی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ اس انداز سے پیوند دوزی کرتے ہیں کہ لوگ ان کی نقل نہ کر سکیں۔ اور وہ ایک دوسرے کو اسی انداز پیوند دوزی سے شناخت کر سکیں۔ یہ چیز صوفیار کا شعار ہو گیا اس حد تک کہ ایک درویش کسی شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا اس کی گدڑی میں پیوند لگاتے وقت بخیہ بہت چوڑا رکھا گیا تھا۔ شیخ نے اس سے کنارہ کر لیا مراد یہ تھی کہ صفا کی بنیاد نزاکتِ طبع اور لطافتِ قلب پر ہے طبیعت کی کجی کسی حالت میں بھی اہلِ صفا کو قابلِ قبول نہیں ہوتی اُن کے لیے غلط کام اتنا ہی بارِ خاطر ہوتا ہے جتنا کہ ایک بُرا شعر۔

بعض لوگوں نے لباس کے معاملے میں تکلّف کو مدِّ نظر نہیں رکھا۔ باری تعالیٰ نے خرقۂ صوف دیا تو قبول کیا۔ قبا ملی تو بخوشی پہن لی۔ ننگا رہنا پڑا تو گوارا کیا۔ اور میں کہ علی بن عثمان الجلّابی رضی اللہ عنہ ہوں اسی مسلک پر کاربند ہوں اور لباس کے معاملے میں اسی چیز کو مدِّ نظر رکھتا ہوں۔ اور حکایات میں ہے کہ احمد بن خضرویہ رحمۃ اللہ علیہ جب ابویزید رحمۃ اللہ کی زیارت کو آئے تو قبا زیبِ تن تھی۔ ابن شجاع جب ابوحفص رحمہم اللہ سے ملنے آئے تو قبا پہنے ہوئے تھے یہ ان کا عام لباس نہیں تھا۔ اکثر خرقہ بھی پہنتے تھے کبھی جامۂ پشمین یا پیراہنِ سفید بھی زیبِ تن فرماتے تھے۔ انسانی طبیعت کو بسا اوقات بعض چیزوں سے لگاؤ ہو جاتا ہے اور انسان رسوم و تکلّفات کا دلدادہ ہے۔ جب اُسے کسی چیز کی عادت ہو جاتی ہے تو وہ عادت اس کی طبعِ ثانی بن جاتی ہے اور طبعِ ثانی حجاب کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اسی واسطے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خَيْرُ الصِّيَامِ صَوْمُ اَخِيْ دَاوٗدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ " روزوں میں بہترین روزہ میرے بھائی داؤد علیہ السلام کا ہے۔" صحابہؓ نے عرض کی۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کس طرح۔ فرمایا ایک دن روزہ رکھتے دوسرے دن چھوڑ دیتے تاکہ نفس کو روزہ رکھنے یا کھولنے کی عادت نہ ہو جائے اور یہ عادت باعثِ حجاب نہ بن جائے۔ اس معاملے میں ابو حامد دوستان مروزی رحمۃ اللہ علیہ خوب تھے کہ ان کو جو کپڑا مرید پہنا دیتے تھے وہ پہن لیا کرتے تھے پھر جب کسی کو اس کپڑے

ص ۴۹/۴۷

ص ۵۰/۴۸

کی ضرورت ہوتی تھی وہ اتار لیتا تھا نہ وہ پہنانے والے سے پوچھتے کہ کیوں پہنایا نہ اتارنے والے سے کہتے کہ کیوں اتارا۔ ہمارے اس زمانے میں غزنی (اللہ اس کی حفاظت کرے) میں بھی ایک بزرگ ملقّب بہ موبدؔ ہیں۔ جن کے ہاں لباس کے بارے میں پسند، ناپسند کو کوئی دخل نہیں اور جس مقام پر وہ پہنچ چکے ہیں وہاں یہی صحیح ہے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ کپڑے زیادہ تر کبود یعنی نیلے رنگ کے کیوں ہوتے ہیں؟ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اہلِ تصوّف نے اپنی طریقت کی بنیاد سیر و سیاحت پر رکھی ہے اور سفر میں سفید کپڑا اپنی حالت پر نہیں رہتا اور آسانی سے صاف نہیں ہو سکتا۔ اور کپڑوں کے متعلق ہر شخص کی یہی خواہش ہوتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ نیلا لباس غمزدہ مصیبت زدہ اور اندوہ گینوں کا شعار ہے۔ اور یہ دنیا دار المحن ہے، مصائب کا گھر ہے۔ آلام کا خیمہ ہے غم کا غار ہے۔ مقامِ فراق اور گہوارۂ بلا ہے۔ مریدانِ طریقت نے یہ دیکھ کر کہ اس عالم میں مرادِ دل پوری نہیں ہو سکتی۔ نیلگوں لباس، ماتمِ فراق خداوندی میں پہن لیا۔ اوروں نے بندگی کو خام۔ دل کو پُر از اوہام اور زندگی کو محض تضییع اوقات پا کر نیلا لباس چن لیا۔ کیونکہ کسی چیز کا ضائع ہونا موت سے بدتر ہے۔ ایک دوست کی موت پر نیلا لباس پہن لیتا ہے دوسرا پژمردہ امیدوں کی موت پر۔

ص ۵۱/۴۹

ایک درویش سے پوچھا گیا کہ وہ نیلا لباس کیوں پہنتا ہے۔ جواب دیا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم تین چیزیں چھوڑ گئے تھے یعنی ایک فقر، دوسرے علم اور تیسرے تلوار۔ تلوار طاقتوروں کے ہاتھ لگی اور انہوں نے اس کو غلط استعمال کیا۔ علم علماء کو ملا اور انہوں نے صرف تعلیم و تدریس کو کافی خیال کیا۔ فقر درویشوں نے سنبھالا اور اسے دولت سمیٹنے کا ذریعہ بنا لیا۔ میں ان تینوں جماعتوں کے ماتم میں نیلا لباس پہنے ہوئے ہوں۔

مرتعش بغداد کے کسی محلّے میں گھوم رہے تھے پیاس لگی ایک دروازے پر پانی کی درخواست کی۔ ایک عورت نے پانی کا کوزہ دیا۔ پانی پیا ساقی کے چہرے پر نظر پڑی فریفتہ ہو کر وہیں بیٹھ گئے۔ یہاں تک کہ گھر کا مالک آیا۔ مرتعش نے کہا مجھے آپ کے گھر سے آبِ شیریں پلایا گیا اور میرا دل لوٹ لیا گیا۔ صاحب خانہ نے کہا وہ میری لڑکی تھی جسے میں رشتۂ زوجیت میں دینے کو تیار ہوں۔ مرتعش کو گھر میں لے گئے۔ صاحب خانہ دولتمند تھا۔ اس نے ہونے والے داماد کو حمام بھجوا دیا۔ اسے بیش قیمت لباس پہنایا گیا اور خرقۂ صوف کی جگہ لبادۂ شبینہ نے لے لی۔ رات ہوئی تو مرتعش نماز کے لیے کھڑے ہوئے تاکہ اوراد و وظائف پورے کریں۔ چنانچہ خلوت کے دوران پکار کر کہا هَاتُوا مُرَقَّعَتِي "میرا خرقہ لاؤ" اہل خانہ نے پوچھا کیا تکلیف ہے؟ کہا میرے دل سے آواز آ رہی ہے کہ اے

مرتعش ہوئی ایک گستاخ نظر کی سزا یہ تھی کہ تیرے جسم سے تیرا خرقہ چھین لیا گیا - دوسری نظر کی سزا یہ ہو گی کہ تیرے باطن سے لباس آشنائی اتار لیا جائے گا۔

ص ۵۱/۷

جو لباس رضائے خداوندی حاصل کرنے کے لیے پہنا جائے اور اس میں دوستان حق کا اتباع مدنظر ہو ہمیشہ مبارک ہوتا ہے۔ اگر اس انداز پر بسر ہو سکتی ہے تو کر ورنہ اپنے دین کی نگہداشت کر اور لباس اولیا میں خیانت کا مرتکب نہ ہو تاکہ تو حقیقی مسلمان ہو جائے اور یہ جھوٹی ولائت کا دعویٰ کرنے سے بہتر ہے۔ خرقہ صوف دو جماعتوں کو راس آتا ہے۔ ایک تارک الدنیا لوگوں کو اور دوسرے عاشقانِ حق کو۔ مشائخ رضی اللہ عنہم کا طریقِ کار یہ ہے کہ جب کوئی مرید ترکِ تعلقات پر آمادہ ہو کر ان کے پاس آتا ہے تو وہ تین سال تک تین مختلف صورتوں میں تدریس ادب کرتے ہیں۔ اگر مرید استقامت کرے تو خیر ورنہ کہہ دیتے ہیں کہ طریقت میں اس کے لیے قبولیت کا دروازہ کھلا نہیں ایک سال خدمت خلق۔ دوسرے سال خدمت حق اور تیسرے سال پاسداری دل۔ خدمتِ خلق کی یہ صورت ہے کہ اپنے آپ کو خادم سمجھے اور سب لوگوں کو آقا کا مقام دے یعنی سب کو بلا تفریق ادنیٰ و اعلیٰ اپنے آپ سے بہتر سمجھے اور سب کی خدمت لازم خیال کرے۔ خدمت یہ نہیں کہ اپنی ذات کو مخدوموں سے بہتر سمجھا جائے اس میں سراسر نقصان ہے اور یہ درحقیقت ایک حجاب ہے۔ اور آفاتِ زندگی میں شامل ہے۔ خدمتِ حق یہ ہے کہ اپنے آپ کو دنیا و عقبیٰ کی تمام لذتوں سے منقطع کرے اور محض باری تعالیٰ کی عبادت کرے صرف اس کی ذات کے لیے کیونکہ اگر اس کی عبادت کسی اور مقصد کے لیے کی جائے تو وہ اپنی ذات کی پرستش ہے اس کی نہیں۔ دل کی پاسداری یہ ہے کہ

ص ۵۲/۱

جمعیت خاطر موجود ہو۔ اوہام مفقود ہوں اور حضورِ حق میں کسی قسم کی غفلت اور لاپرواہی روا نہ ہو۔ اگر یہ تینوں شرائط پوری ہو جائیں۔ تو مرید بلا تقلید خرقہ صوف پہن سکتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ جو خرقہ پہنائے وہ خود قائم الحال ہو۔ طریقت کے نشیب و فراز دیکھ چکا ہو۔ ذوقِ حال میں کامیاب ہو۔ مشربِ اعمال میں باریاب ہو۔ قہرِ جلال اور لطفِ جمال دیکھ چکا ہو۔ نیز اسے خبر ہو کہ مرید کس مقام تک پہنچ سکتا ہے۔ پلٹ جائے گا۔ واقفوں میں سے ہو گا یا کاملوں میں سے۔ اگر لوٹ جانے کا احتمال ہو تو شروع ہی سے اسے مرید نہ بنائے۔ اگر رکاوٹ کا امکان ہو تو اس کا انتظام کرلے۔ اگر مرید منزل آشنا ہو جائے تو اس کی پرورش کرے۔ اہل طریقت دراصل دلوں کے طبیب ہوتے ہیں۔ اگر طبیب بیمار کے مرض سے ناواقف ہو تو یقیناً مریض کو اپنے غلط علاج سے ہلاک کردے گا۔ کیونکہ وہ اس کی تیمارداری سے عاری ہوتا

ہے اور اس کی خطرناک علامات کو سمجھنے سے معذور۔ وہ غلط غذا اور مشروبات تجویز کر دیتا ہے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَلشَّیْخُ فِیْ قَوْمِہٖ کَالنَّبِیِّ فِیْ اُمَّتِہٖ "شیخ طریقت کی حیثیت اپنی جماعت کے لیے وہی ہے جو نبی کی اپنی امت کے لیے"۔ انبیاء نے لوگوں کو دعوت علم و وقوف سے کی اور ہر شخص کو اس کے مقام پر رکھا۔ شیخ طریقت کو بھی یہی لائحہ عمل لازم ہے ہر شخص کو اس کی استطاعت کے مطابق روحانی غذا دینا چاہیئے تاکہ مقصدِ دعوت پورا ہوتا رہے۔ بالغ نظر شیخِ طریقت جسے کمالِ ولایت حاصل ہو تین سال مرید کو ریاضت میں تربیت دینے کے بعد اگر خرقہ پہنائے تو بجا ہے کہ خرقہ دراصل کفن کی حیثیت رکھتا ہے۔ دنیا کی لذتوں سے رشتۂ دل کٹ جائے۔ زندگی کی راحتوں سے بے نیازی میسر ہو۔ تمام عمر خدمتِ خلق کے لیے وقف ہو چکی ہو۔ اپنی خواہشات سے مکمل بیزاری ہو۔ اس حال میں پیرِ طریقت خرقہ عطا کرتا ہے اور مرید کو اپنی نوازشات سے آبرو بخشتا ہے۔ مرید اپنی جگہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی پوری کوشش کرتا ہے اور اپنی خواہشات کو اپنے اوپر حرام کر لیتا ہے۔"

ص ۵۳/۷۲

خرقہ پوشی سے متعلق کئی استعارات ہیں۔ شیخ ابو معمر اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ نے تو اس موضوع پر ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ اکثر اہل تصوف اس بارے میں مبالغہ کرتے ہیں مگر ہمارا مقصد اس کتاب میں اقوال نقل کرنا نہیں بلکہ مشکلات کو حل کرنا ہے۔ خرقہ پوشی پر بہترین استعارہ یہ ہے کہ خرقہ کا قبہ یا کالر صبر ہے۔ دو آستینیں بیم و رجا۔ دو تیریزیں انقباض و انبساط۔ کمر گاہ مخالفتِ نفس۔ کف درستیٔ یقین اور سنجاف اخلاص۔ اس سے خوب تر یہ ہے کہ کالر فنا کا نشان ہے۔ دو آستینیں حفاظت و عصمتِ نفس ہیں۔ دو تیریز فقر و صفا ہیں۔ کمر گاہ اقامتِ مشاہدہ ہے۔ کرسی سکونِ حضور ہے اور سنجاف مقام وصل کا قرار ہے۔ جب باطن کے لیے ایسا لباس ہو تو ظاہر کے لیے بھی ہونا چاہیئے۔ اس موضوع پر میری ایک کتاب ہے "اسرار الخرق والمؤنات" اس کا نسخہ مرید کے پاس ہونا چاہیئے۔"

اگر مرید خرقہ پہننے کے بعد عالم حال میں یا قہرِ سلطانِ وقت کے تحت اپنا لباس چیر پھینکے تو معذور ہے اگر اپنے اختیار سے اور ہوش و حواس میں رہ کر پھاڑ ڈالے تو پھر اس کو خرقہ پہننا زیبا نہیں اور اگر دوبارہ پہن لے تو وہ بھی دنیا کے مکار خرقہ پوشوں میں شمار ہو گا جو صرف ظاہر داری کے لیے لباسِ صوف پسند کرتے ہیں۔ لباس کے بارے میں اصل حقیقت یہ ہے کہ جب صوفی ایک مقام سے دوسرے مقام میں داخل ہوتا ہے تو اپنا لباس تبدیل کر لیتا ہے اور یہ ترقی درجات کے لیے اظہارِ شکر کا ایک انداز ہے مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ معمولی لباس ایک مقام کے لیے ہوتا ہے مگر خرقہ فقر و صفا کے تمام مقامات

ص ۵۳/۷۳

کے لیے۔ اسے رد کرنا تمام طریقت کو رد کرنے کے مترادف ہے۔ میں نے اس موضوع پر صرف تھوڑا سا اشارہ کیا ہے اور یہ جگہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے موزوں بھی نہیں۔ انشاء اللہ تشریح خرق اور کشفِ اسرارِ سماع کے باب میں زیادہ تفصیل سے بیان کروں گا

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خرقہ عطا کرنے والے میں اتنی قدرت ہونی چاہیئے کہ وہ جس کو بھی نگاہِ محبت سے دیکھے وہ دوست بن جائے اور جس گنہ گار کو بھی خرقہ پہنائے وہ ولی اللہ ہو جائے۔ میں ایک دفعہ اپنے شیخ طریقت کے ساتھ آذربائجان کے دیار میں سفر کر رہا تھا۔ دو تین خرقہ پوش درویشوں کو دیکھا کہ ایک گندم کے کھلیان کے پاس کھڑے تھے اور اپنے دامن پھیلائے ہوئے تھے اس امید پر کہ کسان کچھ گندم ڈال دے۔ یہ منظر دیکھ کر شیخ نے فرمایا: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ" یہ ہی ہیں وہ لوگ جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی پس ان کو ان کی تجارت نے کوئی نفع نہ دیا اور یہ ہدایت پانے والے نہ تھے" میں نے پوچھا یا حضرت وہ کیوں اس بلا میں مبتلا ہوئے اور لوگوں کے لیے باعثِ ذلت بنے ؟ فرمایا ان کے پیروں کو مرید جمع کرنے کی ہوس تھی اور ان کو متاعِ دنیا جمع کرنے کی۔ ایک ہوس دوسری ہوس سے بالاتر نہیں ہوتی اور بے حقیقت دعویٰ ہوس پروری کا ذریعہ ہے۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مشہور ہے کہ باب الطاق میں انہوں نے ایک ترسازادہ کو دیکھا جو نہایت خوبصورت تھا دعا کی کہ باری تعالیٰ تیری کتنی حسین تخلیق ہے اسے میرے حلقہ میں شامل فرما۔ تھوڑے عرصہ کے بعد وہ ترسازادہ آیا اور عرض کی کہ یا شیخ مجھے کلمۂ شہادت پڑھائیے وہ مسلمان ہو گیا اور اولیاء اللہ میں شامل ہوا۔

شیخ بوعلی سیاہؒ سے پوچھا گیا کہ خرقہ پوشی کسے زیبا ہے ؟ فرمایا اس مردِ درویش کو جسے باری تعالیٰ نے اتنا مشرف بہ حق کیا ہو کہ جملہ احکام احوالِ عالم کی اسے خبر ہو۔

خرقہ صالح اور نیک لوگوں کا نشان ہے اہلِ فقر و تصوّف کا لباس ہے۔ فقر و تصوّف سے متعلق پہلے بیان ہو چکا ہے اگر کوئی شخص لباسِ اولیاء کو متاعِ دنیا جمع کرنے کا آلہ کار بنا لیتا ہے اور اپنی مصیبت کا سامان سمیٹتا ہے تو اہلِ حقیقت کو زیادہ نقصان نہیں پہنچتا۔ اہلِ ہدایت کے لیے یہ جو کچھ بیان ہوا کافی ہے۔ اس سے زیادہ تشریح اس کتاب کا مقصد نہیں۔ وَبِاللّٰهِ التَّوْفِيْقُ "اور سب توفیق اللہ کی طرف سے ہے"۔

۵
پانچواں باب

اختلافِ فقر و صفا

اہلِ تصوّف میں فقر و صفا کے بارے میں اختلاف ہے بعض کا خیال ہے کہ فقر صفا سے زیادہ مستحکم ہے۔ اور بعض اس بات پر مُصر ہیں کہ صفا فقر سے زیادہ معتبر ہے۔ فقر کو افضل سمجھنے والے کہتے ہیں کہ فقر فنائے کُلّی ہے جس میں ہر چیز کالعدم ہو جاتی ہے۔ صفا مقاماتِ فقر میں ایک مقام ہے اور جب فنائے کلّی حاصل ہو تو ہر مقام ختم ہو جاتا ہے۔ رعایت اس کلام کی وہی ہے جو فقر و غنا کے باب میں بالتفصیل بیان ہو چکی ہے۔ جو لوگ صفا کو فقر پر فوقیت دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ فقر کا وجود ہے اور اسے نام دیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس صفا ہر چیز سے معرّا ہونے کو کہتے ہیں اور صفا عین فنا ہے اور فقر عینِ غنا۔ لہٰذا فقر ایک مقام کی حیثیت رکھتا ہے اور صفا کمال کا نام ہے۔ اس زمانہ میں یہ معاملہ شد و مد سے زیرِ بحث ہے اور ہر جماعت دور افتادہ استعارات اور نازک نکات نکالنے میں مصروف ہے۔ فقر و صفا کی تقدیم و تفضیل میں شدید اختلاف ہے۔ اتفاقِ رائے نہ فقر کے حق میں ہے نہ صفا کے حق میں۔ بحث کرنے والے الفاظ میں الجھ کر حقیقت سے دور جا پڑتے ہیں اور صداقت کو خارج از بحث کر جاتے ہیں۔ خواہش پورا نہ ہونے کو مکمل نفی اور اثبات مراد کو اثباتِ عین تصوّر کرتے ہیں۔ پس موجود و مفقود اور منفی و مثبت محض اپنی خواہش اور اپنے دل کی بات پر اڑے رہنے کے نشانات بن کر رہ گئے ہیں اور راہِ سلوک اس جملہ افسانہ طرازی سے پاک ہے۔ اولیائے کرامؒ اس مقام پر متمکن ہوتے ہیں جہاں کوئی مقام نہیں ہوتا، تمام درجات و منازل مفقود ہو جاتے ہیں۔ گفتگو کا یارا نہیں رہتا۔ نہ مشرب باقی ہوتا ہے نہ ذوق، نہ سکوت نہ غلبہ۔ نہ ہوش نہ بے ہوشی۔ بحث کرنے والے ہر اس چیز کے لیے نام تلاش کرتے ہیں جس کی ماہیت ان کی سمجھ سے باہر ہو اور جس کی تعریف نہ ہو سکتی ہو وہ اپنی اپنی سمجھ کے مطابق کوئی شاندار سا نام چن لیتے ہیں۔ دماغی طور پر ترجیح کا سوال پیدا نہیں ہوتا مگر جب خیالات کا نام دے دیا جائے تو ایک نام کو دوسرے پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ چنانچہ کچھ لوگوں کو لفظِ فقر زیادہ موزوں اور قابلِ قدر نظر آیا۔ کیونکہ اس میں ترک و عجز کا پہلو ہے۔ کچھ اور لوگوں نے لفظِ صفا کو ترجیح دی کیونکہ اس میں ترک ما کدر یعنی خراب چیز کو چھوڑنے

ص ۵۵/۷۵

اور انقطاعِ متاعِ دنیا کے معانی مضمر ہیں۔ ان دو الفاظ کو منتخب کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ ایک ناقابلِ اظہار تصوّر کی نشان دہی کر سکیں اور باہم گفت و شنید کرتے وقت اپنا مفہوم پوری طرح بیان کر سکیں۔ اہلِ طریقت میں کوئی اختلاف نہیں چاہے وہ لفظِ فقر استعمال کریں یا لفظِ صفا۔ اس کے برعکس اہلِ عبارت کے لیے جو اصلِ حقیقت سے بے خبر ہیں تمام مسئلہ لفظ آرائیوں کے سوا کچھ نہیں وہ ایک چیز پر متفق نہ ہو سکے اور ایک کو دوسرے پر مقدّم کرتے رہے۔ اہلِ طریقت اصلِ حقیقت کے متلاشی ہوئے اور اہلِ عبارت ظلمتِ عبارت میں کھو گئے۔ الغرض جس نے اصلِ حقیقت کو پایا اور اسے اپنا قبلۂ دل بنایا اسے چاہے فقیر کہو چاہے صوفی۔ دونوں نام اضطراری کیفیت رکھتے ہیں اس حقیقت سے متصف جو معرضِ بیان میں نہیں آسکتی۔ یہ اختلاف ابوالحسن سمنون رحمۃ اللہ علیہ کے وقت سے چلا آتا ہے جب وہ اس عالمِ کشف میں ہوتے تھے جس کا تعلق بقا سے ہے فقر کو صفا پر ترجیح دیتے تھے اور جب ایسے مقام پر ہوتے تھے جس کا تعلق فنا سے ہے صفا کو فقر سے افضل سمجھتے تھے۔ اربابِ معانی نے ان سے سبب دریافت کیا تو انہوں نے کہا مجھے فنا اور زنگ گساری میں وہی مشربِ کامل حاصل ہے جو بقا میں۔ جب ایسے مقام پر ہوتا ہوں جس کا تعلق فنا سے ہے میں صفا کو فقر سے مقدم سمجھتا ہوں اور مقامِ بقا سے دوچار ہوتا ہوں تو فقر کو صفا سے بہتر کہتا ہوں کیونکہ فقر کا تعلق بقا سے ہے اور صفا کا فنا سے۔ آخر الذکر یعنی صفا کے مقام پر میں بقا کے تصور کو فنا کر دیتا ہوں اول الذکر یعنی فقر کے عالم میں فنا کے تصور کو فنا کر دیتا ہوں حتیٰ کہ فنا و بقا کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ یہ محض عبارت آرائی ہے کیونکہ نہ فنا کو فنا ہے نہ بقا کو فنا ہے ہر باقی چیز جو فنا ہو جاتی ہے اپنے وجود کو ختم کر دیتی ہے اور ہر فنا شدہ چیز جو قائم ہو جاتی ہے اپنے وجود میں قائم ہوتی ہے فنا کا لفظ ازراہِ مبالغہ استعمال نہیں ہو سکتا جب کوئی فنا کے فنا ہونے کا ذکر کرتا ہے تو وہ صرف مبالغہ آمیز الفاظ میں یہ کہنا چاہتا ہے کہ فنا کا تصور تک ختم ہو چکا ہے مگر جب تک بقا کا کوئی تصور بھی باقی ہے فنا روبکار نہیں آتی اور جب روبکار آگئی تو پھر اس فنا کی فنا ایک خود ساختہ بے معنی لفظ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ محض اربابِ لسان کی افسانہ آرائی ہے عبارت پرستی کے شوق میں۔

لڑکپن کی تیزیٔ طبع اور جوشِ طبیعت میں میں نے اس انداز میں ایک کتاب "کتابِ فنا و بقا" کے نام سے تصنیف کی تھی مگر اس کتاب میں وہی چیز پوری احتیاط سے تحریر کروں گا۔ انشاء اللہ عزّ و جلّ۔

یہ فرق ہے صفا و فقر میں جہاں تک معنوی تصور کا تعلق ہے عملی طور پر یعنی ترکِ متاعِ دنیا اور انقطاعِ ہوائے دل کے معاملے میں صورتِ حال مختلف ہے۔ یہ چیز فقر و مسکنت تک پہنچتی ہے۔ بعض مشائخِ کرام فقیر کو مسکین سے بہتر سمجھتے ہیں

جیسے باری تعالیٰ نے فرمایا: لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ" ان فقراء کے لیے جو اللہ کی راہ میں محصور ہیں اور روئے زمین پر چلنے پھرنے کی استطاعت نہیں رکھتے" مساکین کے پاس سامان زیست ہوتا ہے مگر فقراء اسے ٹھکرا چکے ہوتے ہیں۔ اس لیے فقر باعثِ عزت اور مسکینی وجہ ذلت ہوتی ہے۔ سامانِ زینت رکھنے والا طریقت میں ذلیل ہوتا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تَعِسَ عَبْدُ الدَّرَاهِمِ وَتَعِسَ عَبْدُ الدِّیْنَارِ وَتَعِسَ عَبْدُ الْخَمِیْصَةِ وَالْقَطِیْفَةِ "ہلاک ہوا بندہ درہم کا اور ہلاک ہوا بندہ دینار کا اور ہلاک ہوا بندہ لباس و کمخواب کا" تارک سامانِ زینت عزیز ہوتا ہے کیونکہ صاحب سامان کا اعتماد سامان پر ہوتا ہے اور بے سروسامان کا خدائے بزرگ و برتر پر بوقت ضرورت صاحب سامان اپنے سامان کا سہارا ڈھونڈتا ہے اور تارکِ سامان باری تعالیٰ کا۔ کچھ اور لوگ کہتے ہیں کہ مسکین افضل ہوتا ہے کیونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَللّٰهُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَّاَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا وَاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَةِ الْمَسَاکِیْنِ "اللہ مجھے مسکین زندہ رکھ۔ اور مسکین کی موت عطا کر اور قیامت کے دن مسکین کی جماعت میں اٹھائیو" مساکین کا ذکر کرتے ہوئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری زندگی و موت مساکین میں ہو۔ لیکن جب فقر کا ذکر کیا تو فرمایا: کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا" قریب ہے کہ فقر کفر ہو جائے" اس معنی کے اعتبار سے فقیر اسباب سے تعلق رکھتا ہے مسکین وہ ہے جسے اسباب میسر ہی نہ ہوں

ص ۵۷، ۵۸

شریعت میں فقہاء کی ایک جماعت کے نزدیک فقیر صاحبِ بلغہ ہوتا ہے اور مسکین مجرد۔ دوسرے گروہ کا خیال اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ اہلِ مقامات جو اول الذکر صورت سے اتفاق کرتے ہیں لفظِ صوفی کو مساکین کے لیے مختص سمجھتے ہیں۔ اور یہ اختلاف فقہاء رضی اللہ عنہم کے اختلاف کے دوش بدوش ہے جن کے نزدیک فقیر بے وسیلہ اور مسکین کفایت شعار ہوتا ہے وہ فقر کو صفا سے افضل جانتے ہیں اور جن کے خیال میں مسکین بے وسیلہ اور فقیر کفایت شعار ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک صفا کو فقر پر فوقیت حاصل ہے۔ فقر و صفا کے اختلاف کی یہ مختصر سی کیفیت ہے واللہ اعلم بالصواب "اور اللہ بہتر جاننے والا ہے"۔

۶
چھٹا باب

ملامت

مشائخ طریقت کی ایک جماعت نے راہِ ملامت اختیار کی ہے۔ ملامت خلوصِ محبت میں بہت تاثیر رکھتی ہے اور ذوقِ کامل کی نشاندہی کرتی ہے۔ اہلِ حق لوگوں کی ملامت کا نشانہ رہے۔ خاص طور پر اس اُمّت کے سربرآوردہ اکابر اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم جو اہلِ حق کے رہنما اور امام ہیں اور اہلِ محبت کے پیشوا ہیں عام لوگوں کی نظر میں نہایت درجہ صاحبِ توقیر و آبرو تھے جب تک کشفِ حقیقت اور نزولِ وحی نہیں ہُوا تھا۔ جب دوستیِ حق کا لباس عطا ہُوا تو خلقت نے زبانِ ملامت دراز کی۔ کسی نے کہا کاہن ہے۔ کسی نے کہا شاعر ہے کسی نے کہا دیوانہ ہے اور کسی نے کہا جھوٹا ہے وغیرہ باری تعالیٰ نے اہلِ ایمان کا ذکر فرمایا تو کہا کہ وہ ملامت کرنے والوں کی ملامت سے خوفزدہ نہیں ہوتے وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ "وہ کسی کی ملامت سے خوفزدہ نہیں ہوتے۔ یہ اللہ کا فضل ہے جو وہ جس کو چاہے عطا کرتا ہے اور اللہ وسعت والا اور جاننے والا ہے"۔ یہ قانونِ خداوندی ہے کہ اس کے شیدائی نشانۂ ملامت بنتے ہیں مگر خدا ان کے دلوں کو ملامت سے پراگندہ ہونے سے محفوظ رکھتا ہے۔ یہ غیرتِ حق ہے کہ وہ اپنے دوستوں کو نگاہِ غیر سے بچاتا ہے تاکہ کسی کی نظر ان کی کیفیت کے حسن پر نہ پڑ سکے۔ وہ خود اپنی نظر سے بچے رہتے ہیں تاکہ اپنا حسن آپ ہی دیکھ کر عجب کی وجہ سے مصیبت و تکبر میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ خلقت ان پر مامور رہے۔ تاکہ زبانِ ملامت دراز کرے۔ نفسِ لوامہ ان کا جزوِ طبیعت ہے تاکہ ہر کام پر ملامت کرتا رہے۔ اگر برائی سرزد ہو تو وہ اپنے آپ کو برائی کے لیے ملامت کرتے ہیں۔ اگر نیک کام کریں تو نیکی کرنے میں خامی کی وجہ سے اپنے آپ کو ہدفِ ملامت بناتے ہیں۔ یہ ایک پختہ اصولِ طریقت ہے کیونکہ اس راہ میں خود پسندی سے زیادہ خوفناک کوئی حجاب یا مصیبت پیش نہیں آتی۔ خود پسندی کے دو سبب ہوتے ہیں۔ ایک جاہِ خلق اور ان کی نمائش یعنی بندہ کا کوئی کام خلقت کو پسند آ جاتا ہے اس کی تعریف ہوتی ہے اور وہ متکبر ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی اور کے کام کو پسند نہیں کرتا صرف اپنے آپ کو اس کا

ص ۵۹/۴۹

اہل سمجھتا ہے اور تکبر میں مبتلا ہو کر رہ جاتا ہے۔ باری تعالیٰ نے یہ پندار و تکبر کا راستہ اپنے دوستوں پر بند کر رکھا ہے۔ ان کے معاملات کتنے بھی درست ہوں، عام لوگوں کی نظر میں ناپسندیدہ ہوتے ہیں۔ ان کا مجاہدۂ نفس کتنا بھی عالی ہو وہ کبھی اُسے اپنی قوت اور ہمت کا نتیجہ نہیں سمجھتے اور خود پسندی کے مرتکب نہیں ہوتے اور تکبر سے محفوظ رہتے ہیں۔ جو پسندیدۂ حق ہوتا ہے خلقت اسے پسند نہیں کرتی اور جو اپنی تن پروری میں مشغول ہوتا ہے ذاتِ حق اس کو منتخب نہیں کرتی۔ ابلیس کو خلق پسند کرتی تھی اور ملائکہ نے اسے قبول کر رکھا تھا وہ خود پسندی میں مبتلا ہو گیا کیونکہ پسندیدۂ حق نہیں تھا اسے خود پسندی کا پھل لعنتِ ابدی کی صورت میں ملا۔ آدم کو ملائکہ نے ناپسند کیا اور کہا: "اَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيهَا" اے خدایا! کیا تو زمین میں ایسی مخلوق پیدا کرے گا جو اس میں فساد پھیلائے"۔ آدمؑ نے اپنے آپ کو پسند نہ کیا چنانچہ اُس نے کہا: "رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا" اے ہمارے رب ہم نے اپنی جان پر ظلم کیا" چونکہ پسندیدۂ حق تھا حکم ہوا: "فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا" آدم بھول گیا، ہم نے اسے ارادۂ بھٹکتے ہوئے نہیں پایا" خلقت اور آدم کا اپنا عدم پسند رحمت کا پھل لایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ مقبولِ حق خلقت سے منقطع ہوتا ہے اور مقبولِ خلقت حق سے جدا۔ القصہ ملامت دوستانِ حق کی غذا ہے اور قبول کا نشان۔ یہ اولیاء کا مشرب ہے کیونکہ قربتِ حق کی علامت ہے۔ دنیا قبولِ خلق پر خوش ہوتی ہے اور وہ ردِّ خلق پر۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ جبریل صلوات اللہ علیہ نے باری تعالیٰ کا پیغام دیا: "اَوْلِيَائِیْ تَحْتَ قَبَائِیْ لَا يَعْرِفُهُمْ غَيْرِیْ اِلَّا اَوْلِيَائِیْ" میرے دوست میری قبا کے نیچے ہیں انہیں میرے دوستوں کے سوا کوئی نہیں پہچانتا۔ "وَاللّٰهُ اَعْلَمُ" اور اللہ بہتر جاننے والا ہے"۔

ص ۷۰ / ۱۸

فصل

ملامت کی تین صورتیں ہیں (۱) راست روی (۲) قصد کرنا (۳) ترک کرنا۔

ملامت راست روی یہ ہے کہ آدمی اپنی روش پر چل رہا ہو۔ فرائضِ مذہب پورے کر رہا ہو۔ بندگی کی کسی شرط کو نظر انداز نہ کرتا ہو لوگ اسے ملامت کریں اور یہ سب سے بے نیاز ہو کر اپنے کام میں مصروف ہو۔ ملامتِ قصد کی یہ صورت ہے کہ آدمی اپنے ہم جنسوں میں صاحبِ مرتبہ ہو، ممتاز حیثیت رکھتا ہو۔ اس کے دل میں حبِّ جاہ پیدا ہو جائے اور وہ اپنے ہوا خواہوں میں اُلجھ جائے اور پھر یک بیک وہ اُن سے علیحدہ ہونا چاہے۔ مائل بحق ہونے کے لیے ملامتِ خلق برداشت کرے اور کوئی ایسی چیز کر گذرے جو شریعت کے خلاف تو نہ ہو مگر اس کی وجہ سے خلقت

کو اس سے نفرت ہو جائے۔ یہ اس کا اپنا کام ہوتا ہے اور خلق کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ملامتِ ترک یہ ہے کہ کسی کو طبعی کفر و ضلالت گھیر لے اور وہ ترکِ شریعت و ترکِ اتباع کی تلقین شروع کر دے اور یہ سمجھے کہ وہ راہِ ملامت اختیار کر رہا ہے۔ یہ اس کا ذاتی فعل ہے۔

ملامتِ راست روی میں آدمی مکر و فریب سے دور ہوتا ہے۔ نمائش سے بچتا ہے۔ عوام الناس کی ملامت کی پرواہ نہیں کرتا۔ اور ہمیشہ اپنی روش پر قائم رہتا ہے۔ اسے کوئی کسی نام سے پکارے اس کے لیے قطعاً کوئی فرق نہیں پڑتا۔ روایاتِ مشائخ حرمیں مرقوم ہے کہ ایک دن ابو طاہر حرمی رضی اللہ عنہ گدھے پر سوار ایک بازار سے گذر رہے تھے۔ ایک مرید ہمرکاب تھا کسی نے پکار کر کہا "وہ آئے پیرِ زندیق"۔ مرید غضب ناک ہو کر پکارنے والے پر لپک پڑا۔ بازار میں ہنگامہ ہو گیا۔ شیخ نے مرید سے کہا اگر تو خاموش رہے تو میں تجھے ایک ایسی چیز پڑھاؤں گا جو تجھے اس قسم کی مصیبت سے محفوظ رکھے۔ مرید خاموش ہو گیا۔ گھر پہنچ کر شیخ نے کہا میرا صندوقچہ اٹھا لاؤ۔ مرید اٹھا لایا۔ اس میں خطوط تھے۔ مرید سے کہا پڑھو۔ جو خطوط مجھے آئے ہیں ان میں کسی نے مجھے شیخ الاسلام کہہ کر خطاب کیا ہے کسی نے شیخِ پاک کہا ہے۔ کسی نے شیخ زاہد لکھا ہے اور کسی نے شیخ الحرمین وغیرہ۔ یہ تمام القاب ہیں نام نہیں۔ میں کسی ایک کا اہل نہیں۔ ہر کسی نے اپنے اعتقاد کے مطابق کوئی لقب تراش لیا ہے۔ اگر اس شخص نے بھی اپنے اعتقاد کی بنا پر کسی لقب سے مجھے پکار لیا تو اس میں جھگڑے کی کونسی بات تھی۔

ص ۶۱/۸۲

جو آدمی جان بوجھ کر ملامت برداشت کرتا ہے (ملامتِ قصد) وہ بے جاہ توقیر سے دست بردار ہوتا ہے اور حکومت سے منہ پھیرتا ہے وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرح ہے کہ دورانِ خلافت وہ اپنے کھجوروں کے باغ سے آ رہے تھے اور لکڑیوں کا گٹھا ان کے سر پر تھا حالانکہ ان کے ۴۰۰ غلام تھے۔ لوگوں نے پوچھا یا امیر المومنین رضؓ یہ آپ کیا کر رہے ہیں فرمایا: اُرِیْدُ اَنْ اُجَرِّبَ نَفْسِیْ "میں اپنے نفس کو آزمانا چاہتا ہوں"۔ میرے پاس غلام ہیں جو یہ کام سرانجام دے سکتے ہیں مگر مجھے اپنے نفس کی آزمائش مدِنظر ہے تاکہ دنیا کی جاہ و مرتبت اسے کسی کام سے باز نہ رکھ سکے۔

۶۲/۸۳

یہ حکایت اثباتِ ملامت پر بالکل واضح ہے اسی موضوع پر امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے بھی حکایت ہے جو مناسب موقع پر معرضِ تحریر میں آئے گی۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔ ابو یزید رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی مشہور ہے کہ وہ سفرِ حجاز

سے واپس آتے ہوئے شہر رے میں آئے تو ان کی آمد کی خبر مشہور ہوگئی اور لوگ ان کے خیر مقدم کو نکل آئے تاکہ عزت و توقیر سے شہر میں لے جائیں۔ ابویزید ان لوگوں کی وجہ سے حضورِ حق سے بعید ہوکر پراگندہ دل ہوگئے۔ جب بازار میں پہنچے تو انہوں نے ایک روٹی نکال کر کھانا شروع کر دی۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا۔ تمام لوگ ان کو برافروختہ ہوکر تنہا چھوڑ گئے۔ ایک مرید ان کے ساتھ تھا اس سے کہا دیکھا میں نے شریعت کے ایک مسئلہ پر عمل کیا اور سب نے مجھے رد کر دیا۔ میں کہ علی بن عثمان الجلابی رضی اللہ عنہ ہوں کہتا ہوں کہ اس زمانے میں قابلِ ملامت ہونے کے لیے کوئی غیر معمولی یا خلافِ عادت کام کرنا ضروری تھا آج کل اگر کوئی چاہے کہ لوگ اُسے ملامت کریں تو اس سے کہہ دو کہ دو رکعت نمازِ نفل لمبی کر کے پڑھے یا دین کو مکمل طور پر طاری کرے تو تمام خلق فوراً فریب کاری اور منافقت کا الزام لگانے پر اُتر آئے گی۔

ملامتِ ترک کی صورت یہ ہے کہ آدمی قانونِ شریعت کی خلاف ورزی کرتا ہے اور خلافِ مذہب چیز کا مرتکب ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں راہِ ملامت پر گامزن ہوں۔ در اصل وہ واضح گمراہی، صریح فتنہ اور پوری ہوس میں مبتلا ہوتا ہے۔ اِس زمانے میں بہت سے لوگ اسی قماش کے ہیں۔ ان کا مقصد ردِ خلق نہیں بلکہ قبولِ خلق ہوتا ہے ورنہ ردِ خلق تلاش کرنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ قبولیتِ عام حاصل ہو اور اس کے بعد کوئی ایسا فعل سرزد ہو کہ لوگ اسے رد کر دیں۔ اس کے سوا ردِ خلق کی کوشش مقبولِ خلق ہونے کا بہانہ ہے

مصنف رحمۃ اللہ علیہ کہتا ہے کہ مجھے ایک موقعہ پر ایک جھوٹے مدعی کے ساتھ ٹھیرنے کا اتفاق ہوا۔ ایک دن وہ بحالتِ خراب نمودار ہوا اور ملامت طلبی کا بہانہ کیا۔ کسی نے اس سے کہا یہ لغو ہے۔ میں نے دیکھا وہ برافروختہ ہوگیا۔ میں نے کہا ارے بھائی اگر تمہارا دعوایٔ ملامت درست ہے تو اس آدمی کا اعتراض تمہارے طریقِ کار کی تائید ہے اور تائید پر تلملانے کی کیا ضرورت ہے۔ در اصل تمہاری روش ملامت نہیں بلکہ فریب کاری سے قریب تر ہے۔ روشنیٔ حق کی رہبری میں چلنے والے کو اپنے دعویٰ کو ثابت کرنا چاہیئے اور ثبوت صرف اتباعِ سنّت ہے۔ دعوے دار ہو کر ترکِ فریضہ کے مرتکب ہونے سے تم دائرۂ اسلام سے خارج ہو گئے۔

فصل

معلوم ہونا چاہیئے کہ میدانِ طریقت میں ملامت کو فروغ دینے والے اپنے زمانے کے شیخ ابو حمدون

قصار رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ ملامت کی حقیقت سے متعلق ان کے بہت سے لطائف ہیں ان کا قول ہے: اَلْمَلَامَۃُ تَرْکُ السَّلَامَۃِ "ملامت سلامتی کو ترک کرنے کا نام ہے"۔ جب کوئی اپنی سلامتی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، مصائب کا سامنا کرنے کو تیار ہو جاتا ہے اور اپنی محبوب چیزوں اور تعلقات کو ترک کرنے پر مائل ہوتا ہے۔ اس امید پر کہ جلالِ خداوندی کا انکشاف ہو تو وہ جس قدر خلق سے منقطع ہوتا ہے اسی قدر قربِ حق سے مستفید ہوتا ہے۔ چنانچہ اہلِ ملامت دنیا والوں کی محبوب چیز یعنی سلامتی سے روگرداں ہوتے ہیں۔ ان کی ہمت عام لوگوں کی ہمت سے مختلف ہوتی ہے اور عام لوگوں کی ہمت ان کی ہمت سے۔ ان کے اوصاف وجدانی ہوتے ہیں۔ احمد بن فاتک سے روایت ہے کہ حسین بن منصور سے پوچھا گیا مَنِ الصُّوْفِیُّ "صوفی کون ہے"۔ اس نے جواب دیا وِجْدَانِیُّ الذَّات "جس کی طبیعت کی بنیاد وجدان ہو" حمدون نے بھی ملامت سے متعلق کہا کہ عوام کے لیے یہ راستہ بہت سنگلاخ ہے میں اس بارے میں تھوڑی سی بات کہہ سکتا ہوں رِجَاءُ الْمُرْجِئَۃِ وَخَوْفُ الْقَدَرِیَّۃِ "مرجیوں کی امید اور قدریوں کا خوف" اس قول میں معانی پوشیدہ ہیں جن کا انکشاف ضروری ہے۔ انسانی فطرت ہے کہ ہر دلعزیزی اس کے لیے راہِ حق میں سب سے بڑا سنگ حائل ہو کر رہ جاتی ہے آدمی کو یہ چیز اتنی پسندِ خاطر ہوتی ہے کہ جو اس کی ذرا سی تعریف کر دے وہ اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے اور حقیقت سے دور جا پڑتا ہے۔ جسے یہ خطرہ پیشِ نظر ہو وہ ہمیشہ بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کوشش میں دو خطرناک صورتیں سامنے آتی ہیں ایک حجابِ حق کا خوف دوسرا یہ خوف کہ اس سے کوئی ایسا کام نہ ہو جائے جس سے لوگ بھٹک جائیں اور اس پر زبانِ ملامت دراز کریں۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ لوگوں میں منزلت حاصل کر کے آسودہ ہو جائے اور نہ یہ مطلب ہوتا ہے کہ لوگ بھٹک کر ملامت پر اتر آئیں۔ الغرض ملامتی کے لیے یہ ضروری ہے کہ پہلے دنیا اور عقبیٰ کے جھگڑے خلقت سے صاف کرے اور پھر اپنے دل کی نجات کے لیے وہ کام کرے جو از روئے شریعت گناہ کبیرہ یا صغیرہ میں شمار نہ ہو سکے۔ یہاں تک کہ لوگ اس کو رد کریں۔ پس کردار کے معاملے میں اس کا خوف قدریوں کے خوف کی طرح ہو اور ملامت کرنے والوں کی نسبت اس کی امید مرجیوں کی مانند ہو۔

ص ٦٣/٨٥

دوستی کے میدان میں ملامت سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ دوست کی ملامت دوست کے دل پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ دوست کا سوائے کوچۂ یار کے کسی جگہ مقام نہیں ہوتا اور اغیار کا دل دوست میں گذر محال ہے: لِاَنَّ

ص ٦٤/٨٦

الْمَلَامَةُ رَوْضَةُ الْعَاشِقِيْنَ وَنُزْهَةُ الْمُحِبِّيْنَ وَرَاحَةُ الْمُشْتَاقِيْنَ وَسُرُوْرُ الْمُرِيْدِيْنَ" اس لیے کہ ملامت عاشقوں کا چمن۔ محبت کرنے والوں کی نزہت۔ مشتاقوں کی راحت اور مریدوں کا سرور ہے۔" اہلِ ملامت سلامتیٔ دل کے لیے ملامتِ بدنی اختیار کرنے میں مخصوص ہیں۔ خدا کی مخلوق میں سے مقربین، فرشتوں یا روحانیوں کو یہ چیز میسر نہیں۔ پہلی امتوں میں جو زاہد، راغب اور طالبِ حق ہوئے تھے وہ اس سے معرّا تھے۔ صرف اس امت کے لوگ جو انقطاعِ دل کے راستے پر گامزن ہیں اس کے علمبردار ہیں۔ میرے نزدیک طلب ملامت بالکل ریا ہے اور ریا بالکل منافقت۔ ریاکار تکلفاً ایسا راستہ اختیار کرتا ہے کہ لوگ اُسے قبولیت کی نظر سے دیکھیں۔ ملامتی تکلفاً ایسی راہ پر گامزن ہوتا ہے کہ لوگ اسے رد کردیں۔ یہ دونوں جماعتیں خلقت میں گم ہوکر رہ جاتی ہیں اور ان سے باہر نہیں نکل سکتیں۔ ایک جماعت اِس انداز سے نمایاں ہے اور دوسری اُس انداز سے۔ درویش کے دل میں تو خلقت کا خیال تک بھی نہیں گذرتا اور جب خلقت سے بے تعلق ہو تو ریا یا ملامت کا کوئی امکان نہیں رہتا۔ مجھے ماوراء النہر کے ایک ملامتی کے ساتھ ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد میں نے پوچھا کہ بھائی اس شوریدہ کاری سے تیرا مطلب کیا ہے کہا خلقت کو دور کرنا۔ میں نے کہا کہ خلقت کی تو انتہا نہیں۔ تیری عمر اور زمان و مکان اتنا وسیع نہیں کہ تمام خلقت کو دور کرسکے۔ بہتر یہ ہے کہ اپنے آپ کو ان سے دور کرلے تاکہ اس جملہ تکلف سے بچ سکے۔ کچھ لوگ خود مشغول بہ خلقت ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ خلقت ان کی طرف مشغول ہے تجھے کوئی نہیں دیکھتا تو اپنے آپ کو مت دیکھ۔ جب تیرے لیے ہر فتنہ تیری اپنی نظر کا نتیجہ ہے تو دوسروں سے کیا سروکار۔ اگر کسی کو شفا بہ پرہیزی غذا سے ملتی ہو اور وہ کھانا طلب کرے تو یقیناً آدمیت سے خارج ہے۔ کچھ لوگ طریقِ ملامت پر از راہ ریاضت گامزن ہوتے ہیں اور ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ ان کو نفرت کی نظر سے دیکھیں اور انہیں اپنی بے لبسی کا احساس ہو۔ بے کسی اور بے لبسی ان کے لیے مسرت کا مقام ہوتی ہے۔

کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم ادھم رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ کیا کبھی دنیا میں تمہاری کوئی دلی تمنا بھی پوری ہوئی ہے کہا ہاں۔ دو بار۔ ایک بار تو میں کشتی میں سوار تھا۔ کوئی مجھے پہچاننے والا موجود نہ تھا۔ میرے کپڑے پھٹے ہوئے تھے بال بڑھے ہوئے۔ تمام اہلِ کشتی میرا مذاق اڑا رہے تھے۔ ایک مسخرہ تھا جو بار بار آکر میرے بال نوچتا تھا۔ اور از راہِ تفنن میری تحقیر کررہا تھا۔ میں اپنے آپ کو بامراد محسوس کررہا تھا۔ اور اپنی اس ذلتِ نفس پر خوش ہورہا تھا۔ اہلِ کشتی،

کی خوشی کی انتہا اس وقت ہوئی جب مسخرے نے اٹھ کر میرے اوپر پیشاب کر دیا۔ دوسری بار یہ ہوا کہ میں سخت بارش کے دوران ایک گاؤں میں پہنچا۔ سردی کے مارے ٹھٹھر رہا تھا۔ میرا خرقہ شرابور ہو رہا تھا۔ میں ایک مسجد کے دروازے پر گیا مگر مجھے کسی نے اندر نہ آنے دیا۔ دوسری اور تیسری مسجد سے بھی اسی طرح ناکام لوٹا۔ سردی انتہا کو پہنچ چکی تھی

ص ۶۵/۸۸

میں ایک حمام کی بھٹی میں گھس گیا اور اپنا دامن آگ میں ڈال دیا۔ بھٹی کے دھوئیں میں میرا جسم اور لبادہ سیاہ ہو گئے اس مات بھی میری مراد پوری ہوئی تھی اور مجھے کہ علی بن عثمان رضی اللہ عنہ ہوں ایک بار ایک مشکل پیش آئی جو ہزار کوشش کے باوجود حل نہ ہو رہی تھی۔ اس سے قبل ایک ایسی ہی مشکل کے وقت میں ابویزید رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر جا بیٹھا تھا اور مشکل حل ہو گئی تھی۔ اس بار بھی یہی ارادہ کیا۔ تین مہینے تک مزار پر حاضری دی مگر میری مشکل حل نہ ہو سکی ہر روز تین بار غسل کرتا تھا اور تیس بار طہارت، اس کے باوجود مشکل حل ہونے کی امید بر نہ آئی - اٹھا اور خراسان کے سفر کا ارادہ کیا۔ اس ولایت میں ایک شب میں ایک گاؤں میں وارد ہوا۔ اس میں ایک خانقاہ تھی اور اس میں صوفیا کی ایک جماعت۔ میرا لباس ایک سخت قسم کی گدڑی تھی اور سوائے عصا اور کوزہ کے میرے پاس کوئی رسمی سامان نہیں تھا۔ ان لوگوں کے سامنے میں بالکل حقیر تھا کوئی میرا واقف نہیں تھا۔ انہوں نے رسماً کہا یہ آدمی ہماری جماعت کا نہیں اور حقیقت بھی یہی تھی کہ میں ان کی جماعت میں شامل نہیں تھا۔ اور رات تو مجھے بسر کرنا ہی تھی مجھے ایک چھت پر بٹھا دیا اور خود ایک بلند تر چھت پر بیٹھ گئے۔ میرے سامنے وہ روٹی ڈال دی جو خشک اور سبز ہو چکی تھی۔ ان کے اپنے کھانے کی خوشبو میری طرف آرہی تھی وہ میرے متعلق طنزیہ باتیں کر رہے تھے۔ کھانا ختم کرنے کے بعد وہ خربوزہ کھانے لگے اور اپنی خوش وقتی

ص ۶۶/۸۹

اور میری تحقیر کے لیے خربوزہ کے چھلکے میرے سر پر پھینکتے رہے۔ میں اپنے دل میں کہہ رہا تھا کہ الٰہی اگر میں نے تیری دوستی کا لباس پہنا ہوا نہ ہوتا تو شاید میرے ساتھ یہ کچھ نہ ہوتا۔ وہ جس قدر میرا مذاق اڑاتے تھے، میرا دل خوش ہو رہا تھا یہاں تک کہ اسی بوجھ کے تلے میری مشکل حل ہو گئی۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ مشائخ، جاہلوں کو اپنی مجالس میں کیوں جگہ دیتے ہیں اور ان کا بار کیوں اٹھاتے ہیں۔

یہ ہیں احکام ملامت جو میں نے توفیق خداوندی سے ظاہر کر دیئے وَاللّٰہُ اَعْلَمُ" اور اللہ بہتر جاننے والا ہے"۔

ساتواں باب

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

اب بیان کرتا ہوں کچھ حالات اہل تصوف کے اماموں کے اور صحابہ کرام کے جو بعد از انبیاء معاملات میں ان کے پیش رو۔ انفاس میں اُن کے سردار اور احوال میں اُن کے رہنما ہو گذرے ہیں اور نیز مہاجر و انصار میں سے سابقین اولین کے تاکہ تیرا مقصود یقینی طور پر حاصل ہو انشاء اللہ عزّ و جلّ۔

ان میں شیخ الاسلام، بعد از انبیاء خیر الانام، خلیفۂ پیغمبر و امام، اہل تجرید کے سردار، ارباب تفرید کے شہنشاہ، انسانی آفات سے بعید امیر المومنین ابوبکر عبد اللہ بن عثمان الصدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ جن کی کرامات مشہور ہیں اور حقائق و معاملات میں جن کے اشارات و دلایل ظاہر ہیں۔ باب تصوف میں اُن سے متعلق کچھ بیان ہو چکا۔ مشائخ کرام ان کو ارباب مشاہدہ میں سب سے مقدم سمجھتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی جانب سے روایات و حکایات بہت ہی کم ہیں۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان کی سختیٔ طبع اور علوِ ہمت کے باعث مجاہدہ میں مقدم جانتے ہیں۔ صحیح احادیث میں آیا ہے اور اہل علم میں مشہور ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نماز شب میں قرآن آہستہ پڑھتے تھے۔ حضرت عمرؓ بلند آواز سے پڑھتے تھے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے پوچھا آپ قرآن آہستہ کیوں پڑھتے ہیں۔ انہوں نے عرض کیا اُسْمِعُ مَنْ اُنَاجِیْ "جس کے سامنے میں مناجات کرتا ہوں وہ بہت اچھا سننے والا ہے۔" میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے دور نہیں۔ اس کے سامنے آہستہ یا بلند پڑھنا برابر ہے۔ یہی چیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دریافت کی گئی تو انہوں نے فرمایا: اوقظ الوسنان ای النائم و اَطْرُدُ الشَّیْطَانَ "میں سوتے والوں کو جگاتا ہوں اور شیطان کو دور کرتا ہوں"۔ یہ نشانِ مجاہدہ ہے اور حضرت ابوبکرؓ کا اشارہ مشاہدہ کی طرف تھا۔ اور مجاہدہ کا مقام مشاہدہ کے مقابل ایسا ہی ہے جیسا قطرہ سمندر کے مقابلہ میں۔ اسی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: هَلْ اَنْتَ اِلَّا حَسَنَةٌ مِّنْ حَسَنَاتِ اَبِیْ بَکْرٍ "اے عمرؓ! تو ابوبکرؓ کی خوبیوں میں سے ایک خوبی ہے"۔ غور کرو جب حضرت عمرؓ کی یہ کیفیت ہو تو باقی اہلِ عالم کس شمار میں ہیں۔ روایت ہے کہ حضرت

ص ۶۷/۹

ابوبکر رضؓ نے کہا دَارُنَا فَانِیَۃٌ وَاَحْوَالُنَا عَارِیَۃٌ وَاَنْفَاسُنَا مَعْدُوْدَۃٌ وَکَسَلُنَا مَوْجُوْدٌ " ہمارا جہان فانی ہے، ہمارے احوال عاری۔ ہمارے سانس محدود اور ہماری کاہلی نمایاں"۔ سرائے فانی کی تعمیر جہالت ہے، عاری احوال پر بھروسہ حماقت۔ گنتی کے چند سانس پر اعتبار غفلت اور کاہلی کو مذہب سمجھنا خیانت ہے۔ کیونکہ جو چیز عارِیتاً ملی ہو واپس کرنا پڑے گی۔ جو چیز فانی ہے۔ ایک دن نابود ہو جائے گی۔ جو چیز گنتی کی ہے ختم ہو جائے گی۔ کاہلی کا بجائے خود کوئی علاج نہیں۔ اشارہ یہ ہے کہ دنیا و مافیہا میں کوئی ایسی چیز نہیں کہ اس کا دلدادہ ہو جائے کیونکہ فانی اشیاء کی دلدادگی حجابِ حق ہو جایا کرتی ہے۔ دنیا اور نفس امارہ طالب و مطلوب کے درمیان پردہ حائل ہیں۔ دوستانِ حق انہی سے پرہیز کرتے ہیں۔ جو چیز عاریتاً ملی ہو وہ کسی اور کی ملکیت ہوتی ہے۔ اور اہلِ حق کسی اور کی چیزیں تصرف نہیں کرتے۔ یہ بھی روایت ہے کہ وہ مناجات میں کہا کرتے تھے۔ اَللّٰھُمَّ اُبْسُطْ لِیَ الدُّنْیَا وَزَھِّدْنِیْ فِیْھَا " اے اللہ دنیا میرے اوپر فراخ کر اور اس میں مجھے زہد عنایت فرما یعنی اس کی آفات سے مجھے محفوظ فرما۔ اس چیز میں ایک رمز ہے پہلے دنیا مانگی تاکہ شکر بجا لائیں۔ پھر توفیق مانگی کہ صرف خدا کے لیے اس سے دست بردار ہو سکیں تاکہ مقامِ شکر و انفاق (خدا کی راہ میں خرچ کرنا) بھی حاصل ہو اور مقامِ صبر بھی اور فقر کی بنیاد اختیار پر ہو اور اضطرار کا اس میں دخل نہ ہو۔ یہ تردید ہے اس بزرگ کے قول کی جس نے کہا کہ اضطراری فقر اختیاری فقر سے بہتر ہوتا ہے کیونکہ اضطراری فقر از خود معرضِ وجود میں آتا ہے اور اختیاری فقر خود پیدا کیا جاتا ہے۔ بہتر وہ فقر ہے جو بلا کوشش و تکلف میسر آئے۔ ہم کہتے ہیں کہ خوشتر فقیر وہی ہوتا ہے جس کا شوقِ فقر حالتِ غنا میں اس کے دل پر غلبہ کرے اور وہ دنیا کی محبوب چیزوں اور اولاد سے اسے بے نیاز کر دے۔ یہ نہیں کہ عالمِ فقر میں غنا کی خواہش دل پر طاری ہو اور ایسی شدت اختیار کرے کہ فقیر درہم و دینار کی تلاش میں ظالموں اور حاکموں کے دروازوں کی خاک چھانتا پھرے۔ غنا سے فقر کے دائرے میں آنے والا قابلِ تعریف ہے فقر میں طلبِ ریاست کرنے والا نہیں۔ علاوہ ازیں صدیق اکبر رضؓ بعد از انبیاء جملہ خلائق سے مقدم ہیں اور ان سے آگے قدم رکھنا ہرگز روا نہیں۔ انہوں نے فقرِ اختیاری کو فقرِ اضطراری سے مقدم سمجھا ہے اور تمام مشائخ کرام کا یہی مسلک ہے سوائے اس ایک بزرگ کے جس کا قول ہم نے بیان کیا اور اس کے استدلال کی تردید کی کیونکہ اس نے اپنے قول کی حضرت ابوبکر رضؓ کے مقابل اہمیت ظاہر کی تھی اور استدلال کیا تھا۔ زہری نے روایت کی ہے کہ جب لوگ حضرت ابوبکر رضؓ کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت کر رہے تھے تو آپ نے منبر پر خطبہ ارشاد فرمایا اور کہا: وَاللّٰہِ مَا کُنْتُ حَرِیْصًا عَلَی الْاِمَارَۃِ یَوْمًا وَّلَا لَیْلَۃً قَطُّ وَلَا کُنْتُ فِیْھَا رَاغِبًا وَّلَا سَأَلْتُھَا اللّٰہَ

ص ۶۹/۹۲

قَطُّ فِیْ سِرٍّ وَّعَلَانِیَۃٍ وَمَالِیْ فِی الْاِمَارَۃِ مِنْ رَاحَۃٍ" بخدا مجھے امیر بننے کا لالچ نہیں اور نہ میں نے کسی دن یا رات امارت کی حرص کی ہے نہ مجھے اس سے رغبت ہے۔ نہ میں نے ظاہر یا پوشیدہ کبھی باری تعالیٰ سے اس کی خواہش کی اور نہ میرے لیے اس میں کوئی راحت ہے۔" جب خدائے بزرگ کسی کو کمالِ صدق کا مقام عطا کرتا ہے اور محل تمکین سے نوازتا ہے تو وہ اشارۂ حق کا منتظر رہتا ہے جو اشارہ ہو اس پر عمل پیرا ہو جاتا ہے۔ فقر ہو یا امارت۔ اس میں تصرف و اختیار کی گنجائش نہیں ہوتی۔ چنانچہ حضرت صدیق رضؓ نے ابتدا تا انتہا بجز تسلیم کسی چیز کو نہیں اپنایا۔ اہل تصوف تجرید، تمکین۔ خواہشِ فقر اور آرزوئے ترکِ ریاست میں حضرت ابوبکر رضؓ کے پیروکار ہیں اور وہی عام مسلمانوں کے اور خاص طور پر صوفیا کے امام دین و طریقت ہیں۔

اور انہی میں سے اہلِ ایمان کے سردار۔ اہلِ احسان کے پیشوا۔ اہلِ تحقیق کے امام۔ بحرِ محبت میں غرق ابوحفص عمر الخطاب رضی اللہ عنہ تھے۔ جو کرامت و فراست میں مشہور ہیں اور جن کی دانش و استقلال کا شہرہ ہے۔ تصوف میں ان کے بہت سے لطیف و دقیق رموز ہیں۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَلْحَقُّ یَنْطِقُ عَلٰی لِسَانِ عُمَرَ "حق زبانِ عمر رضؓ پر گویا ہے" نیز فرمایا: قَدْ کَانَ فِی الْاُمَمِ مُحَدَّثُوْنَ فَاِنْ یَّکُ مِنْھُمْ فِیْ اُمَّتِیْ فَعُمَرُ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ "پہلی امتوں میں محدث ہو گذرے ہیں اگر میری امت میں ان میں سے ہے تو عمر رضؓ ہے۔" طریقت میں آپ کے بہت سے لطیف رموز ہیں جو اس کتاب میں تحریر نہیں ہو سکتے۔ آپ نے فرمایا اَلْعُزْلَۃُ رَاحَۃٌ مِّنْ خُلَطَاءِ السُّوْءِ "گوشہ نشینی بری صحبت کی نسبت باعث راحت ہے۔" گوشہ نشینی کی دو صورتیں ہیں ایک خلقت سے پرہیز دوسرے قطعِ تعلق۔ پرہیز کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے لیے گوشۂ تنہائی منتخب کرے۔ بظاہر ہم جنسوں کی صحبت سے دور رہے۔ عزلت میں اپنے عیوب پر نظر رکھے۔ لوگوں سے میل ملاپ قطع کرے اور کسی کو اپنے افعال سے گزند نہ پہنچائے۔ قطع تعلق دل سے منسوب ہے جب کسی بیرونی چیز سے تعلق نہ ہو۔ جب انسان قطع علائق کر لیتا ہے تو اس کو کسی مخلوق کا کوئی علم نہیں ہوتا اور کسی چیز کا خیال اس کے دل و دماغ پر طاری نہیں ہوتا وہ لوگوں میں رہتا ہے اور لوگوں سے دور ہوتا ہے۔ یہ بہت بلند مقام ہے۔ حضرت عمر رضؓ اس معاملے میں صحیح راستے پر تھے وہ بظاہر لوگوں میں خلیفہ اور حاکم کی حیثیت سے موجود تھے مگر ان کے قول سے بالکل واضح ہے کہ اہل حق اگرچہ لوگوں سے ملتے جلتے ہیں مگر ان کے دلوں کا لگاؤ باری تعالےٰ

ہی سے ہوتا ہے اور ہر حال میں اسی کی طرف لوٹتے ہیں۔ جس قدر بھی صحبت خلق ان کو نصیب ہو وہ حکم باری تعالیٰ پر مبنی سمجھتے ہیں۔ تاہم یہ صحبت ان کو حق سے روگرداں نہیں کر سکتی کیونکہ دوستانِ حق کی نظر میں دنیا کسی صورت میں بھی آئینہ صفا نہیں ہوتی۔ اور اس کے حالات کبھی قابلِ التفات نہیں ہوتے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: دَارٌ اُسِّسَتْ عَلَی الْبَلْوٰی بِلَا بَلْوٰی مُحَالٌ "جس سرائے کی بنیاد بلا پر ہو وہ کبھی بلا سے خالی نہیں ہو سکتی"۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص صحابی تھے اور ان کے جملہ کام مقبول تھے۔ جب وہ مشرف باسلام ہوئے تو حضرت جبریل علیہ السلام نے آکر کہا: یَا مُحَمَّدُ قَدِ اسْتَبْشَرَ اَهْلُ السَّمَاءِ الْيَوْمَ بِاِسْلَامِ عُمَرَ "اے محمد! آج اہل آسمان عمر کے اسلام کی بشارت دیتے ہیں"۔ پس مشائخ طریقت خرقہ صوف پہننے اور دین کے بارے میں سختی کرنے میں ان کی پیروی کرتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ جملہ دینی امور میں تمام مخلوق کے امام ہیں۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ "اللہ ان سے راضی ہوا۔"

اور ان میں سے اور نیز صحابہ عظام میں گنجینۂ حیا، اہل صفا کے سردار، درگاہِ رضا کے مقبول، طریقِ مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم سے مزین ابوعمرو عثمان رضی اللہ عنہ تھے جن کے فضائل و مناقب بہر انداز روشن ہیں۔ عبداللہ ابن رباح اور ابوقتادہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حرب الدار کے روز ہم امیر المومنین حضرت عثمان رضؓ کے پاس تھے جب شور و غوغا کرنے والے ان کی بارگاہ میں جمع ہوئے تو ان کے غلاموں نے ہتھیار سنبھال لیے۔ آپ نے حکم دیا جو غلام ہتھیار نہ اٹھائے وہ آزاد ہے۔ ہم بسبب خوف باہر نکلے۔ حضرت حسن ابن علیؓ سے ملاقات ہوئی ہم پھر ساتھ ہو لیے یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ بارگاہِ خلافت میں پہنچ کر انہوں نے حضرت عثمان رضؓ کو سلام کیا شور و غوغا پر اظہارِ تاسف کرتے ہوئے عرض کی یا امیر المومنین آپ کے حکم کے بغیر ہم تلوار نہیں نکال سکتے۔ آپ سچے امام ہیں اجازت دیجیے۔ ہم اس فتنہ کو دور کر دیں۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا یَا ابْنَ اَخِیْ اِرْجِعْ وَاجْلِسْ فِیْ بَیْتِكَ حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ فَلَا حَاجَةَ لَنَا فِیْ اِهْرَاقِ الدِّمَاءِ "اے میرے بھائی کے بیٹے لوٹ جاؤ اور اپنے گھر میں بیٹھ یہاں تک کہ تقدیرِ خداوندی ظاہر ہو۔ پس ہمیں مسلمانوں کا خون بہانا درکار نہیں"۔ یہ درد و بلا کے عالم میں تسلیم کا نشان ہے۔

جب نمرود علیہ اللعنۃ نے آگ بھڑکا کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو منجنیق میں آگ کے اندر ڈالنے

ص ۷۱/۹۶

کے لیے رکھ دیا حضرت جبریل علیہ السلام نے آکر کہا: هَلْ لَكَ مِنْ حَاجَةٍ "کیا تجھے کوئی ضرورت ہے"۔ فرمایا
اَمَّا اِلَيْكَ فَلَا "تجھ سے کسی چیز کی ضرورت نہیں"۔ جبریلؑ نے کہا تو اللہ سے مانگیے فرمایا: حَسْبِيْ مِنْ سُؤَالِيْ
عِلْمُهٗ بِحَالِيْ "مجھے یہ کافی ہے کہ وہ میرے حال سے واقف ہے"۔ وہ میرا حال مجھ سے بہتر جانتا ہے اسے علم ہے کہ
بہتری کس چیز میں ہے۔ اس جگہ حضرت عثمان رضؓ بجائے خلیلؑ تھے۔ شور و غوغا بجائے آتش نمرود اور حسن رضؓ بجائے
جبریلؑ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے نجات تھی۔ حضرت عثمان رضؓ کے لیے شہادت۔ نجات کو بقا سے تعلق ہے اور
شہادت کو فنا سے۔ اس چیز کی نسبت قبل ازیں لکھا جا چکا ہے۔ اہلِ تصوّف بذلِ مال و جان تسلیم امور اور خلوصِ
عبادت میں حضرت عثمان رضؓ کی پیروی کرتے ہیں وہ حقیقت اور شریعت میں بلاشبہ امامِ حق تھے دوستیٔ حق میں ان کا
مرتبہ ظاہر ہے۔

اور نیز ان میں برادرِ مصطفےٰ، بحرِ بلا کے غوّاص، سوختۂ آتشِ ولایت، تمام اولیا اور اصفیا کے پیشوا ابو الحسن
علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ ہیں۔ جن کو تصوّف میں شانِ عظیم اور مرتبۂ بلند حاصل تھا۔ اصولِ حقیقت میں اس قدر
باریک بین اور نکتہ رس تھے کہ حضرت جنید رحؒ نے ان کی نسبت کہا: شَيْخُنَا فِي الْاُصُوْلِ وَالْبَلَاءِ عَلِيُّ الْمُرْتَضٰى
رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ "اصول اور بلاکشی میں ہمارے پیر علی مرتضیٰ ہیں"۔ یعنی معاملت و علم میں علی رضؓ ہمارے امام ہیں۔
علمِ تصوف کو اہلِ تصوّف اصول کہتے ہیں اور معاملت تمام بلاکشی ہوتی ہے۔ کوئی شخص حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے
پاس حاضر ہوا اور عرض کی حضور مجھے کچھ وصیت فرماویں۔ آپ نے فرمایا: لَا تَجْعَلَنَّ اَكْبَرَ شُغْلِكَ
بِاَهْلِكَ وَوَلَدِكَ فَاِنْ يَّكُنْ اَهْلُكَ وَوَلَدُكَ مِنْ اَوْلِيَاءِ اللّٰهِ تَعَالٰى فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ
اَوْلِيَاءَهٗ وَاِنْ كَانُوْا اَعْدَاءَ اللّٰهِ فَمَا هَمُّكَ وَشُغْلُكَ لِاَعْدَاءِ اللّٰهِ "دیکھ زن و فرزند کے معاملے
کو ہر کام سے زیادہ اہمیت نہ دے اگر وہ اللہ کے دوست ہیں تو اللہ اپنے دوستوں کو ضائع نہیں کرتا اور اگر
وہ اللہ کے دشمن ہیں تو تجھے اس کے دشمنوں سے کیا تعلق"۔ اس مسئلہ کا تعلق غیر اللہ سے قطع تعلق سے ہے
وہ اپنے بندوں کو جس طرح چاہتا ہے رکھتا ہے۔ یقین صادق ہونا چاہیے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت
شعیبؑ کی بیٹی کو عالمِ مصیبت میں چھوڑ دیا اور باری تعالیٰ کے سپرد کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت
ھاجرہ اور حضرت اسماعیل کو لق و دق صحرا میں چھوڑ دیا اور خدا کے حوالے کیا۔ ان کو کسی کام سے بڑھ کر اہمیت

نہیں دی اور اپنے دلوں کو حق تعالیٰ کی طرف لگا لیا اور تسلیمِ امور سے دونوں جہان کی مرادیں پائیں۔ یہ وہی چیز ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس سائل سے کہی جس نے دریافت کیا کہ پاکیزہ ترین چیز کیا ہے۔ فرمایا اللہ کا غنی کیا ہوا دل۔ جو دل اللہ کی ذات کی عنایات سے غنی ہو۔ متاعِ دنیا کا فقدان اسے فقیر نہیں کر دیتا اور نہ اس کی موجودگی مسرت کا باعث نہیں ہوتی۔ یہ بات فقر و تصوّف تک جاتی ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اہلِ تصوف حقائق عبارات۔ دقائق اشارات۔ تجریدِ دنیا و آخرت اور نظارہ تقدیرِ حق کے معاملے میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی پیروی کرتے ہیں۔ ان کے لطائفِ کلام لاتعداد ہیں۔ اور ہمیں اس کتاب کو مختصر رکھنا ہے۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ "اور اللہ بہتر جاننے والا ہے"۔

۸

آٹھواں باب

اہل بیت رضی اللہ عنہم

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت تقدسِ ازلی میں مخصوص تھے اور ہر ایک کو تصوف میں کمال حاصل تھا اور سب اہلِ تصوف کے سردار تھے بلاتخصیص میں ان میں سے صرف چند کے متعلق تھوڑا سا بیان کروں گا انشاء اللہ تعالیٰ۔

اُن میں جگر بندِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم، ریحانِ دلِ مرتضےٰ، نورِ چشمِ زہراؓ ابو محمد الحسن بن علی کرم اللہ وجہہ ہیں۔ ان کو اس طریقت پر نظرِ غائر حاصل تھی اور اس موضوع پر ان کے دقیق نکات بکثرت ہیں۔ از راہِ وصیت انہوں نے کہا: علیکم بحفظ السرائر فان اللہ مطلع علی الضمائر "تم اپنے دلوں کی حفاظت کرو کیونکہ خدائے عزّوجلّ تمہارے دلوں کے راز جاننے والا ہے۔" اس کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ کو دل کی حفاظت کا حکم ہے جس طرح اظہار کی حفاظت کا۔ دل کی حفاظت یہ ہے کہ غیر اللہ کی طرف عدمِ التفات ہو۔ اظہار کی حفاظت یہ ہے کہ مخالفتِ خدائے جبار مفقود ہو۔ کہتے ہیں جب قدریوں کا زور ہوا اور معتزلہ کی تعلیم جہان میں عام ہوگئی تو حسن بصریؒ نے حضرت حسن بن علی کرم اللہ وجہہ کو خط لکھا اور کہا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ السلام علیك یابن رسول اللہ وقرۃ عینیہ ورحمۃ اللہ وبرکاتہ **اما بعد** فانکم معاشر بنی ھاشم کالفلك الجاریۃ فی بحر لجی ومصابیح الدجی واعلام الھدی وائمۃ القادۃ الذین من تبعھم نجی کسفینۃ نوح المشحونۃ التی یئول الیھا المؤمنون وینجو فیھا المتمسکون فما قولك یابن رسول اللہ عند حیرتنا فی القدر واختلافنا فی الاستطاعۃ لتعلمنا بما تاکد علیہ رایك فانکم ذریۃ بعضھا من بعض بعلم اللہ علمتم وھو الشاھد علیکم وانتم شھداء اللہ علی الناس والسلام۔

ص ۹۹/۷

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند اور نورِ چشم آپ پر اللہ کی سلامتی،
رحمت اور برکت ہو۔ امّا بعد واضح ہو کہ آپ بنو ہاشم ہیں۔ آپ کی مثال بحرِ ذخّار میں کشتیوں کی ہے اور ظلمتوں میں روشنی
اور ہدایت کے نشانات کی۔ آپ وہ پیشوا ہیں کہ جو آپ کی پیروی کرے وہ نجات پائے جس طرح حضرت نوح علیہ
السلام کے ایماندار پیروکاروں نے ان کی طرف توجہ کی اور کشتی کے ذریعہ نجات پائی۔ کیا فرماتے ہیں آپ قدر کے
پرپیچ مسئلہ پر اور اس بحث پر کہ آدمی محض مجبور ہے یا اسے افعال پر اختیار و استطاعت ہے۔ آپ فرزندِ پیغمبر
صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اللہ نے آپ کو علم دیا ہے وہ آپ کا محافظ ہے اور آپ خلقت کے محافظ ہیں اور گواہ۔ والسلام۔

جب حضرت حسن رضؓ کو خط ملا تو انھوں نے جواب میں لکھا:

ص ۸ / ۱۰۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم **اما بعد** فقد انتہیٰ الیّ کتابك عند حیرتك وحیرة
من زعمت من امّتنا والذی علیه رایی انّ من لم یؤمن بالقدر خیره وشرّه من اللہ تعالیٰ
فقد کفر ومن حمل المعاصی علی اللہ فقد فجر ان اللہ لا یطاع باکراہ ولا یعصی بغلبة ولا
یهمل العباد فی ملکه لکنه المالك لما ملّکهم والقادر علی ما علیه قدرهم فان ائتمروا بالطاعة
لم یکن لهم صادًا ولا لهم عنها مثبطا وان اتوا بالمعصیة وشاء ان یمنّ علیهم فیحول
بینهم وبینها فعل وان لم یفعل فلیس هو حملهم علیها اجبارا ولا الزمهم اکراها
ایاها باحتجاجه علیهم ان عرفهم ومکنهم وجعل لهم السبیل الی اخذ ما دعاهم الیه
وترك ما نهاهم عنه ولله الحجة البالغة والسلام۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم **امّا بعد**! آپ کا خط مجھے پہنچا جو لوگ قدرِ خیر و شر من اللہ پر
ایمان نہیں رکھتے کافر ہیں اور جو اپنے گناہوں کو اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں فاجر ہیں۔ قدریہ جماعت کا مذہب
انکارِ تقدیر ہے اور جبریہ جماعت گناہوں کو حق تعالیٰ سے منسوب کرتی ہے۔ بندہ خدائے عزّوجلّ کی جانب سے
ملی ہوئی استطاعت تک اپنے افعال پر مختار ہے اور ہمارا مذہب قدر و جبر کے بین بین ہے"۔

میرا مقصد صرف یہی ایک جملہ بیان کرنا تھا تمام عبارت اس لیے نقل کی کہ بات نہایت فصیح اور موزون
تھی اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حضرت حسن رضؓ کا مقام علمِ حقائق و اصول میں اتنا بلند تھا کہ حسن بصریؒ کو ان کی

ص ۷۶ / ۱۰۱

وسعتِ علم سے مستفید ہونے کی ضرورت پڑی۔ حکایات میں ہے کہ ایک بدوی صحرا سے آیا۔ حضرت حسنؓ کوفہ میں اپنے گھر کے دروازہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بدوی نے گالی دی اور آپ کے ماں باپ کو بُرا کہا۔ آپ اُٹھے اور کہا اے بدوی تو بھوکا ہے یا پیاسا یا تجھے کوئی تکلیف ہے؟ اس نے پھر آپ کو اور آپ کے ماں باپ کو برا بھلا کہا۔ حضرت حسنؓ نے ایک غلام کو حکم دیا اور اس نے ایک تھیلی چاندی کے سکّوں کی بدوی کے آگے ڈال دی۔ پھر آپ نے فرمایا مجبور ہوں اس سے زیادہ میرے گھر میں موجود نہیں ورنہ دریغ نہ کرتا۔ جب بدوی نے یہ بات سنی تو پکار اٹھا میں گواہی دیتا ہوں کہ تو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرزند ہے میں صرف حلم طبع کا امتحان لے رہا تھا۔ یہ محقق اہل تصوف کی صفت ہے۔ وہ خلقت کی مدح و ذم سے متاثر نہیں ہوتے اور سخت کلامی اُن کو متغیر نہیں کرتی۔

اور اس جماعت میں شامل ہیں چراغ خاندان مصطفوی۔ جملہ تعلقات سے مجرد۔ اپنے زمانے کے سردار ابو عبداللہ الحسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم۔ محقق ولی اللہ، قبلۂ اہلِ صفا قتیل کربلا۔ اہل تصوّف ان کی درستیٔ حال پر متفق ہیں۔ جب تک حق ظاہر تھا آپ متابعتِ حق میں معروف رہے اور جب حق مفقود ہوا تو شمشیر بدست میدان میں نکل آئے اور خدا کی راہ میں سر قربان کیے بغیر آرام نہ لیا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو متعدد نوازشات سے سرفراز کیا۔ حضرت عمرؓ بن خطّاب سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک دن دیکھا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھٹنوں پر جھکے ہوئے چل رہے تھے۔ حضرت حسینؓ ان کی پشتِ مبارک پر سوار تھے۔ رسّی کا ایک سرا ان کے ہاتھ میں تھا اور دوسرا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے دہنِ مبارک میں تھا۔ حضرت عمرؓ نے کہا! "ابو عبداللہ! کیا عمدہ اونٹ سواری کے لیے پایا ہے۔" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "عمر! یہ سوار بھی تو کتنا اچھا ہے۔"

ص ۷۶ / ۱۰۲

حضرت امام حسین رضہ طریقت میں کلامِ لطیف فرماتے تھے۔ کئی بیش قیمت رموز اور اشارات ان سے مذکور ہیں ان کا قول ہے: اَشْفَقُ الْاِخْوَانِ عَلَیْکَ دِیْنُکَ۔ "تیرا سب سے زیادہ شفیق بھائی تیرا دین ہے۔" آدمی کی نجات دین کی متابعت میں ہے۔ دین کی مخالفت ہلاکت کا باعث ہے۔ دانائی یہ ہے کہ انسان شفیق بھائی کی مرضی پر چلے۔ اس کی شفقت کا احساس رکھے اور متابعت کرے۔ شفیق بھائی وہ ہے جو نصیحت کرے اور شفقت کا دروازہ کبھی بند نہ کرے۔ کہتے ہیں۔ ایک دن کوئی شخص حضرت امام حسینؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ میں درویش ہوں۔ میرے اہل و عیال ہیں۔ آج رات کے لیے کھانا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا بیٹھ جاؤ۔ میرا رزق

آ رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد معاویہ رضؓ کی طرف سے پانچ تھیلیاں آئیں۔ ہر تھیلی میں ہزار دینار تھے۔ لانے والے نے عرض کیا کہ معاویہ رضؓ نے معذرت کی ہے اور کہا ہے کہ ابھی یہ اپنے خدمت گزاروں پر خرچ کریں۔ اور انتظام کیا جا رہا ہے حضرت امام حسین رضؓ نے پانچوں تھیلیاں سائل کو اٹھا دیں اور فرمایا۔ تمہیں بہت زحمت ہوئی۔ بہت انتظار کرنا پڑا۔ یہی کچھ پیش کر سکتے ہیں۔ اگر ہمیں معلوم ہوتا اس قدر تکلیفِ انتظار نہ دیتے۔ کیا کریں۔ ہم مبتلائے بلا ہیں۔ دنیا کی راحتوں کو ترک کر چکے ہیں۔ اپنے مقاصد کو کھو چکے ہیں اور زندگی اوروں۔ کی خاطر بسر کرنی چاہیئے ۔ آپ کے مناقب اُمت میں کسی سے پوشیدہ نہیں۔

اور اسی جماعت میں وارثِ نبوت، چراغِ امت، سیّد مظلوم، امام مرحوم، عابدوں کے سرتاج اور اوتاد کے رہنما ابو الحسن **علی** بن حسین بن علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ ہیں۔ اپنے زمانے میں سب سے زیادہ مکرّم اور عابد تھے۔ اظہارِ حقیقت اور دقیقہ گوئی میں مشہور تھے۔ لوگوں نے پوچھا۔ دنیا اور آخرت میں زیادہ سعادت کس کو نصیب ہے؟ فرمایا مَنْ اِذَا رَضِیَ لَمْ یَحْمِلْهُ رِضَاهُ عَلَی الْبَاطِلِ وَاِذَا سَخِطَ لَمْ یُخْرِجْهُ سَخَطُهُ عَنِ الْحَقِّ۔ "وہ شخص جو راضی ہو کر باطل کی طرف مائل نہ ہو اور ناراض ہو کر حق کو نہ چھوڑ جائے"۔ اور یہ اہلِ استقامت کا کمال ہے "باطل کو برداشت کرنا باطل ہے اور ناراض ہو کر حق کو چھوڑ دینا بھی باطل ہے مومن کبھی مبتلائے باطل نہیں ہوتا۔"

مذکور ہے کہ جب میدانِ کربلا میں حسین ابن علیؓ کو فرزندوں سمیت شہید کر دیا گیا تو سوائے حضرت زین العابدین کے مستورات کا کوئی پرسانِ حال نہیں تھا، وہ بھی بیمار تھے۔ حضرت حسین رضؓ ان کو علی اصغر کہا کرتے تھے۔ جب مستورات کو اونٹوں پر برہنہ سر دمشق میں لے کر آئے۔ یزید بن معاویہ کے سامنے پیش کرنے کے لیے کسی نے کہا: کَیْفَ اَصْبَحْتُمْ یَا عَلِیُّ وَیَا اَهْلَ بَیْتِ الرَّحْمَةِ قَالَ اَصْبَحْنَا مِنْ قَوْمِنَا بِمَنْزِلَةِ قَوْمِ مُوْسٰی مِنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَاءَهُمْ وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَاءَهُمْ فَلَا نَدْرِیْ صَبَاحَنَا مِنْ مَسَائِنَا وَهٰذَا مِنْ حَقِیْقَةِ بَلَائِنَا۔ "اے علی اور اے اہلِ بیتِ رحمتِ عالمین یہ کیسی صبح ہے؟ فرمایا ہماری صبح ہماری قوم کے ہاتھوں میں ایسی ہے جیسی قومِ موسیٰ کی صبح فرعون اور اس کی قوم کے ہاتھوں تھی۔ ان کے مردوں کو قتل کیا جاتا تھا اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھا جاتا تھا۔ ہمارے لیے صبح و شام کی تفریق ختم ہو چکی ہے یہ ہماری مصیبت کی حقیقت ہے۔

حکایات میں ہے کہ ہشام بن عبد الملک بن مروان ایک سال حج کو آیا۔ خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا جب حجرِ اسود پر بوسہ دینے کا ارادہ کیا تو خلقت کے ہجوم کی وجہ سے اسے راستہ نہ ملا۔ وہ منبر پر چڑھا اور خطبہ پڑھنا شروع کیا۔ اسی وقت حضرت زین العابدینؒ تشریف لائے چہرہ ماہ کامل کی طرح روشن۔ رخسار دمکتے ہوئے اور لباس خوشبو سے معطّر۔ انہوں نے طواف کیا۔ جب حجرِ اسود کے پاس آئے تو لوگ تعظیماً ایک طرف ہٹ گئے اور آپ نے بڑھ کر پتھر کو بوسہ دیا۔ ہشام بن عبد الملک سے کسی نے کہا آپ امیر المومنین ہیں آپ کو حجر اسود تک باریابی نہ ہوئی وہ جوانِ رعنا آیا تو سب لوگ ایک طرف ہٹ گئے اور سنگِ اسود اس کے لیے خالی کر دیا۔ ہشام نے کہا کہ میں اس کو نہیں جانتا ہشام کا مطلب یہ تھا کہ اس کے لوگ حضرت زین العابدین کو پہچان کر ان کی طرف داری اختیار کر کے انہیں امیر بنانے کی کوشش نہ کریں۔ فرزدق شاعر موجود تھا اس نے کہا میں جانتا ہوں۔ لوگوں نے کہا تو بیان کر وہ کون ہے؟ اس کے چہرے سے کیا ھیبت ٹپک رہی ہے۔ فرزدق نے کہا سو میں اس کے صفات اور اس کا نسب بیان کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر فرزدق نے اشعار پڑھے:

ص ۷۸/۱۰۵

۱۔ یہ وہ شخص ہے جس کے نقشِ قدم اہل مکہّ پہچانتے ہیں جس کو خانہ کعبہ اور حرم جانتے ہیں۔

۲۔ یہ خلقِ خدا میں سب سے اچھے آدمی کا بیٹا ہے۔ یہ مشہور متقی و پرہیز گار ہے۔

۳۔ یہ فاطمۃ الزہرا کا لال ہے تو جہالت سے اس کو نہیں جانتا۔ اس کے نانا پر نبوت ختم ہوئی۔

وغیرہ تا صفحہ ۷۹/۱۰۶

اسی طرح اس نے اور اشعار کہے اور اہل بیت کی تعریف کی۔

ہشام برافروختہ ہو گیا اور اس نے فرزدق کو مدینہ اور مکہّ کے درمیان عسفان کے مقام پر قید کر دیا۔ جب یہ خبر حضرت زین العابدین کو ملی تو انہوں نے بارہ ہزار درہم فرزدق کو بھجوائے اور کہلا بھیجا ہم مجبور ہیں اس سے زیادہ ہمارے پاس نہیں۔ فرزدق نے وہ روپیہ یہ کہہ کر واپس کر دیا۔ کہ اے فرزند پیغمبر میں تمام عمر مال و زر کے لیے بادشاہوں اور امیر لوگوں کے قصائد لکھتا رہا ہوں اور ان کی تعریف میں جھوٹ بولتا رہا ہوں۔ یہ اشعار میں نے اہل بیت کی تعریف میں از راہِ کفارہ کہے ہیں جب یہ پیغام امام زین العابدین کو ملا انہوں نے رقم واپس بھجوا دی اور کہا:

ص ۸۰/۱۰۷

اے فرزدق اگر تمہیں واقعی ہمارے ساتھ ارادت ہے تو یہ خیال نہ کرو کہ جو کچھ دے چکے اسے

واپس لے لیں۔ ہم اس کی ملکیت سے دستبردار ہو چکے ہیں۔

حضرت زین العابدینؓ کے مناقب اتنے ہیں کہ احاطۂ تحریر میں نہیں آ سکتے۔

اہل بیت میں سے معاملت کی دلیلِ غالب۔ صاحبانِ مشاہدہ کی حجت ظاہر۔ اولادِ نبیؐ میں امام اور نسلِ علیؓ میں برگزیدہ ابو جعفر محمد بن علی بن حسین بن علی کرم اللہ وجہہ بن ابی طالب ہیں۔ آپ کو امام باقرؒ بھی کہتے ہیں۔ آپ کی کنیت ابو عبداللہ اور لقب باقر تھا۔ علمی باریکیاں اور کتابِ حق میں لطیف اشارات آپ سے مخصوص ہیں۔ آپ کی کرامات مشہور، نشانات روشن اور دلائل واضح ہیں۔ کہتے ہیں ایک بادشاہِ وقت نے آپ کو شہید کرنے کا ارادہ کیا اور بلوا بھیجا جب آپ تشریف لائے تو اس نے معذرت کی تحائف دیئے اور بطریق احسن واپس کر دیا۔ لوگوں نے پوچھا تو در پے قتل تھا یہ کیا ہوا؟ بادشاہ نے جواب دیا جب وہ میرے پاس آئے تو ان کے دائیں بائیں دو شیر تھے اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اگر میں نے ہاتھ اٹھایا تو وہ مجھے چیر ڈالیں گے۔ ص ۸۱/۱۰۸

روائت ہے کہ آپ نے فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ "جس نے طاغوت کو چھوڑا اور اللہ پر ایمان لایا" کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا: كُلُّ مَنْ شَغَلَكَ عَنْ مُطَالَعَةِ الْحَقِّ فَهُوَ طَاغُوْتُكَ "جو کام تجھے یادِ الٰہی سے غافل کر دے وہی تیرا طاغوت ہے"۔ غور کر کہ تو کس چیز سے محجوب ہے یعنی کون سی چیز ہے جو تجھے یادِ الٰہی سے غافل رکھتی ہے اس کو ترک کر تا کہ تیرے لیے کشفِ اسرار ہو۔ س علمِ باطن کا دروازہ کھل جائے اور راہ میں کوئی پردہ حائل نہ رہے کیونکہ جہاں پردہ باقی ہو وہاں قرب کا دعویٰ بیکار ہے۔

آپ کے خادموں میں سے ایک نے روائت کی ہے کہ کچھ رات گئے آپ اوراد سے فارغ ہو کر بلند آواز سے مناجات کرتے تھے اور کہتے تھے۔ اے میرے اللہ۔ میرے مولا۔ رات آ گئی۔ دنیا والوں کی بادشاہی ختم ہوئی۔ آسمان پر ستارے نکل آئے۔ خلقت خوابِ غفلت میں کھو گئی آنکھیں بند ہو گئیں آوازیں گم ہو گئیں۔ لوگ اہلِ دنیا کی بارگاہوں سے چل دیئے۔ بنو امیہ بسترِ استراحت میں چلے گئے۔ اپنی قیمتی اشیاء محفوظ کر لیں۔ اپنے دروازے بند کر لیے نگہبان اور پہرے دار مقرر ہو چکے۔ حاجتمند ان کے دروازے چھوڑ کر جا چکے۔ باری تعالیٰ تو زندہ اور قائم ہے۔ دیکھنے والا اور جاننے والا ہے۔ سونا اور اونگھنا تیری ذاتِ پاک سے بعید ہے جو یہ نہیں سمجھتا ہے وہ کسی نعمت کے قابل نہیں۔ اے خدا ایک چیز تجھے دوسری چیز سے غافل نہیں کرتی۔ تیری بقا شب و روز کے تغیر سے بالاتر ہے۔

ص ۸۱/۱۰۹ جو دعا کرے تیرے دروازے اس پر کھل جاتے ہیں۔ تیری توصیف کرنے والے پر تیرے خزانے کھلے ہیں۔ جو سوالی تیرے در پر آتا ہے کبھی خالی نہیں جاتا۔ جو دعا کرتا ہے کبھی مایوس نہیں لوٹتا۔ اے خدا جب مجھے موت اور قبر کے حساب کا خیال ہو تو کونسی مسرت مجھے اپنا سکتی ہے۔ جب ملک الموت میرے سامنے ہو تو میں دنیا کی کونسی منفعت کی آرزو کر سکتا ہوں میں ہر چیز تیری ذاتِ پاک سے مانگتا ہوں تو واحد و لاشریک ہے۔ تیری جناب میں دعا ہے کہ بوقتِ مرگ سکون بے عذا ب عطا فرما اور بروزِ حساب راحتِ بے عذاب مرحمت فرما۔ آپ یہ دعائیں مانگتے اور روتے تھے۔ ایک رات خادم نے پوچھا اے میرے اور میرے باپ دادا کے سردار یہ اشکباری کب تک؟ فرمایا اے دوست حضرت یعقوب علیہ السلام کا ایک یوسف گم ہو گیا تھا وہ اس قدر روئے کہ بصارت جاتی رہی اور آنکھیں سفید ہو گئیں۔ میرے اٹھارہ آدمی میرا باپ یعنی حسینؓ اور قتیلانِ کربلا گم ہو گئے ہیں یعقوب علیہ السلام سے کم نہیں کہ اپنے اقارب کے فراق میں میری آنکھیں سفید نہ ہو جائیں۔

یہ مناجات عربی میں بہت فصیح ہے ترکِ طوالت کے لیے مطالب فارسی میں لکھ دیئے۔ انشاء اللہ تعالیٰ کسی اور جگہ تحریر کروں گا۔

اسی جماعت میں شامل ہیں یوسفِ سنّت، جمالِ طریقت، غواصِ معرفت اور زینتِ تصوّف ابو محمد جعفر صادق بن محمد بن علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم اجمعین۔ بلند حال اور نیک سیرت تھے۔ ان کا ظاہر آراستہ تھا اور باطن مرتب۔ جملہ علوم میں انہوں نے حسین اشارات چھوڑے ہیں۔ مشائخِ کرام میں دقیق کلام اور وقوفِ معانی کے لیے مشہور ہیں۔ تصوف پر ان کی متعدد معروف تصنیفات ہیں۔ روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: من عرف اللہ اعرض عمّا سواہ "جس نے اللہ کو جانا اس نے ماسویٰ سے منہ پھیر لیا"۔ عارف غیر سے دور اور اسباب سے منقطع ہوتا ہے۔ معرفت اس کے لیے عین ناآشنائی ہوتی ہے یعنی ناآشنائی معرفت کا جزو ہوتی ہے اور معرفت اس کی ناآشنائی کا حصّہ۔ عارف خلق اور اس کی فطرت سے منقطع بھی ہوتا ہے اور خلق سے پیوستہ بھی۔ غیر کو اس کے دل میں اتنا گذر نہیں ہوتا کہ وہ اس کی طرف ملتفت ہو۔ غیر کا وجود اتنا اہم نہیں ہوتا کہ وہ اس کے خیال میں منہمک ہو جائے۔

ص ۸۲/۱۱۱

یہ بھی روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: لا یصح العبادۃ الا بالتوبۃ لان اللہ قدم التوبۃ علی

العبادۃ قال اللہ تعالیٰ اَلتَّائِبُوْنَ الْعَابِدُوْنَ "عبادت صحیح نہیں ہوتی جب تک توبہ کے ساتھ نہ ہو" تحقیق اللہ تعالیٰ نے توبہ کو عبادت پر مقدم کیا ہے چنانچہ فرمایا توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے" عبادت بدون توبہ درست نہیں ہوتی کیونکہ توبہ مقام ابتدا ہے اور بندگی انتہا جب باری تعالیٰ نے گناہ گاروں کا ذکر کیا تو توبہ کا حکم فرمایا تُوْبُوْا اِلَی اللّٰہِ جَمِیْعًا جب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا تو عبودیت سے کیا فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَا اَوْحٰی "اللہ نے اپنے بندے کی طرف وحی کیا جو وحی کرنا تھا۔"

حکایات میں ہے کہ داؤد طائی رح امام صاحب رض کے پاس آئے اور کہا اے فرزند رسول صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کوئی نصیحت فرماویں میرا دل سیاہ ہو گیا ہے۔ امام جعفر صادق رض نے جواب دیا آپ اپنے زمانے کے زاہد ہیں۔ میری نصیحت کی کیا ضرورت ہے۔ داؤد طائی رح نے کہا آپ فرزند پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ باری تعالیٰ نے آپ کو سب پر فضیلت دی ہے سب کو نصیحت کرنا آپ کا منصب ہے۔ امام صاحب رض نے فرمایا مجھے اس بات کا خوف ہے کہ حشر کے دن میرے دادا مجھے گرفت نہ کریں کہ میں نے حق متابعت ادا نہیں کیا۔ نسب سے یہ چیز درست نہیں ہوتی اس کے لیے معاملت حسنہ کی ضرورت ہے۔ داؤد طائی رح رو پڑے اور بولے اے خدا جس کی فطرت میں نبوت کا اثر ہو۔ جس کی طبیعت میں اصول دلائل ہو جس کے دادا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہوں جس کی والدہ ماجدہ بتول ہوں اس کے سامنے داؤد کا کیا مقام کہ اپنے حسن معاملت پر نازاں ہو سکے۔ یہ بھی ان سے روایت ہے کہ ایک روز اپنے خادموں میں بیٹھے ہوئے تھے فرمایا آؤ ہم عہد کریں کہ روز قیامت جسے بھی نجات نصیب ہو وہ سب کی شفاعت کرے خادموں نے کہا حضور فرزند رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کس شفاعت کی ضرورت ہے۔ آپ کے جد امجد تمام خلائق کے شفیع ہیں۔ فرمایا میں اپنے افعال پر شرمسار ہوں۔ اپنے جد امجد کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ یہ اپنے نفس کی عیب جوئی ہے اور صفوت کمال میں شامل ہے۔ جملہ باریاب اہل حق۔ اولیائے کرام۔ انبیائے عظام اور رسولان حق اسی صفت سے آراستہ تھے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِذَا اَرَادَ اللّٰہُ بِعَبْدٍ خَیْرًا بَصَّرَہٗ بِعُیُوْبِ نَفْسِہٖ "جب اللہ تعالیٰ کا ارادہ کسی بندہ پر احسان کا ہوتا ہے تو وہ اس کے ذاتی عیب اس پر نمایاں کر دیتا ہے۔" جو صاحب نظر انسان عجز اور عبودیت سے سرنگون ہو اللہ تعالیٰ اس کو ہر مراد میں کامرانی عطا کرتا ہے۔

اگر میں سب اہل بیت رضی اللہ عنہم کا ذکر کروں اور ہر ایک کے مناقب معرض تحریر میں لاؤں تو اس کتاب میں

گنجائش ممکن نہیں۔ طریقت کے ماننے والے ہوں یا اس کا انکار کرنے والے سب کے لیے اسی قدر کافی ہے بشرطیکہ ان کی عقل کو ادراک کی توفیق حاصل ہو۔

ص ۸۳/۱۱۲

اب اصحابِ صفہؓ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ایجاز و اختصار سے کرتا ہوں۔ اس سے قبل ایک کتاب "منہاج الدین" لکھ چکا ہوں اور اس میں اصحابِ صفہؓ میں سے ہر ایک کے مناقب بالتفصیل لکھے جا چکے ہیں۔ اب صرف ان کے نام اور القاب وغیرہ تحریر کرتا ہوں تاکہ تو۔ خدا تجھے عزت دے۔ کامیاب ہو۔ سب علم اللہ کو ہے اور سب توفیق اسی سے ہے:۔

نواں باب

اہلِ صفہؓ

جملہ امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں صحابہ رضؓ کی ایک جماعت سکونت پذیر تھی۔ عبادت پر آمادہ، تارکِ دنیا اور زندگی کے کاروبار سے منقطع۔ باری تعالیٰ نے ان کی خاطر عتاب کیا اور فرمایا: وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ "دور مت کر ان لوگوں کو جو صبح و شام اپنے رب کو یاد کرتے ہیں اور اس کے طلب گار ہیں"۔ کلامِ پاک میں ان لوگوں کی فضیلت کا بیان ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی حدیثیں ان کی فضیلت پر موجود ہیں۔ اس کتاب کے مقدمہ میں ہم نے تھوڑا بہت ذکر کیا ہے۔ عباسؓ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے (ترجمہ) جب رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان کے قریب سے گذرے ان کو دیکھا ان کے فقر و ریاضت کو ملاحظہ فرمایا اور اس حالت میں خوش پایا تو کہا اے اصحابِ صفہؓ تمہیں بشارت ہو۔ جو میری امت میں تمہاری اس صفت پر راضی ہوگا بہشت میں اس کا شمار میرے رفقا میں ہوگا۔

اصحابِ صفہؓ میں ایک ربِّ جبار کی منادی کرنے والے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے برگزیدہ مقرب حضرت بلال

بن رباح رضؓ تھے۔ دوسرے ربِ بے نیاز کے دوست اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے محرم ابو عبداللہ السلمان فارسی رضؓ
تیسرے مہاجر و انصار کے سپاہی اور باری تعالیٰ کے رضا جو ابو عبیدہ بن عامر بن عبداللہ الجراح رضؓ جو تھے
برگزیدۂ اصحاب اور زینتِ ارباب ابوالیقظان عمار بن یاسر رضؓ۔ پانچویں گنجِ علم اور خزانۂ حلم ابو مسعود عبداللہ
بن مسعود الھذلی رضؓ۔ چھٹے درگاہِ حرمت کے معتکف عیب و آفت سے معرّا عتبہ بن مسعود رضؓ برادر عبداللہ
ساتویں طریقِ عزلت کے سالک عیوب و بے مائگی سے پاک مقداد بن الاسود رضؓ۔ آٹھویں مقامِ تقویٰ کے رہبر مصائب
و تکالیف میں ثابت قدم خبّاب ابن الارت رضؓ۔ نویں درگاہِ رضا کے قاصد فنا میں بارگاہِ بقا کے طالب صہیب
بن سنان رضؓ۔ دسویں درجِ سعادت اور بحرِ قناعت کے موتی عتبہ بن غزوان رضؓ۔ گیارھویں فاروق کے بھائی
دنیا و مافیہا سے بے نیاز زید بن خطاب۔ بارھویں طلب مشاہدہ میں مجاہدہ کے سردار ابو کبشہ مولیٰ پیغمبر صلی
اللہ علیہ وسلم۔ عزیز و نائب اور تمام مخلوق سے روگرداں ہو کر باری تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے ابو المرثد کنّانہ
ص ۸۶/۱۱۲
ابن الحصین العدوی رضؓ۔ چودھویں طریقِ تواضع کی زینت اور دلائل قاطع کا راستہ طے کرنے والے حذیفہ بن یمان رضؓ۔
پندرھویں عذاب سے ڈرنے والے مخالفت کے راستے سے بچنے والے عکاشہ بن الحصن رضؓ۔ سولھویں زین مہاجر
و انصار بن قار مسعود بن ربیع القاری رضؓ۔ سترھویں زہد میں مثال عیسیٰؑ اور شوقِ الٰہی میں نشان موسیٰ ابوذر
جندب بن جنادۃ الغفاری رضؓ۔ اٹھارویں حافظِ انفاسِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم درخورِ خیرات برادر عبداللہ بن عمر رضؓ۔
انیسویں استقامت میں قائم اور متابعت میں مستحکم صفوان بن بیضا رضؓ۔ بیسویں صاحبِ ہمت تہمت سے پاک
ابو درداء عویمر بن عامر رضؓ۔ اکیسویں درگاہِ رجا کے معتکف برگزیدہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ابو لبابہ ابن عبدالمنذر رضؓ۔
بائیسویں کیمیائے بحرِ شرف اور صدفِ درِ توکّل عبداللہ بن بدر الجھنی رضؓ۔

اگر تمام کا ذکر کیا جائے تو کتاب طویل ہو جائے گی۔ شیخ ابو عبدالرحمٰن محمد بن الحسین السلمی رحؒ طریقت اور کلامِ مشائخ کے مؤرخ نے ایک کتاب تصنیف کی ہے جس میں اس نے اہلِ صفہ کے مناقب و فضائل نام و القاب بیان کیے ہیں مگر اس نے مسطح بن اثاثہ بن عباد کو بھی اصحابِ صفہ میں شامل کر دیا ہے۔ میں اسے پسند نہیں کرتا کیونکہ امّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت کی ابتدا اس نے کی تھی۔

البتہ ابو ہریرہ۔ ثوبان۔ معاذ بن الحارث۔ سائب بن خلاد۔ ثابت بن ودیعہ۔ ابو عبیس عویم بن ساعدہ۔ سالم

بن عمیر بن ثابت۔ ابو لبیبہ کعب بن عمرو۔ حبیب بن معقل۔ عبداللہ بن انیس۔ حجاج بن عمرو الاسلمی رضی اللہ عنہم اجمعین اصحابِ صفہؓ میں شامل تھے وہ کبھی کبھی کسبِ معیشت میں بھی مشغول ہوئے۔ مگر مرتبہ سب کا ایک ہے۔ فی الحقیقت صحابہ کرامؓ کا زمانہ بہترین زمانہ تھا اور یہ لوگ بہترین وقت میں ہو گزرے ہیں اور تمام خلق میں بہترین تھے۔ کیونکہ باری تعالیٰ نے ان کو صحبتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے نوازا تھا۔ اور ان کے دلوں کو جملہ عیوب سے محفوظ رکھا تھا۔ چنانچہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خیر القرون قرنی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم "بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے پھر ان کا جو اس کے قریب ہوئے پھر ان کا جو اس کے قریب ہوئے۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ "سبقت کرنے والے یعنی آگے بڑھنے والے پہلے مہاجر اور انصار اور پھر وہ لوگ جو نیکی میں ان کے تابع ہوں"۔

اب میں بعض تابعین کا ذکر کرتا ہوں تاکہ فائدہ تمام تر ہو اور زمانہ ایک دوسرے سے ملتا چلا جائے انشاء اللہ تعالیٰ ؛

دسواں باب

تابعین رضی اللہ عنہم

۱۔ خواجہ اُویس قرنی رضؓ

آفتابِ اُمت چراغِ دین و ملت خواجہ اُویس قرنی رضؓ اہلِ تصوف کے عظیم مشائخ میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھے مگر زیارت نہ کر سکے۔ غلبۂ حال اور والدہ ماجدہ کی خدمت میں حاضر باشی سدِ راہ رہی۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام سے فرمایا کہ قرن میں ایک مردِ حق اویس نامی ہے وہ میری امت کے لیے قیامت کے روز ربیعہ اور مُضر کی بھیڑ بکریوں کی تعداد کے برابر لوگوں کی شفاعت کرے گا پھر حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کو مخاطب کر کے فرمایا تم اِس مردِ حق سے ملنا پست قد ہے۔ اس کے بال لمبے ہیں اس کے بائیں پہلو پر درم کے برابر سفید نشان ہے پھلبہری کا نہیں۔ ایسا ہی ایک نشان ہتھیلی پر ہے۔ جب اس سے ملو تو میرا اسلام پہنچانا اور کہنا کہ میری امت کے حق میں دعا کرے۔ جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت عمر رضؓ مکہ معظمہ تشریف لائے حضرت علی رضؓ بھی ان کے ساتھ تھے۔ خطبہ کے دوران آپ نے کہا۔ اہل نجد کھڑے ہو جائیں۔ جب اہلِ نجد کھڑے ہو گئے تو آپ نے پوچھا کیا قبیلہ قرن کے کچھ لوگ آپ لوگوں میں ہیں؟ لوگوں نے جواب دیا "ہاں"۔ اور ایک جماعت کو حضرت عمر رضؓ کے پاس لے آئے۔ حضرت عمر رضؓ نے اویس رضؓ کی نسبت دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ اویس نامی ایک دیوانہ ہے جو شہر میں نہیں آتا اور کسی کے پاس نہیں بیٹھتا جو چیزیں لوگ کھاتے ہیں وہ نہیں کھاتا۔ خوشی اور غم کی اس کو خبر نہیں جب لوگ ہنستے ہیں وہ روتا ہے جب لوگ روتے ہیں وہ ہنستا ہے۔ حضرت عمر رضؓ نے کہا میں اسے ملنا چاہتا ہوں۔ لوگوں نے کہا وہ صحرا میں ہمارے اونٹوں کے پاس ہی ہے۔ دونوں حضرات اویس رضؓ کے پاس گئے۔ وہ نماز میں مشغول تھا بیٹھے رہے جب اویس رضؓ نماز سے فارغ ہوئے تو دونوں حضرات کو سلام کیا اور اپنی پسلی اور ہتھیلی کا نشان دکھایا۔ حضرت علی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم نے

ص ۸۸/۱۱۶

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام پہنچایا اور امت کے لیے دعا کرنے کا پیغام دیا۔ کچھ دیر ٹھہرے پھر اویس رضؓ نے کہا آپ کو بہت تکلیف ہوئی۔ اب جائیے۔ قیامت قریب ہے۔ قیامت میں نہ ختم ہونے والی ملاقات ہوگی۔ اس وقت سفرِ آخرت کے لیے زادِ راہ بنانے میں مصروف ہوں۔

ص ۸۹/۱۱۷

جب اہلِ قرن واپس ہوئے تو ان کے دلوں میں اویسؓ کی قدر و منزلت بہت زیادہ ہو چکی تھی۔ خواجہ اویسؓ کوفہ کو کوچ کر گئے۔ حرم بن حیان نے ان کو دیکھا پھر وہ کسی کو نظر نہیں آئے۔ خانہ جنگی میں امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف سے لڑتے ہوئے جنگِ صفین کے دن شہید ہوئے۔ عاشَ حمیدًا و ماتَ شہیدًا۔

اویس رضؓ سے روایت ہے السلامۃ فی الوحدۃ "سلامتی تنہائی میں ہے"۔ گوشۂ خلوت میں رہنے والے کا دل غیر سے خالی ہوتا ہے۔ اس کو دنیا اور غیرِ دنیا سے کوئی توقع نہیں ہوتی اور وہ آفاتِ زندگی سے محفوظ ہوتا ہے تاہم یہ خیال غلط ہے کہ صرف گوشۂ خلوت ہی اختیار کر لینا کافی ہے۔ جب تک ابلیس کا دل پر غلبہ ہو۔ نفسانی خواہشات کا زور رہا، اور دنیا و عقبیٰ کی کوئی آرزو بنی نوعِ انسان کو ستا رہی ہو تو خلوت درحقیقت خلوت نہیں کیونکہ کسی چیز یا اس کے تصور سے لطف اندوز ہونا برابر ہے۔ حقیقی خلوت یہ ہے کہ صاحبِ خلوت عینِ مجلس میں بھی خلوت سے دست بردار نہ ہو۔ اگر عزلت گزین ہو تو عزلت میں بھی فارغ محسوس نہ کرے۔ انسانوں سے قطعِ تعلق جز بہ عشقِ حق نہیں ہوتا اور جس کو عشقِ حق ہو اسے انسانوں کا ملاپ مضرت رساں نہیں ہوتا۔ البتہ انسانی موانست عشقِ حق کے لیے سنگِ حائل ہوتی ہے۔ اور گرفتارِ موانست حقیقتِ عشق سے بے خبر ہوتا ہے لانّ الوحدۃ صفۃُ عبدٍ صافٍ۔ اسمع قولہ تعالیٰ: اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ۔ "کیونکہ خلوت بندۂ صاف کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان سنو۔ کیا وہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں"۔

ص ۸۹/۱۱۸

۲۔ ہرم بن حیان رضؓ

شمع صفا اور معدنِ وفا ہرم بن حیان رضؓ بزرگانِ طریقت میں ہوئے ہیں۔ صاحبِ معاملت تھے۔ صحابہ کرام کی صحبت پائی تھی۔ خواجہ اویس رضؓ کی زیارت کے لیے قرن گئے مگر اویسؓ وہاں سے جا چکے تھے۔ ناامید ہو کر مکہ معظمہ واپس آئے تو معلوم ہوا کہ اویسؓ کوفہ میں مقیم ہیں۔ ہرم رضؓ کوفہ تشریف لے گئے مگر اویسؓ وہاں بھی نہ مل سکے۔ بصرہ

کو واپس آرہے تھے تو دیکھا کہ اویسؓ نہرِ فرات پر وضو کر رہے ہیں۔ وضو سے فارغ ہو کر ریش مبارک میں کنگھی کرنے لگے۔ ہرمؓ
نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ اویسؓ نے ہرمؓ کا نام لے کر سلام کا جواب دیا۔ ہرمؓ نے پوچھا۔ آپ نے مجھے کیسے جان لیا۔
اویسؓ نے جواب دیا۔ "میری روح آپ کی روح کو پہچانتی ہے۔" کچھ دیر باہم بیٹھے پھر ہرمؓ کو رخصت کیا۔ بقول ان کے اویسؓ
نے زیادہ تر حضرت عمرؓ اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کے متعلق باتیں کیں۔ حضرت عمرؓ سے روائت کی کہ انہوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم
سے سنا: انما الاعمال بالنیّات ولکلّ امرئٍ مانوی فمن کانت ھجرتہ الی اللہ و رسولہ فھجرتہ الی
اللہ و رسولہ ومن کان ھجرتہ الی الدنیا یصیبھا او امراۃٍ یتزوّجھا فھجرتہ الی ماھاجر الیہ۔
"عمل کی جزا نیّت پر موقوف ہے ہر انسان کو وہی پھل ملتا ہے جس کی نیّت ہو۔ جس شخص نے اللہ اور رسول کی خاطر ہجرت کی اس کو
اس کا اجر ملیگا اور جس نے دنیا کی خاطر ہجرت کی یا عورت کے لیے ہجرت کی کہ اس سے نکاح کرلے ایسے آدمی کی ہجرت انہی دنیاوی
اشیاء کے لیے ہو گی"۔ پھر ہرمؓ کو فرمایا علیک بقلبک "اپنے دل کی حفاظت کر"۔ اس کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ
دل کو مجاہدہ سے تابعِ حق بنا۔ دوسرے یہ کہ اپنی ذات کو تابعِ دل کر۔ یہ دونوں صورتیں برحق ہیں۔ دل کو تابعِ [illegible] اہلِ ارادت
کا کام ہے تاکہ دل شہوات، حرص اور خواہشات سے پاک رہے اور جو چیز بھی ناموافق ہو دل سے منقطع ہو جائے۔ روحانی
صحت حاصل ہو اور اتباعِ احکام کی توفیق میسّر آئے۔ نظر آیاتِ خداوندی پر رہے اور دل محبّت کا مقام بن جائے۔ اپنی
ذات کو تابعِ دل کرنا کاملوں کا کام ہے جن کے دل جمالِ حق سے منوّر ہو چکے ہوں اور وہ تمام اسباب و تعلقات سے کٹ
چکے ہوں۔ جن کو خرقۂ قربت عطا ہو چکا ہو۔ جو اس کے انعامات سے سرفراز ہوں۔ جن کے قلوب مشاہدۂ حق سے تابناک ہوں
جو اس کے قریب ہوں اور جن کی دلی کیفیات، جسمانی لوازمات سے مختلف نہ ہوں۔ اول الذکر صاحبِ قلب ہوتے ہیں۔ اور
آخر الذکر مغلوب القلب۔ صاحبِ قلب اپنے دلوں کے حاکم اور باقی رہنے والی صفات کے مالک ہوتے ہیں۔ مغلوب القلب
فانی الصفت ہوتے ہیں۔ یہ مسئلہ پھیل کر قول باری تعالیٰ تک پہنچا ہے کہ فرمایا: اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ۔ اسے
دو مختلف طریق سے پڑھا جاتا ہے۔ مُخْلِصِيْنَ بکسرِ لام اور مُخْلَصِيْنَ بفتحِ لام۔ مخلِص کسرِ لام کے ساتھ فاعل ہے
باقی الصفت۔ مخلَص فتح لام کے ساتھ مفعول ہے فانی الصفت۔ اس چیز کو زیادہ کھول کر کسی اور جگہ بیان کروں گا انشاء
اللہ تعالیٰ۔ فی الحقیقت فانی الصفت کا مقام باقی الصفت سے ارفع تر ہے کیونکہ وہ جسم کو دل کے موافق ڈھالتے ہیں اور ان
کے دل مشاہدہ حق سے ہمکنار رہتے ہیں۔ باقی الصفت کوشش اور تکلف سے اپنے دلوں کو اوامر کے تابع کرتے ہیں۔ بنیادی

ص ۹۰ / ۱۱۹

ص ۹۱ / ۱۲۰

طور پر اس مسئلے کا تعلق صحو، سکر، مشاہدہ اور مجاہدہ سے ہے اور اللہ بہتر جاننے والا ہے۔

۴۔ خواجہ حسن بصریؒ

امامِ عصر، فریدِ دہر، ابو علی الحسن بن ابی الحسین البصریؒ اہلِ طریقت کے نزدیک بلند مرتبہ بزرگ ہوئے ہیں۔ بعض ان کی کنیت ابو محمد اور بعض ابو سعید بیان کرتے ہیں۔ علم اور معاملت میں کئی لطیف اشارات ان سے منسوب ہیں۔ کہتے ہیں ایک اعرابی ان کے پاس آیا اور صبر کی تشریح چاہی۔ فرمایا صبر کی دو صورتیں ہیں۔ ایک مصیبت اور بلا کے وقت صابر رہنا دوسرے ان چیزوں کے معاملے میں صبر کرنا جن سے منع کیا گیا ہو اور ان سے بچے رہنے کے احکام موجود ہوں۔ اعرابی نے کہا: "آپ زاہد ہیں اور میں نے آج تک آپ سے بڑا زاہد نہیں دیکھا۔" خواجہ حسن بصریؒ نے فرمایا: "اے اعرابی! میرا زہد خواہشات تک محدود ہے اور میرا صبر استقلال کے فقدان کے سوا کچھ بھی نہیں۔" اعرابی نے گذارش کی: "آپ نے میرے ذہن کو جھٹک دیا ہے ذرا تفصیل سے بات کریں۔" خواجہ حسن بصریؒ نے کہا: "مصائب میں میرا صبر و تسلیم صرف آتشِ دوزخ سے خوفزدہ ہونے کی علامت ہے اور بے قراری کے مترادف ہے۔ اس دنیا میں میرا زہد دوسری دنیا کے حصول کے لیے ہے۔ قابلِ رشک وہ بندۂ حق ہے جو ذاتی مطلب سے دستبردار ہو۔ اس کا صبر حق تعالیٰ کے لیے ہو آتشِ دوزخ سے محفوظ رہنے کے لیے نہ ہو۔ اس کا زہد بھی اللہ کے لیے ہو اور محض حصول بہشت کے لیے نہ ہو۔ اسی کا نام صحتِ خلوص ہے۔"

خواجہ حسنؒ سے یہ بھی روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: اِنَّ صُحْبَۃَ الْاَشْرَارِ یُوْرِثُ سُوْءَ الظَّنِّ بِالْاَخْیَارِ "بُروں کی صحبت اچھوں کے متعلق بدگمانی پیدا کرتی ہے۔" یہ بات نہایت دلنشین ہے خاص طور پر اس زمانے کے لوگوں کے لیے جو عام طور پر دوستانِ حق سے روگرداں ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ جھوٹے صوفیا سے ملتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس قسم کے نام نہاد صوفیوں کے افعال خیانت پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان کی زبان جھوٹ اور غیبت میں ملوث ہوتی ہے۔ ان کے کان لغو اور واہیات ابیات سنتے ہیں۔ ان کی آنکھیں لہو و شہوات سے مطمئن ہوتی ہیں۔ اور ان کی تمام تر کوشش مالِ حرام جمع کرنے پر صرف ہوتی ہے۔ وہ سمجھ لیتے ہیں کہ تمام صوفیا اسی قسم کے ہوتے ہیں اور ان کا مسلک یہی ہوتا ہے۔ حالانکہ صوفیائے کرام صرف احکامِ حق تعالیٰ پر کاربند ہوتے ہیں۔ ان کے لبوں پر صرف کلامِ حق ہوتا ہے۔ ان کے دلوں میں محبتِ حق اور

کانوں میں صدائے حق ہوتی ہے۔ ان کی آنکھیں مشاہدۂ حق سے سرفراز ہوتی ہیں۔ ان کے جملہ خیالات اسرارِ خداوندی پر مرکوز ہوتے ہیں۔ اگر ان کی جماعت میں کچھ بدکردار لوگ بھی موجود ہیں تو بدکرداری کی ذمہ داری صرف انہی پر عاید ہوتی ہے۔ بد لوگوں سے ملنے والا خود فطرتاً بد ہوتا ہے کیونکہ نیک فطرت صرف نیک لوگوں سے ملا کرتے ہیں۔ قابلِ ملامت بد انسان کی اپنی طبیعت ہے جو نالائق اور ناجنس لوگوں سے مجالست کی طرف مایل ہوتی ہے۔ نیک سیرت صوفیوں کے منکر لوگ خدائے عزّ وجل کے نزدیک شر پسند اور رذیل ہوتے ہیں کیونکہ شر پسند اور رذیلوں سے ملتے ہیں۔ اور صوفیائے کرام کو اپنی مرضی کے مطابق نہ پا کر ان سے منکر ہو جاتے ہیں اور ان کی پیروی سے انحراف کرتے ہیں۔ جب اہلِ شر ہلاک ہوتے ہیں تو ان کو بھی ہلاکت نصیب ہوتی ہے بجز ان کے جو حقیقی صوفیائے کرام کو رضا و رغبت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کی مجالست کو جان و دل سے خرید لیتے ہیں۔ دنیا میں ان کے طریق کو برگزیدہ سمجھتے ہیں۔ ان کی برکت سے مقصودِ دوجہان حاصل کرتے ہیں اور ہر سمت سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ بقول شاعر

ص ۹۲/۱۲۲

"میرے دل کو حقارت سے نہ دیکھ کیوں کہ تو اس کا حبیب ہے اور ہر شخص اپنے ہم جنس کی طرف مائل ہوتا ہے۔"

۴۔ سعید ابن المسیبؓ

رئیس علماء، فقیہ الفقہا، سعید ابن المسیب رضؓ عظیم الشان، رفیع القدر، عزیز القول اور حمید الصدر صاحبِ طریقت تھے۔ علوم و فنون۔ فقہ۔ توحید۔ تفسیر۔ شعر۔ لغت وغیرہ میں ان کے بے شمار مناقب ہیں۔ مشہور ہے کہ وہ ایک عیار تھا پارسا تھے پارسا نما عیار نہ تھے اور یہ طریق جملہ مشائخ کے نزدیک نہایت قابلِ تعریف ہے۔ روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: ارض بالیسیر من الدنیا مع سلامة دینك كما رضی قوم بکثیرها مع ذهاب دینهم

"اگر تیرا دین سلامت رہے تو دنیا کے اموال کے تھوڑے سے حصے پر بھی خوش ہو جس طرح زیادہ دنیا حاصل کرنے والے دین برباد کر کے خوش ہوتے ہیں۔" فقر اور سلامتیٔ دین غنا اور غفلت سے بہتر ہیں۔ جب فقیر اپنے دل پر نظر کرتا ہے تو اسے اور حصولِ دنیا کی ہوس نہیں ہوتی۔ اپنے ہاتھ کو دیکھتا ہے تو اسے قناعت کی دولت نظر آتی ہے۔ صاحبِ غنا اپنے دل میں زیادہ سے زیادہ ہوس کو جاگزیں پاتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں دولت دنیا ہوتی ہے اور وہ بھی مشتبہ۔ رضائے دوستانِ حق بہتر ہے رضائے اہلِ غفلت سے جو دنیائے پرغرور و آفت و حسرت پر مطمئن ہو جاتے

ص ۹۳/۱۲۳ ہیں۔ ندامت بہتر ہے ذلت و سیہ کاری سے۔ جب کوئی مصیبت ٹوٹ پڑتی ہے تو اہلِ غفلت کہتے ہیں۔ شکر ہے
ہماری جان محفوظ رہی۔ دوستانِ حق کہتے ہیں شکر ہے ہمارا دین محفوظ رہا۔ دل میں دوست کا جلوہ ہو تو جسمانی مصیبت
باعثِ راحت ہوتی ہے۔ دل غفلت میں مبتلا ہو تو جسم ہزار راحت کے باوجود راحت سے ناآشنا ہوتا ہے۔
فی الحقیقت مال و منالِ دنیا کی قلت پر راضی ہونا کثرتِ مال و منال کا باعث ہے اور کثرت کی ہوس قلت کا باعث۔
ان کی نسبت یہ بھی مشہور ہے کہ ایک بار مکہ معظمہ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی شخص نے حاضر ہو کر پوچھا کہ وہ کونسی حلال چیز
ہے جس میں حرام نہیں اور وہ کونسی حرام چیز ہے جس میں حلال نہیں۔ فرمایا: ذکر اللہِ حلالٌ لیس فیہ حرام و ذکر
غیرہ حرام لیس فیہ حلال "ذکرِ باری تعالیٰ وہ حلال چیز ہے جس میں کوئی حرام کا پہلو نہیں اور ذکرِ غیر وہ حرام ہے
جس میں کوئی حلال کا پہلو نہیں"۔ ذکرِ ذاتِ حق میں نجات ہے اور ذکرِ غیر میں ہلاکت اور سب توفیق اللہ تعالےٰ
کی طرف سے ہے۔

گیارھواں باب

تبع تابعین تا بہ زمانہ حال

۱۔ حبیب العجمیؒ

طریقت کے بہادر، شریعت کے کامل حبیب العجمیؒ ایک بلند ہمت اور قابلِ قدر بزرگ تھے۔ اہلِ زمانہ میں ان کی قدر و منزلت بہت زیادہ تھی۔ ان کی توبہ کی ابتدا خواجہ حسن بصریؒ کے دستِ مبارک پر ہوئی۔ وہ پہلے سود کھاتے تھے اور فسق و فجور میں مبتلا تھے۔ باری تعالیٰ نے ان کو توبہ کی توفیق عطا فرمائی وہ راہِ راست پر آئے اور علم و معاملت کا بیشتر حصہ خواجہ حسن بصریؒ سے حاصل کیا۔ ان کی زبان فارسی تھی اور عربی سے نابلد تھے۔ اللہ نے ان کو بہت سی کرامات سے مخصوص کیا تھا۔ ایک روز خواجہ نمازِ شام کے وقت ان کے حجرہ کے پاس سے گزرے وہ تکبیرِ نماز کہہ کر نماز میں مشغول ہو گئے خواجہ حسن بصریؒ اندر آئے مگر ان کے پیچھے نماز میں کھڑے نہ ہوئے کیونکہ وہ عربی زبان کو صحیح ادا نہیں کر سکتے تھے۔ خواجہ صاحب نے رات کو خواب میں ذاتِ باری کو دیکھا اور پوچھا بارِ خدایا تیری رضا کس چیز میں ہے ارشاد ہوا اے حسن! تجھے میری رضا کا مقام ملا مگر تو مستفید نہ ہو سکا۔ اگر کل رات حبیب کے پیچھے نماز ادا کر لیتا تو اس کی صحت نیت تجھے عبادت کی حقیقت سے آشنا کر دیتی اور میں تجھ سے راضی ہو جاتا۔

مشائخ طریقت میں مشہور ہے کہ جب خواجہ حسن بصریؒ حجاج کی پکڑ دھکڑ سے بھاگ کر حبیبؒ کے حجرے میں پناہ گزیں ہوئے تو حجاج کے سپاہیوں نے حبیبؓ سے پوچھا "کیا تو نے حسن بصری کو کہیں دیکھا ہے؟" حبیبؒ نے جواب دیا دیکھا ہے اور وہ میرے حجرے میں بند ہے۔ سپاہی حجرے میں گئے وہاں کسی کو نہ پایا اور سمجھے کہ حبیبؓ نے ان کا مذاق اڑایا ہے اس پر سختی کی۔ حبیب نے قسم کھائی۔ دوبارہ، سہ بارہ حجرے میں تلاش کی گئی مگر خواجہ حسن بصریؒ کہیں نظر نہ آئے۔ جب سپاہی واپس چلے گئے تو خواجہ صاحب حجرہ سے باہر نکلے اور فرمایا

حبیبؓ تیری برکت سے ہی کسی کو نظر نہیں آیا مگر تو نے ظالموں سے کیوں کہا کہ میں حجرے میں بند ہوں۔ حبیبؓ نے جواب دیا یہ میری برکت نہ تھی، صرف میرے سچ بولنے کی برکت تھی۔ اگر میں جھوٹ بولتا تو شاید ہم دونوں رسوا ہوتے۔ اس قسم کی ان کی بہت سی کرامات مشہور ہیں۔

ص ۹۵/۱۲۵
ان سے پوچھا گیا اللہ کی رضا کس چیز میں ہے؟ فرمایا: فی قلب لیس فیہ غبار النفاق" اس دل میں جس میں نفاق کا غبار نہ ہو"۔ نفاق ملاپ کا دشمن ہے۔ رضا ملاپ پر منحصر ہے۔ محبّت کو نفاق سے قطعاً کوئی تعلق نہیں محبّت کا مقام رضا ہے۔ رضا دوستوں کی صفت ہے اور نفاق دشمنوں کی۔ یہ بڑی اہم بات ہے اور انشاء اللہ کسی اور جگہ بیان ہوگی۔ توفیق اور طاقت اللہ کی طرف سے ہے۔

۲۔ مالک بن دینارؒ

نقیب اہل محبّت، جنّ و انس کی زینت مالک بن دینارؓ خواجہ حسن بصریؓ کے مصاحب تھے اور صوفیائے کرام میں بزرگ حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی کرامات، ریاضات اور خصال مشہور ہیں۔ جب پیدا ہوئے تو ان کے والد حالتِ غلامی میں تھے۔ ان کی توبہ کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ ایک رات وہ اپنے ساتھیوں کی معیت میں عیش و طرب میں مشغول تھے جب سب سو گئے تو ایک ساز سے آواز آئی اے مالک! تجھے کیا ہو گیا کیوں توبہ نہیں کرتا۔ مالک بن دینارؓ نے سب کچھ ترک کر دیا۔ خواجہ حسن بصریؓ کے پاس آئے اور صدقِ دل سے توبہ کی۔ اللہ نے بہت بلند مقام عطا فرمایا۔ ایک موقع پر وہ کشتی میں سفر کر رہے تھے ان پر موتی چرا لینے کا الزام تراشا گیا۔ انہوں نے آسمان کی طرف دیکھا آناً فاناً ہزاروں مچھلیاں پانی کی سطح پر آگئیں ہر ایک کے منہ میں ایک موتی تھا۔ مالکؓ نے ایک مچھلی کے منہ سے موتی کا دانہ لے کر چوری کا الزام تراشنے والے کو دے دیا اور خود کشتی سے نکل کر پانی کی سطح پر چلتے ہوئے کنارے پہنچ گئے۔

ص ۹۵/۱۲۶
ان کا قول ہے: احبّ الاعمال علیّ الاخلاص فی الاعمال" اعمال میں سب سے زیادہ پیارا عمل خلوص ہے"۔ کوئی عمل، عمل نہیں ہوتا جب تک اس میں خلوص نہ ہو۔ خلوص کو عمل کے ساتھ وہی نسبت ہے جو روح کو تن کے ساتھ۔ تن بغیر روح پتھر ہے اور عمل بغیر خلوص کھیل۔ خلوص عمل باطن ہے اور طاعت عمل ظاہر۔ ظاہر باطن سے پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے اور باطن کی قیمت ظاہر پر منحصر ہے۔ چنانچہ اگر کوئی ہزار سال بھی خلوص دل کی پرورش کرے

اور اس کے اعمالِ ظاہر میں خلوص نمایاں نہ ہو تو اس کا خلوص بے معنی ہے۔ اور اسی طرح اگر کوئی ہزار سال عمل ظاہر میں مصروف رہے اور اس کا دل خلوص سے خالی ہو تو اس کے عمل کو شامل عبادت نہیں کر سکتے۔

۳۔ ابو حلیم حبیب بن سلیم الراعی رض

فقیر الفقراء، امیر الاولیاء، ابو حلیم حبیب بن سلیم الراعی رض عظیم المرتبہ مشائخ میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے آیات و براہین بے شمار ہیں۔ حضرت سلمان رض فارسی کے مصاحب تھے۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روائت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا نیۃ المؤمن خیر من عملہ "مومن کی نیت اس کے عمل سے اچھی ہے"۔ حبیب رض کے بکریوں کے ریوڑ تھے۔ فرات کے کنارے رہتے تھے اور گوشہ نشینی ان کا طریق تھا۔ روائت ہے کہ ایک شیخ ادھر سے گذرے تو دیکھا کہ بھیڑیا ان کی بھیڑ بکریوں کی رکھوالی کر رہا ہے اور وہ نماز میں مشغول ہیں۔ جی میں آئی کہ زیارت کریں کچھ دیر ٹھہرے۔ جب حبیب رض نماز سے فارغ ہوئے تو شیخ نے بڑھ کر سلام کیا۔ حبیب رض نے فرمایا "بیٹا کیسے آئے"۔ عرض کی زیارت کے لیے۔ فرمایا "اللہ تجھے نیکی دے"۔ شیخ نے کہا "یہ کیا ماجرا ہے۔ بھیڑیا اور بھیڑ بکریوں کی رکھوالی؟" فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ ان بھیڑ بکریوں کا گڈریا حق تعالیٰ کا تابع فرمان ہے۔ یہ کہا اور ایک لکڑی کا پیالہ پتھر کے نیچے رکھا۔ پتھر سے دو چشمے جاری ہوئے ایک دودھ کا دوسرا شہد کا۔ شیخ نے پوچھا یہ درجہ آپ کو کیسے حاصل ہوا؟ فرمایا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت سے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم ان کی مخالفت کر رہی تھی۔ پھر بھی سخت چٹان سے بنی اسرائیل کے لیے چشمے جاری ہوئے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام حضرت موسیٰ ؑ سے بہت بلند ہے۔ کیا ان کی متابعت کرنے والے کے لیے دودھ اور شہد بھی جاری نہ ہو؟

شیخ نے کہا مجھے کوئی نصیحت کیجیے۔ فرمایا: لاتجعل قلبك صندوق الحرص وبطنك وعاء الحرام "دل کو محل حرص اور پیٹ کو جائے حرام نہ بنا"۔ خلقت کی ہلاکت حرص و حرام سے واقع ہوتی ہے۔ نجات ان دونوں چیزوں سے پرہیز کرنے میں ہے۔ میرے پیرِ طریقت کو حبیب رض کے بہت سے واقعات یاد تھے۔ مگر اس وقت کچھ اور بیان کرنا ممکن نہیں۔ کیونکہ میری بیشتر کتابیں غزنی میں ہیں اور میں دیارِ ہند میں شہر لہانور میں جو کہ ملتان کے نواح میں ہے صحبت ناجنس میں مبتلا ہوں۔ ہر خوشی اور تکلیف میں خدا کا شکر ہے۔

۴۔ ابو حازم المدنی رضؓ

پیر صالح ابو حازم المدنی رضؓ بہت سے مشائخ کے پیشرو تھے۔ معاملت میں بلند مقام تھے فقر میں ثابت قدم اور مجاہدہ میں کامل روش۔ عمرو بن عثمان المکی رضؓ ان کے بارے میں رطب اللسان ہیں۔ ان سے روایت ہے کہ ابو حازم رضؓ سے پوچھا گیا ما مالک قال الرضا عن اللہ والغناء عن الناس "تیری دولت کیا ہے؟ کہا رضائے خدا اور بے نیازیٔ خلق۔" جو بھی رضائے حق کا طالب ہوتا ہے وہ دنیا سے مستغنی ہو جاتا ہے اور اس کی سب سے بڑی دولت رضائے خداوندی ہوتی ہے۔ غنا سے مراد غنی باللہ ہوتا ہے۔ غنی باللہ ہر غیر اللہ سے بے نیاز ہوتا ہے۔ اس کا راستہ صرف اس کی بارگاہ تک جانے والا راستہ ہوتا ہے۔ خلوت و جلوت میں صرف اس کو پکارتا ہے۔

ص ۹۷/۱۲۸

مشائخ کرام میں سے کوئی شخص ان کو ملنے آیا وہ سو رہے تھے۔ اس نے انتظار کیا جب وہ بیدار ہوئے تو فرمایا میں نے ابھی ابھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تیرے واسطے حکم ہوا ہے کہ اپنی والدہ کے حقوق کی نگہداشت حج سے بہتر ہے۔ واپس جا اور اس کی دلداری کر۔ وہ شخص واپس چلا گیا۔ حازم رضؓ سے متعلق اس سے زیادہ میں نے کچھ نہیں سنا۔

۵۔ محمد بن واسع رضؓ

داعیِ اہلِ مجاہدہ، قائم بمحلِ مشاہدہ محمد بن واسع رضؓ اپنے زمانے کے عدیم المثال بزرگ تھے۔ کئی تابعین سے مصاحبت کا شرف حاصل کیا اور بہت سے متقدمین سے ملے۔ طریقت کی دولت سے بہرہ یاب تھے۔ حقائق طریقت پر ان کے بہت سے بلند مرتبہ اشارات ہیں۔ فرمایا ما رایت شیئًا الا و رایت اللہ فیہ "میں نے کوئی چیز نہیں دیکھی جس میں جلوۂ حق نہ پایا ہو۔" یہ مشاہدہ کا مقام ہے جہاں غلبۂ دوستی کے باعث ہر فعل میں صرف فاعل نظر آتا ہے جس طرح تصویر کو دیکھ کر مصور۔ اس قول کا تعلق حضرت ابراہیمؑ سے ہے کہ آفتاب، ماہتاب اور ستارہ کو دیکھ کر کہا ھٰذَا رَبِّیْ یہ غلبۂ شوق تھا جس کے باعث ہر چیز میں جلوۂ محبوب نظر آ رہا تھا۔ کیونکہ جب دوست دیکھتے ہیں تو جہان کو اس کے قہر سے مقہور اور غلبہ سے مغلوب پاتے ہیں۔ وجود ہستی اس کی قدرت کے سامنے پراگندہ نظر آتا ہے اور تکوین عالم ناچیز۔ نگاہ شوق ہو تو مقہور نہیں قاہر، مفعول نہیں فاعل، مخلوق نہیں خالق نظر آتا ہے۔ یہ مقام مشاہدہ ہے۔ اس کی تشریح

ص ۹۸/۱۲۹

کی جائے گی انشاء اللہ العزیز۔ بعض لوگ کہتے ہیں رأیت اللہ فیہ "میں نے اس میں اللہ کو دیکھا" یہ قول مکانی۔ جزو اور حلول کا مقتضی ہے اور محض کفر ہے کیونکہ مکان اور مکان پذیر ہم جنس ہوتے ہیں۔ اگر مکان مخلوق ہے تو مکان پذیر بھی مخلوق ہوگا۔ اگر مکان پذیر قدیم ہے تو مکان بھی قدیم ہونا چاہیئے۔ اس میں دو غلط چیزیں ہیں یعنی مخلوق کو قدیم اور خالق کو مُحدث تصور کرنا۔ دونوں چیزیں کفر کے مترادف ہیں۔ اشیاء میں خالق کو دیکھنے سے مراد یہ ہے کہ اس کے نشاناتِ قدرت۔ دلائل اور براہان نظر آئیں۔ اس میں لطائف و رموز ہیں جو اپنی جگہ پر بیان ہوں گے انشاء اللہ تعالیٰ۔

۶۔ ابو حنیفہ نعمان بن ثابت رضؓ

امام امامان مقتدائے اہل سنّت، شرف فقہاء اور عزتِ علماء، ابو حنیفہ نعمان بن ثابت الخزاز رضؓ مجاہدہ و عبادت میں ثابت قدم بزرگ تھے۔ اصول طریقت میں بڑی شان کے مالک تھے۔ اوّل اوّل آپ نے گوشہ نشینی کا ارادہ کیا۔ خلق سے بیزاری کا اظہار کیا اور چاہا کہ دنیا سے دور ہٹ جائیں، کیونکہ ان کا دل اہل دنیا کے جاہ و جلال سے بے نیاز ہو چکا تھا ایک رات خواب میں دیکھا کہ وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے استخوانِ مبارک لحد سے جمع کر رہے ہیں اور ان میں سے بعض کو چن رہے ہیں۔ خوف و ہیبت کے عالم میں بیدار ہوئے اور اپنے ایک دوست محمد بن سیرین سے تعبیر پوچھی۔ اس نے کہا آپ کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کو محفوظ کرنے میں بہت بلند مقام حاصل ہوگا۔ آپ صاحبِ تصرّف ہونے کی حیثیت سے صحیح کو غلط سے جدا فرمائیں گے۔ دوسری بار پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے ابو حنیفہ تیری زندگی احیائے سنت کے لیے ہے گوشہ نشینی کا ارادہ ترک کر دے۔"

آپ اکثر مشائخ کے استاد تھے۔ چنانچہ ابراہیم ادھم، فضیل بن عیاض، داؤد طائی اور بشر حافی وغیرہم نے آپ سے فیض حاصل کیا۔ مذکور ہے کہ ابو جعفر منصور کے دورِ حکومت میں امورِ شرعیہ کے انتظام کے لیے قاضی کی ضرورت تھی۔ اس مقصد کے لیے چار آدمی پیشِ نظر تھے یعنی امام ابو حنیفہ، سفیان ثوری، مسعر بن کدام اور شریح رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔ ہرکارہ بلانے کے لیے آیا۔ راستہ میں ابو حنیفہ رضؓ نے فرمایا میں اپنی فراست کے مطابق اس معاملے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ سب نے کہا فرمایئے۔ آپ نے کہا میں کسی حیلہ سے اس مصیبت کو اپنے سے ٹالنے کی کوشش کروں گا۔ مسعر اپنے آپ کو دیوانہ ظاہر کرے، سفیان راہِ فرار اختیار کرے اور شریح عہدہ قضا قبول کرے

چنانچہ سفیان راستے میں فرار ہوگیا۔ ایک کشتی میں پناہ لی اور کہا مجھے بچاؤ میرا سر کاٹا جا رہا ہے۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی طرف اشارہ تھا من جعل قاضیا فقد ذبح بغیر سکین "جو شخص قاضی بنا بغیر چھری کے ذبح ہوا"۔ کشتی کے ملاح نے اس کو چھپا لیا۔ باقی تینوں ابو منصور کے پاس پہنچے۔ پہلے ابو حنیفہؒ کی باری آئی۔ آپ نے کہا۔ میں عربی النسل نہیں ہوں سادات عرب میری قضا پر راضی نہیں ہوں گے۔ ابو منصور نے کہا قاضی کے عہدے کے لیے نسب کی ضرورت نہیں علم چاہیئے۔ اور تم علماء کے پیشرو ہو۔ آپ نے کہا میں اس کام کے لائق نہیں ہوں۔ اگر میں سچ کہتا ہوں تو معذور ہوں اور اگر جھوٹ بول رہا ہوں تو جھوٹا آدمی قاضی نہیں بنایا جا سکتا۔ آپ خلیفۂ وقت ہیں دروغ گو کو اپنا قاضی نہ بنائیں، اور اپنی رعایا کا اعتماد، ان کے جان و مال اور عزت و ناموس اس کے سپرد نہ کریں۔ آپ کی اس طرح نجات ہوئی۔ مسعر کو پیش کیا گیا۔ اس نے منصور کا ہاتھ تھام لیا اور پوچھنے لگا کیسے ہو تمہارے بچے کیسے ہیں؟ منصور نے حکم دیا۔ یہ دیوانہ ہے اسے باہر نکال دو۔ اس کے بعد شریح کو حکم ہوا کہ قاضی کا عہدہ سنبھال لے۔ اس نے کہا میں سوداوی مزاج آدمی ہوں۔ میرا دماغ بہت کمزور ہے۔ منصور نے کہا اپنا علاج کرو۔ مزاج کے مطابق مشروبات اور ادویات استعمال کرو۔ دماغ درست ہو جائے گا۔ چنانچہ قضا اس کے سپرد ہوئی۔ ابو حنیفہؒ رخصت ہوئے اور شریح سے بات تک بھی نہیں کی

ص ۹۹/۱۲۲

مندرجہ بالا واقعہ ابو حنیفہؒ کی شان کا بین نشان ہے۔ اوّل تو اپنی فراست سے سب کا میلان طبع سمجھ گئے دوسرے اپنی ذات کو مصیبت سے محفوظ کر لیا۔ خلق سے دور رہنا اور دنیوی جاہ و جلال پر مغرور نہ ہونا اس امر کی دلیل ہے۔ کہ صحتِ حال اور سلامتی اسی کنارہ کشی میں ہے۔

آج کل سب اہل علم اس کام یعنی قضا کو پسند کرتے ہیں۔ نفسانی خواہشات میں مبتلا ہیں اور راہِ حق سے نفور ہیں۔ امیروں کے دولت کدے ان کے قبلہ گاہ ہیں۔ ظالموں کے گھران کو آباد نظر آتے ہیں۔ جابروں کی بساط کو "قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰی" کے برابر سمجھتے ہیں اور ہر اس چیز کے منکر ہیں جو ان کے مزاج کے خلاف ہو۔ غزنی میں ایک بار کسی مدعی علم و امامت نے مجھ سے کہا کہ خرقہ پوشی بدعت ہے۔ میں نے کہا کہ ریشم و اطلس جو مردوں کے لیے قطعاً حرام ہے جو ظالموں اور بدکاروں سے التجا کر کے مانگا جاتا ہے اور ظالم بھی وہ جن کا جملہ مال حرام ہوتا ہے وہ ریشم و اطلس تو پہن لیا جاتا ہے اور اسے بدعت نہیں سمجھا جاتا اس کے برعکس جامۂ حلال کو جسے مالِ حلال کے عوض جائے حلال سے خریدا گیا ہو

بدعت کہا جاتا ہے۔ اگر تم رعونتِ طبع اور ضلالتِ عقل میں مبتلا نہ ہوتے تو تمہاری زبان سے اس سے بہتر بات نکلتی ریشمی کپڑا عورتوں کے لیے حلال ہے اور مردوں کے لیے حرام۔ اگر یہ دونوں صورتیں تسلیم کرتے ہیں تو ٹھیک ہے اور ہم عدم انصاف سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔

ص ۱۰۰/۱۴۴ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جب نوفل بن حیانؓ وفات پا گئے میں نے خواب میں دیکھا کہ قیامت بپا ہے سب لوگ اپنے اعمال کا حساب دے رہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حوضِ کوثر پر کھڑے ہیں ان کے دائیں بائیں مشائخِ کرام کا ہجوم ہے ایک خوش شکل بزرگ جن کے سر کے بال سفید ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر رخسار مبارک سے رخسار لگائے کھڑا ہے۔ اس کے بالکل برابر نوفل بن حیان کھڑے ہیں۔ مجھے دیکھ کر میری طرف بڑھے اور سلام کہا۔ میں نے کہا مجھے پانی دیجیے۔ فرمایا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انگشت مبارک سے اشارہ کیا۔ نوفلؓ نے مجھے پانی کا پیالہ دیا اور دوستوں کو بھی پلایا۔ سب نے پیا مگر پیالے میں پانی کم نہ ہوا۔ میں نے پوچھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں طرف کون بزرگ ہیں فرمایا حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ۔ بائیں طرف حضرت ابوبکر صدیقؓ ہیں اسی طرح پوچھتا گیا اور انگلیوں پر شمار کرتا گیا۔ سترہ آدمیوں سے متعلق پوچھا جب آنکھ کھلی تو انگلیوں پر سترہ تک کی گنتی کر چکا تھا۔ اسی طرح معاذ الرازیؒ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم این اطلبک قال عند علم ابی حنیفۃ۔ "میں آپ کو کہاں طلب کروں فرمایا ابوحنیفہ کے علم میں"

ص ۱۰۱/۱۴۴ پارسائی میں آپ کے بے شمار مناقب ہیں جو اس کتاب میں نہیں سما سکتے۔ میں ایک دفعہ حضرت بلالؓ مؤذنِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار پر سو رہا تھا۔ خواب میں دیکھا کہ مکہ معظمہ میں ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بابِ شیبہ سے تشریف لائے اور ایک بوڑھے آدمی کو اس طرح گود میں لیے ہوئے تھے جیسے لوگ شفقت سے بچوں کو اٹھا لیتے ہیں۔ میں نے آگے بڑھ کر قدم بوسی کی حیران تھا کہ یہ پیرانہ سال آدمی کون ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے دل کی بات سمجھ لی اور فرمایا یہ تیرا امام اور تیرے اپنے دیار کا رہنے والا ابوحنیفہ ہے۔ مجھے اس خواب سے بڑی تسلی ہوئی اور اپنے اہل شہر سے ارادت پیدا ہوئی۔ خواب سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ابوحنیفہؒ ان لوگوں میں سے تھے جو اوصافِ طبع میں فانی اور احکامِ شرع میں باقی و قائم ہو گذرے ہیں۔ یہ حقیقت اس امر سے ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو اٹھا کر لائے۔ اگر وہ خود چل کر آتے تو باقی الصفت ہوتے۔ باقی الصفت لوگ منزل کو پا بھی سکتے ہیں اور منزل سے بھٹک بھی سکتے

ہیں چونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اٹھایا ہوا تھا یقیناً ان کے ذاتی صفات فنا ہو چکے تھے اور وہ پیغمبر حق صلے اللہ علیہ وسلم کے صفات کے ساتھ صاحبِ بقا تھے پیغمبر حق صلی اللہ علیہ وسلم سہو و خطا سے بالاتر ہیں اور یہ ناممکن ہے کہ جسے ان کا سہارا نصیب ہو وہ سہو و خطا کا مرتکب ہو سکے۔ یہ ایک رمزِ لطیف ہے۔

کہتے ہیں جب داؤد طائی رح نے علم حاصل کر لیا اور ان کو پیشوائی کا مقام مل گیا تو وہ امام ابو حنیفہ رض کے پاس آئے اور پوچھا اب کیا کروں فرمایا "عمل کی ضرورت ہے کیونکہ علم بلا عمل ایسے جسم کی مانند ہے جس میں روح نہ ہو۔" علم بدون عمل صاف نہیں ہوتا اور خلوص سے خالی رہتا ہے جو صرف علم پر قناعت کرتا ہے کبھی عالم نہیں ہوتا۔ علم عمل کا تقاضا کرتا ہے جیسے ہدایت مجاہدہ کا۔ مشاہدہ بدون مجاہدہ ممکن نہیں۔ بعینہٖ علم بلا عمل کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتا۔ علم صرف عمل سے روبکار آتا ہے اسی سے ترقی پذیر ہو کر برکات کا باعث ہوتا ہے۔ دونوں کو جدا کرنا محال ہے۔ جیسے آفتاب کی روشنی کو آفتاب سے علیحدہ کرنا ناممکن ہے:

۷۔ عبد اللہ بن مبارک المروزی رح

زاہدوں کے سردار اور اوتاد کے پیشرو عبد اللہ بن مبارک المروزی رح اہل طریقت میں ایک شاندار مقام رکھتے تھے اور جملہ احوال و اقوال و اسبابِ طریقت و شریعت کے عالم تھے اور اپنے وقت کے امام تھے بزرگ مشائخ کرام سے ملاقات کر چکے تھے۔ ان کی کئی کرامات و تصانیف مشہور ہیں۔ توبہ کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ وہ ایک کنیز پر عاشق ہو گئے ایک رات وہ رندوں کی صحبت سے اٹھے اور ایک ساتھی کو ہمراہ لے کر معشوقہ کی دیوار کے نیچے جا کھڑے ہوئے وہ چھت پر آ گئی اور دونوں صبح تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ صبح کی اذان ہوئی تو عبد اللہ سمجھے شاید عشاء کی اذان ہے۔ جب سورج نکلتا ہوا دیکھا تو معلوم ہوا کہ تمام رات دیدار میں غرق رہے ہیں طبیعت کو بہت قلق ہوا۔ جی ہی جی میں کہا: "اے مبارک تجھے شرم چاہیئے۔ ساری رات خواہشِ نفسانی میں کھڑا رہا۔ کرامات کا بھی طالب ہے۔ نماز میں اگر امام لمبی سورت پڑھے تو برافروختہ ہو جاتا ہے تیری ایمان داری کا دعویٰ کہاں ہے۔" توبہ کی اور علم اور اس کی طلب میں مشغول ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو بہت بڑا مقام دیا۔ ایک دفعہ اُن کی والدہ نے دیکھا کہ وہ باغ میں سو رہے ہیں اور ایک بہت بڑا سانپ ریحان کی ایک شاخ منہ میں لیے مکھیاں اڑا رہا ہے۔ اس کے

بعد وہ مرو سے کوچ کر گئے اور بغداد میں جا کر مشائخ کی صحبت میں رہے۔ پھر کچھ مدت مکہ شریف میں مجاور رہے اور اس کے بعد پھر مرو میں آ گئے۔ سب لوگ اُن کے دوست اور معاون تھے۔ درس اور مجلس شروع کی۔ اُن دنوں مرو میں کچھ لوگ اہلِ حدیث تھے اور کچھ طریقت کے پیروکار۔ عبداللہ کو رضی الفریقین کہا جاتا ہے۔ کیونکہ آپ دونوں فریقوں سے موافقت رکھتے تھے اور دونوں فریق اُن کو برابر اپناتے تھے۔ انہوں نے دو کمرے بنا رکھے تھے۔ ایک اہل حدیث کے لیے اور دوسرا اہلِ طریقت کے لیے آج تک یہ دونوں کمرے موجود ہیں۔ اس کے بعد وہ حجاز آ کر کچھ عرصہ مجاور رہے اُن سے پوچھا گیا کہ آپ نے کونسی عجیب چیز دیکھی فرمایا: "میں نے ایک راہب کو دیکھا جو مجاہدہ سے لاغر اور خوفِ خدا سے کبڑا ہو چکا تھا میں نے اُس سے پوچھا، اے راہب خدا کی راہ کونسی ہے؟" اُس نے جواب دیا۔ "اگر تو خدا کو جانتا تو اُس کا راستہ بھی پہچانتا۔ میں اُس کی پرستش کرتا ہوں جس کو میں نہیں جانتا اور تو اُس کی نافرمانی کرتا ہے جس کو تو پہچانتا ہے۔" پھر کہا "تو بے غم اور بے فکر نظر آتا ہے اور میں اپنے آپ کو خوفزدہ دیکھتا ہوں۔" عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ مجھے عبرت حاصل ہوئی اور میں کئی بُرے کاموں سے محفوظ رہا۔

ص ۱۰۳/۱۳۷

اُن سے روایت ہے۔ "اللہ کے دوستوں پر سکونِ دل حرام ہے۔" اہلِ حق دنیا میں طلب میں بے قرار ہوتے ہیں اور عقبیٰ میں عالمِ طرب میں بے چین۔ دنیا میں حق سے جدائی اُن کا قرار چھین لیتی ہے اور عقبیٰ میں حضورِ حق اور تجلیٔ حق اُن کو بے قرار کر دیتی ہے۔ مختصر یہ کہ دنیا اُن کے لیے عقبیٰ اور عقبیٰ دنیا کی طرح ہوتی ہے۔ دل کے سکون کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے یا مقصود کو پا لینا یا مقصود سے بالکل غافل ہو جانا۔ مقصود کا حاصل ہونا دنیا اور عقبیٰ میں روا نہیں۔ کیونکہ کامرانی سوزِ محبت کو ختم کر دیتی ہے اور غفلت دوستانِ حق پر حرام ہے۔ کیونکہ دلِ غافل سعیٔ طلب سے معذور ہوتا ہے۔ یہ محققانِ طریقت کا صحیح قول ہے اور اللہ بہتر جاننے والا ہے۔

۸۔ ابو علی الفضیل بن عیاضؒ

اہل حضور اور درگاہِ وصال کے بادشاہ ابو علی الفضیلؒ اہلِ طریقت میں بزرگ درویش تھے۔ معاملات اور حقائق سے بہرۂ کامل رکھتے تھے۔ طریقت کے مشاہیر میں عزت و احترام سے یاد کیے جاتے تھے۔ ان کی زندگی سچائی کا مرقع تھی۔ ابتدائے عمر میں عیار مشرب تھے اور مرو اور باورد کے درمیان رہزنی کرتے تھے مگر ہر وقت مائل بر صلاحیت تھے۔

ص ۱۰۳/۱۳۸

جوانمردی اور ہمت ان کی طبیعت میں موجود تھی۔ کسی قافلہ میں عورت پر دستبرد نہیں کرتے تھے کم سرمایہ والوں کو

نہیں لوٹتے تھے۔ اور سب کے لیے کچھ نہ کچھ حسب سرمایہ چھوڑ دیتے تھے۔ ایک سوداگر مرو سے جا رہا تھا لوگوں نے کہا بدرقہ ساتھ لے لو کیونکہ فضیل راہزن راستے میں ہے۔ اس نے جواب دیا میں نے سنا ہے کہ وہ خدا ترس آدمی ہے۔ سوداگر نے ایک قاری کو ساتھ لے لیا وہ اونٹ پر بیٹھا ہوا دن رات قرآن پڑھتا رہا جب قافلہ فضیل کی کمین گاہ کے قریب پہنچا تو قاری یہ پڑھ رہا تھا اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ "کیا ایمان داروں کے لیے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل ذکرِ حق سے خوفزدہ ہوں"۔ فضیل پر رقّت طاری ہو گئی۔ عنایت ازلی دل و جان پر چھا گئی۔ انھوں نے راہزنی ترک کر دی۔ اپنے تمام دشمنوں کو راضی کیا اور مکّہ معظمہ چلے گئے۔ مدت تک وہاں مجاور رہے اور اکثر اولیائے کرام سے ملے۔ پھر کوفہ واپس آئے اور ایک مدت ابوحنیفہ رضہ سے مصاحبت کی۔ ان کی کئی بلند روایات ہیں۔ وہ اہل حدیث میں مقبول ہیں۔ حقائقِ تصوف و معرفت میں ان کا کلام بہت رفیع الدرجہ ہے۔ ان سے روائت ہے: من عرف اللّٰہ حقّ معرفته عبده بكل طاقته "جس نے اللہ کو کما حقہٗ پہچانا اس نے پوری طاقت سے اس کی عبادت اختیار کی"۔ اللہ تعالیٰ کو اس کے انعام۔ احسان۔ کرم اور رحمت سے پہچانا جاتا ہے۔ جب پہچان لیا تو اس کی دوستی کا دامن ہاتھ میں آ گیا۔ دوستی کے شکر میں عبادت اختیار کی کیونکہ دوستوں کا فرمان بارِ خاطر نہیں ہوتا جتنی دوستی زیادہ ہو گی اتنا ہی عبادت کا شوق زیادہ ہو گا۔ "دوستی معرفت کی حقیقت ہے"۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک رات پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کر باہر تشریف لے گئے۔ مجھے گمان ہوا کہ آپؐ دوسرے حجرہ میں تشریف لے گئے ہیں۔ میں تعاقب میں گئی دیکھا کہ آپؐ مسجد میں مصروف نماز ہیں اور بحالت قیام زاری فرما رہے ہیں۔ حتّٰی کہ صبح ہو گئی اور حضرت بلال رضہ نے اذان دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ صبح ادا کرنے کے بعد واپس تشریف لائے میں نے دیکھا کہ قدم مبارک سوجے ہوئے ہیں۔ پھٹی ہوئی انگلیوں سے زرد رنگ کا پانی نکل رہا ہے۔ میں رو پڑی اور کہا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی اوّل و آخر لغزشیں معاف ہو چکی ہیں۔ آپؐ اس قدر کیوں تکلیف اٹھاتے ہیں۔ یہ تکلیف تو ان لوگوں کیلیے ہے جو عاقبت سے خوفزدہ ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری لغزشوں کی درگذر باری تعالےٰ کا فضل و کرم ہے اَفَلَا اَكُوْنُ عَبْدًا شَكُوْرًا "کیا مجھے اللہ کا شکر گزار بندہ نہیں ہونا چاہیے"۔ رب العزت نے کرم کیا اور مجھے بخشش کی بشارت دی کیا مجھے بندگی نہیں کرنی چاہیے اور تا بہ مقدور شکرِ نعمت حق ادا نہیں کرنا چاہیے۔

روائت ہے کہ معراج کی رات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پچاس نمازیں قبول فرمائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کہنے پر بار بار واپس گئے یہاں تک کہ پانچ نمازیں فرض رہ گئیں۔ ابتدا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پچاس ہی قبول فرمائی تھیں

ص ۱۰۲ / ۱۳۹

کیونکہ طبع مبارک میں مخالفت قطعاً نہیں تھی۔ "محبت موافقت کے قریب ہوتی ہے۔"

روایت ہے کہ آپ نے فرمایا "دنیا پاگل خانہ ہے۔ اہل دنیا پاگل ہیں اور طوق وزنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں۔" نفسانی خواہش ہمارے گلے کا طوق اور معصیت ہماری زنجیر ہے۔

ص ۱۰۵/۱۴۰

فضل بن ربیع سے روایت ہے کہ میں ہارون الرشید کے ہمراہ مکہ معظمہ گیا۔ حج ادا کرنے کے بعد خلیفہ نے مجھ سے پوچھا کیا یہاں کوئی مردِ حق ہے جس کی میں زیارت کرسکوں؟ میں نے کہا ہاں عبدالرزاق صنعانی یہاں پر موجود ہے۔ کہا مجھے اس کے پاس لے چلو۔ ہم وہاں پہنچ گئے۔ کچھ دیر بیٹھ کر جب اٹھنے لگے تو ہارون الرشید نے اشارہ سے کہا "پوچھو ان پر کوئی قرض ہے؟" معلوم ہوا قرض ہے۔ چنانچہ وہ چکا دیا گیا۔ باہر نکل کر خلیفہ نے کہا میرا دل ابھی تشنہ ہے کسی اور بڑے بزرگ کو ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا سفیان بن عُیینہ موجود ہیں۔ کہا اس کے پاس چلو۔ وہاں بھی کچھ دیر بیٹھے۔ چلتے وقت خلیفہ نے پھر قرض سے متعلق دریافت کیا۔ قرض نکلا اور وہ ادا کر دیا گیا۔ خلیفہ نے کہا میرا مقصود ابھی حاصل نہیں ہوا۔ میں نے کہا فضیل بن عیاض بھی یہاں موجود ہیں۔ ہم وہاں گئے۔ وہ ایک غرفہ میں بیٹھے قرآن پڑھ رہے تھے۔ ہم نے دروازے پر دستک دی۔ آواز آئی کون ہے؟ میں نے کہا امیرالمومنین تشریف لائے ہیں جواب ملا مجھے امیرالمومنین سے کیا مطلب؟ میں نے کہا سبحان اللہ! کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نہیں "کسی شخص کو طاعتِ حق میں ذلت طلب نہیں کرنی چاہیئے۔ جواب ملا۔ ٹھیک ہے مگر رضائے حق دائمی شان وشوکت کا باعث ہے۔ تم مجھے ذلت میں دیکھتے ہو اور میں اپنے آپ کو رفیع المرتبہ پاتا ہوں۔ یہ کہہ کر فضیلؒ نیچے اترے چراغ گُل کر دیا اور خود ایک کونے میں کھڑے ہوگئے۔ ہارون الرشید اندھیرے میں اِدھر اُدھر ٹٹولتا رہا۔ آخرکار اس کا ہاتھ ان تک پہنچ گیا۔ فضیلؒ نے کہا۔ "ایسا نرم اور گداز ہاتھ میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ کیا عجب ہے کہ عذابِ خداوندی سے بچ رہے۔" ہارون الرشید رونے لگا اور اتنا رویا کہ بیہوش ہوگیا۔ جب ہوش آیا تو کہا مجھے کوئی نصیحت فرمائیے۔ فرمایا تمہارے جدِ امجد یعنی حضرت عباسؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے امارت طلب کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دنیوی حکومت کی جائے میں آپ کو قلبی حکومت دیتا ہوں۔ خدائے عزوجل کی بندگی میں گزرا ہوا ایک لمحہ خلقت کی ہزار سالہ حکومت سے بہتر ہے۔ "امارت روزِ قیامت ندامت کا باعث ہوگی۔" ہارون نے کہا کچھ اور فرمائیے۔ آپ نے فرمایا جب عمر بن عبدالعزیز کو خلافت تفویض ہوئی اس نے سالم بن عبداللہ، جابر بن حیوٰۃ اور محمد بن کعب رضی اللہ عنہم کو بلا کر کہا کوئی تدبیر کیجیے امارت مصیبت ہے

ص ۱۰۵/۱۴۱

اور میں مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ ان میں سے ایک نے کہا اگر عذابِ خداوندی سے نجات درکار ہے تو بوڑھوں کو باپ، جوانوں کو بھائی اور چھوٹوں کو فرزند تصوّر کر اور ان سے وہ سلوک روا رکھ جو گھر میں باپ، بھائی اور بیٹے سے روا رکھا جاتا ہے۔ سب ولایت تیرا گھر ہے اور اس کے باشندے کنبہ۔ باپ کی زیارت کر، بھائی پر احسان کر اور فرزند سے حسنِ سلوک سے پیش آ۔ مجھے خوف ہے تیرا یہ خوبصورت جسم جہنم کی آگ کے سپرد نہ ہو۔ خدائے عزّوجلّ سے ڈر اور اس کے حقوق بطریقِ احسن پورے کر۔ ہارون نے پوچھا۔ آپ پر کوئی قرض ہے۔ فرمایا ہاں خدا کی طاعت کا قرض ہے مجھے ڈر ہے اس کے لیے مجھے گرفت نہ ہو۔ ہارون نے کہا میرا مطلب خلقت کا قرضہ ہے۔ فرمایا باری تعالیٰ کا ہزار شکر ہے کہ اس نے اپنی نعمتوں سے مالا مال کیا ہے۔ مجھے کوئی ایسی شکایت نہیں جو اس کے بندوں سے بیان کروں۔ ہارون نے ہزار دینار کی ایک تھیلی ان کے سامنے پیش کی اور کہا اسے اپنے کام میں لائیے اور بوقتِ ضرورت خرچ کیجیے۔ فضیلؒ نے فرمایا۔ افسوس ہے میری تمام نصیحت بیکار گئی۔ تو نے ظلم کا راستہ اختیار کیا اور مجھ پر ظلم روا رکھا۔ ہارون نے پوچھا میں نے کیا ظلم کیا۔ فرمایا میں تجھے راہِ نجات دکھاتا ہوں تو مجھے ہلاکت میں ڈالتا ہے۔ یہی ظلم ہوا کرتا ہے۔ ہارون روتا ہوا باہر نکل آیا اور کہا حقیقت میں فضیلؒ بادشاہ ہیں۔ یہ ان کے مقام کی دلیل ہے۔ جو اہلِ دنیا میں ان کو حاصل ہے۔ دنیا اور اس کی زینت ان کی نظر میں بے حقیقت ہے وہ دنیاداروں کی تواضع دنیا کے واسطے نہیں کرتے۔ ان کے فضائل بے شمار ہیں۔

ص ۱۰۶/۱۴۲

۹۔ ابوالفیض ذوالنون بن ابراہیم مصریؒ

سفینۂ تحقیق و کرامت اور شہنشاہِ شرفِ ولایت حضرت ذوالنون مصریؒ ثوبی قبیلہ کے فرزند تھے ثوبان نام تھا۔ اہلِ طریقت میں بہت بلند مقام کے مالک تھے۔ طریقِ بلا اور راہِ ملامت پر گامزن تھے۔ تمام اہلِ مصر ان کی رفعتِ مقام سے ناآشنا تھے اور ان کی بزرگی کے منکر مرتے دم تک ان کے حال و جمال سے کوئی واقف نہ تھا۔ جس رات آپ نے دنیا سے کوچ کیا ستر آدمیوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا فرما رہے تھے کہ ہم خدا کے دوست ذوالنون کا خیر مقدم کرنے آئے ہیں۔ مرنے کے بعد ذوالنون کی پیشانی پر یہ عبارت ثبت دیکھی گئی: هٰذا حبیب الله مات فی حب الله قتیل الله "یہ اللہ کا حبیب ہے، اللہ کی محبت میں مرا، اللہ کا شہید"۔ جب جنازہ اٹھا تو پرندے جمع ہو گئے اور ان کی میت پر اپنے پروں کا سایہ کیا۔ اہلِ مصر پر بڑا اثر ہوا اور وہ اپنی جفا پر سخت پشیمان ہوئے۔ تصوّف میں ان کے بے شمار بیش قیمت اقوال

ص ۱۰۷/۱۴۳

ہیں چنانچہ فرمایا۔" عارف ہر روز زیادہ سے زیادہ انکسار پر مائل ہوتا ہے کیونکہ ہر لحظہ وہ اپنے مالکِ حقیقی کے قریب تر ہوتا جاتا ہے"۔ ہر قدم پر قادرِ مطلق کا جبروت اس کے دل و دماغ پر طاری ہوتا رہتا ہے اور ہر قدم پر اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ سلطانِ مطلق سے کتنی دور ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے دوران کلام میں باری تعالیٰ سے پوچھا" میرے مولا میں تجھے کہاں تلاش کروں"۔ جواب ملا" ٹوٹے ہوئے دلوں میں"۔ عرض کی" بارِ خدایا کوئی دل میرے دل سے زیادہ ٹوٹا ہوا نہیں"۔ ندا آئی" تو پھر جہاں تو ہے وہاں میں ہوں"۔

ص $\frac{108}{144}$ جو کوئی بھی بغیر عجز و خوف عارف ہونے کا دعویٰ کرتا ہے جھوٹا اور ریاکار ہے۔ صحیح عرفان کا نشان خلوصِ ارادت ہے۔ خلوص تمام اسباب و تعلقات کو ختم کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ سوائے ذاتِ باری تعالیٰ کے کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ جیسا کہ ذوالنون رح نے فرمایا:" صداقت خدا کی تلوار ہے جس چیز پر پڑتی ہے اسے کاٹ دیتی ہے"۔ صداقت مسبب پر نظر رکھنے کا نام ہے۔ اسباب کو ثابت کرنے کا نہیں۔ کیونکہ جب اسباب کو ثابت کرنے کی کوشش کی جائے تو صداقت مفقود ہو جاتی ہے۔ حکایات میں ہے کہ ایک روز ذوالنون رح رودِ نیل میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کشتی میں سوار تھے۔ دوسری جانب سے ایک اور کشتی آ رہی تھی جس میں کچھ اربابِ نشاط سوار تھے اور اخلاق سوز مشاغل میں مصروف تھے۔ ذوالنون رح کے مصاحبین کو سخت کوفت ہوئی۔ عرض کی آپ دعا کریں یہ سب غرق ہو جائیں تاکہ خلق کو ان کے شر سے نجات حاصل ہو۔ ذوالنون رح کھڑے ہوئے اور ہاتھ اٹھا کر دعا کی۔ بارِ خدایا! ان لوگوں کو دنیا میں عیش و عشرت عطا کی ہے عاقبت میں بھی سکون و راحت ارزاں فرما۔ اس دعا پر ارادت مندوں کو سخت حیرت ہوئی۔ رفتہ رفتہ کشتی قریب آ گئی۔ جب اربابِ نشاط نے ذوالنون رح کو دیکھا تو بے اختیار رونے لگے۔ معذرت کی۔ چنگ و رباب توڑ کر پھینک دیے۔ توبہ کی اور حق کی طرف رجوع کیا۔ ذوالنون نے فرمایا دیکھا مقصد حاصل ہو گیا وہ بھی کامران ہیں تم بھی کامیاب ہو کسی کو تکلیف نہیں پہنچی۔ ص $\frac{108}{145}$ یہ ذوالنون رح کے قلبِ شفیق کی دلیل ہے آپ کو مسلمانوں سے نہایت درجہ ارادت تھی اور آپ سنتِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کاربند تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی خفا نہیں ہوتے تھے اور فرماتے تھے" باری تعالیٰ میری قوم کو ہدایت فرما وہ میرے حال سے آشنا نہیں ہیں"۔

یہ بھی مشہور ہے کہ آپ ایک بار بیت المقدس جا رہے تھے راہ میں ایک بڑھیا کو دیکھا۔ کوزہ ہاتھ میں تھا عصا کے سہارے چل رہی تھی اور ریشم کا جبہ پہنا ہوا تھا۔ پوچھا" کہاں سے آ رہی ہو"۔ بڑھیا نے جواب دیا" اللہ تعالیٰ کے

ہاں سے"۔ پوچھا "کہاں جا رہی ہو"۔ کہا "اللہ تعالیٰ کی طرف" ذوالنون رح کے پاس ایک دینار تھا اسے دینے کے لیے نکالا۔ بڑھیا نے ذوالنون رح کے منہ پر طمانچہ مارا اور کہا۔ "ذوالنون رح تو نے مجھے غلط سمجھا ہے۔ میں خدائے عزّوجل کی بندی ہوں بجز اس کے کسی سے کچھ طلب نہیں کرتی۔ اسی کی پرستش کرتی ہوں اور اسی کی استعانت چاہتی ہوں"۔ بڑھیا یہ کہہ کر چلی گئی۔ اس حکایت میں ایک لطیف اشارہ ہے۔ "میں اس کی بندی ہوں"۔ بڑھیا کی سچی محبت کا اقرار ہے۔ معاملت کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ انسان نیک کام کرے اور سمجھے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے کر رہا ہوں۔ حالانکہ ہر کام اس کی اپنی ذات کے لیے ہوتا ہے گو بظاہر اس میں کوئی نفسانی خواہش کارفرما نہ ہو تاہم دل میں ثوابِ عاقبت کا خیال ضرور جاگزین رہتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ دنیا اور عقبیٰ کا خیال قطعاً موقوف ہو نہ دنیا کی عزت و توقیر کی ہوس ہو نہ عاقبت کی جزا و سزا پر نظر ہو۔ جو کام بھی ہو محض باری تعالیٰ کے احکام کی تعظیم کی خاطر ہو اور تعمیلِ احکام میں ہر ذاتی مقصد کو نظر انداز کیا جائے۔ اوّل الذکر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ جو کچھ بھی ثواب آخرت کے لیے کرتے ہیں اللہ کے لیے کرتے ہیں۔ اور یہ سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں کہ سالکانِ حق کو صرف طاعت کی ہوس ہوتی ہے اور اس طاعت میں ان کے لیے وہ مسرت ہوتی ہے جو گنہ گار کو معصیت میں ہرگز میسّر نہیں آ سکتی کیونکہ گناہ کی مسرّت صرف چند لمحوں کے لیے ہوتی ہے اور طاعت دائمی مسرّت کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ باری تعالیٰ انسانی طاعت و مجاہدہ سے بے نیاز ہے۔ ترکِ مجاہدہ سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اگر تمام عالم ابوبکر رض کے صدق پر ہو تو اسے کیا فائدہ؟ اگر تمام خلق فرعون کا کذب اختیار کرے تو اسے کیا نقصان؟ بقولِ حق "اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا" "اگر تم نیکوکار ہو تو اپنی ذات کے لیے اور اگر بدکار ہو تو اپنی جان کے لیے"۔ اور نیز "جو راہِ حق پر جادہ پیما ہے اپنی منفعت کے لیے ہے خدا مخلوق سے بے نیاز ہے"۔ وہ عاقبت کی حیاتِ دوام کے طالب ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم حق تعالیٰ کی طاعت میں مشغول ہیں۔ اس کے برعکس عشقِ حق کے انداز اور ہی کچھ ہیں! عاشقانِ حق تعمیلِ احکام کو تعمیلِ محبوب سمجھتے ہیں اور ہر غیر چیز کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اسی موضوع پر کچھ اور بابِ اخلاص میں بیان ہوگا انشاء اللہ عزّ وجلّ۔

۱۰۔ ابو اسحاق ابراہیم بن ادھم بن منصور رح

امیرِ امرا، سالکِ طریق تھا ابو اسحاق ابراہیم بن ادھم رض اپنے طریق میں یگانۂ روزگار تھے۔ اور اپنے

ہم عصروں کے سردار حضرت خضر علیہ السلام کے مرید تھے۔ کئی متقدّمین سے ملاقات کر چکے تھے۔ امام ابو حنیفہؒ سے بھی ملے اور ان سے علم حاصل کیا۔ ابتدا میں وہ بلخ کے حکمران تھے۔ ایک روز شکار کھیلتے ہوئے ایک ہرن کے تعاقب میں لشکر سے دور نکل گئے۔ خدا نے ہرن کو زبان دی اور اس نے ابراہیمؒ کو مخاطب کر کے کہا "کیا تمہیں اس لیے پیدا کیا گیا ہے یا تمہیں یہ کچھ کرنے کا حکم ملا ہے؟" ابراہیمؒ نے توبہ کی ہر طرف سے منہ پھیر لیا اور زہد و افتقار کا راستہ اختیار کیا۔ فضیل بن عیاضؒ اور سفیان ثوریؒ سے ملے۔ ایک عرصہ مصاحبت کی۔ اور باقی ماندہ تمام عمر اپنی محنت سے کما کر روزی کھائی۔ طریقت میں ان کے اقوال بدیع اور لطائف نفیس مشہور ہیں۔ بقول حضرت جنیدؒ "ابراہیم تمام علوم کی چابی ہے"۔ آپ کا قول ہے: "خدا کی دوستی کا دامن پکڑو باقی ہر چیز سے منہ موڑ دو"۔

جب کوئی آدمی خلوصِ دل سے خدا کی طرف رجوع کرتا ہے وہ باقی تمام دنیا سے منہ پھیر لیتا ہے۔ کیونکہ دنیا اور اہلِ دنیا کا خدا کی محبت میں کوئی دخل نہیں۔ قُربِ خداوندی کا اصل یہ ہے کہ اُس کے تعمیل احکام میں محض خلوص اور بندگی ہو۔ عشقِ حق خواہشاتِ نفسانی سے بیزار ہو کر حاصل ہوتا ہے جو نفسانی خواہشات کا شکار ہو وہ قُربِ حق سے محروم ہوتا ہے اور جو خواہشات سے بیزار ہو وہ اپنے خالق سے قریب تر ہوتا ہے۔ انسان کی اپنی ذات تمام بنی نوعِ انسان کا خلاصہ ہے۔ اپنی ذات سے روگردان ہونا نوعِ انسان سے روگردان ہونے کے برابر ہے مگر خلقت سے منہ پھیر کر اپنی ذات میں منہمک ہو جانا ظلم ہے کیونکہ خلقت جس حال میں ہے تقدیرِ الٰہی سے ہے اور تیرا معاملہ تیرے ساتھ ہے۔ طالبِ حق کے ظاہر و باطن کی استقامت دو چیزوں پر ہے شناخت یعنی علم پر اور عمل پر۔ از روئے علم ہر خیر و شر میں تقدیرِ خداوندی کار فرما نظر آتی ہے۔ کیونکہ کوئی چیز ساکن یا متحرک نہیں ہوتی جب تک وہ سکون و حرکت روبکار نہ ہو جو باری تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے۔ عمل تعمیلِ احکامِ خداوندی کا دوسرا نام ہے اور صحتِ معاملات اور حفظِ تکلیف ایں صورت پذیر ہوتا ہے۔ تقدیرِ خداوندی نافرمانی کے لیے دلیل نہیں ہو سکتی۔ جب تک انسان اپنی ذات سے روگردان نہ ہو خلق سے روگردانی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ جب انسان اپنی ذات سے روگردان ہو جائے تو وجودِ خلق اپنی جگہ خالق کی مصلحت کی تکمیل کے لیے لازمی ہوتا ہے۔ جب سالک ذاتِ حق کی طرف مشغول ہوتا ہے تو اس کا اپنا وجود تکمیل رضائے خداوندی کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ اگر بجز ذاتِ خدا کسی چیز سے رغبت ہی ہے تو اپنی ذات سے نہیں بلکہ کسی غیر سے ہونی چاہیئے۔ کیونکہ رغبتِ غیر رویتِ توحید ہے اور اپنی ذات کے ساتھ رغبت خالقِ اکبر کی تردید برملا ہے۔ شیخ ابوالحسن سالبہؒ نے اپنے ایک مرید سے فرمایا اپنی ذات کے تابعِ فرمان ہونے سے یہ بہتر ہے

کہ انسان بلی کا تابع فرمان ہو جائے۔ بغیر کی مصاحبت برائے خدا ہوتی ہے اپنی ذات کی مصاحبت صرف نفس پروری کے لیے کی جاتی ہے۔ اسی موضوع پر اس کتاب میں مناسب مقام پر کچھ اور بھی لکھا جائے گا انشاء اللہ العزیز۔

حکایات میں ہے کہ ابراہیم ادھمؒ ایک صحرا میں جا رہے تھے کہ کسی بوڑھے سے ملاقات ہوئی اس نے کہا: "اے ابراہیم! تجھے معلوم ہے یہ کیا جگہ ہے؟ بغیر زادِ راہ سفر کر رہا ہے۔" ابراہیمؒ نے محسوس کیا کہ وہ ابلیس سے دوچار ہیں۔ ان کی جیب میں چار درھم تھے جو کوفہ میں اپنی زنبیل فروخت کر کے حاصل کیے تھے فوراً نکال کر پھینک دیئے اور عہد کیا کہ ہر میل مسافت کے بعد چار سو نفل ادا کریں گے۔ چار سال صحرا نوردی میں گذر گئے ہر روز وقت پر روزی ملتی رہی۔ اسی دوران حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوئی اسم اعظم ان سے سیکھا اور اس کے بعد ان کا دل کلیتۃً خیال غیر اللہ سے تہی ہو گیا۔ ان کے مناقب بے شمار ہیں سب توفیق اللہ کی طرف سے ہے۔

ص ۱۱۱/۱۴۹

۱۱۔ بشر بن الحارث الحافی رضؓ

سر یہ معرفت، تاجِ اہل معاملت بشر بن الحارث رضؓ مشاہدہ میں بڑی شان کے مالک اور معاملت میں بڑے صاحب کمال تھے۔ فضیلؒ کا فیضِ مصاحبت پایا تھا اپنے خالو علی بن حشرم کے مرید تھے۔ اصول و فروع کے عالم جید تھے۔ ان کی ابتدائے توبہ یوں ہوئی کہ عالمِ مستی میں کہیں جا رہے تھے سامنے ایک پرزۂ کاغذ زمین پر پڑا ہوا نظر آیا تعظیماً اسے اٹھایا۔ کاغذ پر بسم اللہ شریف لکھی ہوئی تھی۔ بشر رضؓ نے اس پرزۂ کاغذ پر عطر لگایا اور کسی پاک جگہ پر رکھ دیا۔ اسی رات ہاتفِ غیب نے خواب میں کہا "خدا کے نام کو خوشبو لگانے والے خدا نے تیرے نام کو دنیا اور عاقبت میں خوشبودار کیا۔" یہ خواب دیکھنے کے بعد بشر رضؓ نے توبہ کی اور زہد اختیار کیا۔ مشاہدۂ حق نے غلبہ کیا تو ننگے پاؤں پھرنا شروع کر دیا۔ لوگوں نے پوچھا تو جواب دیا زمین حق تعالیٰ کا فرش ہے اور میں نہیں چاہتا کہ جب چلوں تو میرے پاؤں اور حق تعالےٰ کے فرش کے درمیان کوئی چیز حائل ہو یہ ان کی معاملت کا عجیب و غریب پہلو ہے۔ ان کی نظر میں جوتا بھی اک حجاب تھا۔

ص ۱۱۲/۱۵۰

روایت ہے کہ بشر رضؓ نے فرمایا "جو شخص دنیا کی عزت اور عاقبت کی سرفرازی کا طالب ہے اس کے لیے یہ تین چیزیں ضروری ہیں (۱) غیر سے انعام کی ہوس نہ رکھے (۲) کسی کو برا نہ کہے اور (۳) کسی کی دعوتِ طعام قبول نہ کرے۔" سالک کبھی غیر اللہ کو منعم نہیں سمجھتا۔ منعمِ حقیقی خدا کی ذاتِ پاک ہے۔ اپنے ہم جلسوں سے مانگنا ظلم ہے اسی طرح

جو کسی کی برائی کرتا ہے در اصل خدا پر نکتہ چینی کرتا ہے کیونکہ ہر چیز کا خالق وہی ہے۔ مخلوق کی عیب جوئی در اصل خالق کی عیب جوئی ہے۔ بجز کفار جن کو بحکم خداوندی برا کہا جاتا ہے۔ دعوتِ طعام سے پرہیز کا مقصد یہ ہے کہ رزاقِ مطلق باری تعالیٰ کی ذاتِ پاک ہے اگر کوئی بندہ روزی کا سبب بنے تو اس پر نہیں بلکہ رازقِ مطلق پر نظر ہونی چاہیئے اور یہ سمجھنا چاہیئے کہ جو کچھ بھی وہ پیش کر رہا ہے وہ باری تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اگر دعوتِ طعام دینے والا یہ سمجھتا ہو کہ پیش کردہ طعام اس کا اپنا ہے اور وہ از راہِ احسان پیش کر رہا ہے تو قبول نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ روزی میں کسی کا احسان نہیں اور اہلِ سنّت کے نزدیک روزی غذا ہے اور غذا صرف خدائے عزّ و جلّ کی عطا ہے۔ اس کے برعکس معتزلہ سمجھتے ہیں کہ روزی ملکیت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس قول کا مطلب مجازاً کچھ اور ہے اللہ بہتر جاننے والا ہے۔

۱۲۔ ابو یزید طیفور بن عیسیٰ البسطامیؒ

فلکِ معرفت، ملکِ محبت ابو یزید طیفور بسطامیؒ مشائخ کبار میں بہت بلند مقام رکھتے تھے حال میں اتنے رفیع اور شان میں اتنے بلند تھے کہ جنیدؒ نے فرمایا: "ابو یزیدؒ ہمارے اندر وہ مقام رکھتے ہیں جو حضرت جبرئیل فرشتوں میں"۔ مجوسی قوم سے تھے اور ان کے والد بسطام کے ایک بزرگ تھے۔ احادیثِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم میں ان کی روایات بہت بلند اور قابلِ قدر ہیں۔ وہ اہلِ طریقت کے دس اماموں میں ایک تھے۔ ان سے قبل اس علم میں کسی کو اتنا تبحر نصیب نہیں ہوا۔ تمام احوال میں محبِ علم اور معظّمِ شریعت تھے گو بعض لوگوں نے اپنے الحاد کی بنا پر بعض بے کار تعلیمات ان سے منسوب کر دی ہیں۔ آپ کا قول ہے: "میں نے تیس سال تک مجاہدہ کیا، علم اور اس کی متابعت سے زیادہ مشکل کوئی چیز نہیں دیکھی۔ اگر علماء میں اختلاف نہ ہوتا تو میں کچھ بھی نہ کر سکتا۔ اختلافِ علماء ایک رحمت ہے بجز توحید و تجرید کے"۔ در حقیقت طبع انسانی مایل بر جہالت ہوتی ہے اور بے علم بہت سے کام جہالت کے باعث بلا تکلّف کر گزرتا ہے۔ صاحبِ علم کوئی چیز بے تکلّف نہیں کر پاتا۔ شریعت کی راہ پل صراط سے زیادہ باریک و پُر خطر ہے۔ سالک کے لیے ضروری ہے ہر حالت میں ایسی روش پر چلے کہ اگر مقاماتِ اعلیٰ اور احوالِ رفیع میسّر نہ آئیں اور وہ گرے تو دایرۂ شریعت میں گرے۔ ہر چیز چھن جائے تو کم از کم شرعی اعمال اس سے نہ چھوٹیں کیونکہ شریعت کے احکام پر عمل چھوڑ دینا مرید کے لیے سب سے بڑا نقصان ہے۔ حالانکہ شریعت پر عامل ہونے کا دعویٰ بے حقیقت ہوتا ہے اور دعویٰ کرنے والے کے بیان کی غلطی کھل جاتی ہے۔

ص ۱۱۳/۱۵۲

ابویزیدؒ ہی نے فرمایا: اہلِ محبت کے نزدیک خدا کی محبت کے مقابلے میں بہشت کی کوئی اہمیت نہیں محبت کے مدعی محبت کے پردوں میں محجوب ہوتے ہیں بہشت اگرچہ بہت بڑی چیز ہے مگر مخلوق ہے اور خدا کی محبت خدا کی صفتِ نامخلوق ہے۔ جو کوئی نامخلوق (محبت خدا) کی بجائے مخلوق (بہشت) کی محبت میں گرفتار رہا اس نے اپنی اہمیت کھودی۔ مخلوق دوستانِ حق کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ دوستوں کے لیے دوستی ہی حجاب ہوتی ہے۔ کیونکہ دوستی کے وجود سے خدا اور اپنے درمیان (دوئی) کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ لیکن دوئی توحید کے خلاف ہے محبت کی راہ توحید سے توحید کی طرف ہوتی ہے۔ محبت کی راہ میں محبت ہی آفت اور بلا بن جاتی ہے۔ محبت میں مرید اور مراد کی ضرورت ہوتی ہے یا خدا مرید اور بندہ مراد ہو یا خدا مراد اور بندہ مرید ہو۔ اگر خدا مرید اور بندہ مراد ہو تو خدا کی نظر میں بندہ کی ہستی ثابت ہو گئی۔ لیکن اگر بندہ مرید ہو اور مراد طلب و ارادت خدا ہو تو آدمی کی اپنی ہستی سدِ راہ بن جاتی ہے۔ پس محب (آدمی) کا محبوب کے لیے فنا ہونا اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ وہ محبت کے لیے فنا ہو۔

ص ۱۱۴/۱۵۳

کہتے ہیں ابا یزیدؒ خانہ کعبہ گئے۔ ایک خالی گھر دیکھا۔ سوچا میرا حج نہیں ہوا کیونکہ ایسے پتھر تو میں بہت دیکھ چکا ہوں۔ دوسری بار گئے تو گھر بھی دیکھا اور گھر کے مالک کو بھی دیکھا۔ پھر بھی سوچا کہ میرا حج نہیں ہوا کیونکہ یہ حقیقتِ توحید کے خلاف ہے۔ تیسری بار پھر گئے۔ صرف گھر کے مالک کو دیکھا۔ گھر غائب تھا۔ دل نے آواز دی: "اے ابویزید اگر اپنے آپ کو نہ دیکھتے تو مشرک نہ ہوتے چاہے سارے عالم پر تمہاری نظر ہوتی۔ تم مشرک ہو کیونکہ تمہاری نظر اپنی ذات پر ہے گو سارے عالم کو نظر انداز کر رکھا ہے۔" ابویزیدؒ فرماتے ہیں میں نے توبہ کی۔ توبہ سے بھی توبہ کی۔ اور پھر اپنی ذات کو دیکھنے سے توبہ کی۔ یہ چیز ابویزیدؒ کی صحتِ حال سے متعلق ایک لطیف نکتہ ہے اور صاحبانِ حال کے لیے ایک عمدہ دلیل۔

۱۳۔ ابو عبداللہ حارث بن اسد محاسبیؒ

ابو عبداللہؒ، اصول و فروع کے عالم تھے اور اپنے زمانے میں اہلِ علم کے لیے مرجع خاص تھے۔ اصولِ تصوف پر ان کی مشہور کتاب "رغائب" ہے۔ اس کے علاوہ ان کی بہت سی تصانیف ہیں۔ ہر فن میں عالی حال اور بزرگ ہمت تھے۔ بغداد میں شیخ المشائخ تھے۔ ان کا قول ہے: العلم بحرکاتِ القلوبِ فی مطالعة الغیوب اشرفُ من العملِ بحرکاتِ الجوارح "مطالعۂ غیوب کے معاملے میں حرکاتِ دل کا علم ہاتھ پاؤں کے عمل سے بہتر ہے"۔ اس کا

مطلب یہ ہے کہ علم محلِ کمال ہے اور جہل محل طلب۔ خدا کے ہاں علم جہالت سے بدرجہا بہتر ہے۔ علم انسان کو درجۂ کمال پر پہنچاتا ہے اور جہل آستان کی باریابی سے بھی محروم کردیتا ہے۔ علم کا مقام عمل سے بھی بلند تر ہے۔ کیونکہ خداوند عزّ و جلّ کو صرف علم سے پہچان سکتے ہیں، محض عمل سے نہیں پا سکتے۔ اگر عمل بدونِ علم کارگر ہوتا تو عیسائی اور رہبانیت کے علم بردار شدّتِ مجاہدہ سے مقام مشاہدہ حاصل کرلیتے اور عاصی ایمان دار مبتلائے مغایبہ رہتے۔ عمل بندہ کی صفت ہے اور علم خدا کی۔

بعض راویوں کو مغالطہ ہوا ہے وہ دونوں جگہ عمل پڑھتے ہیں یعنی "العملُ بحرکات القلوب اشرف من العمل بحرکات الجوارح" یہ محال ہے۔ عملِ انسانی حرکاتِ دل سے عبارت نہیں ہوتا۔ اگر مراد فکر و مراقبۂ باطن سے ہے تو یہ کوئی بدّت نہیں کیونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ایک لمحۂ فکر یہ ساٹھ برس کی بندگی سے بہتر ہے"۔ فی الحقیقت روحانی عمل جسمانی عمل سے بلند تر ہوتا ہے اور اندرونی احساسات و اعمال کا اثر بیرونی اعمال سے کہیں زیادہ مکمل ہوتا ہے۔ اسی واسطے کہا جاتا ہے "صاحبِ دل کی نیند عبادت ہے اور بے وقوف کی بیداری گناہ"۔ صاحبِ دل کے قلب پر خدا کی حکمرانی ہوتی ہے چاہے وہ سو رہا ہو چاہے بیدار ہو اور جب دل محکوم حق ہو تو جسم از خود محکوم ہوتا ہے۔ غلبۂ حق سے مغلوب دل حرکاتِ ظاہر پر غالب نفس سے بہتر ہے۔

مشہور ہے کہ انھوں نے ایک درویش سے کہا "یا خدا کا ہو کر رہ یا کچھ بھی نہ رہ" یعنی یا باقی بالحق ہو یا اپنی ذات سے فنا ہو جا۔ یا صفوت سے جمعیت خاطر حاصل کر یا فقر میں پراگندہ ہو جا۔ یا اس بات کا اہل بن کہ باری تعالیٰ نے فرمایا: اُسْجُدُوا لِآدَمَ "اے فرشتو آدم کو سجدہ کرو"۔ یا اس روش پر جی کہ باری تعالیٰ نے فرمایا: هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا "کیا انسان پر ایسا وقت نہیں گزرا جب وہ کسی قابل بھی نہیں تھا"۔ اگر برضا و رغبت اپنے آپ کو سپردِ خدا کر دے تو روزِ قیامت تیرا حشر تیرے اپنے ہاتھ ہو گا ورنہ حاکمِ حشر کے ہاتھ۔ یہ نکتہ بہت نازک ہے اور اللہ بہتر جاننے والا ہے۔

۱۴۔ ابو سلیمان داؤد بن نصیر الطائیؒ

مشائخِ کبار اور اہلِ تصوّف کے سرداروں میں سے تھے۔ ابو حنیفہؒ کے شاگردِ رشید اور طریقت میں حبیب راعیؒ کے مرید تھے۔ فضیلؒ اور ابراہیم ادھمؒ وغیرہم کے ہم عصر تھے۔ ہر علم و فن کے ماہر اور فقہ میں فقیہ الفقہاء تھے مگر

گوشہ نشینی اختیار کی اور مال و دولت سے روگرداں ہو کر زہد و تقویٰ کا دامن تھام لیا کہتے ہیں آپ نے اپنے ایک مرید سے فرمایا۔ "خیریت درکار ہے تو دنیا کو خیرباد کہو۔ کرامت کی ضرورت ہے تو عقبیٰ سے دستبردار ہو جاؤ"۔ یہ دونوں مقاماتِ حجاب ہیں۔ ہر فراغت کا راز اسی قول میں مضمر ہے۔ جسمانی راحت دنیا سے روگرداں ہونے میں ہے اور دل کا سکون عقبیٰ کی ہوس سے ہاتھ دھو لینے میں ہے۔ مشہور ہے کہ داؤدؒ محمد بن الحسن سے بے تکلف ملتے تھے مگر ابو یوسف القاضی سے پرہیز کرتے تھے۔ کسی نے پوچھا حضرت! آپ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ فرمایا محمد بن الحسن مال و دولت میں کھیلتا تھا اس نے علم دین حاصل کیا اور اس علم کی بدولت اس کی قدر و منزلت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اس کے برعکس ابو یوسف فقیر تھا علم حاصل کیا اور اس کے طفیل جاہ و مرتبہ پایا۔

ص ۱۱۶/۱۵۶

معروف کرخیؒ فرماتے ہیں: "میں نے داؤد طائیؒ سے بڑھ کر دنیا سے بیزار کسی کو نہیں پایا۔ دنیا اور اہل دنیا ان کی نظر میں ہیچ تھے۔ ان کو فقراء سے شکستہ حالی کے باوجود بڑی ارادت تھی"۔ داؤد طائیؒ کے مناقب بے شمار ہیں۔ واللہ اعلم۔

۱۵۔ ابوالحسن سری بن مغلّس السقطی

جنیدؒ کے ماموں تھے۔ تمام علوم میں آپ کامل تھے اور تصوّف میں منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ مقامات کے تعیّن اور باطنی احوال کی وسعت پر غور کرنے والوں میں آپ متقدمین میں شمار ہوتے تھے۔ عراق کے بہت سے مشائخ کبار آپ کے مرید تھے۔ انہوں نے حبیب راعیؒ سے ملاقات کی اور ان کے مصاحب بھی رہے۔ معروف کرخیؒ کے مرید تھے۔ بغداد کے بازار میں خوانچہ فروشی کا کام کرتے۔ کہتے ہیں ایک بار بازار میں آگ لگ گئی لوگوں نے آکر اطلاع دی کہ ان کی دکان بھی نذرِ آتش ہو گئی۔ فرمایا "خوب ہوا مجھے اس بار سے بھی نجات ملی"۔ بعد میں معلوم ہوا کہ بازار تو جل کر راکھ ہو گیا ہے مگر ان کی دکان محفوظ ہے۔ آپ نے تمام سامان غرباء میں تقسیم کر دیا اور خود درویشی اختیار کر لی۔ کسی نے پوچھا آپ کی طبیعت میں انقلاب کا آغاز کیسے ہوا؟ فرمایا "حبیب راعیؒ ایک دن میری دکان کے سامنے سے گذرے میں نے ایک ٹکڑا روٹی کا ان کو دیا اور کہا کسی غریب کو دے دیں۔ انہوں نے کہا "خدا تمہیں اس کا اجر دے"۔ اس دن کے بعد میرے دل میں دنیوی کاروبار کی فلاح اور بہبود کی کوئی آرزو نہ رہی۔

ص ۱۱۷/۱۵۷

ان کا قول ہے "اے خدا جو عذاب بھی دے مجھے گوارا ہے مگر حجاب کے عذاب میں مبتلا نہ کر"۔ کیونکہ حجاب نہیں

تو ہر عذاب کو برداشت کرنا تیرے ذکر اور مشاہدہ سے آسان ہے اور اگر حجاب ہے تو تیرا کرم بھی عذاب سے کم نہیں جہنم کے عذاب کا شدید ترین پہلو یہی ہے کہ اہلِ جہنم دیدارِ خداوندی سے محروم ہوں گے اگر دیدار نصیب ہو تو اہلِ جہنم کبھی بہشت کی تمنا نہ کریں کیونکہ لذتِ دید شدتِ عذاب کو ختم کر دیتی ہے۔ اسی طرح بہشت کی کوئی مسرت کشف سے بڑھ کر دل نشین نہیں۔ ہزار در ہزار مسرت کے باوجود اگر رویت باری تعالیٰ نہ ہو تو اہل بہشت کے دل ٹوٹ جائیں۔ یہ رسمِ خداوندی ہے کہ اس کے دوست اس کی جھلک دیکھتے ہیں اور ہر مصیبت کو برداشت کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے لب پر یہی دعا ہوتی ہے "ہر عذاب تیرے حجاب کے مقابلے میں قبول ہے اگر تو سامنے ہے تو کسی مصیبت کا خوف نہیں"۔ واللہ اعلم۔

۱۶۔ ابو علی شقیق بن ابراھیم الازدیؒ

علوم شریعت، معاملت اور حقیقت کے ماہر تھے۔ تصوف کے کئی پہلوؤں پر ان کی تصانیف ہیں۔ وہ ابراھیم ادھمؒ اور کئی دیگر مشائخ کبار سے مصاحبت کر چکے تھے۔ ان کا قول ہے "اہل طاعت مر کر بھی زندہ رہتے ہیں اور گناہگار زندگی میں بھی مردہ ہوتے ہیں"۔ طاعت گزار بعد از مرگ بھی زندہ ہوتے ہیں کیونکہ فرشتے ان پر حشر تک آفرین کہتے ہیں اور حشر میں بھی ان کو حیاتِ جاوید کی دولت نصیب ہوتی ہے۔ فنا ہو کر وہ دائمی جزا کے ساتھ زندہ و باقی رہتے ہیں۔

ایک مرد پیر آپ کے سامنے پیش ہوا اور عرض کی میں بہت گنہ گار ہوں اور توبہ کرنا چاہتا ہوں۔ فرمایا تم بہت دیر سے آئے۔ مردِ پیر نے کہا یہ درست نہیں موت سے پہلے آ گیا ہوں ایسی کوئی تاخیر تو نہیں ہوئی۔

کہتے ہیں آپ کی توبہ کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ ایک سال بلخ میں سخت قحط پڑا۔ لوگ ایک دوسرے کو کھا رہے تھے اس عالمِ مصیبت و ابتلا میں شقیقؒ نے دیکھا کہ ایک نوجوان سرِ بازار ناچ کود رہا ہے۔ لوگوں نے پوچھا "تم کیوں ناچ رہے ہو۔ تمام خلقت مصیبت میں مبتلا ہے تمہیں اپنی روش پر شرم آنی چاہیئے"۔ نوجوان نے جواب دیا "مجھے کوئی غم نہیں، میرا مالک ایک پورے گاؤں کا مالک ہے اور وہ میری روزی کا کفیل ہے"۔ شقیقؒ نے چلا کر کہا "خدایا! یہ نوجوان اس بات پر نازاں ہے کہ اس کا مالک پورے گاؤں کا مالک ہے۔ تو شاہوں کا شہنشاہ ہے اور روزی کا وعدہ کر چکا ہے۔ پھر ہم بدنصیب اپنے آپ کو رنج و مصیبت میں مبتلا سمجھتے ہیں"۔ آپ نے راہِ حقیقت اختیار کی اور اس کے بعد اپنی روزی کے لیے فکرمند نہ ہوئے آپ

کہا کرتے تھے "میں اس نوجوان کا مرید ہوں میں نے جو کچھ بھی سیکھا اسی سے سیکھا" یہ آپ کا انکسار تھا۔ ص ۱۱۹/۱۵۹

۱۷۔ ابو سلیمان بن عبد الرحمٰن بن عطیۃ الدرانی رح

اہل تصوف آپ کی بہت تعظیم کرتے تھے اور ارادت سے "ریحانِ دل" کہہ کر یاد کرتے تھے۔ آپ ریاضت و مجاہدہ میں بہت مشہور تھے۔ علمِ وقت اور معرفتِ آفات کے ماہر تھے اور ان کی مخفی کمین گاہوں پر نگاہِ غائر رکھتے تھے۔ طاعت اور حفظِ قلب و اعضاء پر ان کے لطیف ارشادات ہیں۔ آپ کا قول ہے "جب امید خوف پر غالب ہو تو وقت پراگندہ ہو جاتا ہے"۔ کیونکہ وقت کا مقصد استقامتِ حال ہے۔ اور استقامت برقرار رہتی ہے جب تک خوف برقرار ہو۔ اس کے برعکس اگر خوف امید پر غالب ہو تو نقصانِ توحید ہے کیونکہ غلبۂ خوف ناامیدی کی علامت ہے اور باری تعالیٰ سے ناامیدی شرک ہے۔ الغرض توحید کا اثبات امید سے ہے اور وقت کا خوف سے۔ دونوں قائم رہتے ہیں جب خوف اور امید کا توازن قائم ہو۔ اثباتِ توحید مومن بناتی ہے اور اثباتِ وقت پرہیزگار۔ امید کی بنیاد مشاہدہ پر ہے اور اعتقادِ راسخ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ خوف کلیۃً مجاہدہ سے متعلق ہوتا ہے جو اضطراب سے خالی نہیں۔ مشاہدہ بھی مجاہدہ سے حاصل ہوتا ہے یا بالفاظِ دیگر ہر امید ناامیدی سے پیدا ہوتی ہے۔ جب انسان اپنے اعمال میں بہبودیٔ مستقبل سے ناامید ہو جاتا ہے تو اس کی ناامیدی راہِ نجات کی مشعل بن جاتی ہے اور وہ بہبودی اور لطفِ خداوندی سے ہم آغوش ہو جاتا ہے۔ مسرتوں کے دروازے وا ہو جاتے ہیں۔ خواہشاتِ نفسانی ناپید ہو جاتی ہیں اور وہ انوارِ حقیقت سے روشناس ہو جاتا ہے۔ ص ۱۱۹/۱۶۰

احمد بن ابی الحواری رح کہتے ہیں ایک رات مجھے خلوت میں نماز ادا کرتے ہوئے بے حد لذت محسوس ہوئی دوسرے دن ابو سلیمان رح سے ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا "بہت کمزور انسان ہو خلوت میں کچھ اور جلوت میں کچھ اور"۔ کائنات میں کوئی ایسی چیز نہیں جو بندے اور خدا کے درمیان حائل ہو سکے۔ دلہن کا پردہ اٹھانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سب اس کو دیکھ لیں اور اس کی عزت و توقیر میں اضافہ ہو۔ دلہن کے لیے یہ زیبا نہیں کہ اس کی نظر بجز دولہا کسی اور کی طرف اٹھے۔ کیونکہ رؤیتِ غیر اس کے لیے ذلت کا باعث ہے۔ اگر زاہد کی شان پر سارے عالم کی نظر ہو تو حرج نہیں۔ لیکن وہ خود اپنی شان کو دیکھنے میں منہمک ہو جائے تو بھٹک جاتا ہے۔

۱۸۔ ابو محفوظ معروف بن فیروز الکرخی رح

قدمائے مشائخ کبار میں شمار ہوتے ہیں۔ حلیمیٔ طبع اور خلوص طاعت کے لیے مشہور ہیں۔ ترتیب کے لحاظ سے ان کا ذکر پہلے آنا چاہیئے تھا مگر میں نے دو بزرگوں کی پیروی کی ہے جو مجھ سے پہلے لکھ چکے ہیں۔ ان میں ایک صاحب نقل ہیں دوسرے صاحبِ تصرّف یعنی شیخ ابو عبدالرحمٰن السلمی اور استاد امام ابو القاسم القشیری رضی اللہ عنہم۔ شیخ ابو عبدالرحمٰن رح نے اپنی کتاب میں اسی ترتیب کو مدنظر رکھا ہے۔ امام ابو القاسم رح نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں اسی ترتیب کا ذکر کیا ہے۔ میں نے بھی اسی کا اتباع کیا۔ معروف رح سری سقطی کے استاد اور داؤد طائی رحمہم اللہ کے مرید تھے۔ ص ۱۲۰/۱۶۱

ابتدا میں معروف غیر مسلم تھے۔ علی بن موسیٰ الرضا رضؓ کے ہاتھ پر ایمان لائے اور ان کی نظر میں بڑی قدر و منزلت پائی۔

روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: "جوانمردی کے تین نشانات ہیں (۱) وفائے بے خلاف (۲) تعریف بے عطا اور (۳) عطائے بے سوال۔" وفائے بے خلاف یہ ہے کہ عبودیت میں خلاف روی اور کج روی اپنی ذات پر حرام سمجھی جائے۔ تعریف بے عطا یہ ہے کہ جس نے کوئی نیک سلوک نہ بھی کیا ہو اسے بھی نیکی سے یاد کیا جائے۔ عطائے بے سوال یہ ہے کہ جب عطا کی توفیق ہو تو تفریق نہ کرے اور کسی کا حال معلوم ہو تو اسے تکلیف سوال نہ دے۔ یہ خلقت میں اخلاق باہمی کا طریق کار ہے تمام مخلوق میں یہ صفات مستعار ہیں۔ حقیقتاً خدا کی صفات ہیں۔ خدائے عزّ و جلّ اپنے دوستوں کے حق میں وفا میں خلاف نہیں کرتا چاہے بندے خلاف کرتے چلے جائیں اس کے لطف و کرم میں کمی نہیں آتی۔ اس کی وفا یہ تھی کہ ازل کے دن انسان کو بغیر کسی خوبی کے نوازا اور آج بھی اس کی بے راہ روی کے باوجود اس پر عتاب نہیں کرتا۔ تعریف بے عطا بھی صرف اسی کی صفت ہے کیونکہ وہ بندوں کے افعال سے بے نیاز ہے اور انسان کی تھوڑی سی نیک کرداری پر بھی اس کی تعریف کرتا ہے۔ عطائے بے سوال اس کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ وہ کریم ہے۔ سب کا حال جانتا ہے اور سب کی مراد بغیر مانگے پوری کر دیتا ہے۔ جب باری تعالیٰ کسی کو توفیق عطا کرتا ہے اور اپنے انعامات سے اس کو عزت و سرفرازی دیتا ہے تو اس کے معاملات کو ان تینوں چیزوں سے آراستہ کر دیتا ہے۔ اور انسان بجائے خود اپنے ہم جنسوں کے ساتھ بقدر ہمت وہی سلوک روا رکھتا ہے۔ اس عالم میں وہ جوانمرد ہے اور جوانمردی میں ناموری کا مستحق ہے۔ یہ تینوں صفات حضرت ابراہیم ؑ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود تھیں اس کا ذکر مناسب جگہ پر ہو گا انشاء اللہ تعالیٰ۔ ص ۱۲۱/۱۶۲

۱۹۔ ابوعبدالرحمٰن حاتم بن علوان العاصم رح

بلخ کے عظیم صاحبانِ اقبال اور خراسان کے قدیم مشائخ کبار میں سے تھے۔ شقیق رحمہ کے مرید اور احمد بن خضرویہ کے استاد تھے۔ اوائل سے اواخرِ عمر تک ہر حال میں صدق پر ثابت قدم رہے۔ جنیدؒ نے فرمایا "حاتم اصم ہمارے زمانے کے صدیق ؓ ہیں"۔ ان کا کلام بلند پایہ ہے جس میں آفاتِ نفس اور رعونتِ طبع کی تشخیص کے دقائق اور معاملات کی روایات مذکور ہیں۔ ان کا قول ہے۔ "شہوت کی تین صورتیں ہیں (۱) شہوتِ طعام (۲) شہوتِ کلام اور (۳) شہوتِ نظر۔ طعام کی نگہداشت کرو اعتمادِ خداوندی سے۔ کلام کی صداقت سے اور نظر کی عبرت سے"۔ توکّل شہوتِ طعام سے محفوظ رکھتا ہے۔ سچ بولنا شہوتِ کلام سے اور درست نظری شہوتِ نظر سے۔ توکّل کی بنیاد علم کی درستی پر ہے جن کو اپنے خالق کا صحیح علم ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ روزی رساں صرف اسی کی ذات پاک ہے۔ وہ صحیح علم سے بولتے اور دیکھتے ہیں۔ ان کی خورد و نوش محبت۔ ان کا کلام وجد اور ان کی دید مشاہدہ حق ہوتا ہے صحیح علم کی بنا پر وہ صرف حلال کھاتے ہیں۔ بولتے ہیں تو اس کی توصیف کرتے ہیں۔ دیکھتے ہیں تو اسی کو دیکھتے ہیں۔ ان کے لیے وہی چیز حلال ہے جو وہ عطا کرے اور اس کے کھانے کی اجازت دے۔ وہی تعریف قابلِ اظہار ہے جو اٹھارہ ہزار عالم میں صرف اس کے لیے ہو۔ فقط وہی چیز قابلِ قدر ہے جو اس کی شان اور اس کے جبروت کی حامل ہو جب اس سے لے کر اس کی اجازت سے کھایا جائے تو شہوت نہیں۔ جب اس کا ذکر اسی کی اجازت سے ہو تو شہوت نہیں۔ جب اس کی قدرت کو اس کی اجازت سے دیکھا جائے تو شہوت نہیں۔ اپنی خواہش سے کھانا شہوت ہے چاہے اکلِ حلال ہو۔ خواہشِ نفسانی پر مبنی گفتگو شہوت ہے چاہے ذکرِ الٰہی ہو۔ خواہشِ نفسانی سے لبریز نظر شہوت اور وبال ہے چاہے اس کے لیے استدلال موجود ہو "واللہ اعلم"۔

ص ۱۲۲/۱۶۳

۲۰۔ ابوعبداللہ محمد بن ادریس شافعی رح

اپنے وقت کے بزرگوں میں سے تھے اور تمام علوم میں یگانہ روزگار تھے۔ جوانمردی اور پرہیزگاری میں ان کے مناقب بے شمار ہیں۔ مدینہ منورہ کے قیام تک امام مالک رض کے شاگرد تھے۔ عراق میں آ کر محمد بن الحسن سے فیضیاب ہوئے۔ وہ ہمیشہ گوشہ نشینی کی طرف مائل تھے تحقیق تصوف کا شوق تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ متعدد پیروکار آپ کے گرد جمع ہوگئے۔

ص ۱۲۲/۱۶۴

احمد حنبلؒ ان میں شامل تھے۔ بعدہ طبیعت مقام طلبی اور امامت کی طرف مائل ہوئی اور آپ نے گوشہ نشینی کا خیال ترک کر دیا ہر حال میں ستودہ خصال تھے۔ ابتدا میں صوفیائے کرام سے پرخاش تھی مگر جب سلیمان راعیؒ سے ملاقات ہوئی اور تقرب حاصل ہوا تو طبیعت بدل گئی اور اس کے بعد جہاں کہیں بھی گئے۔ تلاشِ حقیقت میں مصروف رہے۔ روایت ہے کہ آپ نے فرمایا "جب کوئی عالم دین میں آسان طلبی کا شائق ہو تو سمجھ لو کہ اس کے دامن میں کچھ بھی نہیں"۔ عالم خلق کے پیشرو ہوتے ہیں۔ یہ جائز نہیں کہ کوئی اپنا قدم ان سے آگے رکھے خواہ کسی مطلب سے ہو۔ راہِ حق پر گامزن ہونے کے لیے نہایت درجہ محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔ رخص و تاویل وہی لوگ کرتے ہیں جنہیں حقیقت سے روگردانی منظور ہوتی ہے۔ اور وہ اختصار و سہولت کی طرف مایل ہوتے ہیں۔ رخص ایک عابیانہ روش ہے اور صرف دائرۂ شریعت کے اندر رہنے کے لیے اختیار کی جاتی ہے۔ مجاہدہ خواص کا شیوہ ہے اور وہ اس کے ثمر کی لذت اپنے دلوں میں محسوس کرتے ہیں۔ علمار خواص ہی میں شامل ہیں۔ اور خواص عابیانہ روش اختیار کر لیں تو ان سے کسی چیز کی توقع بے کار ہے۔ علاوہ ازیں رخص احکام خداوندی سے متعلق سبک سری کے برابر ہے اور دوست حکم دوست کی طرف سے سبک سر نہیں ہو سکتا۔

ص ۱۲۳/۱۶۵

ایک شیخ طریقت نے بیان کیا ہے کہ ایک رات اسے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں نظر آئے۔ شیخ نے کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی ایک حدیث ہے کہ روئے زمین پر مختلف درجات کے نیک لوگ ہیں۔ اوتاد۔ اولیار۔ ابرار۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میری حدیث صحیح روایت ہوئی ہے۔" شیخ نے عرض کی "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کسی ایک کو دیکھنا چاہتا ہوں۔" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "محمد بن ادریس کو دیکھو۔"

اس کے علاوہ آپ کے بہت سے مناقب ہیں۔

۲۱۔ ابو محمد احمد بن حنبلؒ

ورع اور تقویٰ آپ کی خصوصیت تھی۔ حدیث پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے حافظ تھے۔ اہلِ طریقت کا ہر طبقہ انہیں واجب التکریم سمجھتا ہے۔ کئی مشائخ کبار سے مصاحبت کی۔ ذوالنون مصری۔ بشر حافی۔ سری السقطی۔ معروف کرخی رضی اللہ عنہم وغیرہم کرامات ظاہر اور فراستِ صحیح کے مالک تھے۔ آج کل کچھ لوگ مشبہین کی تعلیمات آپ کی طرف منسوب کرتے ہیں یہ سراسر افترا پردازی ہے اور من گھڑت باتوں پر مبنی ہے۔ وہ سب سے بری ہیں۔ اصولِ دین میں ان کے اعتقادات

جملہ علماء کے نزدیک پسندیدہ ہیں۔

جب بغداد میں معتزلہ کا زور ہوا تو انھوں نے امام احمد حنبل رض کو ایذا پہنچانے کا ارادہ کیا۔ ان سے کہا گیا کہ قرآن کو مخلوق کہیں۔ آپ بوڑھے اور کمزور ہو چکے تھے۔ آپ کے دونوں ہاتھ پیچھے باندھ دیئے گئے۔ ظالموں نے ہزار کوڑا مارا مگر آپ نے قرآن کو مخلوق نہ کہا۔ اسی عالم میں آپ کا ازار بند کھل گیا۔ آپ کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ دستِ غیب نے مدد کی۔ ازار بند از خود بندھ گیا۔ یہ کرامت دیکھ کر ایذا پسندوں نے آپ کو چھوڑ دیا۔ آپ زخموں کی تاب نہ لاسکے اور تھوڑے ہی عرصے بعد داعی اجل کو لبیک کہا۔ موت سے کچھ دیر پہلے لوگ حاضر خدمت ہوئے اور پوچھا کیا فرماتے ہیں آپ ان ظالموں کے حق میں جنھوں نے آپ کو زدوکوب کیا۔ فرمایا کچھ نہیں۔ ان لوگوں نے مجھے خدا کی راہ میں مارا ہے اور یہ سمجھ کر مارا ہے کہ وہ سچے ہیں اور میں جھوٹا ہوں۔ میں کسی ایک زخم کے لیے بھی قیامت کے دن ان سے مخاصمت نہیں کروں گا۔ معاملات میں ان کے اقوال بڑے بیش قیمت ہیں۔ جب کسی مسئلہ پر آپ سے سوال کیا جاتا اور موضوعِ سوال معاملت ہوتا تو خود جواب دیتے۔ اگر حقیقت ہوتا تو فرما دیتے بشر حافی رض کی طرف رجوع کرو۔ چنانچہ کسی نے پوچھا "اخلاص کیا ہے"۔ فرمایا "اخلاص یہ ہے کہ آفتِ اعمال سے نجات حاصل ہو"۔ یعنی ہر عمل ریا، مکر، فریب اور غرض پرستی سے معرا ہو۔ پھر پوچھا "توکّل کسے کہتے ہیں"۔ فرمایا "ایمان کہ روزی باری تعالیٰ پہنچانے والا ہے"۔ پھر پوچھا "رضا کیا ہے"۔ فرمایا "اپنے تمام امور کو سپردِ خدا کرنا"۔ پھر پوچھا "محبت کسے کہتے ہیں"۔ فرمایا یہ سوال بشر حافی سے پوچھو۔ جب تک وہ زندہ ہیں اس کا جواب نہیں دوں گا"۔

امام حنبل رض ہمیشہ امتحان میں مبتلا رہے۔ زندگی میں معتزلہ کا جور و ستم تھا۔ وفات کے بعد مشبّہین کے اتّہامات یہاں تک کہ اہل سنت بھی ان سے کماحقہ واقف نہ ہوسکے اور ان پر تہمت تراشی کی مگر وہ سب تہمتوں سے بری ہیں واللہ اعلم۔

ص ۱۲۴/۱۶۶

۲۲۔ ابوالحسن احمد بن ابی الحواری رض

شام کے اجلہ مشائخ کرام میں سے تھے۔ تمام مشائخ ان کے مدّاح ہیں۔ جنید رض نے فرمایا۔ احمد بن ابی الحواری رض شام کے گلِ ریحان ہیں۔ علمِ طریقت پر ان کے ارشادات نہایت لطیف ہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے صحیح راوی تھے۔ ابوسلیمان درّانی کے مرید تھے۔ سفیان بن عیینہ اور مروان بن معاویہ الفزاری سے مصاحبت رکھتے

ص ۱۲۴/۱۶۷

تھے، رہبر و سفر کرتے تھے اور ہر جگہ مستفید ہوتے تھے۔ آپ کا قول ہے: "یہ دنیا کوڑے کرکٹ کا ڈھیر ہے جس پر کتے جمع ہوتے ہیں جو اس پر زیادہ دیر ٹھہرے وہ کتے سے بھی بدتر ہے کیونکہ کتا ڈھیر ہی سے اپنے مطلب کی چیز حاصل کر کے پرے ہٹ جاتا ہے مگر دنیادار پرے ہٹنے کا نام نہیں لیتا"۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ دنیا اور اہل دنیا سے کس قدر بیزار تھے۔ اہلِ طریقت کے لیے یہ قطعِ تعلق اور بیزاری وجہ مسرت ہوتی ہے۔ ابتدا میں طلبِ علم ان کا مشغلہ تھا اور اسی سے امامِ وقت کا مرتبہ حاصل کیا۔ بعدہٗ تمام کتابیں دریا برد کر دیں اور کہا "تم نے اچھی رہبری کی مگر منزل پر پہنچ کر رہبر کی ضرورت نہیں رہتی"۔ رہبر کی ضرورت ہوتی ہے جب تک سالک رہروی کر رہا ہو۔ جب بارگاہِ منزل آجائے تو راہ یا دروازے بے کار ہیں۔

ص ۱۲۵/۱۶۸

مشائخ کا خیال ہے کہ احمدؒ سے یہ چیز حالتِ سکر میں سرزد ہوئی۔ کیونکہ راہ طریقت میں جس نے کہا "میں نے منزلِ مقصود پالی" وہ گمراہ ہو گیا۔ کسی منزل کا پالینا اگلی منزل سے دور رہنا ہے شغل مشغلہ بے کار ہے۔ فراغت کسل ہے۔ وصول لانشے ہے شغل اور فراغت میں ایک نسبت ہے اور دونوں انسانی صفات میں شامل ہیں۔ وصل و فراق خدائے عزّ و جل کی مرضی اور قدرت کاملہ پر منحصر ہیں۔ اس کا وصل ناممکن ہے۔ قرب اور نزدیکی کو اس ذات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ وصل یہی ہے کہ انسان کو باری تعالیٰ سے عزت نصیب ہو اور فراق یہی ہے کہ وہ ذلیل و خوار ہو۔

میرا (حضرت علی ہجویریؒ کا) خیال ہے کہ ابی الحواریؒ نے "وصول" کا لفظ راہ حق کے حاصل ہو جانے کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ راہ حق کتابوں میں نہیں ملتی اور جب راہِ روشن سامنے ہو تو کسی رہنمائی یا تشریح کی ضرورت نہیں رہتی۔ تحصیلِ علم کے بعد کتاب یا گفتگو ضروری نہیں اور مشائخ نے بھی ایسا کیا ہے مثلاً شیخ اعظم ابوسعید فضل اللہ بن محمد المیهنی وغیرہ نے کتابیں دریا برد کر دیں۔ ان کی نقل بعض رسم کے شیدائیوں نے بھی کی مگر صرف اپنی کاہلی اور جہالت کے باعث۔ مشائخ کبار کا مطلب یقیناً یہی تھا کہ ان کے اور ذاتِ حق کے درمیان کوئی چیز حائل نہ رہے اور قطع علائق دنیا و اہل دنیا مکمل ہو جائے۔ مگر یہ چیز صرف ابتدا سکر اور جوشِ طفلگی میں ہو تو ہو متمکن کے لیے

ص ۱۲۶/۱۶۹

کونین حجاب نہیں بن سکتے چہ جائیکہ پرزہ کاغذ حجاب بن جائے۔ جب دل علائق سے منقطع ہو چکا ہو تو کاغذ کی کیا حقیقت ہے ہو سکتا ہے کہ کتاب دھو ڈالنے سے مراد نفی عبارت ہو۔ بہتر تو یہ ہے کہ عبارت زبان سے مفقود ہو کیونکہ کتاب میں عبارت مکتوب ہوتی ہے اور زبان پر عبارت جاری۔ عبارت عبارت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ مجھے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ احمد بن ابی الحواری کو غلبۂ حال کے عالم میں کوئی سننے والا میسر نہیں تھا۔

انہوں نے اپنی شرحِ حال کاغذ کے پرزوں پر لکھ لی جب بہت سے کاغذ کے پرزے جمع ہوگئے اور کوئی اہل نظر نہ آیا سب کو دریا برد کر دیا اور کہا "اچھے رہنما ہو مگر تمہارے اندر مشغول ہونا محال ہے"۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے پاس بہت سی کتب تھیں اور اوراد و معاملات پر۔ ان کی ضرورت نہ رہی ان سے دست بردار ہوئے اور اسے ترک عبارت سے تعبیر کیا واللہ اعلم۔

۲۳۔ ابو حامد بن خضرویہ بلخیؒ

جوان مرد سپاہی آفتابِ خراسان، ابو احمد بن خضرویہؒ بلند حال اور پسندیدہ وقت صاحبِ طریقت تھے اپنے زمانے میں اہلِ تصوف کے پیشوا اور خاص و عام میں ہر دلعزیز بزرگ تھے۔ راہِ ملامت پر گامزن تھے اور سپاہیانہ لباس پہنتے تھے۔ ان کی اہلیہ فاطمہ رضی اللہ عنہا بڑی شان کی عورت تھی امیرِ بلخ کی بیٹی تھی جب اس کے دل میں توبہ کا خیال پیدا ہوا تو اس نے احمدؒ کو پیغام دیا کہ وہ اس کے باپ سے درخواست کریں۔ احمدؒ نے منظور نہ کیا۔ فاطمہ نے پھر آدمی بھیجا اور کہا مجھے آپ سے جوانمردی کی توقع تھی۔ آپ کو ایک عورت کا راہبر ہونا چاہیے تھا نہ کہ راہزن۔ احمدؒ راضی ہو گئے اور فاطمہ کے باپ سے درخواست کی اس نے اپنی بیٹی کا ہاتھ آپ کے سپرد کر دیا۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ کے گھر میں گوشہ نشین ہو گئی۔ جب احمدؒ نے ابو یزیدؒ کی زیارت کا قصد کیا تو فاطمہ بھی ہمراہ ہو گئی۔ ابو یزیدؒ کے سامنے فاطمہ نے نقابِ رُخ اٹھا دی اور ان سے بے دریغ گفتگو کی۔ احمدؒ کو سخت تعجب ہوا اور انہوں نے معرضِ غیرت میں فاطمہ سے کہا "مجھے بتاؤ ابو یزید کے سامنے اس قدر بے دریغ ہو کر گفتگو کرنے کا کیا مطلب ہے"۔ فاطمہ نے جواب دیا "آپ میری طبیعت کے محرم ہیں اور ابو یزید میری طریقت کے۔ آپ سے نفس کی حرص و ہوا کا تعلق ہے اور ان سے راہِ خدا کا۔ اس کی بیّن دلیل یہ ہے کہ ان کو میری مصاحبت کی ضرورت نہیں آپ میری صحبت کے محتاج ہیں"۔ فاطمہ اسی طرح ابو یزید سے بے تکلف گفتگو کرتی رہی۔ ایک روز ابو یزیدؒ نے فاطمہ کا ہاتھ دیکھا حنا سے رنگین تھا پوچھا یہ کیوں۔ فاطمہ نے جواب دیا آج تک آپ نے میرا ہاتھ اور اس پر حنا کا رنگ نہیں دیکھا تھا۔ میرے لیے آپ کی مصاحبت باعثِ مسرت تھی۔ اب آپ کی نظر میرے ہاتھ اور رنگِ حنا پر ہے۔ اس لیے ہماری مصاحبت حرام ہو گئی۔ وہاں سے ہٹ کر نیشاپور آ گئے اور وہاں قیام کیا۔ نیشاپور کے لوگوں کو آپ سے بہت ارادت تھی۔ جب یحییٰ بن رازی نیشاپور آئے تو احمدؒ نے ان کی دعوت

ص ۱۲۷/۱۷۰

کا ارادہ کیا۔ فاطمہ سے مشورہ کیا کہ دعوت کے لیے کس سامان کی ضرورت ہو گی۔ فاطمہ نے کہا اتنی گائیں، اتنی بھیڑیں، اتنی سبزی، مصالحے، خوشبو بتیاں اور بیس گدھے۔ احمدؒ نے پوچھا گدھے کس مقصد کے لیے۔ فاطمہ نے جواب دیا "جب کوئی نیک آدمی کسی نیک آدمی کے ہاں مہمان ہو تو گرد و نواح کے کتوں کا بھی حق ہوتا ہے"۔ ص ۱۲۷/۱۷۱

ابو یزیدؒ نے فاطمہؒ سے متعلق کہا "اگر کوئی مرد کو نسوانی لباس میں دیکھنا چاہے تو فاطمہ کو دیکھے"۔ ابو حفص حدادؒ کا قول ہے "اگر احمد بن خضرویہ نہ ہوتے تو دنیا میں جوانمردی نہ ہوتی"۔

احمدؒ کے اقوال بہت بلند ہیں۔ مہذب روایات کے لیے آپ مخصوص ہیں۔ اخلاقیات اور تصوف پر آپ کی بے شمار تصانیف ہیں۔ آپ نے فرمایا "راستہ ظاہر ہے، حقیقت روشن ہے، پاسبان پکار چکا ہے۔ اگر اب بھی کوئی بھٹک جائے تو اس کے اپنے اندھاپن کا قصور ہے"۔ راستہ ڈھونڈنا بے وقوفی ہے کیونکہ راہِ حق آفتاب کی طرح روشن ہے۔ ذاتِ حق اتنی نمایاں ہے کہ اس کی تلاش ضروری نہیں۔ آپ ہی کا قول ہے "اپنے فقر کی شان کو چھپائے رکھو۔ لوگوں سے یہ نہ کہتے پھرو کہ ہم درویش ہیں"۔ فقر انعام خداوندی ہے اور اس کا راز فاش نہیں ہونا چاہیئے۔ آپ نے ماہِ رمضان میں کسی امیر آدمی کو کھانے کی دعوت دی۔ گھر میں ایک سوکھی روٹی کے ٹکڑے کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ امیر آدمی نے گھر جا کر آپ کی خدمت میں اشرفیوں کی ایک تھیلی بھیجی۔ آپ نے واپس کر دی اور فرمایا "یہ میرا راز فاش ہونے کی سزا ہے"۔ یہ چیز ان کے صحیح فقر پر دلالت کرتی ہے واللہ اعلم۔ ص ۱۲۸/۱۷۲

۴۴۔ ابو تراب عسکر ابن الحسین النخشبیؒ

امامِ متوکلان، برگزیدۂ اہلِ زمان ابو تراب عسکریؒ خراسان کے پیشرو اور اجلہ مشائخ میں سے تھے۔ جوانمردی، زہد اور پرہیزگاری میں مشہور تھے۔ ان کی کرامات و عجائبات بے شمار ہیں۔ سیر و سفر کرنے والے صوفیائے کرام میں آپ خاص مقام رکھتے تھے۔ دنیا سے منہ پھیر کر دشت و جبل میں تنہا پھرا کرتے تھے۔ صحرائے بصرہ میں آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ مرنے کے بعد بہت عرصہ تک آپ کا جسم صحرا میں دیکھا گیا قبلہ رو کھڑے ہوتے تھے۔ عصا ہاتھ میں تھا اور پانی کا برتن سامنے پڑا تھا۔ درندے اور جنگلی جانور آپ کے قریب نہیں پھٹکتے تھے۔ آپ کا قول ہے "درویش کی خوراک وہی ہے جو اسے میسر آئے۔ اس کا لباس وہی ہے جو اسے ڈھانپ لے اس کی جائے رہائش وہی ہے جہاں وہ

قیام کرلے۔" مطلب یہ کہ خوراک، لباس اور مسکن کے معاملے میں درویش کی اپنی خواہش کارفرما نہیں ہوتی۔ تمام دنیا ان تینوں آفات میں مبتلا ہے اور تینوں کی ہوس ہمیں مصروف کار رکھتی ہے۔ یہ ظاہری صورت ہے۔ حقیقی معنوں میں درویش کی خوراک وجد ہے۔ اس کا لباس پرہیزگاری ہے اور اس کی جائے رہائش عالم غیب ہے۔ باری تعالیٰ نے فرمایا: وَاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا "اگر وہ راہ حقیقت پر استقامت اختیار کریں تو ہم ان پر باران رحمت برسانے ہیں" (قرآن ۱۲۲ - ۱۶) اور پھر فرمایا: وَرِيْشًا وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ "لباس خوشنما مگر پرہیزگاری کا لباس بہتر ہے۔" (قرآن ۷ - ۲۵) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "فقر کا وطن عالم غیب ہے"۔ درجۂ کمال یہ ہے کہ درویش کی غذا شراب قرب ہو۔ لباس تقویٰ و مجاہدہ ہو۔ وطن عالم غیب ہو۔ طریق فقر ظاہر اور تائید ربانی سے مامور ہو اس کے معاملات روشن اور بیّن ہوں۔ واللہ اعلم۔

۲۵۔ ابو زکریا یحییٰ بن معاذ الرازیؒ

عالی حال اور نیک سیرت تھے۔ راہِ حقیقت میں رجا بحق تعالیٰ کے مسلک پر گامزن تھے۔ حصری نے کہا اللہ کی طرف سے دو یحییٰ آئے ایک نبی ایک ولی۔ یحییٰ بن زکریا علیہ السلام طریق خوف پر اس طرح رواں تھے کہ سب مدعی شدتِ خوف میں اپنی بہبود سے ناامید ہو گئے۔ یحییٰ بن معاذؒ راہ رجا پر اس طرح گامزن ہوئے کہ تمام مدعیانِ رجا بے کار ہو گئے اور بولے یحییٰ بن زکریا کا حال تو معلوم ہے یحییٰ بن معاذ کا کیا حال ہوا۔ جواب ملا وہ جہالت سے معرّا تھے اور ان سے کبھی کوئی گناہِ کبیرہ سرزد نہیں ہوا۔ معاملت اور اس کے برتاؤ میں نہایت سرگرم تھے اور کوئی ان کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ان کے احباب نے پوچھا آپ کا مسلک تو رجا ہے مگر معاملت میں آپ خائف ہیں اس کا کیا مطلب؟ فرمایا ترکِ عبودیت ضلالت ہے۔ خوف و رجا دین کے دو ارکان ہیں۔ ناممکن ہے کسی ایک رکنِ ایمان کی پیروی کرتا ہوا آدمی قعرِ ذلت میں گر جائے۔ خائف عبادت کرتا ہے خوف فراق میں اور صاحب رجا امید وصال میں۔ جب تک عبودیت نہ ہو دونوں غلط ہیں۔ عبودیت موجود ہو تو دونوں داخلِ عبادت ہیں۔ جہاں عبادت ہو وہاں عبارت کی ضرورت نہیں رہتی۔

ص ۱۲۹/۱۷۴

ان کی تصانیف بے شمار ہیں۔ اقوال و ارشادات نہایت لطیف ہیں۔ خلفائے راشدین کے بعد پہلے صاحبِ طریقت آپ تھے کہ منبر پر جلوہ فروز ہوئے۔ مجھے ان کے کلام سے بڑی ارادت ہے جو بہت رقت انگیز ہے۔ کانوں کے لیے

خوشگوار۔ معانی میں دقیق اور عبارت میں مفید۔ ان کا قول ہے۔ "دنیا مقام اشتغال ہے۔ عاقبت جائے احوال۔ بندہ ہمیشہ بیم و رجا میں مبتلا رہتا ہے یہاں تک کہ یا بہشت میں راحت پذیر ہو یا جہنم میں نذرِ آتش"۔ صاحب نصیب آدمی وہ ہے جو اشتغال سے نجات پائے اور احوال سے محفوظ رہے۔ دونوں جہان سے منقطع ہو کر مشغول بحق ہو۔ یحییٰ غنا کو فقر پر ترجیح دیتے تھے۔ رے میں جب ان پر بہت قرض ہو گیا تو خراسان چلے گئے۔ بلخ کے لوگوں نے آپ کو روک لیا۔ وہاں ایک عرصہ تک وعظ فرماتے رہے۔ لوگوں نے ایک لاکھ درہم نذر کیا تاکہ قرضہ ادا کر سکیں۔ رے کو واپس آ رہے تھے کہ راہزنوں کے نرغے میں آ گئے تمام چاندی سکہ لٹ گیا۔ خالی ہاتھ نیشاپور پہنچے اور وہیں وفات پائی۔

۲۶۔ ابو حفص عمرو بن سالم النیساپوری الحدادی

ص ۱۳۰/۱۷۵

عالی مرتبہ بزرگانِ طریقت میں سے تھے۔ جملہ مشائخ آپ کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ آپ نے ابو عبداللہ الابیوردی اور احمد بن خضرویہ سے مصاحبت کی۔ شاہ شجاع آپ کی زیارت کے لیے کرمان سے آیا۔ زیارتِ مشائخ کے لیے آپ بغداد گئے۔ عربی زبان سے نابلد تھے۔ بغداد میں مریدوں نے آپس میں کہا کتنی شرم کی بات ہے کہ مشائخ کرام کی بات سمجھنے کے لیے ہمارے پیشوا کو ترجمان کی ضرورت پڑے گی۔ مسجد شونیزیہ میں مشائخ سے ملاقات ہوئی جنیدؒ بھی ان میں موجود تھے۔ ابو حفصؒ نے نہایت فصیح عربی میں گفتگو کی اور تمام مشائخ آپ کی فصاحت پر عش عش کر اٹھے۔ ان سے پوچھا گیا۔ "فتوت (جوانمردی) سے کیا مراد ہے"۔ کہا پہلے آپ لوگوں میں سے کوئی بتائے۔ جنیدؒ نے کہا۔ "میرے خیال میں فتوت یہ ہے کہ فتوت کو فتوت نہ سمجھا جائے اور اسے اپنی ذات سے منسوب نہ کیا جائے"۔ آپ نے فرمایا "بہت خوب ..... مگر میرے خیال میں فتوت انصاف کرنے کو اور اپنی ذات کے لیے انصاف طلب نہ کرنے کو کہتے ہیں"۔ جنیدؒ نے اپنے مریدوں سے کہا۔ "اٹھو! ابو حفصؒ فتوت میں آدم اور اولادِ آدم سے آگے نکل گیا"۔

آپ کی ابتدا کے متعلق مشہور ہے کہ آپ کسی لڑکی کی محبت میں مبتلا تھے اور اپنے دوستوں کے مشورے کے مطابق نیشاپور کے ایک یہودی سے مدد کے طالب ہوئے۔ یہودی نے کہا چالیس دن تک نماز اور دعا کو ترک کرو

ص ۱۳۱/۱۷۶

کوئی نیکی کا کام نہ کرو۔ کوئی نیکی کی نیت نہ کرو۔ پھر میرے پاس آؤ میں کچھ ایسا انتظام کروں گا کہ محبوب تمہارے

قدموں میں ہو۔ ابو حفصؒ نے یہودی کی ہدایات پر عمل کیا اور چالیس دن کے بعد پھر اس کے پاس پہنچے۔ اس نے حسبِ وعدہ ایک نقش بنا کر دیا۔ مگر یہ بالکل بے اثر ثابت ہوا۔ یہودی نے کہا "معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان چالیس دنوں میں تم نے ضرور کوئی نیک کام کیا ہے سوچو۔" ابو حفصؒ نے جواب دیا "کوئی ایسا کام نہیں کیا سوائے اس چیز کے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا پتھر پڑا ہوا تھا وہ میں نے پرے ہٹا دیا تھا تاکہ کسی کو ٹھوکر نہ لگے" یہودی نے کہا "اس خدا کی خلاف ورزی نہ کرو جس نے تمہاری اتنی سی نیکی کو ضائع ہونے نہیں دیا حالانکہ تم تو اتر چالیس روز تک اس کے احکام سے روگرداں رہے ہو۔" ابو حفصؒ نے توبہ کی اور یہودی مسلمان ہو گیا۔

ابو حفصؒ لوہار کا کام کرتے رہے جب تک آپ نے باورد جا کر ابو عبداللہ باوردی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی۔ ایک دن نیشاپور واپس آکر وہ اپنی دکان پر بیٹھے ہوئے ایک نابینا قاری سے قرآن سُن رہے تھے ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ آپ بے خود ہو گئے۔ آگ میں ہاتھ ڈال دیا اور دہکتا ہوا کوئلہ بغیر دستِ پناہ اٹھا لیا۔ دکان پر کام کرنے والے لڑکے نے یہ چیز دیکھی تو وہ خوفزدہ ہو کر بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بعد آپ نے کام نہیں کیا اور دکان پر واپس نہیں آئے۔

آپ کا قول ہے "میں نے کام سے منہ پھیرا اور پھر اس کی طرف پلٹ کر آیا۔ پھر کام نے مجھ سے منہ پھیرا اور میں اس کی طرف لوٹ کر نہ آیا۔" جب کوئی انسان کسی چیز کو تکلف و کوشش سے ترک کرتا ہے تو ترک کا مقام اس چیز کو حاصل کرنے سے بلند تر نہیں ہوتا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ کوشش سے حاصل کی ہوئی جملہ چیزیں باعثِ آفت ہوتی ہیں۔ قدر و قیمت اسی چیز کی ہے جو از خود پردۂ غیب سے نمودار ہو اور جس جگہ بھی ہوا انسانی اختیار اس کے متصل ہو اور تائید غیب کار فرما نظر نہ آئے۔ ترک و اخذ میں سے کوئی چیز بھی بندے کو راس نہیں کیونکہ دونوں چیزیں خدائے عزّوجل کی طرف سے ہیں جب قدرت مائل بہ عطا ہوتی ہے تو اخذ رونما ہوتا ہے اور جب منشائے قدرت زوال ہو تو ترک ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یہ صورت ہے تو در اصل انسان کو صرف اخذ و ترک کا علم ہو جاتا ہے۔ اس کی کوشش اور ہمت کو جذب و دفاع پر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ رضائے خداوندی کی جستجو میں مرید کی ہزار سالہ کوشش کی کوئی وقعت نہیں۔ رضائے خداوندی کا ایک لمحہ ہزار سالہ کوشش سے بہتر ہے۔ لازوال اقبال قبولِ ازلی سے پیوستہ ہے اور سرورِ جاوید کو خوش بختیٔ سابقہ سے نسبت ہے۔ آدمی کے لیے راہِ نجات ذاتِ حق کی رحمتِ بے قیاس کے سوا نہیں۔ صاحبِ توفیر ہے وہ انسان جس کے لیے مسبّبِ حقیقی اسبابِ بلا کو ختم کر دے۔

ص ۱۳۱/۱۷۷

۲۷- ابوصالح احمدون بن احمد بن عمارۃ القصارؒ

قدمائے مشائخ میں سے تھے۔ زہد و اتقا میں پیش پیش تھے۔ فقہ اور علم اصول میں اعلٰی مقام رکھتے تھے نوری فرقہ سے تعلق تھا اور طریقت میں ابو تراب نخشبی اور علی نصر آبادی کے مرید تھے۔ ان کے رموز معاملت میں اور ان کا کلام مجاہدت میں دقیق ہے۔ مشہور ہے کہ جب ان کا مقام علم میں بلند ہوا تو نیشاپور کے لوگ حاضر خدمت ہوئے اور عرض کی کہ آپ منبر پر تشریف لائیں۔ وعظ فرمائیں تاکہ عوام الناس مستفید ہو سکیں۔ فرمایا مجھے وعظ کرنا زیبا نہیں کیونکہ میرا دل ابھی دنیا اور جاہ و مرتبتِ دنیا پر مائل ہے۔ میرے وعظ کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ اس کا کسی دل پر اثر نہیں ہوگا۔ بے اثر بات شریعت کا مذاق اڑانے کے برابر ہے۔ وعظ ایسے آدمی کو سزاوار ہے جس کی خاموشی دین میں خلل پیدا کر رہی ہو اور اس کی گفتگو سے خلل دور ہو سکتا ہو۔ لوگوں نے پوچھا پہلے لوگوں کا کلام کیوں اس قدر پُرتاثیر ہے۔ فرمایا "وہ کلام کرتے تھے عزتِ اسلام، نجات نفس اور رضائے خداوندی کے لیے۔ ہم کلام کرتے ہیں عزتِ نفس، طلب دنیا اور قبولِ خلق کے لیے۔" جو کوئی مرادِ حق کے مطابق بات کرتا ہے اس کے کلام میں شوکت و دبدبہ ہوتا ہے جس سے اہل شہر کے دل مرعوب ہو جاتے ہیں۔ جو اپنی ذاتی مراد کے موافق بات کرتا ہے۔ اس میں ہوس اور ذلت ہوتی ہے۔ خلقت کو اس سے کوئی منفعت نہیں ہوتی۔ ایسے کلام سے خاموشی بہتر ہے۔

۲۸- ابوالسری منصور بن عمارؒ

درجہ و مرتبت میں بزرگ مشائخ کرام میں شمار ہوتے تھے۔ اہلِ عراق تھے مگر اہلِ خراسان میں مقبولیت حاصل تھی۔ ان کا کلام نہایت درجہ حسین اور ان کا طرزِ بیان نہایت درجہ لطیف تھا۔ وعظ فرماتے تھے۔ روایات، درایات، احکام و معاملت کے عالمِ متبحر تھے۔ بعض اہل تصوف ان کی تعریف میں بے حد مبالغہ کرتے ہیں۔ ان کا قول ہے: "پاک ہے وہ جس نے عارفوں کے دل محلِ ذکر، زاہدوں کے دل موضع توکل، متوکلوں کے دل منبعِ رضا۔ درویشوں کے دل جائے قناعت اور اہلِ دنیا کے دل محل طمع بنائے۔" یہ چیز قابلِ غور ہے کہ باری تعالیٰ نے عضو اس کی حس اور فعل میں نسبت رکھی ہے۔ ہاتھوں میں پکڑنے کی قوت ہے، پاؤں میں چلنے کی، آنکھوں میں دیکھنے کی، کانوں

میں سننے کی، زبان میں بولنے کی۔ ان سب اعضا کے وجود و ظہور میں کچھ ایسا تفرقہ نہیں ہوتا۔ دلوں کا منہاج الگ الگ ہے۔ جدا جدا ارادے، علیحدہ علیحدہ خواہشیں۔ ایک دل معرفت کا مقام ہے دوسرے میں بجز گمراہی کچھ بھی نہیں۔ ایک قناعت سے لبریز ہے دوسرے میں صرف طمع اور لالچ کا گھر ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ دل قدرت حق کا عجیب مظہر ہے۔ ان کا قول ہے "آدمیوں کے دو گروہ ہیں ایک اپنے آپ کو پہچاننے والے جو مجاہدہ اور ریاضت میں مشغول رہتے ہیں دوسرے اپنے رب کو پہچاننے والے جو بندگی عبادت اور طلب رضا میں مصروف رہتے ہیں پہلے گروہ کی عبادت ریاضت ہے دوسرے گروہ کی ریاست۔ وہ عبادت حصولِ مقامات کے لیے کرتے ہیں یہ فارغِ مقامات ہوتے ہیں۔ دونوں میں کتنا فرق ہے؟ ایک کی زندگی مجاہدہ ہے دوسرے کی مشاہدہ۔

ص ۱۳۳/۱۸۰

ان کا ایک اور قول ہے "آدمی دو طرح کے ہیں ایک خدا کے نیاز مند جن کا درجہ شریعتِ ظاہر میں بزرگ ترین ہے۔ دوسرے وہ جو بے نیاز ہیں اور سمجھتے ہیں کہ خدائے عزّ وجلّ نے ازل سے سب کا رزق، موت، زندگی خوش بختی اور بدبختی مقرر کر رکھی ہے۔ یہی لوگ ہیں جو درحقیقت اس کے نیاز مند ہیں اور اس کے سوا ہر چیز سے بے نیاز ہیں۔" پہلے لوگ اپنی نیاز مندی کے پردے میں محجوب ہیں دوسرے اپنی نیاز مندی میں صاحبِ کشف اور غنی بالحق ہیں۔ ایک نعمت کے طالب ہیں دوسرے منعم کے۔ نعمت کے طالب غنی بھی ہوں تو فقیر ہیں منعم کے طالب مشاہدہ کی دولت سے بہرہ ور ہو کر فقیر بھی ہوں تو غنی ہیں۔

۲۹۔ ابو عبداللہ احمد بن عاصم الانطاکیؒ

ممدوح اولیاء، قدوۂ اہلِ رضا ابو عبداللہ بن عاصمؒ اہل طریقت کے برگزیدہ پیشرو تھے۔ علومِ شریعت، اصول، فروع و معاملت کے ماہر تھے، بہت دراز عمر پائی۔ قدیم مشائخ کبار کی صحبت میں رہے اور تابعین کا اتباع کیا۔ بشرؒ اور سریؒ کے ہم عصر تھے اور حارث محاسبیؒ کے مرید، فضیلؒ کی ملاقات اور مصاحبت سے مستفید ہوئے۔ تمام زبانوں پر عبور تھا، شافی لطائف اور عالی کلام مشہور تھے۔ آپ کا قول ہے "بہترین فقر وہ ہے جو تیرے لیے باعثِ عزت ہو اور تو اس سے راضی ہو" یعنی عام لوگوں کی عزت اسبابِ ظاہر کی موجودگی ہے مگر درویش کی عزت مسبب الاسباب سے ہے۔ وہ ہر حالت میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس کے احکام کے سامنے سرنگوں ہوتا ہے۔ فقر عدمِ اسباب کا نام ہے اور غنا وجودِ اسباب کا۔ اسباب کے بغیر فقر خدا شناسی اور اسباب کے ساتھ فقر کا دعویٰ خودنمائی۔ اس لیے اسباب حجاب کا باعث ہیں اور ترکِ اسباب ذریعۂ کشف و جمال۔ دونوں جہان کی دولت کشف و رضا میں ہے اور غضب حجاب میں۔ یہ بیان فقر کی افضلیت کو واضح کرتا

ص ۱۳۴/۱۸۱

ہے۔ واللہ اعلم۔

۳۰۔ ابو محمد عبداللہ بن خُبیق رضؓ

ماہرِ طریق پرہیزو انقار ابو محمد عبداللہ بن خُبیق رضؓ اہلِ تصوّف کے متّقی اور متورّع مشائخ میں شمار ہوتے ہیں۔ صحیح احادیث کے راوی تھے۔ فقہ، معاملت اور حقیقت میں ثوری مدرسہ سے تعلق تھا جن کے مریدوں سے آپ کا اختلاط تھا۔ تصوف و معاملت پر ان کے اقوال نہایت لطیف ہیں۔ آپ نے کہا "جو اپنی زندگی میں صحیح زندگی کی طلب رکھتا ہے اسے اپنے دل میں طمع کو جگہ نہیں دینی چاہیئے"۔ طمع کرنے والا اپنے لالچ کے ہاتھوں ہلاک ہوتا ہے۔ طمع دل پر مہر لگاتی ہے اور مہر زدہ دل مردہ ہوتا ہے۔ مبارک ہے وہ دل جو ماسوا اللہ کے لیے مُردہ ہو اور صرف اللہ کے لیے زندہ ہو۔ تخلیقِ دل میں عزت و ذلّت مضمر ہے، باری تعالیٰ کا ذکر اس کی عزت ہے اور لالچ اس کی ذلّت۔ چنانچہ آپ ہی کا قول ہے۔ "باری تعالیٰ نے دل کو مقامِ ذکر پیدا کیا۔ نفس کی قربت سے مقامِ شہوات بن گیا۔ سوائے خوفِ فزار دشمن اور شوقِ آرام شکن کے کوئی چیز دل کو شہوات سے خالی نہیں کر سکتی"۔ "خوف و شوق ایمان کے ستون ہیں۔ اہلِ ایمان کے دلوں میں قناعت و ذکر ہوتا ہے اور طمع اور غفلت سے پاک ہوتے ہیں۔ مومن کا دل طمع اور شہوات کا تابع نہیں ہوتا کیونکہ یہ چیزیں وحشت سے پیدا ہوتی ہیں اور دل وحشت زدہ ایمان سے بے بہرہ ہوتا ہے۔ ایمان کا تعلق حق تعالیٰ سے ہے اور وحشت ہمیشہ غیرِ حق سے ہوتی ہے دانا کے بقول "طمع رکھنے والے سے ہر ایک ڈرتا ہے"۔

۳۱۔ ابو القاسم جُنَید بن محمد الجُنید القواریری رحؒ

اہلِ ظاہر اور اہلِ باطن دونوں میں مقبول تھے۔ فنونِ علم، اصول، فروع اور معاملت میں کامل تھے۔ ابو ثوری کے مصاحبوں میں شامل تھے۔ عالی کلام اور بلند احوال تھے۔ تمام اہلِ تصوّف آپ کو امامِ طریقت تسلیم کرتے ہیں اور کسی مدعی یا متصوّف کو اس پر اعتراض نہیں۔ سری السقطی رحؒ کے بھانجے اور مرید تھے لوگوں نے سری رحؒ سے پوچھا "کیا مرید کا مقام کبھی اپنے پیر کے مقام سے بھی بلند تر ہو سکتا ہے"۔ فرمایا "بے شک ہو سکتا ہے اس کی بیّن دلیل یہ ہے کہ جنید میرے مرید ہیں مگر مجھ سے اونچا مقام رکھتے ہیں"۔

ص ۱۳۶ / ۱۸۳

سری رحؒ نے یہ بات از راہِ تواضع کہی اور بصیرت پر مبنی تھی مگر آدمی اپنے اوپر نہیں دیکھ سکتا، ہمیشہ نیچے دیکھتا ہے۔

سریؒ کے قول کی دلیل بیّن ہے۔ انہوں نے جنیدؒ کو اپنے مقام سے اوپر دیکھا اگرچہ ان کا مکانِ دید نیچے ہی تھا اوپر نہیں تھا۔ مشہور ہے کہ سریؒ کی حیات میں لوگوں نے جنیدؒ سے درخواست کی کہ وہ وعظ فرمائیں مگر انہوں نے قبول نہ کیا اور فرمایا کہ جب تک میرے شیخِ طریقت موجود ہیں میں کلام نہیں کر سکتا۔ ایک رات خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا۔ انہوں نے فرمایا "جنید! لوگوں کو اپنا کلام سناؤ۔ خدا نے تمہارے کلام کو خلق کے لیے ذریعۂ نجات بنایا ہے"۔ بیدار ہوئے تو دل میں خیال آیا شاید اب میرا مقام شیخِ طریقت سے بلند تر ہو گیا ہے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم صادر فرمایا ہے۔ صبح ہوئی تو سریؒ نے ایک مرید کو بھیجا اور حکم دیا کہ جب جنیدؒ نماز سے فارغ ہوں تو ان سے کہنا کہ مریدوں کے کہنے پر وعظ شروع نہ کیا۔ مشائخ بغداد کی سفارش بھی رد کر دی۔ میں نے پیغام دیا مگر راضی نہ ہوئے۔ اب تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے بجا لاؤ۔ جنیدؒ کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور معلوم ہو گیا سریؒ ان کے احوال ظاہر و باطن سے کماحقہ واقف ہیں۔ ان کا درجہ بلند تر ہے کیونکہ وہ جنیدؒ کے اسرار سے واقف ہیں اور جنیدؒ ان کے حال سے بے خبر ہے۔ جنیدؒ سریؒ کے پاس حاضر ہوئے توبہ کی اور دریافت کیا۔ "آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکمِ کلام دیا ہے؟" فرمایا "خواب میں ہاتفِ غیب نے بتایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جنیدؒ کو حکمِ وعظ فرمانے گئے ہیں تاکہ بغداد کے لوگ مستفید ہوں"۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ شیخِ طریقت ہر حال میں اپنے مرید سے باخبر ہوتا ہے۔

ص ۱۳۶/۱۸۴

آپ بڑے عالی کلام تھے۔ آپ نے بہت سے رموزِ لطیف بیان فرمائے ہیں۔ کہا "انبیاء کا کلام خبرِ حضور سے معمور ہوتا ہے اور صدیقوں کا رموزِ مشاہدات سے"۔ خبر کا تعلق نظر سے ہے اور مشاہدہ کا فکر سے۔ خبر دیدار پر مبنی ہوتی ہے اور رمز کا تعلق غیر سے ہوتا ہے اسی لیے اولیاء کا منتہائے کمال انبیاء کا مقام ابتدا ہوتا ہے۔ نبی اور ولی کا فرق بالکل بیّن ہے۔ نبی ولی سے افضل ہے بخلاف دو ملحد جماعتوں کے جو ولی کو پہلا اور نبی کو بعد کا درجہ دیتی ہیں۔ جنیدؒ فرماتے ہیں۔ کہ مجھے ابلیس کو دیکھنے کا شوق تھا۔ ایک روز مسجد کے دروازے پر کھڑا تھا۔ دور سے ایک بوڑھا مرد آتا ہوا دکھائی دیا۔ قریب آ کر وہ میری طرف متوجہ ہوا اسے دیکھتے ہی میرے دل پر خوف طاری ہو گیا۔ میں نے پوچھا "تو کون ہے؟ تیری ہیبت سے میرا دل لرز گیا"۔ بوڑھے نے کہا "میں وہی ہوں جس کو دیکھنے کی تجھے آرزو تھی"۔ میں نے پوچھا "ملعون تو نے آدمؑ کو سجدہ کیوں نہ کیا" بولا "جنید تجھے کیا ہو گیا۔ کیا میں غیر اللہ کو سجدہ کرتا؟"

ص ۱۳۷/۱۸۵

میں ابلیس کا جواب سن کر حیرت میں ڈوب گیا۔ ہاتفِ غیب نے میرے دل میں ڈالا" اس سے کہو تو جھوٹ بکتا ہے۔ اگر تیرے دل میں فرمانبرداری کا جذبہ ہوتا تو تُو رب العزت کے فرمان سے سرتابی نہ کرتا اور اس طرح خدا کا قرب کیوں نہ حاصل کیا۔" ابلیس نے بھی میرے دل میں آنے والی ندائے ہاتف سُن لی اور چلّایا: "جنید تو نے مجھے پھونک دیا" اور غائب ہوگیا۔ یہ حکایت جنیدؒ کی باکرامانی اور ان کے محفوظ ہونے کی دلیل ہے۔ باری تعالیٰ ہر حال میں اپنے دوستوں کو ابلیس کے مکر و فریب سے محفوظ رکھتا ہے۔

ایک مرید آپ سے کبیدہ خاطر ہوگیا اور سمجھا کہ اسے بھی مقام حاصل ہوگیا ہے اور وہ شیخ طریقت کا ضرورتمند نہیں رہا۔ ایک روز وہ بغرض امتحان آیا۔ جنیدؒ کو اس کی قلبی کیفیت سے آگاہی ہوگئی۔ اس نے کوئی سوال پوچھا آپ نے کہا۔ "لفظی جواب چاہتے ہو یا معنوی؟" مرید نے کہا دونوں۔ فرمایا "لفظی جواب تو یہ ہے کہ اگر تو نے اپنا امتحان کیا ہوتا تو میرا امتحان کرنے یہاں نہ آتا۔ معنوی جواب یہ ہے کہ میں نے تجھے ولایت سے خارج کیا۔" مرید کا چہرہ سیاہ ہوگیا اور اس کا سکونِ دل لٹ گیا۔ توبہ میں مشغول ہوا اور لغو باتوں سے پرہیز کرنے لگا۔ جنیدؒ نے فرمایا "تجھے یہ بھی خبر نہیں اولیاء واقفِ اسرار ہوتے ہیں اور تو ان کے مقابلے کی تاب نہیں رکھتا۔" پھر اس پر دم کیا۔ اسے اپنی مراد حاصل ہوئی۔ وہ مشائخ کے کام میں تصرف سے دستبردار ہوا اور توبہ کی۔

۳۲۔ ابوالحسن احمد بن محمد النوریؒ

ص ۱۳۸/۱۸۶

طریقت کے شیخ المشائخ، شریعت کے امام آئمہ، اہلِ تصوّف کے بادشاہ، آفتِ تکلف سے بے نیاز، ابوالحسن احمد بن محمد نوریؒ معاملات میں بہت نیک، کلام میں بہت فصیح، مجاہدے میں بہت عظیم تھے۔ طریقت میں ان کا اسکول جداگانہ ہے اور اہلِ تصوف میں سے ایک گروہ جو نوری کہلاتا ہے ان کا پیروکار اور مقتدی ہے۔ اہلِ تصوّف بارہ مختلف گروہوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں دس ان میں سے مقبول ہیں اور وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) محاسبی (۲) قصاری (۳) طیفوری (۴) جنیدی (۵) نوری (۶) سہلی (۷) حکیمی (۸) خرّازی (۹) خفیفی (۱۰) سیاری۔ یہ سب راہ حق پر ہیں اور اہل سنت والجماعت میں شامل ہیں۔ باقی دو گروہ مردود ہیں۔ ایک ان میں حلولی کہلاتے ہیں۔ یہ حلول و امتزاج میں الجھے ہوئے ہیں۔ مسالمی اور مشبّہ فرقوں کے لوگ اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسرا

مردود گروہ حلاجیوں کا ہے جو ترکِ شریعت کرتے ہیں اور الحاد میں مبتلا ہیں۔ اباحتی اور فارسی فرقے اسی گروہ میں شامل ہیں۔ آگے چل کر اسی کتاب کے علیحدہ باب میں ان فرقوں میں اختلاف کی تشریح ہو گی انشاء اللہ العزیز۔

نوریؒ کا سلوکِ طریقت قابلِ تعریف تھا۔ سست روی کو ترک کرنے، سہولت طلبی کو چھوڑنے اور دوامِ مجاہدہ اختیار کرنے میں پیش پیش تھے۔ کہتے ہیں آپ جنیدؒ سے ملنے آئے وہ کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے فرمایا "اے ابو القاسم تو نے سچ کو ان سے چھپایا اور انہوں نے تجھے صدر نشین کیا میں نے نصیحت کی لیکن انہوں نے مجھ پر پتھر برسائے تعریف و ستایش کا کا تعلق خواہشِ نفس کے ساتھ ہے اور نصیحت کو نفس کے ساتھ مخالفت ہے۔ آدمی ہر اس چیز کا دشمن ہوتا ہے جو اس کے نفس کے خلاف ہے اور اسے ہر اس چیز سے محبت ہوتی ہے جو اس کی ہوائے نفس کے موافق ہو۔

ص ۱۳۸/۱۸۷

ابو الحسن نوریؒ جنیدؒ کے رفیق تھے اور سریؒ کے مرید۔ بہت سے مشائخ سے مل چکے تھے اور ان کی مصاحبت سے مستفید ہو چکے تھے۔ احمد بن الحواری سے بھی ملے۔ تصوّف پر آپ کے لطیف اشارات اور جمیل اقوال ہیں۔ آپ نے علم و فن میں بڑے نازک نکتے بیان فرمائے ہیں۔ ان کا قول ہے "رو بہ حق ہونا ہر چیز سے کنارہ کشی کا نام ہے اور ہر چیز سے کنارہ کش ہونا رو بہ حق ہونے کا مترادف ہے" یعنی جس کسی کو حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی توفیق ہے۔ وہ ہر غیر اللہ سے منقطع ہے، اور جو غیر اللہ سے منقطع ہے وہ حق تعالیٰ کی طرف راجع ہے۔ رجوع بحق غمِ مخلوقات سے رہائی ہے جب غمِ مخلوقات سے نجات ملی تو اقبال بحق درست ہوا اور جب اقبال درست ہوا تو خلق سے روگردانی واجب ہوئی۔ کیونکہ متضاد چیزیں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ میں نے سنا کہ آپ تین روز دن رات ایک ہی جگہ کھڑے ہوئے نالہ و بکا کر رہے تھے۔ لوگوں نے جنیدؒ کو خبر کی وہ آئے اور فرمایا "اے ابو الحسن اگر تجھے علم ہے کہ خروش ربّ العزت کے سامنے سود مند ہے تو مجھے بھی بتا میں بھی یہی چیز اختیار کر لوں۔ اگر خروش سود مند نہیں تو سرِ تسلیم خم کر تیرے دل کو مسرّت نصیب ہو" نوریؒ نے خروش ختم کیا اور کہا "ابو القاسم تو کتنا اچھا معلّم ہے۔"

ان کا قول ہے "ہمارے زمانے میں دو چیزیں نہایت کمیاب ہیں۔ ایک عالم جو اپنے علم پر کاربند ہو دوسرا عارف جو اپنی حقیقتِ حال کو معرضِ بیان میں لائے" علم بے عمل علم نہیں ہوتا۔ معرفت بے حقیقت معرفت نہیں ہوتی۔

ص ۱۳۹/۱۸۸

نوریؒ نے اپنے زمانے کا ذکر کیا ہے۔ یہ چیزیں ہر زمانے میں کمیاب رہی ہیں۔ جو بھی عالم و عارف کو تلاش کرتا ہے۔ اپنے وقت کو ضائع کرتا ہے اور بجز پریشانی اسے کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا۔ اپنی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیئے تاکہ ساری

دنیا عالم نظر آتے۔ خدا کی طرف رجوع کرنا چاہیے تاکہ ساری دنیا عارف دکھائی دے۔ عالم و عارف کمیاب ہیں۔ کمیاب چیز مشکل ملتی ہے۔ جس چیز کے وجود کا ادراک مشکل ہو اس کی تلاش وقت ضائع کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ علم و معرفت اپنی ذات سے طلب کرنا چاہیئے۔ اور حقیقت کی روشنی میں اپنے آپ کو عمل پر مجبور کیا جائے

ان کا قول ہے: "جو لوگ ہر چیز کو من اللہ سمجھتے ہیں ہر چیز میں اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں"۔ ملک اور مُلک کا قیام مالک سے ہوتا ہے۔ راحت خالق کی جانب دیکھنے سے ہوتی ہے مخلوق پر نظر کرنے سے نہیں۔ اشیاء کو سببِ افعال سمجھنے میں مصیبت ہی مصیبت ہے۔ سالک کے لیے اشیائے عالم کی طرف رجوع بمنزلہ شرک ہے کیونکہ اشیا کو فعل یا عمل کا سبب سمجھنا اسباب میں لے ڈوبتا ہے اور نجات مسبب الاسباب کی طرف رجوع کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

۳۳۔ ابو عثمان سعید بن اسمٰعیل الحیریؒ

قدیم بزرگ صوفیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اپنے زمانے میں یگانۂ روزگار تھے سب لوگوں کے دل میں ان کے لیے قدر و منزلت تھی۔ ابتدا میں یحیٰی بن معاذ سے مستفید ہوئے۔ پھر کچھ مدت شاہ شجاع کی صحبت میں رہے۔ ان کے ہمراہ ابو حفصؒ کی زیارت کو نیشاپور آئے اور وہیں ٹھہر گئے۔ اور ان کی صحبت میں عمر گزار دی۔ ایک ثقہ روایت کے مطابق آپ لڑکپن ہی سے حقیقت کی تلاش میں تھے اور ظاہرداروں سے نفرت کرتے تھے۔ آپ نے کہا میرا دل کہتا تھا کہ اس ظاہر کے علاوہ جو عام لوگوں کے علم میں ہے شریعت میں ایک راز ہے یہاں تک کہ میں سن بلوغت کو پہنچا اور ایک روز یحیٰی بن معاذ کی مجلس میں یہ راز مجھ پر آشکارا ہوگیا اور میں نے اپنا مقصد حاصل کر لیا۔ میں نے یحیٰی بن معاذؒ کی صحبت اختیار کی۔ کچھ لوگ شاہ شجاع کی طرف سے آئے اور ان کا ذکر کیا میرے دل میں ان کی زیارت کا شوق پیدا ہوا۔ اور میں رے سے کرمان روانہ ہوا اور طریق صحبتِ شاہ شجاع کا طالب ہوا۔ انہوں نے مجھے باریابی کی اجازت نہ دی اور کہا تیری طبیعت رجا پرورده ہے کیونکہ یحیٰی بن معاذؒ کا مقام رجا اور اہل رجا راہ طریقت کے قابل نہیں ہوتے۔ رجا کسل کا باعث ہوتی ہے۔ میں نے بہت آہ و زاری کی اور بیس روز تک ان کے آستانے پر پڑا رہا بیس روز کے بعد اذنِ باریابی ملا اور مجھے شرفِ قبولیت بخشا گیا۔ پھر میں شاہ شجاع کی صحبت میں رہا۔ عجیب مردِ غیور تھا۔

شاہ شجاعؒ، نیشاپور ابو حفصؒ کی زیارت کو آرہے تھے میں بھی ساتھ ہولیا۔ جب ابو حفصؒ کے پاس پہنچے۔ تو

ص ۱۴۰/۱۸۹

ص ۱۴۰/۱۹۰

شاہ شجاعؒ نے قبا زیب تن کی ہوئی تھی۔ ابو حفصؒ کھڑے ہوگئے اور کہا "جس چیز کی عبا میں تلاش تھی وہ آج قبا میں مل گئی"
اس دوران میری جملہ کوشش یہی تھی کہ مجھے ابو حفصؒ کی صحبت نصیب ہو مگر شاہ شجاع کا دبدبہ سدِّ راہ تھا۔ ابو حفصؒ نے
میری ارادت کا اندازہ لگا لیا اور میں خدائے عزّوجل سے رو رو کر دعا کرتا رہا کہ مجھے ابو حفصؒ کی مصاحبت میسر آئے مگر شاہ شجاع
بھی آزردہ خاطر نہ ہوں۔ شاہ نے واپس لوٹنے کا ارادہ کیا اور میں بھی از راہِ تیاری کپڑے پہننے لگا۔ مگر میرا دل ابو حفصؒ کے ساتھ
تھا۔ آخر کار انہوں نے فرمایا اے شاہ! بحقِ فیضِ صحبت اس لڑکے کو میرے پاس چھوڑ جاؤ مجھے اس سے انس ہوگیا ہے۔
شاہ نے میری طرف دیکھا اور کہا "شیخ کا حکم مانو"۔ شاہ شجاع چلے گئے اور میں ابو حفصؒ کی خدمت میں ٹھہر گیا اور پھر ان کی
صحبت میں عجائبات سے جو کچھ دیکھا وہ دیکھا۔ ان کا مقام شفقت تھا۔

باری تعالیٰ نے ابو عثمانؒ کو تین مختلف شیوخ کی بدولت تین مختلف مقامات عطا فرمائے۔ مقامِ رجا صحبتِ یحییٰؒ میں
مقامِ غیرت خدمت شاہ شجاعؒ میں اور مقامِ شفقت مجلسِ ابو حفصؒ میں۔ یہ روا ہے کہ مرید پانچ یا چھ یا اس سے زیادہ
مصاحبتوں کے ذریعہ منزلِ مقصود حاصل کرے اور ہر پیر کی صحبت میں اس کے لیے نئے مقام کا کشف ہو تاہم مناسب
یہی ہے کہ مرید پیر کو کسی جگہ بھی اپنے مقام سے آلودہ نہ کرے۔ پیر کے کمال کی نشان دہی نہ کرے اور یہی کہے کہ میں نے
سب کچھ اس کی صحبت میں حاصل کیا مگر اس کا مقام بہر حال بلند تر تھا۔ یہ اخلاق کا تقاضا ہے اور مریدوں کو مقامات و احوال
سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

ص ۱۴۱/۱۹۱

ابو عثمانؒ نے نیشاپور اور خراسان میں تصوف کی تعلیم دی۔ انہوں نے جنیدؒ، رویمؒ، یوسف بن الحسینؒ اور محمد بن الفضل
رضی اللہ عنہم سے مصاحبت کی۔ کوئی آدمی ان سے زیادہ اپنے پیروں اور استادوں سے بہرہ ور نہیں ہوا۔ اہل خراسان نے
ان کو منبر پیش کیا اور انہوں نے تصوف پر تقاریر کیں۔ ان کی تصانیف بہت بلند پایہ ہیں۔ اور فنونِ علم تصوف پر پختہ روایات
ہیں۔ ان کا قول ہے "لازم ہے کہ جس کو خدا معرفت سے سرفراز کرے وہ گناہوں سے آلودہ نہ ہو" اس کا تعلق انسانی افعال
اور انسان کی احکام خداوندی بجالانے میں کوششِ پیہم سے ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ جسے اپنی معرفت سے سرفراز کرتا ہے
اسے گناہوں میں ملوث ہو کر ذلیل ہونے سے بچاتا ہے تاہم معرفت اس کی عطا ہے اور گناہ انسانی فعل ہے۔ جسے اللہ کی طرف
سے عزت عطا ہو اس کے لیے اپنے فعل سے ذلیل ہونا ممکن نہیں جیسے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی معرفت سے عزت دی
مگر ان کی ذلت سے ان کو ذلیل نہیں کیا۔

۳۴- ابو عبداللہ احمد بن یحیٰی الجلائیؒ

عظیم اہلِ طریقت میں سے تھے اور اپنے وقت کے پیش رو تھے۔ ان کا طریق نیک اور سیرت قابلِ تعریف تھی۔ جنیدؒ کی صحبت پائی تھی۔ ابوالحسن نوریؒ اور دیگر مشائخ کبار سے ملاقات کر چکے تھے۔ ان کا کلام بلند اور اشارات لطیف ہیں۔ فرمایا: "عارف کا دل مشغول بحق ہوتا ہے اور وہ کسی اور چیز کی طرف ملتفت نہیں ہوتا۔" عارف کے پاس بجز معرفت کچھ نہیں ہوتا۔ معرفت اس کے لیے سرمایۂ دل ہوتی ہے اور دل ہمہ تن مشغول بحق ہوتا ہے۔ دل پراگندہ خیال ہو تو توہمات کی یورش ہوتی ہے اور توہمات پردۂ حائل بن جاتے ہیں۔

ص ۱۴۲/۱۹۲

کہتے ہیں کہ آپ نے ایک روز ایک نوجوان آتش پرست کو دیکھا اور اس کے حسن و جمال سے حیرت زدہ ہو کر اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ جنیدؒ کا ادھر سے گزر ہوا۔ آپ نے فرمایا: "استادِ محترم! کیا اتنا حسین چہرہ بھی جہنم کی نذر ہو سکتا ہے؟" جنیدؒ نے فرمایا: "بیٹا! یہ نفس کا کھیل ہے جس میں تو الجھ گیا ہے۔ نظارۂ عبرت نہیں اگر چشمِ عبرت سے دیکھے تو کارگاہِ حیات کا ہر ذرہ یہی حسن و جمال رکھتا ہے۔ بہت جلد اس بے حرمتی کے باعث تجھ پر عذاب آنے والا ہے۔"

جنیدؒ یہ کہہ کر چلے گئے اور قرآن احمد بن یحیٰی کے دل و دماغ سے محو ہو گیا۔ سالہا سال توبہ کی۔ خدا سے توفیق مانگی۔ قرآن پھر یادداشت پر وارد ہوا اور اس کے بعد یہ یارا نہ رہا کہ بجز حق کسی چیز کی طرف نظر کرتے یا نظارۂ غیر پر وقت ضائع کرتے۔

۳۵- ابو محمد رُویم بن احمدؒ

جنیدؒ کے قریبی رفیق تھے۔ فقہ میں داؤد کے پیروکار تھے۔ قرأت اور تفسیر قرآن کے عالمِ جید تھے۔ بلندیٔ احوال اور رفعتِ مقام کے لیے مشہور تھے۔ مجرد سفر کرتے تھے اور ریاضتِ شدید فرماتے تھے۔ اواخرِ عمر میں اپنے آپ کو اہلِ اموال میں چھپا لیا اور خلیفۂ وقت کا اعتماد حاصل کر کے عہدۂ قضا پر فائز ہو گئے۔ مگر ان کا مقام اتنا بلند تھا کہ یہ چیز بھی انہیں محجوب نہ کر سکی۔ جنیدؒ نے فرمایا کہ ہم لوگ فارغ ہونے کے باوجود مشغول ہیں اور رُویمؒ مشغول ہونے کے باوجود فارغ ہے۔

ص ۱۴۳/۱۹۳

تصوف پر آپ کی تصانیف ہیں۔ ایک خاص کتاب سماع پر ہے جس کا نام "غلط الواجدین" ہے۔ میں اس کتاب کا

بے حد مشتاق ہوں۔

کہتے ہیں ایک روز کسی شخص نے آکر پوچھا "آپ کا کیا حال ہے"، فرمایا "کیا حال ہوگا ایسے آدمی کا جس کا مذہب اس کی اپنی ہوس ہو جس کے خیالات دنیا تک محدود ہوں جو نہ زاہد متقی ہو نہ عارف برگزیدہ"۔

یہ اشارہ ہے عیوبِ نفس کی طرف کیونکہ نفس کے لیے مذہب خواہشِ نفس تک محدود ہوتا ہے اور لوگ خواہشِ نفس کی متابعت کو مذہب کا نام دے دیتے ہیں اور اس کی پیروی کو شریعت کا۔ جو ان کی ہاں میں ہاں ملائے متقی ہے چاہے ملحد ہی کیوں نہ ہو۔ جو ان کی مرضی کے خلاف چلے بے دین ہے چاہے متقی ہی کیوں نہ ہو۔ یہ آفت ہمارے زمانے میں زیادہ نمایاں ہے اور خدا کی پناہ ایسے آدمی سے جو اس قماش کا ہو۔

رویمؒ کا جواب سائل کی قلبی کیفیت کے مطابق تھا اور یقیناً انہوں نے صحیح تشخیص کی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ خود ایسی حالت میں مبتلا تھے اور اپنی ہی کیفیت بیان کر رہے تھے یعنی اپنی ہی کمزوری کو انصاف کرنے والے کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔

۳۶۔ ابُو یعقوب یوسف ابن الحسین الرازیؒ

اپنے وقت کے عظیم ائمہ اور قدیم مشائخ میں شمار ہوتے تھے۔ بہت لمبی عمر پائی۔ ذوالنون مصریؒ کے مرید تھے۔ کئی مشائخِ کبار سے مل چکے تھے اور سب کی خدمت کر چکے تھے۔ ان کا قول ہے: "لوگوں میں ذلیل ترین شخصیت طمع کرنے والے فقیر کی ہے اور عزیز ترین محبوب سے سچی محبت رکھنے والے کی"۔ طمع درویش کے لیے دو جہان کی رسوائی کا باعث ہے۔ درویش تو پہلے ہی دنیا کی نظر میں حقیر ہوتا ہے اور اگر دنیا کی طمع رکھے تو اور بھی حقیر ہو جاتا ہے۔ غنا جس میں آبرو ہو ذلیل فقر سے بہتر ہے۔ طمع سے آلودہ فقیر بیّن طور پر جھوٹا نظر آتا ہے۔ محب اپنے آپ کو محبوب کے سامنے حقیر ترین سمجھتا ہے اور محبوب کی تواضع میں مصروف رہتا ہے۔ اس میں بھی طمع کا شائبہ ہے۔ طمع ختم ہو جائے تو حقیر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ زلیخا کو یوسفؑ کی طمع تھی تو خواری ہی خواری تھی۔ جب طمع مٹ گئی تو رب العزت نے حسن و جوانی از سرِ نو عطا فرمائی۔ قاعدہ ہے کہ محب قدم آگے بڑھائے تو محبوب پیچھے ہٹتا ہے۔ جب دوست دوستی کو سینے سے لگا کر دوست سے فارغ ہو جاتا ہے اور صرف دوستی سے تسکینِ خاطر

حاصل کرتا ہے تو دوست اس کی طرف مائل ہوتا ہے محبت کے لیے عزت ہی عزت ہے۔ جب تک اسے وصل کی آرزو نہ ہو جب آرزوئے وصل ہو اور وہ کامیاب نہ ہو تو عجز، ذلت کچھ بھی نہیں۔ اگر محب کو احساسِ دوستی فراق و وصال سے بے نیاز نہیں کرتا تو اس کی محبت یقیناً خام ہے واللہ اعلم۔

۳۷۔ ابوالحسن سمنون بن عبداللہ الخواصؒ

ص ۱۴۴/۱۹۵ اپنے زمانے میں بے مثال تھے۔ محبت میں بلند مقام رکھتے تھے۔ سب مشائخ ان کی بزرگی کے قائل تھے۔ عام لوگوں میں "سمنونِ محب" کے نام سے مشہور تھے وہ خود اپنے آپ کو "سمنون کذب" کہتے تھے۔ غلام الخلیل کے ہاتھوں بہت مصائب اٹھائے اور خلیفہ وقت کے روبرو محال شہادتیں دیں۔ مشائخ اس بات پر نہایت کبیدہ خاطر تھے۔ یہ غلام الخلیل ایک ریاکار اور جھوٹا مدعی طریقت و زہد تھا جو خلیفۂ وقت اور امراء کے منہ چڑھا ہوا تھا۔ دین کو دنیا کے بدلے فروخت کر چکا تھا جیسا کہ اس زمانے میں بھی ہو رہا ہے۔ غلام الخلیل مشائخ طریقت کی برائی امراء کے سامنے کرتا تھا۔ اور اس کی مراد یہ تھی۔ کہ صرف اس کی رسائی ہو اس کی جاہ و مرتبت قائم رہے اور کوئی سچے اہل دل کی طرف منہ نہ کرے۔ سمنون اور ان کے ہم عصر مشائخ کتنے خوش بخت تھے۔ کہ ان کو صرف ایک غلام الخلیل سے واسطہ پڑا اس زمانے میں تو لاکھوں غلام الخلیل ہیں مگر کوئی ڈر نہیں مردار پر صرف کرگس گرتے ہیں۔

جب سمنونؒ کی بغداد میں شہرت ہوئی اور لوگ ان کی طرف جوق در جوق آنے لگے۔ غلام الخلیل کو بہت تکلیف ہوئی۔ مکر و فریب کے جال پھیلانے لگا۔ ایک عورت سمنونؒ کے حسن پر بظاہر فریفتہ ہوگئی اور اپنے آپ کو پیش کیا آپ نے رد کر دیا۔ وہ جنیدؒ کے پاس گئی اور کہا کہ سمنون کو سمجھائیں کہ وہ اسے اپنی زوجیت میں قبول کر لیں۔ جنیدؒ برافروختہ ہوئے اور اس عورت کو سرزنش کی۔ وہ پھر سمنونؒ کے پاس آئی اور آپ پر ناپاک تہمت لگائی۔ غلام الخلیل دشمنوں کی طرح اس بات کو لے اڑا اور خلیفۂ وقت کے سامنے شکایت کی۔ خلیفہ نے خفا ہو کر موت کا حکم دے دیا۔ جب جلاد آیا اور خلیفہ حکم دینے لگا تو اس کی ص ۱۴۵/۱۹۶ زبان بند ہوگئی۔ اسی رات خواب میں دیکھا کہ ملک کا زوال سمنون کے ساتھ وابستہ ہے۔ دوسرے روز خلیفہ نے عذر خواہی کی اور سمنونؒ کو عزت و آبرو سے رہا کر دیا۔

ان کا کلام بلند ہے اور محبت پر دقیق اشارات ہیں۔ ایک دفعہ آپ حجاز سے واپس آ رہے تھے کہ سامنے میں اہلِ فید نے

وعظ کی درخواست کی۔ آپ نے منبر پر چڑھ کر کلام کیا۔ مگر کسی پر اثر نہ ہوا۔ آپ نے قندیلوں کی طرف منہ کر کے کہا "میں تم سے مخاطب ہوں"۔ تمام قندیلیں گر کر چور چور ہو گئیں۔ ان کا قول ہے "ہر چیز کی تشریح اس چیز سے نازک تر الفاظ میں کی جا سکتی ہے۔ محبت سے نازک تر کوئی چیز نہیں۔ محبت کو کس چیز سے تعبیر کیا جائے"۔ مراد یہ ہے کہ محبت کی تعبیر محال ہے کیونکہ تعبیر معبر (تعبیر کنندہ) کی صفت اور محبت محبوب کی صفت ہے اس لیے الفاظ میں اس کے معانی نہیں سما سکتے۔ واللہ اعلم۔

۳۸۔ ابوالفوارس شاہ شجاع الکرمانیؒ

شاہی خاندان سے تھے اور اپنے زمانے میں بے مثال تھے۔ ابوتراب نخشبیؒ سے شرفِ مصاحبت تھا اور کئی مشائخ سے ملاقات کر چکے تھے۔ ابوعثمان حیریؒ کے سوانح میں ان کے کچھ حالات بیان ہو چکے ہیں۔ تصوف پر ان کے کئی رسالے ہیں۔ ایک کتاب بھی ہے جسے "مرآۃ الحکماء" کہتے ہیں۔ ان کا طرزِ کلام بہت بلند ہے۔ فرماتے ہیں: "اہلِ فضیلت صاحبِ فضیلت ہیں جب تک وہ اپنی فضیلت کو نہیں دیکھتے اور اہلِ ولائت صاحبِ ولائت ہیں جب تک ان کی نظر اپنی ولائت پر نہیں ہوتی"۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں فضل و ولائت ہو وہاں نظر ساقط ہو جاتی ہے۔ اور جہاں نظر ہو وہاں فضل و ولائت ساقط ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ فضل ایک ایسی صفت ہے جسے فاضل نہیں دیکھ سکتا اور ولائت ایک ایسی چیز ہے جسے ولی نہیں دیکھ پاتا۔ جب کوئی کہے کہ فاضل یا ولی ہوں تو وہ نہ فاضل ہے نہ ولی۔ کہتے ہیں آپ نے چالیس برس بیداری میں گزار دیئے۔ چالیس برس کے بعد سوئے تو خواب میں رویتِ باری تعالیٰ سے سرفراز ہوئے۔ عرض کی "باری تعالیٰ میں بیداری میں طالبِ دید تھا"۔ آواز آئی "اگر بیدار نہ رہتے تو آج خواب میں رویت بھی نصیب نہ ہوتی"۔ واللہ اعلم۔

ص ۱۴۶/۱۹۷

۳۹۔ عمر بن عثمان المکیؒ

بزرگ اور پیشرو اہلِ طریقت میں شمار ہوتے ہیں۔ طریقت پر آپ کی تصانیف مشہور ہیں۔ ابوسعید خراجی کی ملاقات اور نباجی کی مصاحبت کے بعد آپ جنیدؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے۔ اصول میں آپ امامِ وقت تھے۔ آپ کا قول ہے "وجد کی تشریح نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ رب العزت اور مومن کے درمیان ایک راز ہے"۔

آدمی لاکھ کوشش کرے اس کی کوئی تشریح رازِ حق کو نہیں چھو سکتی کیونکہ انسانی گفتار اسرارِ ربانی کو قطعاً نہیں چھو سکتی۔

کہتے ہیں جب عمرو اصفہان آئے تو ایک نوجوان اپنے باپ کے فرمان کے خلاف آپ کی مجلس میں شامل ہو گیا۔ یہ نوجوان بیمار ہو گیا۔ بیماری طویل ہو گئی۔ ایک روز آپ کچھ لوگوں کے ساتھ اس کی عیادت کو گئے۔ نوجوان نے اشارے سے کہا کسی قوال سے کہیے چند اشعار گائے آپ نے قوال کو حکم دیا اور اس نے گایا:

ص ۱۴۶/۱۹۸

ترجمہ: "جب میں بیمار ہوتا ہوں تو تم عیادت نہیں کرتے جب تم بیمار ہوتے ہو تو میں عیادت کرتا ہوں"۔

بیمار نوجوان اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس کی بیماری کم ہونے لگی۔ اس نے کہا کچھ اور۔ قوال نے پھر کہا:

ترجمہ: "تمہارا نہ آنا عیادت کے لیے میرے لیے بیماری سے زیادہ سخت ہے عیادت سے روکنا تکلیف دہ ہے"۔

نوجوان کھڑا ہو گیا اور اس کی بیماری دور ہو گئی۔ اس کے باپ نے اسے عمروؒ کے سپرد کر دیا اور جو وسوسہ اس کے دل میں تھا اس سے توبہ کی۔ یہی نوجوان بعدہٗ ایک بزرگ صاحبِ طریقت ہوا واللہ اعلم۔

۴۰۔ ابو محمد سہل بن عبداللہ التستریؒ

شیخِ وقت تھے۔ سب لوگ آپ کے مدّاح تھے۔ سخت ریاضت، نیک معاملت اور خلوصِ دل میں صاحبِ مقام تھے عیوبِ افعال پر روشنی ڈالنے میں مشہور تھے۔ علمائے ظاہر کہتے ہیں کہ آپ نے شریعت اور حقیقت کو یکجا کیا۔ یہ قول غلط ہے کیونکہ کسی نے شریعت اور حقیقت میں تفریق نہیں کی۔ شریعت بجز حقیقت کچھ نہیں اور حقیقت بجز شریعت کچھ نہیں۔ ابو محمد سہلؒ کے اقوال عام طور پر آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ اس لیے علمائے ظاہر نے یہ غلطی کی ہے رب العزت نے شریعت کو حقیقت سے وابستہ کیا ہے اور کسی ولی اللہ کی جرأت نہیں کہ ان کو جدا کر سکے۔ اگر تفرقہ ثابت ہو جائے تو یقیناً ایک کو رد اور ایک کو قبول کرنا پڑے گا۔ ظاہر ہے ردِ شریعت الحاد ہے اور ردّ حقیقت شرک۔ جو فرق کیا جاتا ہے وہ معنوی نہیں بلکہ صرف اثباتِ حقیقت کے لیے کیا جاتا ہے چنانچہ لا الٰہ الا اللہ حقیقت ہے اور محمد رسول اللہ شریعت۔ اگر کوئی چاہے کہ صحتِ ایمان بھی رہے اور ان دونوں جملوں میں فرق بھی ہو تو یہ قطعاً ناممکن ہے اور باطل کوشش ہے۔ الغرض حقیقت اصل ہے اور شریعت اس کی شاخ ہے

ص ۱۴۷/۱۹۹

معرفت حقیقت ہے اور احکامِ خداوندی کی بجاآوری شریعت۔ در اصل اہل ظاہر ہر اس چیز سے انکار کر گذرتے ہیں جو ان کی سمجھ میں نہ آئے۔ یاد رکھو اصولِ راہِ حق سے انکار کرنا خطرناک ہے اور دولت ایمان کے لیے اللہ کا شکر گزار ہونا چاہیئے۔

ان کا قول ہے "روئے زمین پر آفتاب طلوع ہو کر غروب ہو جاتا ہے مگر انسان خدا سے غافل رہتا ہے، سوائے اس شخص کے جس نے خدا کو اپنے جان و تن اور خیال دنیا و عقبیٰ سے مقدم سمجھا" مطلب یہ کہ اپنے نصیب کی آغوش میں آسودہ رہنے والا اپنے خدا سے بے خبر ہوتا ہے۔ اس کی معرفت ترکِ تدبیر کی مقتضی ہوتی ہے اور ترکِ تدبیر تسلیم کا باعث ہے۔ تدبیر کا سہارا نزدیدِ تقدیر کا مترادف ہے واللہ اعلم۔

۴۱۔ ابو عبداللہ بن الفضل البلخیؒ

آپ عراق اور خراسان دونوں جگہ مقبول تھے۔ احمد بن خضرویہؒ کے مرید تھے۔ ابو عثمان حیریؒ کو ان سے بڑی ارادت تھی۔ عشقِ تصوف کی پاداش میں متعصب لوگوں نے آپ کو بلخ سے نکال دیا تو آپ سمرقند چلے گئے اور وہیں عمر گذار دی۔ ان کا قول ہے "سب سے بڑا عارف وہ ہے جو سب سے زیادہ ریاضت کرے اور سنتِ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر چلے" جو حق سے زیادہ قریب ہوتا ہے وہ اس کے احکام پر زیادہ کاربند ہوتا ہے جس کے مقدر میں دوری ہو وہ اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی متابعت سے دور بھاگتا ہے۔

ص ۱۴۸/۲۰۰

ان کا ایک اور قول ہے "مجھے تعجب ہے اس آدمی پر جو خانۂ خدا تک جانے کے لیے دشت و صحرا کو طے کرتا ہے تاکہ وہاں انبیاء علیہم السلام کی نشانیاں دیکھے۔ کیوں اپنے نفس اور نفسانی خواہشات کو عبور کر کے اپنے دل تک نہیں پہنچتا۔ دل میں تو اس کے مولا کے آثار ہیں" مطلب یہ کہ دل معرفتِ حق کا مقام ہے۔ اور اس کعبہ سے عظیم تر ہے جس طرف جبینِ بندگی خم ہوتی ہے۔ خلق رو بہ قبلہ ہوتی ہے اور حق رو بہ دل۔ جہاں دل ہے میرا دوست وہیں ہے۔ جہاں اس کا حکم ہے میری آرزو وہیں ہے جہاں میرے انبیاء کے نشانات ہیں میرے دوستوں کی نگاہیں وہیں مرکوز ہیں واللہ اعلم۔

۴۲۔ ابو عبداللہ محمد بن علی الترمذیؒ

آپ کئی مایہ ناز کتابوں کے مصنف تھے جن کی فصاحت و بلاغت آپ کی کرامت کی دلیل ہے مثلاً "ختم الولایت"

"کتاب النہج"۔ "نوادر الاصول" وغیرہم۔ میرے نزدیک ان کی عظمت بہت زیادہ اور میرا دل ان کا گرویدہ ہے۔ میرے شیخ طریقت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ محمد بن علی الترمذیؒ ایک ایسے دُرِ یکتا ہیں جس کی مثال نہیں۔ علومِ ظاہر پر بھی ان کی بہت تصانیف ہیں۔ احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت ثقہ راوی ہیں۔ کلامِ پاک کی تفسیر لکھ رہے تھے۔ مگر عمر نے وفا نہ کی جس قدر معرضِ تحریر میں آچکی تھی اہلِ عالم میں پھیلی ہوئی ہے۔ فقہ آپ نے امام ابو حنیفہؒ کے دوست سے پڑھی۔ ترمذ میں لوگ آپ کو محمد حکیم کہتے ہیں اور اہلِ تصوف میں فرقہ حکیماں کو آپ سے نسبت ہے۔

ص ۱۴۹/۲۰۱

آپ کے مناقب بے شمار ہیں۔ آپ کی خضر علیہ السلام سے ملاقات تھی۔ الورّاق جو آپ کے مرید تھے کہتے ہیں کہ ہر شنبہ کو خضر علیہ السلام ان کے پاس آتے تھے اور دونوں میں گفتگو ہوتی تھی۔

ان کا قول ہے "جسے شریعت اور آدابِ بندگی کا علم نہ ہو اسے ہرگز علمِ حق نہیں ہوتا" مطلب یہ ہے کہ جسے ظاہراً اپنے نفس کی معرفت حاصل نہ ہو اسے معرفتِ حق بھی حاصل نہیں ہوتی۔ جسے آفاتِ بشریت کی خبر نہ ہو وہ صفاتِ حق سے بھی نا آشنا ہوتا ہے۔ ظاہر کو باطن سے تعلق ہے جس کو ظاہر سے آویزش ہو وہ بے باطن نہیں ہو سکتی اور جس کو باطن کا دعویٰ ہو وہ بے ظاہر نہیں ہو سکتا۔ اوصافِ ربانی کی معرفت ارکانِ بندگی کی صحت کے ساتھ وابستہ ہے اور اس کے بغیر کبھی درست نہیں ہو سکتی۔ یہ بات نہایت درجہ صادق اور سود مند ہے اپنی جگہ پر بیان ہو گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ عزّ و جلّ۔

۳۴۔ ابو بکر محمد بن عمر الورّاقؒ

ص ۱۴۹/۲۰۲

عظیم مشائخ اور زاہدوں میں شامل تھے۔ احمد خضرویہؒ سے ملاقات اور محمد بن علیؒ سے مصاحبت کر چکے تھے۔ آداب و معاملات پر ان کی بہت سی کتب ہیں۔ مشائخ کبار آپ کو "مؤدبِ اولیاء" کہا کرتے تھے۔ کہتے ہیں محمد بن علیؒ نے چند کتابیں آپ کو دیں اور کہا انہیں دریا میں ڈال دو۔ آپ کو حوصلہ نہ ہوا۔ کتابیں گھر میں رکھ لیں اور محمد بن علیؒ کے پاس جا کر کہہ دیا کہ دریا میں ڈال دیں۔ پوچھا "کیا دیکھا"۔ کہا کچھ بھی نہیں دیکھا۔ کہنے لگے غلط ہے پھر جاؤ اور کتابیں پانی میں ڈال کر آؤ۔ ورّاقؒ کے دل پر اس کرامت کا اثر ہوا فوراً جا کر اجزائے کتاب پانی میں ڈال دیئے۔ پانی دو ٹکڑے ہو گیا ایک صندوق ظاہر ہوا جس کا ڈھکنا کھلا ہوا تھا۔ اجزاء اس صندوق میں چلے گئے۔ ڈھکنا بند ہو گیا۔ ورّاقؒ نے واپس آکر سب کیفیت بیان کی۔ محمد بن علی نے کہا "اب ٹھیک ہے"۔ آپ نے پوچھا "یہ کیا راز تھا مجھے بتایئے"۔ کہا "میں نے یہ کتاب اصول و

تحقیق پر لکھی تھی مگر اتنی مشکل تھی کہ کسی کی سمجھ میں نہ آتی۔ خضر علیہ السلام نے مجھ سے طلب کی تھی اور دریا کو باری تعالیٰ کا حکم تھا کہ ان تک پہنچا دے۔"

ابو بکر وراق" کا قول ہے۔" لوگوں کے تین گروہ ہیں۔ علمار۔ امرار و فقرار۔ علمار تباہ ہو جائیں تو عمل شریعت ختم ہو جائے۔ امرار تباہ ہو جائیں تو معیشت خلق برباد ہو جائے اور اگر فقرار مٹ جائیں تو لوگوں کے اخلاق نیست و نابود ہو جائیں۔"

ص ۱۵۰/۲۰۳ امرار اور سلاطین کی تباہی جور و ستم سے ہوتی ہے۔ علمار کی طمع سے اور فقرار کی ریا سے۔ امرار برباد نہ ہوں اگر وہ علمار سے منہ نہ موڑیں۔ علمار برباد نہ ہوں اگر وہ سلاطین سے مجالست نہ کریں۔ فقرار برباد نہ ہوں اگر وہ دولت کی تلاش نہ کریں۔ شاہوں کا جور و ستم بے علمی پر مبنی ہوتا ہے۔ طمع علمار کی بد دیانتی سے جنم لیتی ہے اور فقرار کی ریا کے پیچھے بے توکلی کار فرما ہوتی ہے۔ بادشاہِ بے علم، عالمِ بے پرہیز اور فقیرِ بے توکل شیطان کے قریب تر ہوتے ہیں۔ تمام دنیا کا فساد ان تین گروہوں سے وابستہ ہے۔ واللہ اعلم۔

۴۴- ابو سعید احمد بن عیسےٰ الخراز رح

سفینۂ اہل توکل و رضا، سالک طریقِ فنا احمد بن عیسیٰ الخراز رح مریدوں کے حال کو بیان کرنے والے اور طالبوں کے وقت کو ثابت کرنے والے تھے۔ سب سے پہلے صاحبِ طریقت ہیں جنھوں نے فنا اور بقا کے موضوع پر قلم اٹھایا۔ ان کے مناقب بے شمار ہیں۔ ریاضت، نکتہ رسی، عالی کلامی اور بلند اشارات کے لیے مشہور ہیں۔ ذوالنون مصری رح سے ملاقات اور بشر رح اور سری رح سے مصاحبت فرمائی تھی۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے"۔ دل قدرتی طور پر اس سے محبت کرتا ہے جو مہربانی سے پیش آئے"۔

اس حدیث سے متعلق ابو سعید رح نے فرمایا" تعجب ہے اس آدمی پر جو دنیا میں بجز ذاتِ خدا کسی کو محسن سمجھے اور خدا کو محسن سمجھ کر بجان و دل اس کا نہ ہو جائے"۔

ص ۱۵۱/۲۰۴ حقیقی احسان کرنے والا خالقِ اکبر ہے اور احسان در اصل اس پر ہوتا ہے جو احسان کا محتاج ہو۔ جو خود احسان کے محتاج ہوں وہ دوسروں پر کیا احسان کریں گے۔ رب العزت ہر چیز کا مالک و حاکم ہے اور کسی کا محتاج نہیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر دوستانِ حق ہر انعام میں منعم کو دیکھتے ہیں۔ ان کے دل مکمل طور پر اس کی محبت میں اسیر

ہوتے ہیں اور وہ ہر غیر چیز سے اعراض کرتے ہیں۔

۴۵۔ ابوالحسن علی بن محمدؒ الاصفہانیؒ

کچھ لوگوں کے نزدیک ان کا نام علی بن سہل تھا۔ مشائخ کبار میں شمار ہوتے تھے۔ جنیدؒ اور ان کے درمیان لطیف خط و کتابت ہوتی رہی۔ عمر بن عثمان مکیؒ ان کی زیارت کے لیے اصفہان تشریف لائے۔ وہ ابوترابؒ کے مصاحب اور جنیدؒ کے رفیق تھے۔ تصوف میں ان کا طریق قابلِ ستائش تھا۔ رضا اور ریاضت سے آراستہ تھے اور فتنہ و آفت سے محفوظ۔ حقائق و معاملات پر کلام بلیغ اور دقائق و اشارات پر بیان لطیف رکھتے تھے۔

ان کا قول ہے۔ "حضوری یقین سے بہتر ہے کیونکہ حضوری کیفیتِ مستقل ہے اور یقین بدلنے والی چیز ہے"۔ مطلب یہ کہ حضوری کا مقام دل ہے اور فراموش نہیں ہو سکتی۔ یقین ایک آنی جانی چیز ہے جن کو حضوری حاصل ہے وہ بارگاہ میں باریاب ہیں اور اہلِ یقین گویا آستانے پر پڑے ہیں۔ غیب و حضور پر ایک علیحدہ باب مناسب جگہ پر آئے گا انشاء اللہ تعالیٰ۔

ص ۱۵۱/۲۰۵

ان کا ایک اور قول ہے۔ "آدم سے لے کر قیامت تک لوگ دل دل پکاریں گے۔ مجھے ایسے آدمی کی تلاش ہے جو یہ بتا سکے کہ دل کیا ہے اور کیسا ہے؟ کوئی نظر نہیں آتا"۔ عام لوگ گوشت کے ٹکڑے کو دل کہتے ہیں۔ یہ دیوانوں، از خود رفتہ لوگوں اور بچوں کے پاس بھی ہوتا ہے مگر وہ بے دل ہوتے ہیں۔ دل کیا ہے؟ بجز عبارت کچھ بھی نہیں۔ عقل کو دل کہو تو وہ دل نہیں۔ روح کو دل کہو تو وہ دل نہیں۔ مشاہدات حق کا مقام دل ہے اور دل بجز عبارت موجود نہیں۔

۴۶۔ ابوالحسن محمد بن اسمٰعیل خیر النساجؒ

اپنے وقت کے مشائخ کبار میں شمار ہوتے تھے۔ معاملات پر اور خطبات میں لطیف طرز بیان رکھتے تھے۔ تحریر نہایت پاکیزہ تھی۔ عمر دراز پائی تھی۔ شبلیؒ اور ابراہیم خواصؒ نے آپ کی مجلس میں توبہ کی۔ شبلیؒ کو آپ نے تعظیماً جنیدؒ کے پاس بھیجا۔ آپ سریؒ کے مرید اور جنیدؒ اور ابوالحسن نوریؒ کے ہم عصر تھے۔ جنیدؒ آپ کو بہت عزیز سمجھتے تھے اور ابوحمزہ بغدادی آپ سے بڑی ارادت رکھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ آپ کو خیر النساج اس لیے کہا جاتا ہے کہ جب آپ اپنے وطن سامرہ

سے حج کی نیت سے نکلے اور کوفہ سے گذرے تو شہر کے دروازے پر ایک ریشم باف نے آپ کو پکڑ لیا اور کہا "تو میرا غلام ہے اور تیرا نام خیر ہے"۔ آپ نے اس چیز کو من جانب اللہ سمجھا اور رد نہ کی۔ کئی سال ریشم باف کی خدمت کرتے رہے وہ جب بھی کہتا "یا خیر" آپ فرماتے "لبیک"۔ وہ از خود پشیمان ہوا۔ آخر ایک روز بولا "میں نے غلطی کی۔ جاؤ۔ تم میرے غلام نہیں ہو"۔

ص ۱۵۲/۲۰۶

رہا ہو کر آپ مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور وہ مقام پایا کہ جنیدؒ نے کہا "خیر ہم سب سے بہتر ہے"۔ آپ "خیر" کہلانا پسند فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ میرے لیے روا نہیں کہ وہ نام بدل دوں جو ایک مرد مسلمان نے مجھے دیا ہے۔

کہتے ہیں جب آپ قریب المرگ ہوئے نمازِ شام کا وقت تھا موت کی غفلت سے ذرا ہوشیار ہوئے۔ آنکھیں کھولیں اور ملک الموت کی طرف دیکھ کر بولے۔ "تو خدا کا فرمانبردار ہے میں بھی فرمانبردار ہوں جو تجھے حکم ہوا ہے وہ تو بجا لا رہا ہے یعنی جان قبض کرنا۔ جو مجھے حکم ہوا ہے وہ رہا جاتا ہے یعنی نمازِ شام۔ جو مجھے حکم ہے وہ بجا لانے دے پھر وہ حکم بجا لا جو تجھے ہوا ہے"۔ پانی طلب کیا۔ وضو کے بعد نماز ادا کی اور داعی اجل کو لبیک کہا۔ اسی رات وہ خواب میں نظر آئے۔ آپ سے پوچھا گیا "باری تعالیٰ کے حضور کیا گذری؟" فرمایا "یہ نہ پوچھو۔ مختصر یہ ہے مجھے تمہاری دنیا سے نجات نصیب ہوئی"۔

آپ نے اپنی مجلس میں فرمایا "اللہ نے اہلِ اتقا کے سینوں کو نورِ یقین سے کھول دیا اور اہلِ یقین کی بصارت کو حقائق ایمان کے نور سے"۔ جہاں ایمان ہے وہاں یقین ہے اور جہاں یقین ہے وہاں تقویٰ ہے۔ کیونکہ یہ سب ایک دوسرے کے قریب ہیں اور تابع۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ص ۱۵۳/۲۰۷

۴۷۔ ابو حمزہ الخراسانیؒ

خراسان کے قدیم مشائخ میں شمار ہوتے ہیں۔ ابو تراب کے مصاحب تھے اور خرازؒ سے ملاقات کر چکے تھے۔ توکل پر قدم راسخ رکھتے تھے۔ کہتے ہیں آپ کسی کنوئیں میں گر گئے۔ تین دن کے بعد کچھ مسافر وہاں سے گذرے۔ آپ نے سوچا ان کو پکارنا چاہیئے پھر کہا "نہیں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں غیر اللہ سے مدد کی درخواست کر رہا ہوں اور اپنے اللہ کی شکایت کر رہا ہوں"۔ جب مسافروں نے عین راہ میں کنواں دیکھا تو کہنے لگے آؤ اسے بند

کردیں۔ کوئی اس میں گر نہ جائے۔ ثواب ہوگا۔ ابو حمزہؒ بہت پریشان ہوئے اور زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ مسافروں نے کنواں اوپر سے بند کر دیا اور چلے گئے۔ ابو حمزہؒ عبادتِ حق میں مصروف ہو گئے اور موت کا انتظار کرنے لگے۔ رات ہوئی تو کنوئیں سے باہر انہیں کچھ حرکت محسوس ہوئی غور سے دیکھا تو کنوئیں کا منہ کھلا ہوا تھا اور ایک اژدہا کی دم نیچے کو آرہی تھی۔ آپ نے اسے تائیدِ خداوندی سمجھا۔ دُم کو تھام لیا اور اژدہا نے باہر کھینچ لیا۔ ہاتف غیب نے آواز دی "ابو حمزہ کیا عمدہ نجات ہے۔ ہم نے تجھے موت کے ذریعہ موت سے بچا لیا"۔

آپ سے پوچھا گیا "غریب کون ہوتا ہے"۔ فرمایا "جس کو انس و تعلق سے پرہیز ہو"۔ درویش کا دونوں عالم میں گھر نہیں ہوتا۔ عالمِ مستعار سے منقطع ہو کر وہ ہر چیز سے پرہیز کرتا ہے اور غریب ہوتا ہے۔ یہ مقام بہت بلند ہے۔

۴۸۔ ابو العباس احمد بن مسروقؒ

خراسان کے عظیم مشائخ میں سے تھے۔ جملہ اولیائے کرام اس بات پر متفق ہیں کہ آپ اوتاد میں شامل تھے۔ اور قطب آپ کے شریک کار تھے۔ ان سے پوچھا گیا بتائیے قطب کون ہے؟ انھوں نے نام تو ظاہر نہیں کیا مگر اشارتاً بتایا کہ جنیدؒ قطب ہیں۔ کہتے ہیں آپ نے چالیس ایسے مشائخ کی خدمت کی جو صاحبِ تمکین تھے اور سب سے مستفید ہوئے۔ ان کی ظاہری باطنی قابلیت مسلّمہ ہے۔ ان کا قول ہے "جسے بجز خدائے تعالیٰ کسی چیز سے خوشی ہو اس کی خوشی سر بسر رنج و الم ہوتی ہے۔ جسے طاعتِ خداوندی سے محبت نہ ہو اس کی محبت سراپا وحشت ہوتی ہے"۔ مطلب یہ ہے کہ بجز خدا ہر چیز فانی ہے۔ جسے فانی چیز سے لگاؤ ہے وہ اپنے مقصود کے فنا ہونے پر سوائے حسرت و اندوہ کے کچھ نہیں دیکھتا۔ اس کی طاعت کے سوا ہر چیز خاک ہے۔ جب عالمِ ہستی کی بے مائیگی نمایاں ہوتی ہے تو اس کی محبت صرف وحشت ہو کر رہ جاتی ہے۔ الغرض غم و وحشت غیر اللہ کی طرف مائل ہونے کا نتیجہ ہے۔ واللہ اعلم۔

۴۹۔ ابو عبداللہ بن احمد بن اسمٰعیل المغربیؒ

اہلِ توکّل کے اُستاد، محققین کے پیشوا ابو عبداللہ بن احمدؒ اپنے زمانے کے بزرگ پیشرو تھے۔ اپنے

ص ۱۵۴/۲۰۹

استادوں کی نظر میں مقبول تھے اور اپنے مریدوں کے احوال کے پاسدار۔

ابراہیم خواص اور ابراہیم شیبانی رضی اللہ عنہم دونوں آپ کے مرید تھے۔ ان کا کلام بلند تھا اور براہین نمایاں۔ تارک الدنیا ہوتے ہیں ثابت قدم تھے۔ ان کا قول ہے "دنیا سے زیادہ انصاف پسند کوئی چیز نہیں جب تک اس کی خدمت کرو خدمت کرتی ہے جب منہ پھیرو منہ پھیر لیتی ہے۔" جو آدمی سچے دل سے دنیا سے روگردان ہو وہ اس کی مصیبت سے بچ نکلتا ہے اور اس کی آفت سے محفوظ رہتا ہے۔ واللہ اعلم۔

۵۰۔ ابو علی الحسن ابن علی الجرجانیؒ

اپنے زمانہ میں یگانہ روزگار تھے۔ علمِ معاملات اور رویتِ آفات پر آپ کی تصانیف بڑی روشن ہیں۔ محمد بن علی الترمذیؒ کے مرید اور ابوبکر وراقؒ کے ہم عصر تھے۔ ابراہیم سمرقندیؒ آپ کے مرید تھے۔

ان کا قول ہے: "اہل دنیا غفلت کے میدان میں گھوڑے دوڑاتے ہیں۔ اپنے وہم وگمان پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان کے اعمال حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں اور ان کا کلام کشف پر۔" اس شیخِ طریقت کا اشارہ غرورِ طبع اور رعونت نفس کی طرف ہے۔ جاہل کبھی اپنی جہالت کا معترف نہیں ہوتا بے علم جھوٹے صوفیار کی طرح۔ صاحبِ علم صوفی تمام مخلوق میں قابلِ توقیر ہوتے ہیں اور بے علم ذلیل وخوار۔ عالم کا سہارا گمان نہیں بلکہ حقیقت ہوتی ہے۔ جاہل حقیقت سے دور وہم وگمان میں مبتلا ہوتے ہیں۔ راہِ غفلت پر گامزن ہوتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ یہ راہ ولایت ہے۔ گمان پر اعتماد رکھتے ہیں اور کہتے ہیں یہ حقیقت ہے۔ ظاہری رسوم کی پابندی کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں یہ اصلیت ہے۔ خواہشِ نفس کی بنا پر کلام کرتے ہیں اور اسے کشف کا نام دیتے ہیں۔ انسان کے سر سے غرور وپندار نہیں نکلتا۔ جب تک جلالِ حق یا جمالِ حق رونما نہیں ہوتا۔ اس کے جمال میں ہر چیز غائب ہوجاتی ہے۔ ان کا پندار بھی فنا ہوجاتا ہے۔ اس کے جلال کے سامنے وہ خود بھی کالعدم ہوجاتے ہیں پندار کا تو ذکر ہی کیا۔ واللہ اعلم۔

ص ۱۵۵/۲۱۰

۵۱۔ ابو محمد احمد بن الحسین الجریریؒ

جنیدؒ کے رفیق تھے۔ سہل بن عبداللہ کی مصاحبت سے مستفید ہوچکے تھے۔ تمام اصنافِ علوم کے ماہر

اور فقہ کے امامِ وقت تھے۔ نیک اصول تھے اور تصوّف میں اتنے بلند مقام تھے کہ جنیدؒ نے اُن کو اپنے مریدوں کے لیے تلقینِ ادب و ریاضت پر مقرر فرمایا۔ جنیدؒ کے بعد آپ ان کے سجادہ نشین ہوئے۔ ان کا قول ہے۔ "دوامِ ایمان، پختگیٔ دین اور اصلاحِ بدن تین چیزوں سے وابستہ ہے یعنی کفایت، تقویٰ اور احتیاط سے۔ جس نے اللہ کو کفیل سمجھا اس کا دل منوّر ہوا۔ جس نے ممنوعہ چیزوں سے پرہیز کیا اس کی سیرت پاک ہوئی جو اپنے طعام کے معاملے میں محتاط ہوا اس کے نفس کو ریاضت نصیب ہوئی۔ کفایت کا ثمرہ معرفت ہے۔ تقویٰ کا حاصل حسنِ اخلاق اور احتیاطِ طعام کا اعتدالِ طبیعت۔"

ص ۱۵۶/۲۱۱

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "نمازِ شب کی کثرت دن کے وقت چہرہ کو منور رکھتی ہے۔" احادیث میں ہے کہ متّقی لوگ قیامت کے روز آئیں گے۔ منور چہروں کے ساتھ نور کے تختوں پر۔"

جو آدمی طعام کے معاملے میں احتیاط برتتا ہے علتِ نفس اور شہوت سے پاک رہتا ہے یہ نہایت حسین و بلیغ بات ہے۔ واللہ اعلم۔

۵۲۔ ابوالعباس احمد بن محمد بن سھل الآملیؒ

محتشم بزرگ مشائخ میں شمار ہوتے ہیں۔ اپنے ہم عصروں میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ تفسیر و قرأت کے عالم تھے۔ لطائفِ قرآن کا فہم و ادراک آپ کی خصوصیت تھی۔ جنیدؒ کے عظیم مریدوں میں شامل تھے۔ ابراہیم مارستانی کی صحبت سے مستفید ہو چکے تھے۔ ابوسعید خراز آپ کی بہت توقیر کرتے تھے اور تصوف میں بجز ان کے کسی کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔

ص ۱۵۷/۲۱۲

ان کا قول ہے "جس چیز سے محبّت ہو اس سے سکون حاصل کرنا آدمی کو اس کے مقام سے گرا دیتا ہے۔" مطلب یہ کہ جو کوئی محبوب چیزوں کو وجہ تسکین بناتا ہے وہ حقیقت سے بہت دور جا پڑتا ہے کیونکہ میلانِ طبیعت نفس کا آلۂ کار ہے۔ نفس مقامِ حجاب ہے اور حقیقت کشف کا محل ہے۔ محبوب چیز سے الجھا ہوا مرید صاحبِ کشف کی برابری نہیں کر سکتا۔ ادراکِ حقائق کشف ہے اور محبوب اشیاء سے روگردانی میں مضمر ہے۔ انسانی طبیعت کا میلان دو طرف ہوتا ہے۔ ایک دنیا اور اس کی دلچسپیوں کی طرف دوسرے عقبیٰ اور اس کی نعمتوں کی طرف۔ دنیا کا میلان جنسیت سے جنم پاتا ہے عقبیٰ کی محبت کی بنا رخیال پر ہوتی ہے جس میں ناجنسیت اور ناآشنائی شامل ہوتی ہے۔ عقبیٰ کا تصوّر، تصور ہی ہوتا ہے کیونکہ اگر حقیقت آنکھوں کے سامنے آجائے تو آدمی دنیا سے کلیتہً منقطع ہو جائے ولایت کی منزل سامنے آجائے اور حقائق

روشن ہو جائیں۔ عقبیٰ کا تعلق فطری طور پر فنا سے ہے۔ عقبیٰ میں جو کچھ ہے وہ انسانی وہم و قیاس میں نہیں آسکتا۔ عقبیٰ کی منزلت اسی میں ہے کہ اس کی راہ سخت مشکل ہے۔ جو چیز انسانی دل و دماغ میں سما سکے وہ بے قدر و منزلت ہوتی ہے جب وہم و قیاس حقیقتِ عقبیٰ کو نہیں پا سکتے۔ طبیعت کو اس کے عین نظارہ سے کیا الفت ہو سکتی ہے؟ ظاہر ہے میلانِ طبع صرف عقبیٰ کے تصوّر کی طرف ہونا۔ واللہ اعلم۔

۵۳۔ ابوالمغیث الحسین بن منصور الحلّاجؒ

غریقِ معانی۔ ہلاکِ دعویٰ منصور الحلاج رحمۃ اللہ علیہ اس طریقت کے مشتاقوں اور مستوں میں شامل تھے۔ بہت عالی ہمت تھے۔ مشائخ کبار میں ان کے متعلق اختلاف ہے۔ ایک گروہ انہیں مردود کہتا ہے دوسرا مقبول سمجھتا ہے۔ مثلاً عمر بن عثمان المکی۔ ابو یعقوب نہر جوری۔ ابو ایوب اقطع۔ علی بن سہل اصفہانی وغیرہم۔ نیز ابن عطا۔ محمد بن خفیف۔ ابوالقاسم نصر آبادی اور تمام متاخرین ان کو مقبول سمجھتے ہیں کچھ لوگ اس کے معاملے میں فیصلہ کن بات نہیں کہتے مثلاً جنیدؒ۔ شبلیؒ۔ جریریؒ۔ حصریؒ کچھ اور لوگ اسے جادوگر تصوّر کرتے ہیں مگر ہمارے زمانے میں شیخ ابوسعید ابوالخیر، شیخ ابوالقاسم گرگانی اور شیخ ابوالعباس شقانی اس کے ساتھ ارادت کا اظہار کرتے ہیں اور اس کی بزرگی کے معترف ہیں۔ ابوالقاسم قشیریؒ کہتے ہیں کہ اگر منصور الحلّاج اربابِ حقیقت و معانی میں سے تھا تو خلقت کے رد کرنے سے رد نہیں ہوتا۔ اگر مہجورِ طریقت اور مردودِ حق تھا تو خلقت کے مقبول کہنے سے مقبول نہیں ہوتا۔ اس کا معاملہ خدا پر چھوڑ دینا چاہیئے اور جہاں تک وہ حق پر نظر آئے اسے قابلِ تکریم سمجھنا چاہیئے۔ الغرض چند مشائخ کے سوا باقی اس کے کمالِ فضل، صفائی حال اور کثرتِ اجتہاد و ریاضت کے منکر نہیں ہیں۔ خیانت تھی کہ ان کا ذکر اس کتاب میں نہ کیا جاتا اور وہ بھی صرف اس بنا پر کہ چند اہلِ ظاہر اس کو کافر سمجھتے ہیں۔ ان کی بزرگی سے انکار کرتے ہیں۔ ان کے احوال کو جادو اور فریب سے منسوب کرتے ہیں۔ اور یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ حسین بن منصور وہی ملحد حسن منصور حلّاج ہے جو محمد بن زکریا کا استاد اور ابوسعید قرمطی کا رفیق تھا۔ مگر یہ منصور حق کے متعلق مشائخ میں اختلاف ہے فارسی النسل تھے اور بیضاوی کے رہنے والے تھے اور ان کو رد اس بنا پر نہیں کیا جاتا کہ ان کی تعلیم اور ان کا دین خام تھا بلکہ اس واسطے کیا جاتا ہے کہ ان کا کردار اور خلق قابلِ گرفت تھا۔

وہ پہلے سہل بن عبداللہ کے مرید ہوئے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد ان کی اجازت حاصل کیے بغیر چلے گئے اور

ص ۱۵۷/۲۱۳

ص ۱۵۸/۲۱۴

عمر بن عثمان سے جا ملے۔ کچھ عرصہ بعد ان کو بھی بلا اجازت چھوڑ دیا اور جنیدؒ کی طرف منہ کیا مگر انہوں نے قبول نہ فرمایا اسی وجہ سے ان کو سب نے چھوڑ دیا۔ وہ دراصل مہجورِ معاملت تھے مہجورِ اصل نہیں تھے۔ شبلیؒ نے ان کی نسبت فرمایا "میں اور حلاج برابر ہیں۔ میرے جنون نے مجھے بچا لیا اور اس کی عقل نے اسے ہلاک کر دیا۔" محمد بن خفیف نے فرمایا "وہ عالم ربانی ہے" وغیرہ۔ دراصل مشائخ کرام کی ناخوشنودی اور ان سے علیحدگی نے منصور کو مہجور اور وحشت زدہ کر دیا۔

ان کی تصانیف روشن ہیں اور اصول و فروع میں ان کے رموز اور ان کا کلام مہذب ہے۔ میں نے بغداد اور اس کے نواح میں کم و بیش پچاس رسالے ان کے قلم سے نکلے ہوئے دیکھے اور کچھ خوزستان، فارس اور خراسان میں بھی۔ سب میں ایسی چیزیں نظر آئیں جو عموماً مرید ابتدا میں ظاہر کرتے ہیں۔ کچھ ٹھوس ہیں، کچھ کمزور، کچھ آسان اور کچھ ناقابلِ قبول۔ جب ص ۱۵۹/۲۱۵ بارگاہِ حق سے کسی چیز کا ظہور ہوتا ہے تو دیکھنے والا اپنی وجدانی کیفیت کو معرضِ بیان میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ الفاظ مبہم ہوتے ہیں۔ خاص طور پر جب لکھنے والا تعجیل بھی کرے اور اسے اپنے اوپر ناز بھی ہو۔ یہ الفاظ تخیّل پر گراں گذرتے ہیں۔ سننے والے ان کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں اور کہتے ہیں "واہ کیا نازک چیز ہے۔" قطع نظر اس سے کہ وہ باور کریں یا نہ کریں۔ بہر حال وہ سمجھتے کچھ بھی نہیں اور ان کا باور کرنا یا نہ کرنا برابر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جب اہلِ نظر کسی ظہورِ حقیقت سے دوچار ہوتے ہیں تو اس کو معرضِ بیان میں لانے سے گریز کرتے ہیں اور اپنے آپ کو کسی تفاخر کا مستحق نہیں سمجھتے۔ عزت و ذلت سے بے نیاز ہوتے ہیں اور کسی کا باور کرنا یا نہ کرنا ان کو متاثر نہیں کرتا۔

جو لوگ منصور کے احوال کو جادو سے منسوب کرتے ہیں غلطی پر ہیں۔ اہلِ سنت کے اصول کے مطابق جادو ٹھیک ہے جس طرح کرامت۔ مگر عالمِ باکمال میں جادو کا مرتکب ہونا کفر ہے اور کرامت کا سرزد ہونا معرفت ہے۔ جادو قہرِ خداوندی کا مظہر ہے اور کرامت اس کی رضا کا۔ اہلِ سنت میں صاحبِ بصیرت لوگ بالاتفاق مانتے ہیں کہ جادوگر مسلمان نہیں ہو سکتا اور کافر صاحبِ کرامت نہیں بن سکتا کیونکہ متضاد چیزیں باہم جمع نہیں ہو سکتیں۔ اثباتِ کرامت کے تحت اس بارے میں اور تشریح کی جائے گی۔

حسین بن منصور تا بقیدِ حیات خیر و صلاح کے راستے پر تھے۔ نماز، ذکر، مناجات، روزہ دائمی اور پاکیزہ حمد و ثنا آپ کا شیوہ تھا۔ انہوں نے توحید پر لطیف نکات بیان فرمائے اگر وہ جادوگر ہوتے تو یہ سب چیزیں محال تھیں۔ لامحالہ کرامات تھیں اور کرامات صرف ولی محقق سے ظہور پذیر ہوتی ہیں۔

اہلِ اصول میں سے کچھ لوگ ان کو اس بنا پر رد کرتے ہیں کہ ان کے اقوال میں اتحاد و امتزاج کا پہلو نکلتا ہے لیکن یہ عیب عبارت میں ہے معانی میں نہیں۔ مغلوب الحال لوگ صحیح عبارت پر قادر نہیں ہوتے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عبارت کا اصلی مفہوم مشکل ہو، پڑھنے والا صاحبِ عبارت کا مطلب سمجھنے سے قاصر ہو اور اپنی کوتاہی کی وجہ سے عبارت کو بے معنیٰ قرار دے دے۔ یہ کوتاہی اس کی اپنی ہے عبارت کی نہیں۔

ص ۱۵۹/۲۱۶

میں نے بغداد کے ملحدوں کا ایک ایسا گروہ بھی دیکھا جو حلاج کی اقتدار کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس کے اقوال کو اپنی بے دینی کی بنیاد بناتے ہیں اور حلاجی کہلاتے ہیں۔ منصور کے بارے میں مبالغے سے کام لیتے ہیں جس طرح رافضی لوگ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں۔ ان کی تردید بابِ اختلافات میں آئے گی انشاء اللہ تعالیٰ۔ مختصراً یہ ہے کہ منصور بن حلاج کے اقوال کی پیروی روا نہیں کیونکہ وہ مغلوب الحال تھے اور پیروی صرف صاحبِ تمکین کی ہو سکتی ہے۔

بحمد اللہ مجھے حسین بن منصور سے ارادت ہے لیکن اس کا طریق کسی اصلیت پر قائم نہیں اور اس کا حال کسی ایک محل پر قرار پذیر نہیں۔ اس کے احوال میں بہت فسادات ہیں۔ میں نے ابتدائے حال اس کے اقوال سے بہت سے دلائل حاصل کیے اس کے کلام کی شرح بھی لکھی اور دلائل و براہین سے اس کی صحتِ حال اور رفعتِ کلام کو ثابت کیا۔ اپنی کتاب "منہاج الدین" میں بھی اس کی ابتدا اور انتہا پر تبصرہ کیا اور یہاں بھی کچھ نہ کچھ بیان کر دیا۔ جس چیز کو اتنی احتیاط اور کاٹ چھانٹ کے بعد اپنایا جا سکے اس کی پیروی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یاد رکھو خواہش و ہوا کو صداقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ صاحب ہوا ہمیشہ طریقت میں ناہموار اور الٹی سیدھی چیزیں تلاش کرتا ہے۔ حسین بن منصور کا ایک قول ہے "زبانیں بولنے کی خواہش مند ہیں اور گفتگو کے تلے ہلاک ہونے کی آرزو مند"۔ اس قسم کے اقوال خطرناک ہوتے ہیں۔ حقیقت کے معانی بیان کرنے کی کوشش بیکار ہے۔ اگر معانی موجود ہیں تو اظہار سے مفقود نہیں ہو سکتے۔ مفقود ہیں تو اظہار سے معرضِ وجود میں نہیں آ سکتے۔ اظہار صرف توہم آفریں ہوتا ہے اور توہم طالب کو گمراہ کر دیتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ لفظی اظہار ہی اصل حقیقت ہے واللہ اعلم۔

ص ۱۶۰/۲۱۷

۵۴۔ ابو اسحاق ابراہیم بن احمد الخواص رح

توکل میں عظیم شان اور بلند منزلت رکھتے تھے۔ بہت سے مشائخ کرام سے ملاقات کر چکے تھے۔ ان کی کرامات

بے شمار ہیں اور معاملاتِ طریقت پر کئی خوبصورت تصانیف۔

ان کا قول ہے "تمام علم دو جملوں میں مضمر ہے۔ اس چیز کو کرنے کی کوشش نہ کرو جو تمہارے لیے ہو چکی ہے اور اس چیز کو کرنے سے گریز نہ کرو جو تمہارے اوپر عاید ہو چکی ہے"۔ مطلب یہ ہے کہ مقدر کے ساتھ مت کھیلو جو ازل سے مقدر ہو چکا ہے وہ کوشش سے بدلا نہیں جا سکتا۔ اُس کے احکام سے سرتابی نہ کرو کیونکہ سرتابی کے لیے سزا ملے گی۔

اُن سے پوچھا گیا "آپ نے کیا عجائبات دیکھے"؟

فرمایا: "بہت عجائبات دیکھے مگر سب سے زیادہ عجیب چیز یہ ہے کہ مجھے خضر علیہ السلام نے دعوتِ شرکت دی اور میں نے انکار کر دیا۔ اس واسطے نہیں کہ مجھے کسی بہتر رفیق کی ضرورت نہ تھی بلکہ اس لیے کہ مجھے بجائے خدا کے اُن پر زیادہ اعتماد کرنا پڑے گا اور میرا خدا پر توکّل گھٹ جائے گا اور نتیجہ کے طور پر میں اپنے فرائض کو تندہی کے ساتھ سرانجام نہ دے سکوں گا"۔ یہ کامل ہونے کا ایک مقام ہے۔

۵۵۔ ابوحمزہ البغدادی البزّازؒ

آپ عظیم صوفی متکلموں میں شمار ہوتے ہیں۔ حارث محاسبیؒ کے مرید تھے۔ سریؒ کے مصاحب اور نوریؒ اور خیر النسّاج کے ہم عصر تھے۔ بغداد کی مسجدِ رصافہ میں وعظ کیا کرتے تھے۔ تفسیر اور قرأت کے جید عالم تھے۔ احادیثِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے قابلِ اعتماد راوی بھی تھے۔ وہ نوریؒ کے ساتھ تھے جب ان پر سختی کی جا رہی تھی اور جب باری تعالیٰ نے صوفیاء کو موت کے پنجے سے نجات دی تھی۔ نوریؒ کی تعلیم کی تشریح کرتے وقت اس حکایت کو بیان کیا جائے گا۔

اُن کا قول ہے "اگر تمہارا نفس اپنے ہاتھ سے محفوظ ہے تو تم نے اپنی ذات کا حق ادا کر دیا۔ اور اگر خلقت تمہارے ہاتھوں سے محفوظ ہے تو تم نے اُن کا تمام قرض چکا دیا"۔ مطلب یہ ہے کہ انسان پر دو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ایک اپنی ذات کے ساتھ اور ایک باقی انسانوں کے ساتھ۔ اگر تم اپنے نفس سے گریز کرو اور نجاتِ اُخروی کا راستہ تلاش کرو تو تمہاری پہلی ذمہ داری پوری ہو گئی۔ اگر خلقت کو اپنی بدکرداری سے نقصان نہ پہنچاؤ تو دوسرا حق بھی ادا ہو گیا۔ اپنے نفس کو محفوظ

رکھو۔ دوسروں کو تکلیف نہ دو اور اس کے بعد اپنے خالق کے حقوق پورے کرو۔

۵۶۔ ابوبکر محمد بن موسےٰ الواسطیؒ

آپ محقق مشائخ کرام میں شمار ہوتے تھے اور حقائق کے معاملے میں بڑی نشان اور منزلت رکھتے تھے۔ تمام مشائخ آپ کو قابلِ احترام سمجھتے تھے۔ آپ جنیدؒ کے قدیم مریدوں میں شامل تھے۔ آپ کا کلام نہایت گہرا تھا۔ اور ظاہر پرست اس کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ آپ کو امن وسکون نصیب نہ ہوا جب تک آپ مرو میں تشریف فرما نہ ہوئے۔ مرو کے لوگوں نے آپ کا خیر مقدم کیا کیونکہ آپ نہایت حلیم الطبع اور متورع بزرگ تھے۔ اہلِ مرو نے آپ کا کلام سنا اور انہوں نے اپنی باقی عمر وہیں گذار دی۔

ص ۱۶۲/۲۱۹

آپ کا قول ہے "ذکر بھول جانے والوں سے ذکر یاد رکھنے والے زیادہ غافل ہوتے ہیں"۔

اگر کوئی ذکر بھول جائے تو کوئی حرج نہیں۔ حرج یہ ہے کہ ذکر یاد رہے اور خدا بھول جائے۔ ذکر مقصودِ ذکر سے مختلف ہوتا ہے۔ مقصودِ ذکر کو فراموش کر دینا اور پندارِ ذکر میں مبتلا رہنا غفلت سے زیادہ قریب ہے بمقابلہ اس کے کہ ذکر بے پندار فراموش ہو جائے۔ بھولنے والے کو اپنے نسیان و غیبت کے عالم میں پندارِ حضوری نہیں ہوتا۔ ذاکر کو ذکر و غیبت کی حالت میں پندار حضوری ہوتا ہے۔ پندارِ حضوری بدونِ حضوری غفلت کے نزدیک تر ہے۔ طالبانِ حق کی ہلاکت پندار سے واقع ہوتی ہے۔ جہاں پندار زیادہ ہو وہاں حقیقت کم ہوتی ہے اور جہاں حقیقت کم ہو وہاں پندار کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ پندار کی بنیاد عقل کی بدگمانی پر ہوتی ہے۔ اور عقل کی بدگمانیوں سے بدگمانیاں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ہمتِ اہلِ حق کو بدگمانی اور حرص سے کوئی نسبت نہیں ہوتی۔ بنیادی اصول یہ ہے کہ ذکرِ حق یا غیبت میں ہوتا ہے یا حضور میں۔ جب ذاکر اپنے آپ سے غائب اور حضورِ حق میں حاضر ہو تو یہ حضور ہی نہیں بلکہ مشاہدہ ہوتا ہے۔ جب ذکر کرنے والا حق سے غائب اور اپنی ذات میں حاضر ہو تو یہ ذکر نہیں غیبت ہے اور غیبت غفلت کا نتیجہ ہوتی ہے واللہ اعلم۔

۵۷۔ ابوبکر بن دُلف بن جحدر الشبلیؒ

آپ مشہور اور بزرگ مشائخ میں شمار ہوتے ہیں۔ عنایتِ حق سے مہذب اور پاک وقت پایا۔ ان کے

ص ۱۶۲/۲۲۰ لطیف ارشادات نہایت درجہ قابلِ تعریف ہیں چنانچہ متاخرین میں سے کسی نے کہا ہے " دنیا کی تین عجیب چیزیں ہیں یعنی شبلی کے اشارات، مرتعش کے نکات اور جعفر کی حکایات " آپ قوم کے سردار اور اہلِ طریقت کے پیش رو تھے۔ ابتدا میں خلیفۂ وقت کے حاجبوں کے افسر تھے۔ خیر النساج رح کی مجلس میں توبہ کی اور تعلق ارادت جنید رح سے کیا۔ اکثر مشائخِ کبار سے ملاقات کر چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا : قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ " اہلِ ایمان سے کہو اپنی آنکھیں نیچی رکھیں" (قرآن ۲۴-۳۰) اس کی تفسیر کرتے ہوئے شبلی رح نے فرمایا " اے پیغمبر اہلِ ایمان سے کہو کہ وہ اپنی جسمانی آنکھیں حرص انگیز چیزوں سے بچائیں اور اپنی روحانی آنکھیں بجز اللہ ہر چیز سے بچائیں"، مطلب یہ کہ مومن حرص انگیز چیز سے نظر پھیریں اور بجز مشاہدہ حق کسی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیں۔ یہ نشانِ غفلت ہے کہ انسان حرص و ہوا کی پیروی کرے اور نفسانی خواہشات کو برانگیختہ کرنے والی چیزوں کو دیکھتا پھرے۔ غافل کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ اسے اپنے عیوب کی خبر نہیں ہوتی۔ دنیا کا بے خبر عاقبت میں بھی بے خبر ہوگا : وَمَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى : " اس دنیا کے اندھے عاقبت میں بھی اندھے ہوں گے"۔ (قرآن ۱۷-۷۲) فی الحقیقت جب تک باری تعالیٰ کسی کو حرص و ہوا سے پاک نہ کرے۔ اس کی آنکھیں ناقابلِ دید چیزوں سے محفوظ نہیں ہوتیں اور جب تک اس کی ذاتِ پاک کسی دل کو اپنی محبت کا مسکن نہ بنائے۔ اس کی روحانی آنکھیں رویتِ غیر سے مصئون نہیں رہ سکتیں۔

کہتے ہیں آپ ایک روز بازار میں نکلے تو لوگوں نے آپ کو دیوانہ کہہ کر پکارا۔ آپ نے فرمایا " تم مجھے دیوانہ کہو میں تمہیں فرزانہ کہتا ہوں۔ میری دیوانگی محبت کے سبب ہے تمہاری فرزانگی غفلت کے باعث۔ اللہ میری دیوانگی کو زیادہ کرے اور تمہاری فرزانگی کو۔

یہ آپ نے معرضِ غیرت میں کہا ورنہ آدمی اتنا از خود رفتہ کیوں ہو کہ خدا کی محبت اور دیوانگی میں فرق قائم نہ رکھ سکے اور دنیا و آخرت میں دونوں کی حدِ امتیاز نمایاں نہ رہنے دے۔ واللہ اعلم۔

۵۸۔ ابو محمد بن جعفر بن نصر الخالدی رح

ص ۱۶۳/۲۲۱ آپ جنید رح کے قدیم اصحاب میں شامل تھے۔ علمِ طریقت میں کامل تھے۔ انفاسِ شیوخ کے پاسدار اور ان کے

حقوق کے نگہبان تھے۔ ان کا کلام ہر فن پر بہت بلند تھا خاص طور پر ترکِ رعونت پر۔ ہر مسئلہ پر کوئی نہ کوئی حکایت بیان فرماتے تھے اور اس کا حوالہ کسی نہ کسی کی طرف ہوتا تھا۔

آپ کا قول ہے "توکّل یہ ہے کہ تیرے رزق کا عدم و وجود تیرے دل کے لیے یکساں ہو"۔ مطلب یہ کہ رزق کی موجودگی مسرت کا باعث نہ ہو اور اس کی غیر موجودگی غم و الم کا سبب نہ بنے۔ وجودِ انسانی خدا کی ملکیت ہے۔ اس کی پرورش اور ہلاکت پر وہ مالک ہی قادر ہے۔ بلا چون و چرا ملکیت مالک کے سپرد کر دینا چاہیے۔

آپ فرماتے ہیں میں ایک روز جنید؁ کے پاس آیا اور وہ بخار کی حالت میں تھے۔ میں نے کہا دعا کریں خدا صحت دے۔ فرمایا "میں نے کل دعا کی تھی ہاتفِ غیب نے کہا۔ تیرا جسم خدا کی ملکیت ہے وہ تندرست رکھے یا بیمار۔ تو دخل دینے والا کون ہے اپنا تصرف ختم کرتا کہ صحیح مقامِ بندگی حاصل ہو"۔ واللہ اعلم

۵۹۔ ابو علی بن محمد القاسم الرودباری؁

آپ بزرگ اور جوان مرد صوفیائے کرام میں شمار ہوتے تھے اور ان کے پیشرو تھے۔ شہزادے تھے۔ فن معاملت میں عظیم شان کے مالک تھے۔ ان کے مناقب اور آیات بے شمار ہیں۔ تصوف کے دقیق نکات پر آپ کا کلام نہایت لطیف ہے۔

ص ۱۶۴/۲۲۲

آپ کا قول ہے: "مرید صرف اس چیز کی طلب کرتا ہے جو حق تعالیٰ اس کے لیے چاہتا ہے اور مراد کونین میں کسی غیر اللہ کی طلب نہیں رکھتا"۔ مطلب یہ ہے کہ رضائے حق پر راضی رہنے والا اپنی مرضی کو ترک کر دیتا ہے تاکہ صحیح مرید کا مقام حاصل کر سکے۔ اہل محبت کی اپنی مرضی کوئی ہوتی ہی نہیں۔ اور اس لیے اس کی اپنی مراد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ حق کو چاہتا ہے اور وہی چاہتا ہے جو حق چاہتا ہے۔ جسے حق چاہے وہ بجز حق کسی چیز کو نہیں چاہتا۔ الغرض رضا مقام ابتدا ہے اور محبت انتہا۔ مقاماتِ تحقیق بندگی کے لیے ہیں۔ اور وحدانیت (مشرب) تائیدِ ربوبیت کے لیے۔ مرید اپنی ذات میں قائم ہوتا ہے اور مراد ذاتِ حق میں۔ واللہ اعلم۔

۶۰۔ ابو العباس قاسم بن المہدی الیساری؁

آپ اپنے وقت کے امام تھے۔ علوم ظاہر و باطن کے علمبردار تھے۔ ابو بکر واسطی؁ کی مصاحبت پائی تھی۔ کئی

مشائخ کبار سے تحصیلِ ادب کی تھی۔ اہلِ طریقت میں رفاقت کے معاملے میں بہت آراستہ اور الفت میں بہت پیراستہ تھے ان کا کلام عالی اور تصانیف عمدہ ہیں۔

آپ نے فرمایا "توحید یہ ہے کہ دل میں کوئی چیز بجز خدا راہ نہ پائے" مطلب یہ کہ مخلوقات میں سے کسی چیز کو دل سے تعلق نہ ہو اور معاملت کی صفائی میں کدورت نام کو نہ ہو۔ خیالِ غیر کی بنیاد اثباتِ غیر اللہ پر ہے۔ اور اثباتِ غیر توحید کی نفی ہے۔

آپ مرو کے ایک خوشحال اور بلند اقتدار خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ باپ کی طرف سے بہت سی دولت ورثہ میں ملی مگر آپ نے تمام کی تمام حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے دو عدد موئے مبارک کے عوض دے دی۔ ان دو بالوں کی برکت سے رب العزت نے آپ کو توبہ کی توفیق عطا فرمائی۔ آپ ابوبکر واسطیؒ کی صحبت میں رہے اور وہ مقام پایا کہ اہلِ طریقت کے ایک گروہ کے امام کہلائے۔ وفات سے پہلے وصیت کی کہ موئے مبارک دفن کرتے وقت ان کے منہ میں رکھ دیئے جائیں۔ ان کا مزار مرو میں ہے آج بھی حاجت مند لوگ وہاں جاتے ہیں۔ منتیں مانتے ہیں اور مرادیں پاتے ہیں۔ مجرب ہے واللہ اعلم۔

ص ۱۶۵/۲۲۴

۱۶۱۔ ابوعبداللہ محمد بن خفیفؒ

اپنے زمانے کے امام تھے اور مختلف علوم پر عبور رکھتے تھے۔ مجاہدہ میں عظیم شان اور حقائق میں شافی بیان کے مالک تھے۔ ان کے احوال کی پاکیزگی ان کی تصانیف سے نمایاں ہے۔ ابن عطا، شبلی، حسین بن منصور اور جریر رضی اللہ عنہم سے مصاحبت کی۔ مکہ معظمہ میں یعقوب نہرجوری سے ملاقات کی۔ عالمِ تجرید میں بہت سفر کیے۔ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ رب العزت نے توبہ کی توفیق دی اور آپ نے حکومت سے اعراض کیا۔ ان کا مقام اہلِ معانی کے نزدیک بہت بلند ہے۔ آپ نے فرمایا "توحید طبیعت سے اعراض کرنے کا نام ہے" مطلب یہ کہ طبیعتیں آلائے حق سے محجوب ہیں اور اس کی نعمتوں کو دیکھنے سے قاصر۔ جب تک طبیعت سے اعراض نہ ہو، اقبالِ خداوندی حاصل نہیں ہوتا اور صاحبِ طبع حقیقتِ توحید سے محجوب رہتا ہے۔ جب آفتِ طبیعت کا علم ہو جائے تو گویا توحید کی معرفت حاصل ہوئی ان کی آیات و براہین بہت ہیں۔ واللہ اعلم۔

۶۲- ابوعثمان سعید بن سلام المغربیؒ

ص ۱۶۵/۲۲۴

سیفِ سیادت، آفتابِ سعادت ابوعثمان رحمۃ اہلِ تمکین بزرگانِ طریقت میں سے تھے۔ علم وفن میں تبحر حاصل تھا۔ صاحبِ ریاضت وثبات تھے۔ ان کی آیات اور عمدہ دلائل کثرت سے ہیں۔ فرماتے ہیں: ”جو امرار کی صحبت کو فقرار کی مجلس پر ترجیح دے خدائے عزوجل ان کو مرگِ دل میں مبتلا کر دیتا ہے۔“ یہاں الفاظ صحبت اور مجلس (مجالست) استعمال کیے گئے ہیں کیونکہ فقرار سے پلٹنے والے صرف مجالست کے بعد پلٹتے ہیں صحبت کے بعد نہیں۔ صحبت سے اعراض نہیں ہوتا۔ جب لوگ مجالستِ فقرار سے صحبتِ امرار کی طرف جاتے ہیں تو ان کے دل حاجت مندوں کے ہاتھوں ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے جسم پندار میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ مجالست سے منہ پھیرنے کی سزا مرگِ دل ہے تو فقرار کی صحبت سے منہ پھیرنے کی سزا کیا ہو گی؟ اس بیان سے مجالست اور صحبت کا فرق ظاہر ہو گیا۔ واللہ اعلم۔

۶۳- ابوالقاسم بن ابراہیم بن محمد بن محمود النصرآبادیؒ

آپ نیشاپور میں بادشاہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ بادشاہوں کی جاہ وحشمت اس دنیا کے لیے ہوتی ہے آپ کی اس دنیا کے لیے تھی۔ ان کا کلام بلند تھا اور آیات دل نشین تھیں شبلیؒ کے مرید تھے اور خراسان کے متاخرین کے اُستاد۔ اپنے زمانے میں یگانۂ روزگار تھے اور علم وورع میں سب سے برگزیدہ تھے۔

آپ نے فرمایا: تیری نسبت دو طرفہ ہے ایک آدم سے دوسری خدا سے۔ اگر نسبتِ آدم کا دعویدار ہے تو تیرے سامنے شہواتِ نفسانی اور سہو وخطا کا میدان ہے۔ یہ حصولِ بشریت کا راستہ ہے اور باری تعالیٰ فرما چکے ہیں: اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوۡمًا جَہُوۡلًا ”انسان ظالم اور جاہل تھا“ (قرآن ۳۳-۷۲) اگر خدائی نسبت کی تلاش ہے تو مقاماتِ کشف، برہان، عصمت، ولایت تیرے سامنے ہیں۔ یہ نسبت تحقیقِ عبودیت کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَعِبَادُ الرَّحۡمٰنِ الَّذِیۡنَ یَمۡشُوۡنَ عَلَی الۡاَرۡضِ ہَوۡنًا ”اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین پر انکسار سے چلتے ہیں“ (قرآن ۲۵-۶۳) آدم کی نسبت قیامت کے دن ختم ہو جائے گی۔ حق سے نسبتِ عبودیت ابد تک رہے گی اور کبھی تغیر پذیر نہ ہو گی جب بندہ اپنی ذات یا آدم سے نسبت قائم کرے تو اس کا کمال یہ ہے کہ اقرار کرے: اِنِّیۡ ظَلَمۡتُ نَفۡسِیۡ ”تحقیق میں

ص ۱۶۶/۲۲۵

نے اپنے نفس پر ظلم کیا" (قرآن ۲۸-۱۵) جب نسبت حق سے ہو تو اس کا مقام یہ ہے کہ حق تعالیٰ کہے : "یٰعِبَادِ لَاخَوْفٌ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ" "میرے بندے آج تیرے لیے کوئی خوف نہیں" (قرآن ۴۳-۶۸) واللہ اعلم۔

۶۴۔ ابوالحسن علی بن ابراھیم الحصری رح

سرورِ سالکانِ طریقت، جمال جان اہل تحقیق ابوالحسن علی بن ابراہیم رح درگاہِ حق کے محتشم حر اور امام صوفیائے کرام تھے۔ اپنے زمانے میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ ان کا کلام بلند اور عبارت دلنشین تھی۔ آپ نے فرمایا: "مجھے میری آفت میں مبتلا رہنے دو۔ کیا تم اسی آدم کی اولاد نہیں جسے خدائے عزوجل نے خاص تقویم پر پیدا کیا۔ اور بے واسطہ غیر اسے زندگی عطا کی۔ فرشتوں کو کہا اسے سجدہ کرو۔ پھر اسے کچھ حکم دیا اور اس نے نافرمانی کی پہلے ہی جام میں تلچھٹ ہو تو آخری جام تک کیا گذرے گی"۔ مطلب یہ کہ اگر آدمی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ سراسر نافرمان ہے اگر رب العزت کی عنایت شامل ہو تو سراپا بقدم محبت ہے۔ عنایاتِ پروردگار پر نظر کرو اور پھر اپنی برائیوں کی طرف دیکھو تمام عمر اسی میں گذار دو۔ واللہ اعلم۔

ص ۱۶۷/۲۲۶

یہ تھے حالات چند برگزیدہ متقدمین صوفیائے کرام کے۔ اگر تمام کا ذکر کیا جاتا یا صرف انہی کے احوال پر تفصیل سے لکھا جاتا یا ان کی حکایات کو معرضِ تحریر میں لایا جاتا تو مقصد مفقود ہو جاتا اور کتاب طویل ہو جاتی۔ اب کچھ متاخرین پر لکھنا مقصود ہے۔

وباللہ التوفیق

۱۲ بارھواں باب

متاخرین

ہمارے زمانے میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو ریاضت کا بار تو اٹھا نہیں سکتے مگر ریاست کے طلبگار ہیں۔ تمام اہلِ طریقت کو اپنے جیسا خیال کرتے ہیں۔ جب بزرگانِ سلف کے اقوال سنتے ہیں۔ ان کی شان و عظمت دیکھتے ہیں ان کے معاملات سے متعلق پڑھتے ہیں۔ اور پھر اپنے پر نظر کرتے ہیں تو اپنے آپ کو پس ماندہ دیکھ کر کہتے ہیں۔ ہمارا ان سے کیا مقابلہ وہ لوگ ختم ہو چکے۔ ایسے لوگ اب پیدا نہیں ہوتے۔ یہ بات سراسر غلط ہے کیونکہ ربّ العزت کبھی اہل زمین کو بلا صحت نہیں چھوڑتا اور امت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بغیر ولی نہیں رہنے دیتا۔ چنانچہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میری امت میں ایک گروہ تا قیامت حق و صداقت پر رہے گا" اور نیز فرمایا "میری امت میں ہمیشہ چالیس آدمی خلقِ ابراھیمی پر رہیں گے"۔

ص ۱۶۸/۲۲۷

جن مشائخِ کبار کا ذکر اب ہوگا ان میں سے کچھ داعی اجل کو لبّیک کہہ چکے ہیں اور کچھ ابھی بقیدِ حیات ہیں۔ رضی اللہ عنھم وعنّا وعن جمیع المسلمین والمسلمات۔

۱۔ ابو العباس احمد بن محمد القصّاب رح

آپ ماوراء النہر کے متقدمین سے مصاحبت فرما چکے تھے۔ رفعتِ حال۔ صدقِ فراست اور کثرتِ برہان و کرامات کے لیے مشہور تھے۔ ابو عبداللہ خیاطی جو طبرستان کے امام تھے فرماتے ہیں کہ یہ باری تعالیٰ کی خاص عنایت ہے کہ وہ کسی کو بغیر تعلیم وہ مقام عطا کر دیتا ہے کہ اگر اصول دین اور دقائق توحید میں کوئی مشکل پیش آئے تو وہ رہنمائی کرے۔ ابو العباس قصاب ایک ایسے ہی بزرگ ہیں۔ آپ امّی تھے مگر دینیات اور طریقت پر نہایت عالی کلام تھے۔ میں نے ان کی بہت سی حکایات سنی ہیں مگر اس کتاب میں مجھے اختصار مدنظر ہے۔

ایک روز ایک بھاری بوجھ سے لدا ہوا اونٹ آمل کے بازار سے گذر رہا تھا کیچڑ بہت تھی۔ اونٹ کا پاؤں پھسل گیا وہ گر گیا اور اس کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ لوگ اونٹ کا بوجھ اتارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اونٹ کا مہار بردار لڑکا رو رہا تھا اور ہاتھ اٹھا کر خدا کے سامنے فریاد کر رہا تھا۔ ابوالعباسؒ کا ادھر سے گذر ہوا۔ انہوں نے اونٹ کی مہار تھام لی اور رو بہ آسمان ہو کر کہا "باری تعالیٰ اس اونٹ کو ٹھیک کر دے۔ اگر اسے ٹھیک نہیں ہونا تو میرے دل پر اس لڑکے کی فریاد نے اتنا اثر کیوں کیا؟ اونٹ یکبار کھڑا ہو گیا اور چلنے لگا۔

ص ۱۶۹/۲۲۸

آپ کا قول ہے "تمام عالم کو راضی برضائے حق ہونا چاہیئے ورنہ دکھ ہوگا" اگر کوئی راضی برضا ہے تو اس کا میلانِ طبع بلا کی طرف ہوگا اور بلا بلا کی طرف نہیں آتی۔ اگر خو کردہ بلا نہیں تو بلا ضرور آئے گی اور باعثِ رنج ہوگی۔ ہمارا رنج و راحت مقدر ہو چکا ہے اور مقدر میں تغیر نہیں آتا۔ راضی بہ رضا ہونا راحت کا باعث ہے جو خوگرِ رضا ہو اس کے لیے راحت ہی راحت ہے اور روگردانی کرنے والے کے لیے قضا کے صورت پذیر ہونے میں تکلیف ہی تکلیف ہے۔ واللہ اعلم۔

۲۔ ابو علی بن حسین بن محمد الدقاقؒ

آپ فن کے امام تھے۔ زمانے میں بے نظیر تھے۔ صاف بیان اور فصیح زبان تھے۔ کئی مشائخ کبار سے ملاقات اور مصاحبت فرما چکے تھے۔ نصر آبادی کے مرید تھے اور وعظ فرمایا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا "جو بجز خدا کسی چیز کو دوست رکھتا ہے اپنے حال میں کمزور ہے۔ جو بجز خدا کسی کا ذکر زبان پر لاتا ہے جھوٹ بولتا ہے" مطلب یہ کہ غیر اللہ سے دوستی کی بنیاد اللہ کو نہ جاننے پر ہوتی ہے۔ اللہ سے دوستی غیر اللہ سے عدم دوستی کا نشان ہے جو غیر سے دور بھاگے وہ اس کا ذکر بھی زبان پر نہ لائے گا۔ ایک بوڑھے آدمی نے بیان کیا کہ وہ ایک دن آپ کی مجلس میں اس خیال سے گیا کہ متوکلوں کی کیفیت سے متعلق کچھ دریافت کرے۔ آپ نے طبرستان کا بنا ہوا خوبصورت عمامہ زیبِ سر کیا ہوا تھا۔ بوڑھے نے سوال کیا۔ "توکل علی الحق کیا چیز ہے۔" فرمایا "لوگوں کی پگڑیوں کو لالچ کی نظر سے نہ دیکھنے کو توکل کہتے ہیں" یہ کہا اور پگڑی اتار کر بوڑھے آدمی کے سامنے رکھ دی۔ واللہ اعلم

ص ۱۷۰/۲۲۹

۳۔ ابوالحسن علی بن احمد الخرقانیؒ

آپ قدیم مشائخ کبار میں شمار ہوتے ہیں۔ اپنے زمانے میں تمام اولیائے کرام کی نگاہوں میں ممتاز تھے۔ شیخ ابوسعیدؒ

نے آپ سے ملاقات کی۔ مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ چلتے وقت شیخ ابوسعیدؒ نے کہا "میں آپ کو اپنا جانشین مقرر کرتا ہوں"۔

میں نے شیخ ابوسعیدؒ کے خادم حسن مؤدّب سے سنا کہ جب شیخ ابوسعیدؒ کے پاس پہنچے تو آپ نے کوئی بات نہیں کی صرف سنتے رہے اور گاہے گاہے احمد الخرقانی نے کوئی سوال کیا تو آپ نے جواب ضرور دیا۔ حسن مودّب نے پوچھا "آپ خاموش کیوں رہے"۔ فرمایا "ایک موضوع کی تشریح ایک ہی آدمی کر سکتا ہے"۔

میں نے اپنے استاد ابوالقاسم قشیریؒ سے سنا کہ جب وہ خرقان آئے تو احمد الخرقانیؒ کے دبدبہ سے ان کی فصاحت وبلاغت ختم ہو گئی اور یہ محسوس ہوا کہ گویا کسی نے ان کی ولائت چھین لی۔

آپ نے فرمایا "دو راستے ہیں۔ ایک غلط ایک صحیح۔ غلط راستہ بندے کا خدا کی جانب ہے اور صحیح راستہ خدا کا بندہ کی طرف ہے"۔ جو یہ دعویٰ کرے کہ خدا کو پا لیا۔ اس نے نہیں پایا۔ ہاں جو یہ کہے کہ مجھے خدا تک پہنچا دیا گیا اس نے واقعی خدا کو پا لیا۔ سوال خدا کو پانے یا نہ پانے یا نجات حاصل کرنے یا نہ کرنے کا نہیں بلکہ خدا تک پہنچائے جانے یا نہ جانے کا اور نجات دیئے جاتے یا نہ دیئے جانے کا ہے۔ واللہ اعلم۔

۴۔ ابوعبداللہ محمد بن علی المعروف بالداستانی مقیم بِبسطام

آپ اپنے وقت کے بادشاہ تھے۔ بیان وعبارت میں منفرد حیثیت کے مالک تھے۔ آپ کا کلام مہذب اور اشارات نہایت لطیف ہیں۔ شہر کے امام شیخ سہلکی آپ کے نیک سیرت جانشین تھے۔ میں نے ان سے بالداستانیؒ کے کئی خوبصورت اور دل نشین اقوال سنے۔ مثلاً آپ نے فرمایا "توحید موجود ہے اور تو توحید میں مفقود" یعنی توحید درست ہے مگر تو نادرست۔ کیونکہ تجھے اقتضائے حق پر قیام حاصل نہیں۔ توحید کا کمترین درجہ یہ ہے کہ تو اپنی ہر ملکیت میں تصرف سے دست بردار ہو اور ہر امر میں مکمل تسلیم کا اقرار کرے۔

ص ۱۷۱ / ۲۳۰

شیخ سہلکی کہتا ہے "ایک موقعہ پر بسطام پر ٹڈی دَل اُمڈ پڑا۔ تمام کھیت اور درخت سیاہ ہو گئے۔ لوگ چلّا رہے تھے۔ شیخ نے سبب پوچھا میں نے ٹڈی دل کا ذکر کیا۔ آپ چھت پر چڑھ گئے اور رو بہ آسمان کھڑے ہو گئے۔ ٹڈی دل ختم ہونا شروع ہو گیا۔ ظہر تک فضا صاف ہو گئی۔ اور کسی کو گھاس کے ایک تنکے کے برابر بھی نقصان نہ پہنچا۔ واللہ اعلم۔

۵۔ ابو سعید فضل اللہ بن محمد المھینیؒ

آپ شہنشاہ اہلِ محبت اور اہلِ تصوف تھے۔ تمام ہم عصر آپ سے بہرہ ور تھے کچھ دیدار سے کچھ اعتقاد سے کچھ اپنے روحانی جذبات کی بنا پر۔ آپ تمام علوم کے ماہر تھے عجیب فراست کے مالک تھے۔ لوگوں کے اسرارِ دل سمجھنے میں کمال رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ آپ کے آثار۔ آیات اور براہین بے شمار ہیں اور آج تک ان کے اثرات موجود ہیں۔

اوائلِ عمر میں آپ تعلیم کی خاطر مہنا سے سرخس تشریف لائے اور ابو علی ظاہر سے تعلق پیدا کیا۔ تین دن کا سبق ایک دن میں ختم کر لیا کرتے تھے اور وہی تین دن عبادت میں صرف کرتے تھے۔ اس وقت شیخ ابو الفضل حسن والیئے سرخس تھے۔ ایک روز آپ دریائے سرخس کے کنارے جا رہے تھے ابو الفضل حسن آپ سے ملے اور کہا "تمہارا یہ راستہ نہیں اپنے راستے پر جاؤ" آپ نے کوئی توجہ نہ دی اور اپنی جگہ پر واپس آ کر ریاضت و مجاہدہ میں مشغول ہو گئے۔ بالآخر درِ ہدایت کھلا اور آپ کو مقامِ بلند نصیب ہوا۔

ص ۱۶۲/۲۳۱

میں نے شیخ ابو مسلم فارسی سے سنا جس کو ابو سعید سے مخاصمت تھی۔ ان کی زیارت کے لیے گھر سے نکلا جسم پر ایک خرقہ تھا جو بوسیدگی اور میل کی وجہ سے چمڑے کی طرح ہو چکا تھا۔ خدمت میں پہنچ کر دیکھا کہ آپ مصری کپڑے کا لباس پہنے تخت پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ دل میں کہا یہ آدمی اس تعلقِ دنیا کے باوجود فقر کا دعویدار ہے اور مجھے فقر کا دعوےٰ اس بے سروسامانی پر ہے۔ مجھے ان کے ساتھ کیا موافقت ہو سکتی ہے؟ ابو سعیدؒ نے اس دلی کیفیت کو پا لیا اور فرمایا "یہ کس کتاب میں لکھا ہے کہ فقر کا لفظ صرف ایسے آدمی پر عاید ہوتا ہے جس کا دل مصروفِ مشاہدہ ہو" یعنی اہلِ مشاہدہ غنی بالحق ہوتے ہیں اور فقر ابتلائے مجاہدہ۔ ابو مسلم کہتا ہے میں اپنے دل میں سخت پشیمان ہوا اور اپنی بدگمانی سے توبہ کی۔

آپ کا قول ہے: "تصوف خدا سے دل کے بلا واسطہ تعلق کا نام ہے" یہ اشارہ مشاہدہ ہی کی طرف ہے۔ مشاہدہ دوستی کی شدت و فورِ شوق اور دیدارِ جمال میں انسانی عوارض کو ختم کر دینے کا نام ہے یا بہ الفاظِ دیگر بقائے حق میں فنائے صفت کو کہتے ہیں۔ کتاب الحج میں مشاہدہ اور اس کے وجود پر کچھ اور تحریر ہو گا انشاء اللہ تعالیٰ۔

آپ نیشاپور سے طوس جا رہے تھے راستے میں ایک سرد وادی پڑتی تھی خنکی کی وجہ سے آپ کے پاؤں سرد ہو گئے۔ ایک درویش ساتھ تھا۔ اس نے سوچا کہ اپنے کمربند کو پھاڑ کر دونوں پیروں پر لپیٹ دے۔ پھر خیال آیا کمربند اتنا خوبصورت ہے ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔ طوس پہنچ کر وہ درویش حاضرِ مجلس ہوا اور پوچھا "وسوسہ اور الہام میں کیا فرق ہے"۔ فرمایا "کمربند کو پھاڑ کر پاؤں پر ڈال دینے کا خیال الہام تھا۔ روکنے والی چیز وسوسہ تھا۔"

ایسی کئی کرامات ان سے منسوب ہیں مگر طولِ کلام ہمیں منظور نہیں۔ واللہ اعلم۔

۶۔ ابوالفضل محمد بن الحسین الختلیؒ

میں طریقت میں آپ کا مقتدی ہوں۔ آپ تفسیر اور حدیث کے معلم تھے اور تصوّف میں مکتبۂ جنیدؒ سے منسلک تھے۔ حصریؒ کے مرید تھے اور ان کے واقفِ اسرار تھے۔ ابو عمرو قزوینی اور ابوالحسن بن سالبہ کے ہم عصر تھے ساٹھ برس تک ازراہِ عزلت نشینی دنیا اور اہلِ دنیا سے روپوش رہے۔ خلقت ان کو بھول گئی۔ اکثر پہاڑوں میں رہے۔ عمر دراز پائی۔ ان کی کرامات، روایات اور براہین بے شمار ہیں۔ اہلِ تصوّف کے لباس اور رسوم سے متنفر تھے۔ اور اہلِ رسم کو سختی سے پیش آتے تھے۔ میں نے ان سے زیادہ دبدبے والا آدمی نہیں دیکھا۔ میں نے ان کو کہتے ہوئے سُنا "دنیا ایک روزہ ہے اور ہم روزہ سے ہیں"۔ یعنی دنیا مختصر ہے اور ہمارا اس میں کوئی حصہ نہیں۔ حالانکہ ہم اس کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ہم نے اس کی مصیبت دیکھ لی ہے اس کی حقیقت سے واقف اور اس سے کنارہ کش رہے۔

ایک دن میں آپ کو وضو کروا رہا تھا۔ میرے دل میں خیال گذرا کہ جب ہر کام حسب تقدیر صورت پذیر ہونا ہے تو آزاد لوگ کیوں کرامت کی امید پر پیروں کے غلام بنے رہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا "عزیزِ من! میں تیرے دل کی کیفیت سمجھ رہا ہوں۔ تجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ ہر چیز کے لیے سبب درکار ہے۔ جب حق تعالیٰ چاہتے ہیں کہ کسی حاجب زادہ کو تخت و تاج سے سرفراز کریں تو اسے توبہ کی توفیق عطا فرماتے ہیں اور اپنے کسی دوست کی خدمت اس کے سپرد کرتے ہیں تاکہ یہ خدمت حصولِ کرامت کا سبب بن جائے"۔ ایسے کئی لطیف رموز آپ سے ہر روز ظاہر ہوتے تھے۔ ص ۱۶۳ / ۲۳۳

وفات کے روز آپ بیت الجن کے مقام پر تھے۔ یہ ایک گاؤں ہے دریائے بانیا اور دمشق کے درمیان ایک وادی کے کنارے۔ ان کا سر میری آغوش میں تھا۔ میں اپنے دل میں بتقاضائے بشریت اپنے ایک دوست کی

طرف سے سخت کبیدہ خاطر تھا۔ آپ نے فرمایا "بیٹا! میں تجھے ایک اعتقادی مسئلہ بتاتا ہوں جس پر کاربند ہو کر تو ہر رنج و تکلیف سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ یاد رکھو ہر حال اور ہر مقام پر نیک و بد ربّ العزت کی طرف سے ہے اور اس کے کسی کام سے از راہ مخاصمت کبیدہ خاطر نہ ہو۔" اس کے علاوہ کوئی اور وصیت نہ فرمائی اور جان بحق ہو گئے۔ واللہ اعلم۔

۱۶۴/۲۳۴

۷۔ ابو القاسم عبد الکریم بن ھوازن القشیری رح

آپ اپنے زمانے کے یگانۂ روزگار تھے۔ آپ کا درجہ بلند اور مقام رفیع تھا۔ آپ کی کرامات اور روحانی کمالات کی دنیا آج تک معترف ہے۔ آپ کے اقوال دلنشین اور تصانیف دل پذیر ہیں۔ باری تعالیٰ نے آپ کی زبان کو بے ہودہ کلامی سے پاک رکھا۔ آپ نے فرمایا "صوفی مرض برسام کی طرح ہے جس کی ابتدا ہذیان سے اور انتہا خاموشی سے ہوتی ہے۔" تصوّف کے دو رخ ہیں۔ ایک وجد دوسرا نمود۔ نمود مبتدیوں کے لیے ہے اور اس کا مطلب ہذیان ہے۔ وجد منتہی لوگوں کا مقام ہے۔ وجد کے عالم میں گفتگو محال ہوتی ہے۔ جب طلب کا دور ہو تا بلند حوصلگی کا اظہار ہوتا ہے اور اظہار، ہذیان کے مترادف ہے۔ جب دُرِ مقصود حاصل ہو گیا۔ زبان خاموش ہو گئی اور گفتگو یا اشارے کی ضرورت ختم ہو گئی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام مبتدی تھے اور ان کا حوصلہ رویت باری تک محدود تھا چنانچہ کہا "میرے مولا سامنے آ تا کہ میں تجھے دیکھ سکوں"۔ یہ پکار حسرتِ مقصود کی مظہر تھی۔ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم منتہی اور متمکن تھے جب مقامِ مقصود پر پہنچے طلب ختم ہو گئی اور کہا "میں تیری ثنا کما حقہٗ نہیں کر سکتا"۔ یہ مقامِ بلند اور منزلِ عالی ہے۔ واللہ اعلم۔

۸۔ ابو العباس احمد بن محمد الاشقانی رح

آپ علومِ اصول و فروع کے امام ہوئے ہیں اور ہر علم میں کامل۔ کئی مشائخ کبار سے ملاقات کر چکے تھے۔ کبیر اور اجلّ اہل طریقت میں شمار ہوتے تھے۔ طریقِ "فنا" پر لکھتے تھے اور اندازِ تحریر سخت مغلق تھا۔ یہ ان کی خصوصیت تھی۔ میں نے جاہلوں کی ایک جماعت ایسی بھی دیکھی جو تحریر میں ان کی تقلید کرتے تھے اور ان کے پراگندہ اقتباسات لیے پھرتے تھے۔ وہ تقلید کے معنی بھی سمجھنے سے قاصر تھے تقلید کے طور پر کچھ تحریر کرنا تو درکنار مجھے

ان کے ساتھ بہت انس تھا اور وہ مجھ پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ میں نے کسی مرد یا عورت کو ان سے بڑھ کر شریعت کا پاسدار نہیں دیکھا۔ دنیا سے تمام علائق منقطع کر چکے تھے۔ علم اصول پر دقیق عبارات کے سبب بجز اہلِ تحقیق کوئی بھی ان کو سمجھ نہیں سکتا تھا۔ ان کی طبیعت ہمیشہ دنیا و عقبیٰ سے بے نیاز رہتی تھی اور وہ اکثر پکارا اٹھا کرتے تھے۔ "مجھے ایسی نیستی کی ضرورت ہے جس کا وجود نہیں"۔ فارسی میں فرماتے تھے "ہر آدمی کو کسی محال چیز کی خواہش ہوتی ہے۔ مجھے بھی ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ وہ کبھی پوری نہیں ہوگی یعنی خدا مجھے ایسا عدم نصیب کرے جس کا وجود نہ ہو" مقصد یہ کہ جملہ مقامات و کرامات محض حجاب کی حیثیت رکھتے ہیں جو انسان اور باری تعالیٰ کے درمیان حائل ہے۔ انسان کو محجوب رکھنے والی چیزوں سے محبت ہے۔ دیدار میں فنا ہو جانا حجاب میں الگ رہنے سے بہتر ہے۔ باری تعالیٰ کی ہستی کو عدم نہیں اس کی سلطنت میں کیا فرق پڑتا ہے اگر میں اس طرح نیست و نابود ہو جاؤں کہ میری نیستی کا بھی وجود نہ ہو۔ یہ "فنا" کی اصل حقیقت ہے واللہ اعلم۔

ص ۱۷۵ / ۲۳۵

۹۔ ابو القاسم بن علی بن عبداللہ الگرگانی رح

(خدا ان کی عمر ہمارے لیے اور تمام مسلمانوں کے لیے دراز کرے)

اپنے زمانے میں بے نظیر ہیں اور کوئی ان کا ثانی نہیں۔ ان کی ابتدا نہایت اچھی اور پائدار تھی۔ انہوں نے بہت سخت سفر بقیدِ شریعت سرانجام دیئے۔ سب لوگ آپ کے گرویدہ ہیں اور سب طالب آپ کے معتقد۔ مریدوں کی دلی کیفیتوں کو بیان کرنے میں کمال رکھتے ہیں اور علمی فنون کے ماہر ہیں ان کے مرید جہاں بھی جاتے ہیں زینتِ مجالس ہیں انشاءاللہ تعالیٰ۔ اپنے پیچھے وہ ایک ایسا جانشین چھوڑیں گے جسے تمام صوفیائے کرام رہنما تسلیم کریں گے یعنی لسان الوقت ابو علی ابو الفضل بن محمد الفارمدی (اللہ اس کی عمر دراز کرے) جس نے حقِ خدمت ادا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ جو مکمل طور پر تارکِ علائقِ دنیا ہے اور جو اپنی خدمت اور ترکِ علائق کی برکت سے اس سردارِ مشائخ یعنی ابو القاسم الگرگانی کی زبانِ حال ہے۔

ایک دن میں آپ کے سامنے اپنے احوال و مشاہدات بیان کر رہا تھا۔ اس خیال سے کہ وہ ناقدِ وقت ہونے کی حیثیت سے میری کیفیت پر نظر فرما دیں۔ وہ نہایت انہماک سے سن رہے تھے۔ میں نے پندارِ طفلی اور زورِ جوانی

ہیں طول بیانی سے کام لیا اور دل میں سوچا کہ غالباً یہ بزرگ ان مقامات سے نہیں گذرے ورنہ اس انہماک اور نیاز مندی سے نہ سنتے۔ انہوں نے میری دلی کیفیت کو سمجھ لیا اور فرمایا "جانِ پدر! میرا خضوع اور انہماک تیرے لیے یا تیرے احوال کے لیے نہیں بلکہ اس ذات کے لیے ہے جو خالقِ احوال ہے۔ یہ چیزیں ہر طالب کو پیش آتی ہیں۔ تیرے لیے کوئی خصوصیت نہیں۔" یہ سن کر میرے ہوش اڑ گئے۔ انہوں نے میری طرف دیکھا اور کہا "طریقت سے آدمی کو صرف اس قدر نسبت ہے کہ جب وہ اس پر گامزن ہوتا ہے تو سمجھتا ہے اس نے منزل کو پا لیا۔ اور جب بھٹک جاتا ہے تو اپنے تصوّر کو عبادت میں ڈھالنا شروع کر دیتا ہے۔ نفی اور اثبات۔ عدم اور وجود سب خیالی ہیں۔ اور انسان کبھی خیالات کے دھندلکوں سے نجات نہیں پاتا۔ لازم یہی ہے کہ وہ درگاہِ حق پر سرنگوں رہے اور بجز مردانگی و فرمانبرداری ہر نسبت یا تعلق سے دستبردار ہو جائے۔"

ص ۱۶۷/۲۳۶

اس کے بعد ان کے ساتھ بہت راز و نیاز رہا مگر میں طوالت کے خوف سے بیان نہیں کر سکتا۔

۱۰۔ ابو احمد المظفر بن احمد بن حمران رحمۃ اللہ علیہ

آپ بارگاہِ ریاست میں متمکن تھے کہ حق تعالیٰ نے درِ طریقت وا کیا۔ اور تاجِ کرامت سے سرفراز فرمایا۔ آپ کو فنا اور بقا پر خوش بیانی اور ژرف نگاری عطا فرمائی۔

شیخ المشائخ ابو سعیدؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں درگاہِ حق میں بندگی سے باریابی ملی اور خواجہ مظفر کو حکمرانی سے یعنی ہم مجاہدہ اور مشاہدہ سے کامیاب ہوئے اور وہ مشاہدہ اور مجاہدہ سے۔ میں نے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا "جو اہلِ طریقت کو دشت و صحرا میں گھوم کر ملا مجھے تخت پر اور بسترِ استراحت میں مل گیا۔"

کچھ کم فہم اور کم نظر لوگوں نے اس قول کو اظہارِ تکبر قرار دیا ہے مگر ظاہر ہے کہ اظہارِ حقیقت کو "تکبر" کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ بالخصوص جب اظہار کرنے والا صاحبِ دل ہو۔ آجکل وہ (ابو سعید) خواجہ مظفرؒ کے عالی ظرف اور مقبول سجادہ نشین ہیں۔

ایک روز میں آپ کی خدمت میں حاضر تھا۔ نیشاپور کے ایک مدعی طریقت نے عبارتاً کہا "میں فنا ہو کر بقا حاصل کرتا ہوں"۔ خواجہ مظفرؒ نے فرمایا۔ "فنا سے بقا کیسے حاصل ہو سکتی ہے۔ فنا تو عدم کا عالم ہے اور بقا ہستی کا۔ دونوں چیزیں متضاد ہیں۔ فنا فریبِ فہم ہے جب تک عدم وجود پیشِ نظر ہے۔ اگر عدم وجود مفقود ہو جائے یعنی

نیستی جامۂ ہستی پہن لے تو فنا کی حقیقت ختم ہو جاتی ہے کسی چیز کی ذات فنا نہیں ہوتی البتہ صفت اور سبب فنا ہو جاتے ہیں: صفت کے بعد موصوف اور سبب کے بعد مسبب باقی رہ جاتا ہے۔ موصوف اور مسبب کی ذات فنا پذیر نہیں ہوتی۔"

میں کہہ سکتا ہوں کہ خواجہ صاحب کا قول مجھے لفظ بہ لفظ یاد نہیں۔ مطلب یہی تھا جو کم و بیش بیان کر دیا۔ ذرا تشریح اور کیے دیتا ہوں تاکہ بات عام فہم ہو جائے۔ اختیار آدمی کی صفت ہے اور اس صفت کی وجہ سے وہ اختیارِ خداوندی سے محجوب ہے۔ اس کی صفت اس کے لیے پردہ ہے۔ اختیارِ خداوندی ازلی ہے اور اختیار انسانی مُحدث۔ ازلی چیز فنا سے بالاتر ہے۔ جب اختیارِ خداوندی کسی آدمی سے متعلق ظہور پذیر ہوتا ہے تو آدمی کا اپنا اختیار فنا ہو جاتا ہے اور اس کا ذاتی تصرف ختم ہو جاتا ہے واللہ اعلم۔

ایک دن میں آپ کے پاس حاضر ہوا تپش بہت زیادہ تھی میں لباسِ سفر میں تھا اور میرے بال پریشان تھے آپ نے کہا "بتاؤ کیا چاہتے ہو؟" میں نے عرض کی "مجھے سماع کی خواہش ہے"۔ خواجہ صاحب نے فوراً گانے والوں کا انتظام کیا۔ میں جوان تھا۔ میری طبیعت میں جوش اور ایک ناآزمودہ بندی کا خروش تھا۔ نغمہ و سرود نے مجھے بے چین کر دیا۔

ص ۱۷۷/۲۳۸

تھوڑی دیر بعد جب اس آفت کا زور و غلبہ کم ہوا تو آپ نے فرمایا "پسند آیا" میں نے عرض کی "بے حد لطف اندوز ہوا ہوں" کہنے لگے "ایک وقت ایسا آئے گا جب تیرے لیے یہ سماع اور کوّوں کی کائیں کائیں برابر ہوگی۔ سماع کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب مشاہدہ حاصل نہ ہو۔ مشاہدہ حاصل ہو تو سماع بے کار ہو جاتا ہے۔ خبردار اسے عادت نہ بنانا جو طبیعت ثانی ہو کر رہ جائے اور اس سے دست بردار ہونا مشکل ہو جائے۔

واللہ اعلم بالصواب

۱۳
تیرھواں باب

مختلف ممالک کے متاخرین صوفیائے کرام

سب کے سوانحِ حیات قلم بند کرنے کی گنجائش نہیں اور اگر کچھ لوگوں کا ذکر چھوڑ دیا جائے تو مقصدِ کتاب فوت ہونے کا اندیشہ ہے۔ یہی ہو سکتا ہے کہ سوائے اہلِ رسوم کے بیشتر و مشائخ کبار اور صوفیائے کرام کے نام لکھ دوں جو میرے وقت میں ہو گذرے ہیں یا ابھی زندہ ہیں۔

۱۔ شام و عراق

شیخ زکی ابن علا بزرگ مشائخ اور سرداران زمانہ میں شمار ہوتے ہیں۔ میں نے انہیں محبت کے بھڑکتے ہوئے شعلے کی طرح پایا۔ عجیب دلائل و آیات کے مالک تھے۔

ابو جعفر محمد المصباح الصیدلانی طریقت کے رئیس تھے۔ موضوعِ حقیقت پر عجیب حسنِ بیان پایا تھا۔ حسین بن منصور کے ساتھ خاص ارادت رکھتے تھے جس کی کئی تصانیف میں نے ان کو پڑھ کر سنائیں۔

شیخ ابو القاسم سدی صاحبِ مجاہدہ اور نیک حال بزرگ تھے۔ درویشوں سے بڑی ارادت رکھتے تھے اور ان کے معتقد تھے۔

۲۔ فارس

شیخ المشائخ ابو الحسن بن سالبہ تصوف پر نہایت فصیح زبان اور توحید پر نہایت بلیغ بیان واقع ہوئے تھے ان کے اقوال مشہور ہیں۔

شیخِ مرشد ابو اسحاق بن شہریار نہایت بلند وقار اور صاحبِ اختیار صوفی تھے۔

ص ۱۶۹/۲۳۹

شیخ طریقت ابوالحسن علی بن بکران بزرگ اہل تصوف میں شمار ہوتے تھے۔

ابومسلم اپنے وقت کے صالح بزرگوں میں سے تھے اور شیخ ابوالفتح اپنے باپ کی طرح نیک اور رحمتِ خداوندی کے امیدوار تھے۔ شیخ ابوطالب صفات باری تعالیٰ کے متعلق سوچ بچار میں تھے۔

میں ان میں سے شیخ المشائخ ابواسحاق کو نہیں مل سکا۔

۳۔ قہستان، آذربائیجان، طبرستان و فک

شیخ شفیق فرخ معروف بہ اخی زنجانی نیک سیرت اور ستودہ طریقت بزرگ تھے۔

شیخ بدرالدین بزرگ اہل تصوف میں شامل تھے۔ ان کی بہت سی نیکیاں مشہور ہیں۔

بادشاہ وقت بھی خدا سے رجوع کرنے والا اور اس کے نیک بندوں میں سے تھا۔

شیخ ابوعبداللہ جنیدی رفیق و محترم تھے۔

شیخ ابوطاہر مکشوف اپنے زمانے کے برگزیدہ صوفی تھے۔

خواجہ حسن سمنان خدا کی محبت میں مگن اور ہمیشہ اس کے لطف و کرم کے امیدوار رہتے تھے۔

شیخ سھلکی بزرگ صوفی فقرا میں شامل تھے۔

ادیب کمندی اپنے وقت کے اہم مشائخ میں شمار ہوتے تھے۔

۴۔ کرمان

خواجہ علی بن الحسین الیرکانی اپنے وقت کے سیاح تھے خوب سفر کر چکے تھے۔ ان کے فرزند حکیم بھی بڑے بڑے باوقار آدمی ہیں۔

شیخ محمد بن سلمہ بزرگانِ وقت سے تھے۔ ان سے پہلے بہت سے گمنام و پوشیدہ حال اولیاء کرام ہو گذرے ہیں اور کئی مسلک تصوف میں تو وارد اور رحمت کے امیدوار جوان بھی موجود ہیں۔

۵۔ خراسان

اقبالِ حق کا سایہ آج کل خراسان پر ہے۔ اسی جگہ شیخ مجتہد ابوالعباس سرہ مغانی ہوئے ہیں۔ زندہ دل اور

خوش وقت بزرگ تھے۔

خواجہ ابو جعفر محمد بن علی الجواری اہلِ تصوّف کے بزرگ محققین میں شامل ہیں۔

خواجہ ابو جعفر ترشیزی عزیزِ وقت ہو گزرے ہیں۔

خواجہ محمود نیشاپوری امام وقت تھے اور نہایت درجہ خوش زبان تھے۔

شیخ محمد معشوق خوش وقت اور فارغ البال تھے۔ محبت کے نور سے درخشاں تھے۔ نیک باطن اور خرّم۔ ص ۱۸۰/۲۴

خواجہ رشید مظفرؔ پسرِ شیخ ابو سعید کی نسبت امید کی جاتی ہے کہ وہ ایک دن پیشرو اہلِ تصوّف ہوں گے اور اہلِ دل کا قبلۂ امید۔

خواجہ احمد حمّادی سرخسی وقت کے مردِ میدان تھے۔ مدّت تک میرے رفیق رہے۔ میں نے ان کی بہت سی کرامات دیکھیں۔ جواں مرد صوفی تھے۔

شیخ احمد نجّار سمرقندی مرو میں قیام رکھتے تھے اور اپنے وقت کے حکمران تھے۔

شیخ ابوالحسن علی بن ابی طالب الاسود باپ کے ارجمند فرزند تھے۔ یگانۂ روزگار تھے۔ بلند ہمت اور صاحبِ صدق و فراست۔

اگر اہلِ خراسان کے سب بزرگوں کا ذکر کیا جائے تو یہ کتاب بہت طویل ہو جائے گی۔ میں کم از کم تین سو ایسے بزرگوں سے ملا کہ ان میں سے ہر ایک صاحبِ مشرب تھا اور تنہا سارے عالم کے لیے کافی تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آفتابِ محبّت اور اقبالِ طریقت اہلِ خراسان کے مقدر میں ہے۔

۷۔ ماوراء النہر

ابو جعفر محمد بن الحسین الحرمی امام وقت ہیں اور مقبول خاص و عام۔ صاحبِ وجد اور وارفتہ ہیں۔ عالی ہمت ہیں۔ صاف مشرب ہیں اور طالبانِ حق سے شفقت سے پیش آتے ہیں۔

خواجۂ فقیہ پیکرِ وجاہت ابو محمد بالغزی خوش وقت اور نیک معاملہ بزرگ تھے۔

احمدِ ایلاقی شیخِ وقت، بزرگ زمانہ اور تارکِ رسوم و عادات تھے۔

خواجہ عارف فریدِ وقت اور بدیعِ روزگار تھے۔

علی ابن اسحاق خواجہ روزگار اور محتشمِ وقت تھے۔ نہایت شیریں زبان تھے۔

یہ نام ان لوگوں کے ہیں جن سے میں نے ملاقات کی اور جن کے مقامات کو پہچانا۔ سب اہلِ تحقیق تھے۔

۷۔ غزنین

ص ۱۸۱/۲۴۱

غزنین اور اس کے ساکنوں میں شیخ عارف اور اپنے وقت کے منصف ابوالفضل بن اسدی پیرِ بزرگ ہوئے ہیں۔ ان کے دلائل روشن اور کرامات ظاہر تھیں۔ محبّت کی آگ کے شعلۂ جوالہ تھے آپ کا مشرب اخفار تھا۔

شیخ مجرد علائقِ دنیوی سے منقطع اسماعیل الشاشی پیرِ محتشم تھے اور راہِ ملامت پر گامزن تھے۔

شیخ سالار طبری تصوّف کے عالم تھے اور خوش وقت تھے۔

شیخ عیار، معدنِ اسرار ابوعبداللہ محمد بن الحکیم معروف بہ مریدؔ سرمستِ بارگاہِ حق تھے۔ ان کی کیفیت خلقت سے معرضِ اخفا میں تھی مگر ان کے دلائل آیات ظاہر اور روشن تھے۔ دیدار کی بجائے ان کی صحبت زیادہ دل نشین تھی۔

شیخ محترم اور سب سے مقدم سعید بن ابی سعید العیارؔ حدیثِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے حافظ تھے۔ عمرِ دراز پائی اور کئی مشائخ کبار سے ملاقات کی۔ قوی حال اور صاحبِ خبر تھے مگر پردۂ اخفا میں رہتے تھے اور اپنی حقیقت کسی پر ظاہر نہ کرتے تھے۔

پیکرِ حرمت و وقار ابوالعلا عبدالرحیم بن احمد السعدی اہلِ طریقت میں صاحبِ عزت اور سردارِ وقت تھے مجھے ان سے بہت ارادت ہے۔ ان کی روحانی کیفیت بہت بلند ہے اور وہ علمِ تصوّف کی تمام فروع سے بخوبی واقف ہیں۔

شیخ اوحد قسورہ بن محمد الجردیزی اہلِ طریقت سے ارادت تام رکھتے ہیں۔ ان کے دل میں سب کے لیے جگہ ہے۔ کئی مشائخ کبار سے ملاقات کر چکے ہیں۔

اس شہر کے خوش اعتقاد لوگوں اور علمار کو دیکھ کر امید کی جاسکتی ہے کہ وقت گزرنے پر ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو ہمارے اعتقاد کے صحیح حقدار ہوں۔ وہ پراگندہ کار لوگ جو اس شہر میں جمع ہو گئے ہیں اور طریقت کو بدنام کر رہے ہیں دور ہو جائیں گے اور غزنین پھر قیام گاہِ اولیار کرام بن جائے گا۔ اب ہم اہلِ تصوّف کے مختلف مکاتب اور ان کے اختلافات بیان کریں گے۔

واللہ اعلم بالصواب

۱۴
چودھواں باب

اہلِ تصوف کے مختلف مکاتب اور اُن کے اختلافات

ص ۱۸۳/۲۴۲

میں پہلے ابوالحسن نوریؒ کے ذکر میں بیان کر چکا ہوں کہ اہلِ تصوف کے بارہ مختلف فریق ہیں۔ دو مردود ہیں اور دس مقبول۔ دس فریق مجاہدہ میں نیک معاملہ اور ستودہ طریق ہیں۔ مشاہدہ میں آدابِ لطیف رکھتے ہیں۔ گو معاملات مجاہدات اور ریاضات میں اختلاف ہے مگر اصول اور فروعِ شرع و توحید میں اتفاق ہے۔ ابو یزیدؒ نے فرمایا ہے: "علماء کا اختلاف رحمت ہے سوائے تجرید و توحید کے"۔ اسی موضوع پر ایک مشہور حدیث بھی ہے۔ دراصل حقیقتِ تصوف مشائخ کبار کی روایات میں ہے اور اس کی تقسیم صرف رسمی اور مجازی ہے۔ میں تصوف کی تشریح کے طور پر مختصراً ان کے اقوال کو تقسیم کروں گا تاکہ ہر فریق کا بنیادی مکتبۂ خیال نمایاں ہو جائے۔ طالب کو علم حاصل ہو۔ علماء کو قوت۔ مریدوں کو اصلاح۔ اہلِ محبت کو فلاح۔ عاقلوں اور اہلِ مروت کو تنبیہ اور مجھے ثوابِ دوجہاں۔ وباللہ التوفیق۔

۱۔ محاسبیہ

محاسبی ابوعبداللہ الحارث بن اسد المحاسبیؒ کے پیروکار ہیں۔ حارثؒ کو ان کے تمام ہمعصر "مقبول النفس" اور "مقتول النفس" مانتے تھے۔ ان کو علم اصول، فروع اور حقائق پر پورا عبور تھا۔ تجرید و توحید پر صحتِ ظاہر و باطن سے گفتگو کرتے تھے۔ ان کی تعلیم کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ "رضا" کو مقام کا درجہ نہیں دیتے تھے بلکہ "احوال" میں شامل سمجھتے تھے وہ پہلے صوفی ہیں جس نے اس مکتبۂ خیال کو اپنایا اور جس پر اہلِ خراسان کاربند ہوئے۔ اس کے برعکس اہلِ عراق کے نزدیک "رضا" مقامات میں شامل ہے اور "توکل" کی انتہا ہے۔ یہ تفرقہ آج تک رونما ہے۔ اب ہم اس کی تشریح کرتے ہیں انشاء اللہ عزوجل۔

ص ۱۸۴/۲۴۲

حقیقتِ رضا

سب سے پہلے حقیقتِ رضا کو ثابت کرنا اور اس کی اقسام کو قائم کرنا ضروری ہے۔ اس کے بعد حقیقتِ

حال و مقام اور دونوں کے فرق کو معرضِ تحریر میں لایا جائے گا انشاء اللہ تعالیٰ۔

کتاب اور سنت رضا کے معاملے میں ناطق ہے اور امت کا اس پر اجماع ہے باری تعالیٰ نے فرمایا رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ "اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے"۔ اور پھر فرمایا لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ "تحقیق اللہ مومنوں سے راضی ہوا جب انہوں نے درخت کے نیچے تیرے ہاتھ پر بیعت کی"۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ذاق طعم الایمان من رضی باللہ ربًّا "ایمان کا مزہ اس نے پایا جو اللہ سے اس کی رضا پر راضی ہوا"

رضا کی دو صورتیں ہیں (۱) خدا کا بندہ سے راضی ہونا (۲) بندہ کا خدا سے راضی ہونا۔ خدا کا راضی ہونا یہ ہے کہ وہ بندے کی خوش اعمالی پر از راہِ اجرا سے کرامت اور عزت عطا کرے۔ بندے کا راضی ہونا یہ ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے احکام پر سرِ تسلیم جھکائے اور اوامر کو بجا لائے۔ خدا کا راضی ہونا مقدم ہے کیونکہ جب تک اس کی رضا نہ ہو کوئی انسان اس کے احکام بجا لانے کی توفیق نہیں رکھ سکتا۔ انسانی رضا کا تعلق رضائے خداوندی سے ہے بلکہ وہ صورت پذیر ہی نہیں ہو سکتی جب تک اس کی رضا شاملِ حال نہ ہو۔ القصہ رضائے بندہ قضائے حق کو بطیبِ خاطر قبول کرنے کا نام ہے، عطا ہو یا ضبط۔ اور حالات پر سرِ تسلیم خم کرنے کو کہتے ہیں جلال ہو یا جمال۔ اہلِ رضا کے لیے غضب کی آگ میں جل بجھنا یا رحم و کرم کے نور میں چمک اٹھنا یکساں ہے غضب ہو یا رحم۔ ہر چیز اسی کی مظہر ہے اور دل نشین ہے کیونکہ اس کی آفریدہ ہے۔

امیر المومنین حسین ابن علی کرم اللہ وجہہ سے ابوذر غفاری کے اس قول سے متعلق سوال کیا گیا: الفقر احبّ الیّ من الغنی والسقم احبّ الیّ من الصحۃ "مجھے دولت سے زیادہ فقیری اور صحت سے زیادہ بیماری عزیز ہے"۔ حسینؓ نے جواب دیا: رحم اللہ اباذر اما انا فاقول من اشرف علی حسن اختیار اللہ لہ لم یتمن غیر ما اختار اللہ لہ "خدا ابوذر پر رحم کرے مگر میں کہتا ہوں کہ رضائے مولا پر چلنے والا صرف اسی چیز کا آرزومند ہوتا ہے جو اس کے لیے مولائے مطلق نے پسند فرمائی"۔ جب انسان مرضیِ مولا کو سمجھ لیتا ہے تو اپنی مرضی سے دستبردار ہو جاتا ہے اور ہر مصیبت سے نجات پاتا ہے۔ یہ چیز غیبت سے نہیں بلکہ حضور سے حاصل ہوتی ہے کیونکہ لان الرضا للاحزان نافیۃ وللغفلۃ معالجۃ شافیۃ "رضا غم و الم کو مٹا دیتی ہے اور غفلت کے چنگل سے رہائی دیتی

ص ۱۸۵/۲۴۴

ہے"۔ اندیشۂ غیر دل سے ختم کر دیتی ہے اور مشقّت کے بندھنوں کو توڑ دیتی ہے رضا نجات کا ذریعہ ہے۔

عملاً رضا علمِ خداوندی کے مطابق انسان کی پسندیدہ روی ہے اور اس چیز کو تسلیم کر لینا ضروری ہے کہ اس کی ذات پاک ہر حال میں دیکھنے والی ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے والوں کو چار فریقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے وہ لوگ جو باری تعالیٰ کی عطا پر راضی ہیں یہ معرفت ہے۔ دوسرے وہ لوگ جو نعمتوں پر راضی ہیں یہ دنیا ہے۔ تیسرے وہ لوگ جو مصیبت پر راضی ہیں یہ جملہ رنج و محن کا مقام ہے۔ چوتھے وہ لوگ جو برگزیدہ ہونے پہ راضی ہیں یہ محبّت ہے۔

جو آدمی عطا کرنے والے سے عطا کو دیکھتا ہے وہ اسے بجان و دل قبول کرتا ہے اور تکلّف و مشقّت سے محفوظ رہتا ہے۔ جو عطیہ سے عطا کرنے والے پر نظر کرتا ہے وہ عطیہ میں الجھ جاتا ہے۔ راہِ رضا پر تکلّف سے گامزن ہوتا ہے اور تکلّف میں تمام رنج و مشقت سے دوچار ہوتا ہے۔ حقیقی معرفت کشف پر منحصر ہوتی ہے۔ کوشش اور تکلّف سے حاصل کی ہوئی معرفت پابند اور محجوب ہوا کرتی ہے۔ ایسی معرفت در اصل ناشناسی، ایسی نعمت عذاب اور ایسی عطا حجاب ہوتی ہے جو انسان دنیا میں رضی برضا کے مقام پر ہی رک جائے وہ بھی خسارے میں ہے کیونکہ اس طرح گویا اس کی زندگی میں جمود آیا جو اپنے ہی دل کی آگ میں جلنے کے مترادف ہے۔ کیونکہ عالم اسباب قطعاً اس قابل نہیں کہ کوئی ولی اللہ اس پر التفات کرے یا اس کا کوئی تصور اپنے دل میں آنے دے۔ مسرّت صرف وہی مسرّت ہے جو مسرت کرنے والے کی طرف رہنمائی کرے۔ ورنہ مصیبت تنے تکلیف میں راضی برضا ہونے والا ہر چیز کے خالق پر نظر رکھتا ہے اور اسی کے نام پر برداشت کرتا ہے بلکہ وہ تکلیف کو اپنے محبوبِ حقیقی کے تصوّر میں تکلیف ہی نہیں سمجھتا۔

ص ۱۸۵/۲۴۵

برگزیدہ ہو کر راضی ہونے والا محبّ ذاتِ حق ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کی اپنی ذات رضا و بلا میں یکساں طور پر بے حقیقت ہوتی ہے۔ ان کے دل صفائے حق سے لبریز اور محبتِ حق سے معمور ہوتے ہیں۔ حاضر نظر آتے ہیں مگر در اصل غائب ہوتے ہیں۔ زمین کے ساکن مگر عرش آشیاں۔ پیکرِ خاک مگر روحانی سرشت۔ موّاحد ربّانی۔ خلق سے رو گرداں۔ مقامات و احوال کے بندھنوں سے آزاد۔ موجودات سے دل برداشتہ، دوستیٔ حق پہ کمر بستہ، لطفِ دوست کے منتظر، باری تعالیٰ نے فرمایا: "لَا یَمْلِکُوْنَ لِاَنْفُسِہِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا یَمْلِکُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَیٰوۃً وَّلَا نُشُوْرًا" وہ اپنی جانوں کے لیے نفع و ضرر کی طاقت نہیں رکھتے اور نہ زندگی، موت اور حشر پر قدرت رکھتے ہیں"

غیرِ حق پر راضی ہونا موجبِ زیاں اور راضی برضائے حق ہونا خوشنودیٔ حق کا باعث ہے۔ اس کی رضا

بادشاہی ہے اور عافیت کی ابتدا۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص ذاتِ حق اور اس کے حکم سے راضی نہیں ہوتا
وہ اسبابِ دنیا اور نصیب کا طالب ہے اور اس کا جسم شکارِ آفات و مصائب ہے۔"

فصل

حکایت ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: دُلّنی علی عمل اذا عملتُ رضیت عنّی فقال اللہ تعالیٰ
انک لا تطیق ذلک یا موسیٰ فخرّ موسیٰ علیہ السلام ساجداً متضرّعاً فاوحی اللہ الیہ یا ابن عمران
انّ رضائی فی رضاک بقضائی "یا باری تعالیٰ وہ کام بتا جسے میں سرانجام دوں اور تیری رضا حاصل کرسکوں۔ حکم
ہوا اے موسیٰ علیہ السلام یہ تیرے دائرۂ امکان سے باہر ہے۔ موسیٰ علیہ السلام سجدہ میں گر گئے۔ تضرع کیا۔ وحی
کا نزول ہوا اے ابن عمران! میری رضا اس میں ہے کہ تو میرے حکم پر سرِ تسلیم خم کرے۔" مطلب یہ کہ جب آدمی راضی برضائے
حق ہو جاتا ہے تو گویا ذاتِ حق اس سے راضی ہو جاتی ہے۔

ص ۱۸۶/۲۴۶

بشر حافیؒ نے فضیل بن عیاضؒ سے پوچھا۔ زہد اور رضا میں فضیلت کس چیز کو حاصل ہے۔ فضیلؒ نے کہا: الرّضا
افضل من الزھد لانّ الراضی لا یتمنّی فوق منزلتہ "رضا کو زہد پر فضیلت ہے کیونکہ صاحبِ رضا کے دل میں
کوئی تمنّا نہیں رہتی"۔ زاہد آرزومند ہوتا ہے یعنی درجۂ زہد سے اوپر اور درجہ ہے اور زاہد کو اس کی تمنّا ہوتی ہے۔ رضا
کے اوپر کوئی اور درجہ نہیں جس کی صاحبِ رضا کو تمنّا ہو۔ بارگاہ بہرصورت آستانۂ بارگاہ سے فاضل تر ہوتی ہے۔

اس حکایت سے محاسبی مکتبۂ خیال کی تائید ہوتی ہے کہ رضا صیغۂ احوال میں شامل ہے اور انعامِ حق ہے تکلّف سے
حاصل کیے ہوئے مقامات میں شامل نہیں۔ اور نیز یہ بھی احتمال ہوتا ہے کہ صاحبِ رضا متمنّی ہو سکتا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ
علیہ وسلم اپنی دعاؤں میں فرماتے: اسئلک الرضاء بعد القضاء "باری تعالیٰ میں قضا سے بعد رضا مانگتا ہوں"۔
یعنی مجھے ایسے حال میں رکھ کہ جب تیرا حکم نازل ہو تو مجھے راضی برضا پائے۔ اس سے ثابت ہوا کہ رضا کا سوال قضا
کے بعد پیدا ہوتا ہے کیونکہ اگر رضا مقدم ہو تو یہ صرف رضا کا ارادہ ہو سکتا ہے اور محض ارادہ رضا نہیں کہلا سکتا۔

ص ۱۸۷/۲۴۷

ابو العباس بن عطاؒ فرماتے ہیں: الرضا نظر القلب الی قدیم اختیار اللہ للعبد "رضا خدا کے قدیم کے
اختیارِ کلّی کو بدل و جان تسلیم کرنے کا نام ہے"۔ یعنی جو کچھ بھی رونما ہو انسان یہ سمجھے کہ عین قدیم ارادۂ خداوندی اور
سابق حکمِ حق کے مطابق ہے۔ شادان ہو اور اضطراب سے بچے۔ حارث محاسبی نے جو اس مکتبۂ فکر کا موجد ہے فرمایا

الرضا سکون القلب تحت مجاری الاحکام "رضا احکامِ جاریہ پر تسکین قلب کا نام ہے۔" یہ قول ثقہ ہے کیونکہ دل کا سکون وطمانیت انسان کوشش سے حاصل نہیں کرتا بلکہ محض انعامِ خداوندی ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ رضا احوال ہے مقام نہیں اکثر عتبۃ الغلام کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ وہ ایک رات سویا نہیں اور تا بہ سحر پکارتا رہا۔ "ان تعذبنی فانا لک محب وان ترحمنی فانا لک محب" "مجھے عذاب میں مبتلا کر یا رحمت سے نوازیں ہر حال میں تجھے محبت کرتا ہوں۔" یعنی عذاب کی تکلیف اور نعمت کی لذت بدن کو حاصل ہوتی ہے۔ محبت کا معاملہ دل سے ہے۔ یہ چیز بھی محاسبی کے مکتبہ کی تائید کرتی ہے کیونکہ رضا محبت کا نتیجہ ہے۔ محبوب جو کچھ کرے محب اس پر راضی ہوتا ہے۔ عذاب یا نعمت حجابِ دوستی نہیں ہو سکتے صرف اختیارِ حق کے مقابل اپنا اختیار بے کار سمجھنا چاہیے۔

ابو عثمان حیری فرماتے ہیں: منذ اربعین سنۃ ما اقامنی اللہ فی حال فکرھتہ وما نقلنی الی غیرہ فسخطتہ "چالیس برس گذر گئے باری تعالیٰ نے مجھے جس حال میں رکھا میں نے اسے مکروہ نہیں سمجھا مجھے کوئی تغیرِ حال صرف اس بنا پر پیش نہیں آیا کہ میں کسی حال سے دل برداشتہ ہو چکا تھا۔" یہ دوامِ رضا اور کمالِ محبت کی طرف اشارہ ہے۔ ص ۱۸۸/۲۴۸

کہتے ہیں ایک درویش دریائے دجلہ میں گر گیا۔ تیرنا نہیں جانتا تھا۔ کنارے پر سے کسی نے پکار کر پوچھا۔ "کیا کسی کو مدد کے لیے پکاروں"۔ درویش نے کہا "نہیں" پکارنے والے نے پھر پوچھا "کیا ڈوبنا چاہتے ہو؟"

درویش نے پھر کہا "نہیں"

"تو کیا چاہتے ہو"

"وہی جو خدا چاہتا ہے۔ میرے چاہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"

مشائخ نے رضا پر بہت کچھ کہا ہے اختلافِ عبارات کے ساتھ۔ مگر اصولاً یہی دو چیزیں ہیں جو بیان کر دی گئیں۔ مگر اب ضروری ہے کہ احوال و مقام کا فرق بیان کیا جائے اور ان کی حدود قائم کر دی جائیں تاکہ تجھے اور دیگر پڑھنے والوں کو اس حقیقت کو سمجھنا آسان تر ہو جائے انشاء اللہ عزوجل۔

حال اور مقام کا فرق

حال اور مقام کے الفاظ اہلِ تصوف عموماً استعمال کرتے ہیں اور ان کی عبارات میں اکثر سامنے آتے ہیں۔ اہلِ تحقیق تفسیر علوم میں بیشتر ان الفاظ کا سہارا لیتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ طالبانِ علمِ تصوف کے لیے ان کا صحیح مفہوم جان لینا ضروری

ہے۔ اگرچہ یہ باب اس تفصیلِ حدود کا مناسب مقام نہیں تاہم یہ تشریح ضروری ہے۔ سب توفیق ہمت اور پاکیزگی اللہ کی طرف ہے۔

معلوم ہونا چاہیئے کہ لفظ مُقام بہ رفع میم اقامت کو کہتے ہیں۔ اور مَقام فتح میم کے ساتھ جائے اقامت کو۔ یہ تفصیل اور معنی لفظِ مقام کے بارے میں غلط ہے۔ کیونکہ عربی قواعد کے مطابق مُقام بضمِ میم اقامت اور جائے اقامت کو کہتے ہیں اور مَقام بفتح میم قیام اور جائے قیام کو کہتے ہیں۔ مقام سے مراد راہِ حق میں کھڑا ہونا ہے اور اس مقام سے متعلقہ تمام فرائض کو پورا کرنا ہے یہاں تک کہ انسان کو تا بہ امکان یقین ہو جائے کہ اسے درجۂ کمال حاصل ہو چکا ہے۔ یہ روا نہیں کہ کوئی بغیر تکمیل کسی مقام سے گزر جائے۔ پہلا مقام توبہ کا ہے دوسرا انابت کا تیسرا زہد کا اور پھر توکل کا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ بغیر توبہ کے کوئی انابت کا مدعی ہو۔ بغیر انابت کے زہد کا اور بغیر زہد کے توکل کا۔ باری تعالیٰ نے بذریعہ جبرائیل علیہ السلام خبر دی: وَمَا مِنَّا اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ "ایسا کوئی نہیں جس کے لیے مقامِ مقرر نہ ہو۔

ص ۱۸۹/۲۴۹

"حال" وہ کیفیت ہے جو حق عزّ و جلّ کی طرف سے کسی دل پر وارد ہو۔ یہ انسانی طاقت سے باہر ہے کہ اس کیفیت کے ورود کو روک سکے یا کوشش سے حاصل کر سکے۔ مطلب یہ ہے کہ مقام سے مراد طالب کی راہ نوردی جد و جہد اور حسبِ استطاعت بارگاہِ حق میں اس کے درجہ کا نام ہے۔ اس کے برعکس حال وُہ لطف و کرم خداوندی ہے جو بغیر مجاہدہ قلبِ انسانی کو ارزاں ہوتا ہے۔ مقام عمل اور کسب ہے اور حال فضل و عطائے خداوندی ہے۔ صاحبِ مقام اپنے مجاہدہ سے برقرار ہوتا ہے۔ صاحبِ حال اپنی ذات سے بے خبر اس حال میں سرشار ہوتا ہے جو اسے بارگاہِ حق سے عطا ہو۔ یہاں پر مشائخ کرام میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ حال کے دوام کا قائل ہے دوسرا گروہ اس چیز کو تسلیم نہیں کرتا۔ حارث محاسبیؒ کے خیال میں حال دائمی چیز ہے اس کا استدلال ہے کہ محبت، شوق، انقباض اور انبساط سب حال کے تحت آتے ہیں اور اگر حال کو دوام نہ ہو محبت محب اور مشتاق مشتاق نہیں ہو سکتا۔ جب تک حال انسان کی صفت نہ ہو حال کے لفظ کا اطلاق اس پر ناروا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ حال کو منجملہ احوال تصوّر کرتے ہیں۔ اس خیال کو ابو عثمانؒ کے اس قول میں ظاہر کیا گیا ہے: منذ اربعین سنة ما اقامنی اللہ علی حال فکرھتہ "گذشتہ چالیس برس میں باری تعالیٰ نے

مجھے کسی ایسے حال میں نہ رکھا جس سے میں دل برداشتہ تھا۔"

دیگر مشائخ دوامِ حال کے منکر ہیں۔ جنید رحؒ نے فرمایا "احوال کی حیثیت چشمکِ برق سے زیادہ نہیں۔ ان کے دوام کا تصور نفس کی تخلیق ہے۔" اسی طرح اوروں نے کہا: الاحوال کاسمھا یعنی انھا کما تحلّ بالقلب احوال کی حیثیت ان کے نام سے زیادہ نہیں یعنی دل پر ان کا ورود ہوتا ہے۔ اور وہ ختم ہو جاتے ہیں۔ جو کچھ باقی رہتا ہے وہ صفت ہے صفت کے لیے موصوف کی ضرورت ہوتی ہے اور موصوف کو صفت سے زیادہ صاحبِ وقار ہونا چاہیے۔ اس طرح سوچا جائے تو حال کا دوام بے معنیٰ نظر آتا ہے۔ حال و مقام کا فرق بیان کر رہا ہوں تاکہ جہاں کہیں بھی عباراتِ صوفیہ میں یا اس کتاب میں یہ الفاظ استعمال ہوں ان کے معانی پیشِ نظر رہیں۔ ص ۱۹۰/۲۵۰

المختصر رضا مقامات کی انتہا اور احوال کی ابتدا ہے۔ ایک ایسی جگہ ہے جس کی ایک طرف کسب و مجاہدہ کا سہارا لیے ہوئے ہے اور دوسری طرف محبت و تواجد کا۔ اس کے بعد کوئی مقام نہیں۔ یہاں پہنچ کر مجاہدہ ختم ہو جاتا ہے یعنی آغاز کسب و مجاہدہ سے ہے اور انجام انعامات خداوندی پر۔ اسے مقام کہو یا حال کوئی فرق نہیں پڑتا۔

یہ محاسبی مکتبۂ خیال ہے۔ عملاً اسد المحاسبی رحؒ کوئی تخصیص نہیں فرماتے تھے۔ اپنے پیروکاروں کو یہ تنبیہ ضرور فرماتے تھے کہ عملاً یا قولاً کسی ایسی بات کے مرتکب نہ ہوں جو درست تو ہو مگر اس پر برائی کا شبہ کیا جا سکے۔ مثلاً آپ کے پاس ایک بہت بڑا مرغ تھا جو بانگ دیا کرتا تھا۔ ایک روز ابو حمزہ بغدادیؒ جو آپ کا فرماں بردار اور صاحبِ دل مرید تھا، آپ کے پاس آیا۔ مرغ نے بانگ دی۔ ابو حمزہؒ نے نعرہ بلند کیا۔ حارثؒ کھڑے ہو گئے اور فرمایا "تو کافر ہو گیا"۔ یہ کہہ کر چھری سے اس کو ہلاک کرنے کو بڑھے۔ باقی مرید پاؤں پڑ گئے اور ابو حمزہؒ کو بچا لیا۔ حارثؒ نے کہا "مردود! مسلمان ہو۔" لوگوں نے کہا حضرت یہ تو ولی اللہ اور پکا موحد ہے آپ اس پر کیوں ناراض ہو رہے ہیں۔ فرمایا میں ناراض نہیں ہو رہا۔ یہ صاحبِ مشاہدہ ہے اور اس کا باطن مستغرق توحید ہے۔ مگر اس سے کوئی ایسی چیز سرزد نہیں ہونی چاہیئے جو حلولیوں سے مشابہ ہو مرغ جو بے عقل جانور ہے اپنی عادت کے مطابق بانگ دیتا ہے یہ کیوں سمجھے کہ اس میں آوازِ حق ہے۔ خدا کی تقسیم نہیں ہو سکتی اور اس کی ذاتِ قدیم کسی چیز میں حلول نہیں کرتی۔ ابو حمزہؒ نے شیخ کا مطلب سمجھ کر کہا۔ "گو میں نظریاتی طور پر صحیح ہوں مگر چونکہ میرا فعل مرتدین سے ملتا ہے میں توبہ کرتا ہوں۔" ص ۱۹۱/۲۵۱

اسی طریق پر اور بہت سی باتیں ہیں مگر میں اختصار سے کام لے رہا ہوں۔ اور یہی راہِ سلامتی پر قابلِ تعریف اور ہوش و

خرد کے لیے بے ضرر ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من کان منکم یؤمن باللہ والیوم الآخر فلا یقفن مواقف التہم "جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور روزِ قیامت کو مانتا ہے اس کو چاہیئے کہ ہر اس مقام سے دور رہے جہاں تہمت لگ سکے"۔ میں علی بن عثمان عفی اللہ عنہ ہمیشہ بارگاہِ حق سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے اس چیز کی توفیق عطا فرمائے مگر فی زمانہ ظاہر دار لوگوں کی صحبت میں بڑی مشکل کا سامنا ہے۔ اگر سیہ کاری اور فریب میں ان کی موافقت نہ کی جائے تو وہ عداوت پر کمر باندھ لیتے ہیں۔ اللہ جہالت سے پناہ میں رکھے واللہ اعلم۔

۲۔ قصاری

ص ۱۹۲/۲۵۲

قصاری فرقے کے لوگ ابو صالح حمدون بن احمد بن عمارہ القصار کا اتباع کرتے ہیں۔ یہ بزرگ اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم اور طریقت کے سردار تھے۔ "ملامت" کے اظہار و تشہیر پر اعتقاد رکھتے تھے۔ معاملات کے پہلوؤں پر عالی کلام تھے۔ ان کا قول ہے۔ "تجھے خدا خلقت سے بہتر جاننے والا ہے۔" یعنی عالمِ خلوت میں تیرا معاملہ باری تعالےٰ کے ساتھ اس معاملہ سے بہتر ہونا چاہیئے جو سرِ عام خلقت سے روا رکھتا ہے۔ کیونکہ خلقت کے ساتھ تیرا تعلق تیرے اور تیرے خدا کے درمیان حجابِ اعظم ہے۔ ابتدائے کتاب میں بابِ ملامت کے تحت میں ان کے متعلق کچھ احوال و حکایات معرضِ بیان میں لا چکا ہوں مگر اختصار کے ساتھ تاکہ کتاب طویل نہ ہو جائے۔ ایک نادر حکایت یہ ہے کہ انہوں نے کہا۔ میں ایک روز نواحِ نیشاپور میں دریائے حیرہ کے کنارے جا رہا تھا۔ نوح عیار جو نیشاپور کے تمام عیاروں کا سردار تھا سخاوت اور جوانمردی میں مشہور تھا مجھے ملا۔ میں نے پوچھا "اے نوح! جوانمردی کیا چیز ہے؟" نوح نے کہا "میری جوانمردی یا تمہاری؟" کہا "دونوں"۔ نوح نے جواب دیا "میری جوانمردی یہ ہے کہ میں قبا چھوڑ کر خرقہ اختیار کرتا ہوں اور وہ کام کرتا ہوں جو خرقہ کو زیبا ہیں تاکہ میں صوفی بن جاؤں اور باری تعالیٰ سے متصل ہو کر سیہ کاری سے پرہیز کروں تم خرقہ سے پرہیز کرو تاکہ خلقت تمہیں اور تم خلقت کو فریب نہ دے سکو۔ الغرض میری جوانمردی ظاہری حفظِ شریعت ہے اور تمہاری باطنی حفظِ طریقت۔" یہ بات اصولاً نہایت ثقہ ہے۔

۳۔ طیفوریہ

یہ لوگ ابو یزید طیفور بن عیسےٰ بن سروشان البسطامی کے پیروکار ہیں۔ وہ رئیس اور بزرگ اہلِ طریقت میں سے تھے۔ ان کا طریق غلبہ اور مستی تھا۔ حق تعالیٰ کا غلبۂ شوق اور اس کی دوستی میں از خود رفتگی انسانی دائرۂ امکان سے

ص ۱۹۲/۲۵۳

باہر ہے۔ کسی غیر ممکن چیز کا دعویٰ ہمیشہ باطل ہوتا ہے اور اس کی تقلید محال ہوتی ہے۔ صاحب ہوش کے لیے مستی صفت نہیں اور انسان مستی کو جذب کرنے پر قادر نہیں۔ مست بجائے خود از خود رفتہ ہوتا ہے اور خلقت سے بے نیاز۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ کوشش کر کے کوئی صفت پیدا کر سکے۔ مشائخ کبار کا اس بات پر اتفاق ہے کہ صرف وہی آدمی قابلِ اتباع ہوتا ہے جو مستقیم ہو اور جملہ احوال سے آزاد ہو چکا ہو۔ تاہم بعض کا خیال ہے کہ "مستی و وارفتگی" کی راہ بھی کوشش سے طے ہو سکتی ہے۔ کیونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابکوا فان لم تبکوا فتباکوا۔ "روؤ۔ اگر نہیں رو سکتے تو رونے والوں کی سی صورت بناؤ"۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ از راہِ ریاکاری کسی کی نقل کرنا شرکِ صریح ہے۔ مگر جب نقل کا مقصد یہ ہو کہ شاید باری تعالیٰ از راہِ کرم ان کی طرح ہی بنا دے جن کی نقل کی جا رہی ہے تو یہ عین اس حدیثِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مطابق ہے من تشبہ بقوم فھو منھم "جو شخص کسی قوم کی شکل اختیار کرے وہ اسی قوم سے ہے"۔ بشرطیکہ جس مجاہدہ کی ضرورت پیش آئے اس سے عہدہ برآ ہو اور بارگاہِ حق سے امید رکھے کہ حق تعالیٰ اس کے لیے تحقیق و معانی کے دروازے کھول دے گا۔ کسی شیخ طریقت کا قول ہے۔ "مجاہدات مشاہدات کا ذریعہ بنتے ہیں"۔ میں یہ کہتا ہوں کہ مجاہدات بہر صورت قابلِ تحسین ہیں مگر غلبہ و مستی کسب کے تحت نہیں آتے اور مجاہدات سے صورت پذیر نہیں ہوتے۔ مجاہدات کسی حالت میں بھی غلبہ و مستی کا سبب نہیں بن سکتے۔

اب میں سکر و صحو (مستی و ہوشیاری) پر مشائخ کبار کے مختلف خیالات تحریر کرتا ہوں تاکہ ان کی صحیح کیفیت سامنے آ جائے اور ابہام دور ہو جائے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ص ۱۹۳/۲۵۴

سکر و صحو

اربابِ معانی "سکر" کا لفظ "غلبہ محبتِ حق تعالیٰ" کے لیے استعمال کرتے ہیں اور "صحو" "حصولِ مراد" کے لیے (سُکر = نشہ بے ہوشی اور صحو = ہوش)، اس معاملہ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ کچھ لوگ سُکر کو صحو سے افضل سمجھتے ہیں اور کچھ صحو کو سُکر سے۔ ابویزید اور اس کے پیروکار سُکر کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں صحو کی بنیاد آدمیت کی صفت کے استحکام و استقامت پر ہوتی ہے اور آدمیت کی صفت حجابِ اعظم ہے۔ اس کے برعکس سُکر صفاتِ بشریت کے زوال اور نقصان پر مبنی ہوتا ہے۔ انسانی تدبّر، اختیار، تصرف اور خودی کی فنا ہو تو سُکر ظہور پذیر ہوتا ہے اور صرف وہ قوتیں روبکار رہ جاتی ہیں جو بشریت سے بالاتر ہوں۔ یہی قوتیں کامل و بالغ ترین ہوتی ہیں۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام حالت

صحو میں تھے جو فعل ان سے ظہور پذیر ہوا باری تعالیٰ نے اسے ان کی ذات سے منسوب کر دیا اور فرمایا: قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ "داؤد علیہ السلام نے جالوت کو قتل کر دیا" ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم عالمِ سُکر میں تھے جو چیز ان سے ظہور پذیر ہوئی۔ باری تعالیٰ نے اسے اپنی طرف منسوب کیا اور فرمایا: وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى "کنکریاں، جب پھینکیں، تو نے نہیں پھینکیں بلکہ اللہ نے پھینکیں" بندے بندے میں کتنا فرق ہے۔ جو اپنی ذات میں قائم اور اپنی صفات میں ثابت تھا بوجہ کرامت اس کا فعل اسی سے منسوب کیا۔ جو ذاتِ حق سے قائم اور اپنی صفات میں فانی تھا۔ اس کا فعل اپنا فعل گردانا۔ انسانی فعل کا ذاتِ حق سے منسوب ہونا اس سے بہتر ہے کہ فعل حق تعالیٰ بندے سے منسوب ہو۔ جب فعلِ حق بندے سے منسوب ہو تو بندہ صفاتِ بشریت میں قائم ہوتا ہے اور جب بندے کا فعل حق سے منسوب ہو تو بندہ ذاتِ حق سے قائم ہوتا ہے۔ صفاتِ بشریت میں قائم ہونے سے یہی ہوا کہ داؤد علیہ السلام کی نظر خلافِ دستور اوریا کی عورت پر پڑی اور دیکھا جو دیکھا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر بھی اسی طرح پڑی اور وہ عورت زید پر حرام ہو گئی کیونکہ آپ سُکر کے عالم میں تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام حالتِ صحو میں تھے۔

ص ۱۹۴/۲۵۵

صحو کو سکر پر فضیلت دینے والے جنیدؒ اور ان کے پیروکار ہیں۔ ان کے نزدیک سُکر محل آفت ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب پریشان حالی، فنائے صحت اور از خود رفتگی ہے۔ طالب کی طلب از روئے فنا ہوتی ہے یا از روئے بقا۔ از روئے محویت ہوتی ہے یا از روئے ثبات۔ جب انسان صحیح الحال نہ ہو تو تحقیق و طلب بے کار ہے۔ اہل حق کا دل تمام موجودات سے مجرد ہونا چاہیئے۔ آنکھیں بند کر لینے سے عالمِ اشیا کے بندھنوں سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ جو لوگ عالمِ اشیاء کی دلفریبیوں میں الجھ جاتے ہیں وہ دراصل کسی چیز کو اس کے اصلی رنگ میں نہیں دیکھتے۔ اگر دیکھتے تو الجھنے سے محفوظ رہتے۔ دیکھنے کی دو صورتیں ہیں۔ دیکھنے والا یا بقا کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے یا فنا کے۔ بقا کی نظر ہو تو کائنات کی ہر چیز اپنی بقا کے مقابل نامکمل دکھائی دیتی ہے۔ کیونکہ کوئی شے بذاتِ خود باقی نہیں۔ فنا کی نظر ہو تو حق تعالیٰ کے سوا ہر چیز فانی نظر آتی ہے۔ بہر صورت وہ کائنات سے روگرداں ہو جاتا ہے۔ اس لیے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم نے دعا میں فرمایا: اللھم ارنا الاشیاء کما ھی "اے خدا ہمیں ہر چیز اس کے اصلی روپ میں دکھا" یہ معنیٰ ہیں باری تعالیٰ کے اس فرمان کے: فَاعْتَبِرُوْا يٰۤاُولِي الْاَبْصَارِ "اے آنکھ والو عبرت حاصل کرو" یہ تمام بجز صحو سر انجام نہیں پا سکتا۔ اہل سُکر اس سے قطعاً محروم ہیں موسیٰ علیہ السلام حالتِ سکر میں تھے ایک تجلی کی تاب نہ لا سکے بے ہوش ہو گئے۔ ہمارے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

ص ۱۹۵/۲۵۶

حالتِ صحو میں تھے مکہ سے قاب قوسین تک تجلیوں کی زد میں ہوشیار و بیدار رہے (شعر) میں نے ساغر پر ساغر پیا۔
نہ شراب کم ہوئی نہ میں سیراب ہوا۔

میرے پیرِ طریقت نے جو جنیدی مکتبہ سے تعلق رکھتے تھے۔ فرمایا سکر بازیچۂ طفلاں ہے اور صحو رزم گاہِ مرداں۔
میں بھی ان کی موافقت میں یہی کہتا ہوں کہ صاحبِ سکر کے حال کا کمال صحو ہے۔ صحو کا سب سے نچلا درجہ انسان کی بے چارگی
کا ادراک ہے۔ اس لیے وہ صحو جو بظاہر آفت معلوم ہو اس سکر سے بہتر ہے جو سر بسر آفت ہو۔ ابو عثمان مغربیؒ سے متعلق
مشہور ہے کہ ابتدا میں وہ بیس برس تک بیابانوں میں تنہا رہے جہاں انہوں نے انسانی آواز تک بھی نہ سنی یہاں تک کہ
ان کا جسم گھل گیا۔ اور آنکھیں سکڑ کر ٹاٹ سینے والے سوئے کے ناکے کے برابر رہ گئیں۔ انسانی شکل و شباہت تک ختم
ہو گئی۔ بیس برس کے بعد انسانی مجالست کا حکم ہوا۔ دل میں سوچا کہ ابتدا اہلِ حق اور مجاورانِ خانۂ خدا سے کرنا چاہیے۔
چنانچہ مکہ کا قصد کیا۔ مشائخ کو روحانی طور پر ان کے آنے کی خبر ہو گئی۔ استقبال کے لیے آئے۔ دیکھا تو صورت بالکل
ص ۱۹۶/۲۵۰
بدل چکی تھی اور پیدائشی قویٰ میں صرف بال برابر سکت باقی تھی۔ مشائخ نے پوچھا آپ نے بیس برس اس طرح بسر کیے ہیں
کہ آدم اور اس کی اولاد معرضِ حیرت میں ہے۔ فرمائیے آپ کیوں گئے تھے؟ کیا دیکھا؟ کیا حاصل کیا؟ اور اب کیوں واپس
آگئے؟ آپ نے فرمایا "حالتِ سکر میں نکل گیا تھا۔ آفتِ سکر دیکھی، ناامیدی حاصل ہوئی اور عاجز ہو کر واپس آنا پڑا۔" مشائخ
نے کہا "مرحبا! آپ کے بعد تفرقۂ سکر و صحو پر گفتگو کرنا حرام ہے۔ آپ نے معاملہ صاف کر دیا اور آفتِ سکر کو
نمایاں فرما دیا۔"

"سکر" دراصل اپنی ذات کی فنا کا غلط احساس ہوتا ہے۔ حالانکہ صفاتِ بشریت موجود ہوتی ہیں۔ یہ ایک حجاب ہے
اس کے برعکس صحو دیدارِ بقا ہوتا ہے جہاں صفاتِ بشریت ختم ہو چکتی ہیں۔ یہ سراسر غلط ہے کہ سکر فنا کے قریب تر ہے
کیونکہ سکر صحو کی صفت پر ایک زائد صفت ہے اور جب تک انسانی صفات رو بہ ترقی ہیں انسان ان سے بے خبر ہوتا ہے۔
مگر جب انسان صفاتِ بشریت سے دست بردار ہو رہا ہو تو اہلِ حق اس کے احوال کو امید افزا سمجھتے ہیں۔ صحو و سکر
کی غرض و غایت بھی یہی ہے۔

ابو یزیدؒ کی نسبت مشہور ہے کہ انہوں نے حالتِ غلبہ میں یحییٰ بن معاذؒ کو خط لکھا اور پوچھا "آپ کا کیا خیال ہے
اس شخص کے بارے میں جو دریائے محبت کا ایک قطرہ پی کر سرشار ہو جائے"۔ بایزیدؒ نے جواباً پوچھا "آپ کیا

فرماتے ہیں اس شخص کے بارے میں جس کے لیے تمام جہان شرابِ محبت ہو جائے اور وہ سب پی کر بھی تشنہ لب محسوس کرے۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ یحییٰ کا مطلب سکر سے تھا اور ابو یزید کا صحو سے۔ مگر یہ غلط ہے صاحبِ صحو اسے سمجھا جاتا ہے جو ایک قطرہ بھی نہ پی سکے۔ اور صاحبِ سکر وہ کہلاتا ہے جو سب پی کر بھی تشنہ لب ہو۔ شراب مستی کا آلہ کار ہے اور ہوشیاری کی دشمن۔ سکر کو اس چیز کی ضرورت ہے جو اس کی ہم پایہ ہو یعنی شراب اور صحو یعنی ہوش کو شراب (مستی) سے کوئی تعلق نہیں۔

سکر کی دو قسمیں کی جا سکتی ہیں (۱) سکر از راہِ مودت اور (۲) سکر از راہِ محبت۔ پہلی قسم کا سکر نعمت کے پیشِ نظر ظہور پذیر ہوتا ہے۔ دوسری قسم کے سکر کے لیے علت کی ضرورت نہیں۔ وہ منعم کے التفات سے پیدا ہوتا ہے۔ نعمت پر نظر رکھنے والا ذاتی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے مگر منعم کو سامنے رکھنے والا منعم میں محو ہوتا ہے اور اپنی ذات کو نظر انداز کر دیتا ہے گویا وہ صاحبِ سکر ہو کر بھی صاحبِ صحو ہوتا ہے۔

ص ۱۹۷/۲۵۸

صحو کی بھی دو قسمیں کی جا سکتی ہیں (۱) صحو از روئے غفلت اور (۲) صحو از روئے محبت۔ پہلی قسم تو حجابِ اعظم ہے مگر دوسری عین مشاہدہ۔ صحو از روئے غفلت محض سکر ہوتا ہے اور جو صحو محبت سے حاصل ہو وہ سکر سے کم نہیں ہوتا اور چونکہ اصلیت مستحکم ہوتی ہے اس لیے صحو و سکر میں فرق نہیں رہتا۔ اگر اصلیت غیر مستحکم ہو تو دونوں بے کار ہیں۔ الغرض سالکانِ طریقت کی راہ میں سکر و صحو اختلافات کی وجہ سے ہیں۔ جب سلطانِ حقیقت جلوہ فرما ہوتا ہے تو دونوں چیزیں طفیلی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ دونوں کی حدود ملتی ہیں۔ ایک کی انتہا دوسرے کی ابتدا ہے۔ ابتدا اور انتہا فرق باہمی ظاہر کرتی ہیں اور فرق صرف نسبتِ باہمی کا نام ہے۔ وصل ہر تفرقہ کی نفی کرتا ہے بقولِ شاعر:

جب آفتابِ ساغر طلوع ہوتا ہے تو مست و ہوشیار میں کوئی فرق نہیں رہتا

سرخس میں دو پیرانِ طریقت تھے۔ لقمان اور ابو الفضل حسن رضی اللہ عنہم۔ ایک روز لقمانؓ ابو الفضلؓ کے پاس آئے اور دیکھا کہ وہ ایک مسودہ سامنے رکھے پڑھ رہے ہیں۔ پوچھا "ابو الفضل! اس کاغذ میں کیا ڈھونڈھ رہے ہو" انہوں نے جواب دیا "وہی جو تم بغیر کاغذ تلاش کر رہے ہو"۔ لقمان نے کہا "تو پھر یہ تفرقہ کیوں؟" فرمایا "تفرقہ نہیں اپنے سوال کی وجہ سے نظر آتا ہے۔ سکر سے نکل کر صحو میں آؤ اور پھر صحو سے دست بردار ہو جاؤ تاکہ تفرقہ مفقود ہو جائے۔ اور یہ معلوم ہو جائے کہ میں اور تم کیا تلاش کر رہے ہیں"۔

ص ۱۹۸/۲۵۹

بہ طیفوریہ اور جنیدیہ مکاتبِ تصوّف کا فرق تھا جو میں نے بیان کر دیا۔ معاملت میں بایزید ترکِ صحبت اور عزلت گزینی کے قائل تھے۔ اور اپنے مریدوں کو یہی تلقین کرتے تھے۔ اگر میسر آجائے تو یہ طریق نہایت درجہ قابلِ تحسین ہے۔

۴۔ جنیدیہ

اس مکتبۂ تصوّف کے لوگ ابوالقاسم الجنید بن محمدؒ کا اتباع کرتے ہیں۔ جنیدؒ اپنے زمانے میں طاؤس العلماء مشہور تھے۔ اس طائفہ کے سردار تھے اور اماموں کے امام۔ آپ کی تعلیم صحو پر مبنی ہے۔ طیفوریہ مکتبہ کے برعکس جو سُکر کو اپناتے ہیں۔ جنیدی مکتبہ مشہور و مقبول ترین گنا جاتا ہے۔ تمام مشائخ اسی پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ گو بظاہر ان کے اقوال بہت حد تک مختلف ہیں میں نے طولِ کلام کے خوف سے اختصار سے کام لیا ہے۔ اگر قارئین میں سے کسی کو اس سے زیادہ درکار ہو تو کسی اور کتاب سے رجوع کر سکتا ہے۔

حکایات میں ہے کہ جب حسین بن منصور مغلوب الحال ہو کر عمر بن عثمان سے رد گرداں جنید کے پاس آیا۔ جنیدؒ نے پوچھا "کیوں آئے ہو؟" حسین نے کہا "فیضِ صحبت کے لیے" فرمایا "اہلِ جنوں کا ہمارے ہاں کوئی کام نہیں۔ مجالست کے لیے صحت کی ضرورت ہے اور تمہیں صحت حاصل ہوگئی تو وہی کرو گے جو عبداللہ تستری اور عمرو سے کیا"۔

حسین بن منصور نے کہا "یا شیخ! سکر و صحو دو انسانی صفات ہیں اور جب تک یہ فنا نہیں ہوتیں انسان حق تعالیٰ سے محجوب ہے"۔

جنیدؒ نے فرمایا۔ "تم غلط کہہ رہے ہو۔ صحو باری تعالیٰ کے سامنے صحتِ حال کا نام ہے اور سُکر فرطِ شوق اور غائتِ محبّت کو کہتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں انسانی صفات میں شامل ہیں اور کوشش سے حاصل نہیں ہو سکتیں۔ تمہارا کلام فضول اور بے معنی ہے" واللہ اعلم۔ ص ۱۹۹/۲۶۰

۵۔ نوریہ

نوریہ مکتبِ تصوّف کے پیروکار ابوالحسن احمد بن محمد النوری رح کا اتباع کرتے ہیں جو علمائے تصوّف کے مشہور و معروف سردار گذرے ہیں۔ روشن مناقب اور قاطع برہان رکھتے تھے۔ ان کا مکتبۂ تصوف پسندیدہ ہے۔ وہ تصوف کو فقر سے افضل سمجھتے تھے۔ ان کے مکتبہ کی نادر چیز یہ ہے کہ مجالست میں مصاحب کے حق کو برتر سمجھا جائے۔ وہ مجالست

بے ایثار کو حرام قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ مجالست درویشوں پر فرض ہے اور عزلت قابلِ گرفت ہے۔ نیز مجالست میں ایثار فرض کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کا قول ہے "عزلت سے پرہیز کرو کیونکہ یہ ابلیس سے ہم نشینی ہے۔ مجالست کو لازم سمجھو کیونکہ اس میں خدا کی خوشنودی ہے" میں اب حقیقت ایثار کی تشریح کرتا ہوں۔ صحبت و عزلت کے باب میں ان سے متعلقہ رموز بیان کروں گا تاکہ سب مستفید ہو سکیں انشاء اللہ عزّ وجلّ۔

ایثار

باری تعالیٰ نے فرمایا: وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ "وہ اپنی بے سر و سامانی کے باوجود دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں"۔ یہ آیت خاص طور پر صحابہ کرامؓ کے حق میں نازل ہوئی۔

ص ۲۰۰ / ۲۶۱

ایثار کے حقیقی معنیٰ یہ ہیں کہ مصاحب کے حق کو تسلیم کیا جائے۔ اپنے مطلب کو دوست کے مطلب سے فروتر رکھا جائے اور اس کی خوشی کے لیے خود تکلیف برداشت کی جائے۔ ایثار دوسروں کی مدد کرنے کا نام ہے۔ اور اس حکم پر عمل کرنا ہے جو باری تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا: خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ "عفو سے کام لیں۔ امر معروف کا حکم دیں اور اہلِ جہالت سے دور رہیں"۔

ایثار کی دو صورتیں ہیں (۱) ایثارِ مصاحبت (۲) ایثارِ محبّت۔ مصاحب سے ایثار کوشش اور تکلف چاہتا ہے۔ مگر محبوب سے ایثار سر بسر مسرت ہوتی ہے۔

کہتے ہیں جب غلام الخلیل نے صوفیوں پر سختی کی اور ہر ایک کو اپنے جور و ستم کا نشانہ بنایا تو نوری، رقّام اور بوحمزہ گرفتار ہو کر دربارِ خلافت میں پیش ہوئے۔ غلام الخلیل نے الزام لگایا کہ یہ لوگ اہلِ زندقہ میں شامل ہیں۔ اور ان کے سرغنہ ہیں اگر ان کی گردنیں اڑا دی جائیں تو زندقہ کی بیخ کنی ہو جائے گی۔ جو اس نیک کام کو سرانجام دے میں اس کے لیے اجرِ عظیم کا ضامن ہوں۔ خلیفہ نے فوراً قتل کا حکم صادر کر دیا۔ جلّاد نے سب کے ہاتھ باندھ دیئے اور تلوار لے کر رقّام کی طرف بڑھا۔ نوری فوراً مقتل میں مسکراتے ہوئے رقّام کی جگہ پہنچ گئے۔ لوگ حیران تھے۔ جلّاد نے پوچھا اے جواں مرد! یہ تلوار ایسی چیز نہیں کہ تو مسکراتا ہوا اس کی زد میں آئے حالانکہ تیری باری بھی ابھی نہیں آئی۔ نوری نے جواب دیا "میرا مسلک ایثار ہے۔ دنیا میں عزیز ترین چیز زندگی ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ باقی ماندہ چند سانس ان بھائیوں کے کام آجائیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس دنیوی زندگی کا ایک لمحہ دوسری دنیا کے ہزار سال سے بہتر ہے۔ کیونکہ یہ

ص ۲۰۰ / ۲۶۲

مقامِ خدمت ہے اور وہ دنیا مقامِ قربت اور قربت خدمت سے حاصل ہوتی ہے۔" قاصد نے یہ خبر خلیفہ کو پہنچائی اور وہ نوری کے کلام کی رقت اور نزاکت سے حیرت زدہ ہو گیا۔ اس پر ایسا اثر ہوا کہ اس نے قتل کا حکم منسوخ کر کے معاملہ تحقیق کے لیے قاضی کے سپرد کر دیا۔ قاضی القضاۃ ابو العباس بن علی سب کو اپنے گھر لے گیا۔ شریعت و طریقت سے متعلق ان سے سوالات کیے۔ سب کو ہر پہلو کامل پایا اور اپنی غفلت پر نادم ہوا۔ نوری نے کہا "قاضی صاحب! آپ نے جو کچھ پوچھا وہ گویا نہ پوچھنے کے برابر ہے۔ خدائے عزّ وجلّ جن کو بزرگی عطا فرماتے ہیں وہ خدا کے لیے کھاتے ہیں۔ خدا کے لیے پیتے ہیں۔ اسی کے لیے بیٹھتے ہیں اور اسی کے لیے کلام کرتے ہیں۔ ان کی حرکات ان کی سکنات غرض ان کی ہر چیز اسی کے لیے ہوتی ہے۔ وہ اسی کے مشاہدہ میں رہتے ہیں۔ اگر ایک لمحہ کے لیے وہ مشاہدۂ حق سے محروم ہو جائیں تو بے قرار ہو جاتے ہیں۔" قاضی بہت حیران ہوا اور اس نے خلیفہ کو لکھا کہ اگر یہ لوگ ملحد ہیں تو دنیا میں کوئی موحد نہیں۔ خلیفہ نے سب کو دربار میں طلب کیا اور کہا کسی چیز کی ضرورت ہو تو مانگو۔ سب نے کہا صرف ایک چیز کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ آپ ہمیں فراموش کر دیں۔ نہ اپنے تقرب سے سرفراز کریں نہ راندۂ درگاہ خیال کریں کیونکہ ہمارے نزدیک آپ کا تقرّب اور آپ سے دوری برابر ہیں۔" خلیفہ آبدیدہ ہو گیا۔ اور ان کو عزت و آبرو سے رخصت کر دیا۔

نافع روایت کرتا ہے کہ ابن عمرؓ کو مچھلی کی خواہش ہوئی۔ تمام شہر میں تلاش کی گئی مگر میسر نہ آئی۔ کئی دنوں کے بعد مجھے دستیاب ہوئی۔ میں نے کباب بنوا کر پیش کیے۔ مچھلی کو دیکھ کر ابن عمرؓ بشاش ہو گئے۔ اسی وقت کوئی سائل دروازے پر حاضر ہوا حکم دیا مچھلی سائل کو دے دو۔ غلام نے کہا حضور اتنے روز کے بعد مچھلی دستیاب ہوئی ہے۔ اسے کیوں تقسیم کر رہے ہیں۔ اس کی بجائے سائل کو کوئی اور چیز دے دی جائے گی۔ فرمایا نہیں یہ مجھ پر حرام ہے اور میرے دل سے اتر چکی ہے۔ میں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا: ایّما امرئ یشتھی شھوۃ فردّ شھوتہ وآثر علی نفسہ غفرلہ "جس نے کسی چیز کی آرزو کی اور وہ اس کو مل گئی اور پھر اس نے کسی دوسرے کی خواہش کو اپنی آرزو سے فائق سمجھ کر اس کو دے دی تو وہ یقیناً بخشش کا مستحق ہے۔"

س ۲۰۱/۲۷۳

کہتے ہیں دس درویش ایک بیابان میں سفر کر رہے تھے۔ ان پر پیاس کا غلبہ ہوا۔ صرف ایک پیالہ پانی تھا۔ وہ ایک دوسرے کے لیے ایثار کرتے رہے اور کسی نے پانی نہ پیا حتیٰ کہ ان میں سے نو جان بحق تسلیم ہو گئے۔ دسویں نے جب دیکھا کہ صرف وہی ایک باقی ہے تو اس نے پانی پی لیا اور سلامت واپس آ گیا۔ کسی نے اس سے کہا "بہتر

یہی تھا کہ تو بھی پانی نہ پیتا۔" درویش نے جواب دیا "تم شریعت سے بے خبر ہو اگر میں نہ پیتا تو خودکشی کا مرتکب ہوتا اور عذاب میں گرفتار ہو جاتا۔" اس شخص نے پھر پوچھا "اس کا مطلب یہ ہوا کہ باقی نو درویش خودکشی کے مرتکب ہوئے۔" درویش نے کہا "ہرگز نہیں وہ ایک دوسرے کے لیے ایثار کر رہے تھے۔ جب صرف میں باقی رہ گیا تو بحکم شرع پانی پینا مجھ پر واجب تھا۔"

جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر لیٹ گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ کے ہمراہ مکہ معظمہ سے نکل کر غار میں رونق افروز ہو گئے۔ کفار مکہ نے قتلِ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کا قصد کر رکھا تھا۔ باری تعالیٰ نے جبرائیل اور میکائیل کو فرمایا "تم دونوں میں بھائی چارہ ہے۔ ایک کی عمر دوسرے سے دراز ہے۔ تم میں سے کون دوسرے کو مقدم سمجھ کر پہلے موت کے لیے تیار ہو گا؟ دونوں میں سے کوئی تیار نہ ہوا۔ حق تعالےٰ نے فرمایا۔ "علی کا مقام دیکھو اس کے اور میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان برادری ہے اس نے قتل و مرگ کو قبول کیا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر لیٹ گیا۔ جان قربانی کے لیے پیش کی اور زندگی کا ایثار کیا۔ تم دونوں زمین پر جاؤ اور دشمنوں سے اس کی حفاظت کرو۔" حسب حکم دونوں زمین پر آئے اور حضرت علیؓ کے سرگاہ اور پایگاہ بیٹھ گئے۔ جبرائیلؑ نے کہا: بخ بخ من مثلک یا ابن ابی طالب ان اللہ تعالیٰ یباھی بک علی ملائکتہ "شاباش اے فرزند ابی طالب! تیرے برابر کون ہو سکتا ہے کہ حق تعالیٰ تیری فضیلت اپنے فرشتوں سے بیان کر رہا ہے۔" اور تو میٹھی نیند سو یا ہوا ہے۔ اس وقت یہ آیت ان کی شان میں نازل ہوئی: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ "لوگوں میں وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے اپنی جان فروخت کر دیتا ہے اور اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔"

ص ۲۰۲/۲۶۴

جب غزوۂ احد میں مومنوں کی آزمائش ہو رہی تھی صالحاتِ انصار میں سے ایک عورت نے ارادہ کیا کہ خود میدان کارزار میں جا کر سرفروشوں کو پانی پیش کرے۔ ایک صحابیؓ زخموں سے نڈھال دم توڑ رہے تھے پانی کے لیے اشارہ کیا جب پانی ان کو دیا جا رہا تھا ایک دوسرے زخمی نے کہا یہ پانی مجھے دو۔ پہلے زخمی نے پانی پینے سے انکار کر دیا اور کہا دوسرے کے پاس لے جاؤ۔ جب اس کے پاس گئی تو تیسرے نے آواز دی پانی مجھے دو۔ دوسرے نے بھی پانی نہ پیا اور کہا تیسرے کے پاس لے جاؤ۔ اسی طرح سات مجروحین کو پانی پیش کیا گیا۔ ساتویں نے پانی پینا چاہا تو دم توڑ دیا۔

ص ۲۰۳/۲۶۵

واپس ہوئی تو باقی بھی جاں بحق ہو چکے تھے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ کَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۔ "وہ اپنی بے سروسامانی کے باوجود دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں"۔

بنی اسرائیل میں ایک عابد چار سو برس عبادت کرتا رہا ایک روز اس کی زبان سے نکلا "اے باری تعالیٰ اگر تو یہ پہاڑ نہ بناتا تو تیرے بندوں پر سیر و سیاحت آسان ہو جاتی"۔ پیغمبرِ وقت کو حکم ہوا کہ اس عابد کو کہہ دے کہ خدائی میں تصرّف کرنا اس کا کام نہیں۔ وہ چونکہ خیالِ تصرّف کا مرتکب ہوا ہے ہم نے اس کا نام اہلِ سعادت کی فہرست سے کاٹ کر اہلِ شقاوت کی فہرست میں لکھ دیا۔ عابد کا دل باغ باغ ہو گیا اور اس نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ پیغمبرِ وقت نے کہا شقاوت پر سجدۂ شکر واجب نہیں۔ عابد نے جواب دیا میرا سجدہ شقاوت پر نہیں بلکہ اس چیز کی مسرت پر ہے کہ آخر میرا نام کسی فہرست میں موجود تو ہے۔ پھر کہا میری ایک درخواست ہے۔ پیغمبر نے پوچھا کیا؟ کہا آپ خدا سے استدعا کریں اگر میرے لیے جہنّم ہے تو سارا جہنّم میرے مقدّر میں لکھ دیا جائے تاکہ اور کسی گنہ گار موحد کے لیے جگہ باقی نہ رہے اور میرے سوا سب بہشت میں چلے جائیں"۔ فرمانِ خداوندی آیا "اس بندے سے کہو یہ صرف امتحان تھا۔ اہانت مدّنظر نہ تھی۔ دنیا اور عقبیٰ میں تو جس کی شفاعت کرے گا وہ بہشت میں جائے گا"۔

میں نے احمد بن حمّاد سرخسی سے دریافت کیا "آپ کی توبہ کی ابتدا کیسے ہوئی؟" فرمایا "میں سرخس کے جنگل میں اونٹ چرا تا تھا۔ ایک رات جنگل میں رہا۔ میری ہمیشہ یہ خواہش ہوتی تھی کہ خود بھوکا رہوں اور اپنا حصہ دوسروں کی نذر کروں۔ خدائے عزّ وجل کا یہ فرمان ہر وقت میرے سامنے تھا: وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ کَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ "وہ اپنی بے سروسامانی کے باوجود دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں"۔ اہلِ طریقت سے مجھے ارادت تھی۔ ایک دن ایک بھوکا شیر آیا اور اس نے میرا ایک اونٹ مار ڈالا۔ اس کے بعد وہ ایک بلندی پر چڑھ گیا اور زور سے دھاڑا۔ جنگل کے درندے اس کی آواز سن کر جمع ہو گئے۔ شیر نے نیچے اتر کر اونٹ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ سب درندوں نے پیٹ بھر کر کھایا۔ جب وہ چلے گئے تو شیر نے خود بھی کچھ کھانے کا ارادہ کیا۔ اسی وقت ایک پاشکستہ لومڑی دور سے آتی دکھائی دی۔ شیر پھر بلندی پر چڑھ گیا۔ لومڑی نے بے خوف ہو کر کچھ کھایا اور واپس چلی گئی۔ شیر نے بھی اتر کر کچھ کھایا۔ میں نے سب کچھ دیکھا۔ واپس لوٹتے ہوئے شیر نے فصیح زبان میں کہا اے احمد لقمے کا ایثار کتّوں کا کام ہے۔ مردانِ ہمت جان و زندگانی ایثار کرتے ہیں۔ یہ دلیلِ بیّن دیکھ کر میں نے سب کچھ تیاگ دیا۔ یہ میری توبہ کی

ص ۲۰۴
۲۶۶

ابتدا نہی۔"

ابوجعفر خلدیؒ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز ابوالحسن نوریؒ گوشۂ خلوت میں مناجات کر رہے تھے۔ میرے دل میں آئی کہ کان لگا کر چپکے سے سنوں۔ مناجات میں عجیب فصاحت تھی۔ کہہ رہے تھے "باری تعالیٰ! کیا تو اہل جہنم کو عذاب دے گا؟ حالانکہ سب مخلوق تیری ہے تیرے قدیم علم، قدرت اور ارادے سے معرضِ وجود میں آتی ہے۔ اگر جہنم کو پُر کرنا ہی ہے تو یہ تیری قدرتِ کاملہ سے بعید نہیں کہ صرف میرے ہی وجود سے ساری جہنم اور اس کے طبقات کو پُر کر دے اور سب کو بہشت میں بھیج دے۔" ابوجعفر کہتے ہیں کہ مجھے سخت حیرت ہوئی۔ اسی رات خواب میں ہاتفِ غیب نے مجھے حکم دیا کہ ابوالحسن نوری کو بشارت دوں کہ اسے اس شفقت اور تعظیم کے طفیل بخش دیا گیا جو اس کے دل میں خدا کے بندوں کیلئے موجود ہے۔

ابوالحسن نوری کو نوری اس لیے کہا جاتا ہے کہ جب وہ بات کرتے تھے تو اندھیرے گھر میں نور پھیل جاتا تھا اور اس نورِ حق کے ذریعے مریدوں کے اسرار سے واقف ہو جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جنیدؒ آپ کو "جاسوس القلب" کہا کرتے تھے۔ یہ ہے ان کے مکتبۂ تصوّف کی خصوصیّت۔ اہلِ بصیرت کے نزدیک اس کی بنیاد مضبوط اور معظم ہے۔

ص ۲۰۵/۲۶۷

روحانی قربانی سے اور اپنے مقصودِ محبت سے دست بردار ہونے سے مشکل تر کوئی کام نہیں۔ باری تعالیٰ نے تمام خوبیوں کی کلید کا حق دار اسے ٹھہرایا جو اپنی محبوب چیز کو دوسروں کے لیے چھوڑ دے۔ جیسا کہ فرمایا: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ "جب تک تم اپنی محبوب چیز کو راہِ حق میں خرچ نہ کرو کسی نیکی کے حق دار نہیں ہو سکتے۔" جو انسان اپنی روح پیش کر سکتا ہے۔ اس کی نظر میں مال، حال، لباس اور طعام کی کیا حقیقت ہے۔ یہ طریقت کی بنیاد ہے۔

ایک شخص رویمؒ کے پاس آیا اور وصیت کا طلب گار ہوا۔ فرمایا "بیٹا یہ کام جان قربان کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اگر ہمت نہیں تو صوفیوں کی بے سروپا باتوں میں مت الجھ۔" اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ واہیات ہے۔

باری تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ "جو لوگ راہِ حق میں قتل ہوئے انہیں مردہ مت تصور کرو۔ وہ زندہ ہیں اور پروردگار ان کو رزق دیتا ہے۔"

اور نیز فرمایا: وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ "راہِ حق میں قتل ہونے والوں کو مردہ مت کہو

وہ زندہ ہیں"۔ قربِ جاودانی جان قربان کرنے، اپنا حصہ ترک کرنے اور دوستانِ حق کی پیروی کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ حق سے دوری ہو تو ایثار و اختیار تفرقہ ہے۔ قربِ حق ہو تو ایثار درحقیقت ایثار ہے اور اپنے نصیب سے دست بردار ہونا گویا اپنا نصیب ہے۔ جب تک طالب کی روش اکتسابی جدوجہد تک محدود ہو وہ اس کی ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔ جب جذبِ حقیقی کارفرما ہو تو اس کے جملہ افعال درہم برہم ہو جاتے ہیں اور اسے تابِ اظہار نہیں رہتا۔ نہ اس کو کوئی نام دیا جاسکتا ہے نہ اس کی توضیح کی جاسکتی ہے اور نہ کسی چیز کو اس کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے۔ بقولِ شبلی رحمۃ اللہ علیہ ؎ غبتَ عنّی فما اُحسُّ بنفسی ؛ وتلاشت صفاتی الموصوفہ فانا الیوم غائب عن جمیع ؛ لیس الّا العبارۃ الملهوفۃ ؛ "تو مجھ سے دور ہوا مجھے اپنی خبر نہ رہی، میری صفات فنا پذیر ہو گئیں۔ آج میں ہر چیز سے محروم ہوں اور بجز اظہارِ مجبوری میرے پاس کچھ بھی نہیں۔

۶۔ سہیلیہ

ص $\frac{۲۰۶}{۲۶۸}$

اس مکتبۂ تصوّف کے لوگ سہیل تستریؒ کا اقتدار کرتے ہیں سہیلؒ ایک بزرگ اور قابلِ تعظیم صوفی تھے جیسے کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ وہ اپنے وقت کے بادشاہ تھے اور طریقت میں اہلِ بست وکشاد۔ ان کی کئی کرامات مشہور ہیں جن کو سمجھنے سے عقل قاصر ہے۔ ان کا طریقِ اجتہاد، مجاہدہ نفس اور ریاضت تھا۔ وہ اپنے مریدوں کو مجاہدہ سے کمال پر پہنچا دیتے تھے۔ مشہور ہے کہ ایک مرید کو انہوں نے حکم دیا کہ ایک روز سارا دن اللہ اللہ کہتا رہے۔ دوسرے اور تیسرے روز بھی یہی حکم دیا۔ پھر کہا اب راتیں شامل کرو۔ مرید نے تعمیل کی یہاں تک کہ وہ سونے میں بھی "اللہ اللہ" کا ذکر جاری رکھنے لگا۔ اس کے بعد حکم دیا کہ اب ظاہر ذکر چھوڑ دو صرف یاد رکھو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مرید ہمہ تن ذکر ہو گیا۔ ایک دن اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک لکڑی اس کے سر پر گری خون بہنے لگا مگر جو قطرہ زمین پر گرا لفظ "اللہ" بن گیا۔

سہیلی مکتبۂ تصوّف میں مریدوں کی تربیت مجاہدہ اور ریاضت سے کی جاتی تھی۔ خدمتِ درویشاں، محمدیوں کے طریقوں کا احترام اور جنیدی طریق پر مراقبۂ باطن بھی شاملِ تربیت تھے۔

مجاہدہ اور ریاضت دراصل نفس کے خلاف چلنے کا نام ہے۔ ریاضت و مجاہدہ کی کوئی اہمیّت نہیں۔ جب تک معرفتِ نفس حاصل نہ ہو۔ اب میں معرفتِ نفس اور اس کی حقیقت بیان کروں گا۔ اس کے بعد مجاہدات کی مختلف

صورتیں اور ان کے احکام تحریر کروں گا تاکہ طالب کو کما حقہٗ علم حاصل ہو اور توفیق اللہ کی طرف سے ہے۔

ص ۲۰۷/۲۶۹

حقیقتِ نفس اور معنیٔ ہوا

نفس کے لغوی معنے کسی چیز کی حقیقت اور اصلیت ہے۔ عام زبان میں یہ لفظ کئی مختلف اور متضاد معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً روح، انسانیت، جسم، خون وغیرہ، لیکن اہلِ تصوف کے نزدیک نفس ان چیزوں میں سے کچھ بھی نہیں۔ اتفاق اس بات پر ہے کہ نفس منبعِ شر اور رہبرِ بدی ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے نفس بدن میں روح کی طرح ایک امانت ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے نفس انسانی قالب کی ایک صفت ہے جیسے حیات۔ یہ سب تسلیم کرتے ہیں۔ کہ سب برے اخلاق اور مذموم افعال کا سبب نفس ہے۔ مذموم افعال کی دو صورتیں ہیں (۱) گناہ (۲) اخلاقِ بد مثلاً غرور، حسد، بخل، غصہ و کینہ وغیرہ جو شرعاً اور عقلاً مذموم ہیں۔ یہ چیزیں ریاضت سے دور ہو سکتی ہیں جیسے توبہ سے گناہ۔ گناہ ظاہری صفات میں شامل ہے اور مندرجہ بالا بدیاں باطنی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسی طرح ریاضت ظاہری افعال میں شامل ہے اور توبہ ایک باطنی صفت ہے۔ باطنی برائیاں ظاہری وصفوں سے پاک ہو جاتی ہیں اور ظاہری گناہ باطنی صفت یعنی توبہ سے دور ہو جاتے ہیں۔ نفس اور روح دونوں قالبِ انسانی میں نہایت نازک چیزیں ہیں اور ایسے ہی موجود ہیں جیسے کائنات میں شیاطین، ملائکہ، بہشت اور دوزخ۔ مگر ایک محلِ شر ہے اور دوسری محلِ خیر جیسے کہ آنکھ محلِ نظر ہے، کان محلِ سمع اور زبان محلِ ذائقہ یا دیگر عین اور صفات یعنی جوہر اور عرض جو انسانی طبیعت کو ودیعت ہیں۔

نفس کے خلاف چلنا سب عادتوں سے بالاتر ہے اور سب مجاہدوں کا نقطۂ کمال ہے مخالفتِ نفس کے بغیر راہِ حق دستیاب نہیں ہوتی۔ نفس کی موافقت باعثِ ہلاکت اور اس کی مخالفت وجہِ نجات ہے۔ باری تعالیٰ نے مخالفتِ نفس کا حکم دیا ہے۔ نفس کے خلاف چلنے والوں کی تعریف اور موافقت کرنے والوں کی مذمت فرمائی ہے، چنانچہ فرمایا: وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ "جس نے نفسانی خواہش کو رد کیا اس کے لیے بہشت جائے آرام ہے"۔ پھر فرمایا: أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ "جب تمہارے پاس کوئی رسول آیا اور اس نے تمہاری خواہش پر صاد نہ کیا تو تم اس کے خلاف متکبرانہ روش پر اتر آئے"۔ حضرت یوسف صدیق علیہ السلام نے کہا: وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي "میں اپنے نفس کو بری الذمہ نہیں سمجھتا کیونکہ نفس برائی پر آمادہ کرتا ہے جب تک میرے رب کا رحم شاملِ حال نہ ہو"۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اذا اراد اللہ بعبد خیرا بصرہ

ص ۲۰۸/۲۷۰

بعیوب نفسہ "جب باری تعالیٰ کو کسی بندے کی بہبودی منظور ہوتی ہے تو وہ اس کو نفس کے عیوب سے آگاہ کر دیتا ہے۔" آثارِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ہے کہ حق تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی اور فرمایا "اے داؤد اپنے نفس سے عداوت کر میری دوستی اس کی عداوت میں ہے۔"

یہ سب اوصاف ہیں اور ہر وصف کے لیے موصوف کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ وصف از خود قائم نہیں ہوتا۔ وصف کو سمجھنے کے لیے جملہ موصوف یعنی پورے قالب کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس کا طریقِ کار یہی ہے کہ انسانی جبلّت اور اس کے عجائبات کو سمجھا جائے۔ یہ طالبانِ حق پر فرض ہے کیونکہ جو اپنی ذات کو سمجھنے سے قاصر ہو وہ دوسرے کو کیا سمجھ سکے گا۔ جب انسان نے معرفتِ خداوندی کی طرف گامزن ہونا ہی ہے تو پہلے اس کو اپنی معرفت حاصل ہونا چاہیئے تاکہ اپنے کو حادث دیکھ کر حق تعالیٰ کو قدیم دیکھ سکے اور اپنی فنا سے اس کی بقا کو سمجھ سکے۔ نصِ قرآنی اس پر شاہد ہے۔ حق تعالیٰ نے کفّار کو اپنی ذات کی جہالت میں مبتلا کیا اور فرمایا: وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرَاهِمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ "ابراہیم کی ملّت سے وہ دست بردار ہوتا ہے جو اپنے نفس سے بے خبر ہے۔" ایک پیرِ طریقت نے کہا ہے۔ "جو اپنے نفس سے بے خبر ہے وہ ہر چیز سے بے خبر ہے۔" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من عرف نفسہ فقد عرف ربّہ ای من عرف نفسہ بالفناء فقد عرف ربہ بالبقاء ویقال من عرف نفسہ بالذلّ فقد عرف ربہ بالعزّ ویقال من عرف نفسہ بالعبودیۃ فقد عرف ربّہ بالربوبیّۃ جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا جس نے اپنے نفس کو فانی جانا اس نے اپنے رب کو باقی جانا۔ بعض کہتے ہیں جس نے اپنے آپ کو حقیر سمجھا اس نے اپنے رب کو عزیز دیکھا۔ بعض کہتے ہیں جس نے اپنے نفس کو عبودیت کے لیے سمجھا اس نے خدا کی ربوبیت کو سمجھا۔" الغرض جو اپنے آپ کو نہیں پہچانتا وہ کسی چیز کو پہچاننے کے قابل نہیں ہوتا۔ واضح ہونا چاہیئے کہ اس کلام میں معرفتِ نفس سے مراد جبلت انسانی (انسانیت) کی معرفت ہے۔ اہلِ قبلہ (مسلمانوں) کا ایک گروہ یہ سمجھتا ہے کہ انسان بجز روح کچھ بھی نہیں اور یہ جسم صرف زرہ یا ہیکل کی حیثیت رکھتا ہے جو اس کا مقام اور پناہ گاہ ہے اور جس کے اندر وہ کائنات کے طبعی اثرات سے محفوظ ہے حس اور عقل اس کی صفات ہیں۔ یہ نظریہ غلط ہے کیونکہ لفظ "انسان" روح جدا ہونے کے بعد بھی عائد ہوتا ہے جب جسم میں جان ہو تو اسے زندہ انسان کہا جاتا ہے اور جب جان نکل جائے تو مردہ انسان۔ علاوہ ازیں بیل کے جسم میں بھی جان امانت رکھی گئی

ص ۲۰۹/۲۷۱

ہے مگر ہم بیل کو انسان نہیں کہتے۔ اگر انسانیت محض روح کا نام ہوتا تو یقیناً "ہر روح دار" (جاندار) کو انسان کہنا پڑتا۔ یہ اس نظریہ کے غلط ہونے کی کافی دلیل ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ لفظ یعنی انسان روح اور جسم دونوں پر حاوی ہے جب تک دونوں باہم ہیں۔ جب ایک دوسرے سے جدا ہو گئے تو یہ لفظ عاید نہیں ہوتا جیسے سیاہ اور سفید دونوں رنگ گھوڑے میں موجود ہوں تو اس کو ابلق کہتے ہیں۔ جدا ہوں تو ایک کو سیاہ اور ایک کو سفید کہیں گے۔ ابلق کا لفظ مفقود ہو جائے گا، یہ چیز بھی غلط ہے کیونکہ باری تعالیٰ نے فرمایا: هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا "کیا انسان پر ایسا وقت نہیں گذرا جب وہ کوئی قابلِ ذکر چیز ہی نہ تھا" یہاں انسان کی خاک بے جان کو انسان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے حالانکہ ابھی جان اس کو ودیعت نہیں ہوئی تھی۔

ص ۲۱۰/۲۷۲

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ انسان ایک ناقابلِ تجزیہ جزو ہے۔ دل اس کا مقام ہے اور تمام صفات انسانی کی بنیاد ہے یہ چیز بھی غلط ہے اگر کسی کو مار کر اس کا دل علیحدہ کر دیا جائے تو انسان کا لفظ اس پر بدستور عاید ہوتا رہے گا، یہ تو سب تسلیم کرتے ہیں کہ دل قالبِ انسان میں روح سے پہلے نہیں تھا۔ کچھ مدعیانِ تصوّف نے اس معاملے میں ٹھوکر کھائی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان وہ چیز نہیں جو کھاتی ہے، پیتی ہے، بیمار ہوتی اور زوال پذیر ہوتی ہے۔ بلکہ انسان ایک "سرِ حق" ہے۔ یہ جسم جس کا لباس ہے اور جو اتحادِ جسم و روح اور امتزاجِ طبع میں ملفوف ہے۔ میں کہتا ہوں تمام عاقل، جنونی، کافر، فاسق اور جاہل انسان کہلاتے ہیں۔ ان میں کوئی ایسا "سرِ حق" موجود نہیں ہوتا سب روبہ تغیّر ہیں، سب کھاتے ہیں، سب پیتے ہیں۔ جسم کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں جس کو انسان کہا جاتا ہے۔ جسم زندہ ہو یا مردہ۔ باری تعالیٰ نے ان تمام ماہیتوں کو انسان کہا ہے جن سے ہمارے جسم مرکب ہیں بجز ان چیزوں کے جو بعض انسانوں میں مفقود ہوں چنانچہ فرمایا: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ "تحقیق ہم نے انسان کو کیچڑ کے پارہ سے بنایا پھر ہم نے اسے قطرۂ منی بنا کر ایک مقام پر رکھا۔ پھر نطفہ کو پارۂ خون بنایا۔ پھر پارۂ خون کو پارۂ گوشت بنایا پھر پارۂ گوشت سے ہڈیوں کو ملبوس کیا۔ پھر اس کو صورت عطا کی۔ بے شک اللہ تعالیٰ بڑا بزرگ اور بڑا اچھا پیدا کرنے والا ہے۔" خدائے عزّ و جلّ کے فرمان کے مطابق جو سب صادقوں کا صادق ہے۔ یہ پیکرِ خاص خاک سے تا بہ خاک گوناگوں تغیّرات اور صورت آرائیوں کے باوجود انسان ہے۔

اہل سنت والجماعت کے ایک گروہ کا قول ہے کہ انسان ایک جاندار ہے جس کے پیکرِ خاص پر انسانیت کی صفت اس طرح مقرر ہے کہ موت بھی اس صفت کو جدا نہیں کر سکتی۔ اسے ظاہر میں انسانیت کے پیکرِ خاص اور باطن میں آلاتِ مقررہ سے آراستہ کیا گیا ہے۔ "پیکرِ خاص" تندرست یا بیمار ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ "آلاتِ مقررہ" دیوانگی اور ہوش سے متعلقہ ہیں۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ جو چیز صحیح و تندرست ہوگی وہ فطرتاً مکمل ہوگی۔ اہلِ طریقت کے نقطۂ نظر سے انسان کامل کی ترکیب تین اجزاء پر مشتمل ہوتی ہے یعنی روح، نفس اور بدن۔ ان میں سے ہر ایک جزو کی ایک صفت ہے جو اپنے موصوف سے قائم ہے۔ روح کی صفت عقل، نفس کی ہوا اور جسم کی حس۔ انسان خلاصہ (نمونہ) ہے کل عالم کا۔ عالم سے مراد دو جہان ہیں۔ انسان میں دونوں جہان کے نشانات موجود ہیں۔ اس جہان کے عناصر اربعہ یعنی پانی، خاک، ہوا اور آتش اور ان سے متعلقہ اخلاط یعنی بلغم، خون، صفرا اور سودا۔ دوسرے جہان کے نشان بہشت، دوزخ اور میدانِ حشر۔ جان بوجہ لطافت کے بہشت کا نشان، نفس بوجہ آفت و وحشت جہنم کا اور جسم میدانِ حشر کا۔ بہشت و دوزخ کی حقیقت قہر و موانست سے وابستہ ہے۔ بہشت خدائے عزّوجلّ کی رضا اور جہنم اس کے غضب کا نتیجہ ہیں۔ مومن کی روح حقیقتِ معرفت سے جلا پاتی ہے۔ نفس گمراہی اور حجاب سے مذموم ہوتا ہے۔ حشر میں جب تک مومن کو دوزخ سے نجات نہ ہوگی وہ بہشت میں داخل نہیں ہوگا۔ دیدارِ ربّانی کی حقیقت سے آشنا نہیں ہوگا اور صفائے محبت سے بہرہ اندوز نہیں ہوگا۔ اسی طرح جب تک بندہ دنیا میں نفس اور خواہشاتِ نفسانی کے چنگل سے نہیں نکلتا وہ حقیقی ارادت کے قابل نہیں ہوتا اور قربت اور حقیقتِ معرفت سے سرفراز نہیں ہوتا۔ جو شخص دنیا میں اس کی معرفت حاصل کرے اور راہِ شریعت پر گامزن ہو وہ روزِ قیامت جہنّم اور پل صراط سے محفوظ رہے گا۔ الغرض روح اہلِ ایمان کو بہشت کی دعوت دیتی ہے اور نفس جہنم کی طرف بلاتا ہے۔ کیونکہ روح اور نفس بہشت اور جہنم کا نمونہ ہیں۔ بہشت کے لیے عقلِ کامل مدبّر ہے اور جہنم کے لیے ہوا و ہوسِ ناقص رہبر ہے۔ عقلِ کامل کی تدبیر صواب اور ہوسِ ناقص کی رہبری خطا ہے۔ طالبانِ درگاہِ حق کے لیے لازم ہے کہ ہمیشہ روشِ نفس کے خلاف راستہ اختیار کریں۔ تاکہ روح و عقل کو معاونت ملے یہ سرّ خدائے عزّوجلّ کا مقام ہے واللہ اعلم۔

فصل

مشائخ نے نفس کے بارے میں کیا کچھ کہا ہے؟ ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں۔ سب سے بڑا حجاب

ص ۲۱۱/۲۷۴
ص ۲۱۱/۲۷۴

نفس اور اس کی مکاریاں ہیں"۔ نفس کی متابعت در اصل حق کی مخالفت ہے اور حق کی مخالفت تمام حجابات سے بڑا حجاب ہے۔ ابو یزید بسطامیؒ نے فرمایا: "نفس کو بجز باطل کسی چیز سے تسکین حاصل نہیں ہوتی"۔ یعنی کبھی طریقِ حق اختیار نہیں کرتا۔ محمد ابن علی ترمذیؒ فرماتے ہیں" تو چاہتا ہے کہ تجھے نفس کے باوجود معرفت حق حاصل ہو حالانکہ نیز النفس اپنی معرفت سے بھی معذور ہے غیر کی معرفت تو درکنار" یعنی نفس اپنی بقا کے عالم میں اپنے آپ سے محجوب ہے اسے مکاشفۂ حق کیسے نصیب ہوسکتا ہے۔ جنیدؒ کہتے ہیں" کفر کی بنیاد یہی ہے کہ انسان اپنے نفس کے سانچے میں ڈھل جائے"۔ نفس کو حقیقتِ اسلام سے دور کا رشتہ بھی نہیں اور اس لیے وہ مخالفتِ ایمان کی روش پر چلتا ہے۔ منکر ہوتا ہے اور منکر ہمیشہ بیگانہ ہوتا ہے۔ ابو سلیمان دارانیؒ کہتے ہیں" نفس خیانت کا مرتکب ہوتا ہے اور راہِ حق سے روکتا ہے۔ بہترین عمل نفس کی مخالفت ہے"۔ کیونکہ امانت میں خیانت بیگانگی کے مترادف ہے اور ترکِ رضا گمراہی کے برابر ہے۔ اہلِ تصوف کے اقوال اس بارے میں بے شمار ہیں سب معرضِ بیان میں نہیں آسکتے۔ اب میں مجاہدہ نفس کی درستی۔ ریاضت اور اس کے طریق بیان کرتا ہوں تاکہ مقصدِ تحریر اور سہیلیہ بکتۂ تصوف کا نقطۂ نظر صاف ہوجائے۔

ص ۲۱۲ / ۲۷۵

مُجاہدۂ نفس

باری تعالیٰ نے فرمایا: وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا "جو ہمارے لیے جہاد کرتے ہیں ہم انہیں اپنی راہ دکھا دیتے ہیں"۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: المجاهد من جاهد نفسه فی الله "مجاہد وہ ہے جس نے راہ حق میں اپنے نفس سے جہاد کیا" یعنی رضائے حق حاصل کرنے کے لیے خواہشاتِ نفسانی کو روکا۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا: رجعنا من الجهاد الاصغر الی الجهاد الاکبر "ہم نے جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کی طرف رجوع کیا"۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ جہادِ اکبر کیا ہے۔ تو آپ نے فرمایا: مجاہدہ نفس۔ ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجاہدۂ نفس کو جہاد بالکفار سے بڑا درجہ دیا۔ کیونکہ مجاہدۂ نفس زیادہ باعثِ تکلیف ہوتا ہے اور نفسانی خواہشات کو پامال کرنے کا نام ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ تجھے مکرمت عطا کرے۔ طریقِ مجاہدۂ نفس اور اس کی عظمت بیّن اور قابلِ ستائش ہے۔ ہر مذہب و ملت کے لوگ اس پر متفق ہیں۔ بالخصوص اہلِ تصوف اس کے قائل اور اس پر عامل ہیں۔ مشائخ کبار نے اس بارے میں

بہت رموز اور نکات بیان کیے ہیں۔ سہل بن عبداللہ تستریؒ کو اس معاملے میں غلو ہے۔ مجاہدات پر انہوں نے بہت سے دلائل بیان فرمائے ہیں۔ کہتے ہیں وہ التزاماً پندرھویں روز کھانا کھایا کرتے تھے ان کی عمر بہت دراز ہوئی کیونکہ ان کی خوراک بہت ہی کم تھی۔

ص ۲۱۳/۲۷۶

جملہ محققین نے مجاہدہ کی برتری ثابت کی ہے اور اسے مشاہدہ کا سبب کہا ہے۔ ایک بزرگ نے مجاہدہ کو مشاہدہ کا ذریعہ قرار دیا ہے اور طالب کے لیے حصولِ حق میں اس کی بہت تاثیر بیان کی ہے۔ آخرت کی کامرانی کے لیے دنیا میں مجاہدہ کو فضیلت دی ہے کیونکہ عاقبت دنیا کا ثمرہ ہے اور ثمرہ بجز ریاضت و عبادت حاصل نہیں ہوتا۔ لازماً حصولِ مراد کے لیے ریاضت و کوشش کی ضرورت ہے تاکہ لطفِ خداوندی حاصل ہو۔ دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ مشاہدۂ حق کے لیے علت کی ضرورت نہیں۔ مشاہدۂ حق فضلِ خداوندی ہے اور فضلِ خداوندی کے لیے علت و افعال لازم نہیں۔ مجاہدہ تہذیبِ نفس کا ذریعہ ہے۔ اصلی قرب کا ذریعہ نہیں۔ کیونکہ مجاہدہ انسانی روش ہے اور مشاہدہ انعام باری تعالیٰ ہے۔ یہ غلط ہے کہ مجاہدہ کسی صورت میں بھی مشاہدۂ حق کا ذریعہ یا سبب بن سکتا ہے۔ سہلؒ کی دلیل قولِ باری تعالیٰ پر مبنی ہے وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا "جو لوگ ہمارے لیے جہاد کرتے ہیں ہم انہیں اپنی راہ دکھا دیتے ہیں"۔ انبیاء علیہم السلام کی بعثت، ورودِ شریعت، نزولِ صحائفِ آسمانی اور احکامِ عبادات سب مجاہدہ کے لیے دلیل ہیں۔ اگر مجاہدہ باعثِ مشاہدہ نہ ہوتا تو یہ سب کچھ تکلف بیکار تھا۔ دنیا اور عقبیٰ کے جملہ احوال حکم و علت کے تابع ہیں۔ اگر علت یا سبب کو حکم سے علیحدہ کر دیا جائے تو تمام شرعی اور رسمی تقاضے ختم ہو کر رہ جائیں۔ نہ اصل میں تکلیف کی ضرورت رہے نہ فرع میں۔ نہ طعام پیٹ بھرنے کا اور نہ لباس سردی سے بچنے کا ذریعہ سمجھا جا سکے۔ القصہ علت و معلول کو تسلیم کرنا اثباتِ توحید ہے اور انکار اس کا تعطل ہے۔ اس کے بیّن دلائل موجود ہیں اور ان کی تردید مشاہدہ سے روگردانی اور کج بحثی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ریاضت سے گھوڑا ایک جوان ہونے کے باوجود انسانی صفات کا حامل بن جاتا ہے۔ اس کی حیوانی جبلت بدل جاتی ہے۔ وہ خود چابک اٹھا کر مالک کو دیتا ہے، گیند اچھالتا ہے وغیرہ۔ کم عقل عجمی بچہ ریاضت سے عربی زبان حاصل کر لیتا ہے۔ اور اس کی طبیعت عجمی نہیں رہتی۔ وحشی جانور کو ریاضت سے اس درجہ سدھاتے ہیں کہ جب اسے چھوڑیں تو چلا جاتا ہے بلائیں تو واپس آ جاتا ہے۔ قید کی تکلیف اسے آزادی سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔ سگِ پلید کو محنت سے ایسا کر لیا جاتا ہے کہ اس کا

شکار کیا ہوا جانور حلال ہوتا ہے۔ اس کے برعکس بے مجاہدہ اور ریاضت ناآشنا آدمی کا شکار حرام ہے وقس علیٰ ھٰذا القیاس۔

شرع اور رسم کا تمام تر انحصار کوشش پر ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قربِ تام حاصل تھا۔ پاک دامانی، سلامتی اور عاقبت کی کامرانی مسلم تھی۔ تاہم ریاضت یعنی طویل فاقہ کشی، مسلسل روزہ داری اور شب بیداری کا یہ عالم تھا کہ حق عزوجل نے فرمایا: طٰہٰ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓی۔ طٰہٰ قرآن ہم نے اس لیے نازل نہیں کیا کہ آپ خود کو ہلاک کرلیں"۔ ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم تعمیرِ مسجد کے دوران اینٹیں اٹھا رہے تھے اور میں دیکھ رہا تھا کہ آپ کو تکلیف ہو رہی ہے۔ کہا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے فرمائیے میں اینٹیں اٹھاتا ہوں آپ کیوں تکلیف کر رہے ہیں"۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ابوہریرہ! تم دوسری اینٹیں اٹھاؤ۔ راحت دوسری دنیا میں ہے یہاں مشقت ہی مشقت ہے"۔

ص $\frac{۲۱۵}{۲۷۸}$

حبان بن حارثہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے عبداللہ بن عمرؓ سے دریافت کیا "غزوہ سے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں"۔ فرمایا "اپنے نفس سے ابتدا کرو اور اسے ریاضت کی عادت ڈالو۔ پھر اپنے نفس سے شروع کرو اسے لڑائی کے قابل بناؤ، اگر منہ پھیر کر بھاگتے ہوئے مارے گئے تو بھاگنے والوں میں حشر ہوگا اگر ثابت قدم ہو کر مارے گئے تو صبر کرنے والوں میں شمار ہوگا" اگر تو دکھاوا کرنے کے لیے مارا جاتا ہے تو تیرا حشر دکھاوا کرنے والوں میں ہوگا"۔

مطالب و معانی بیان کرنے میں تالیف و ترکیبِ تحریر کو بڑا دخل ہے۔ اسی طرح مجاہدۂ نفس کی آراستگی اور پیراستگی کو وصولِ حقیقت میں بڑا دخل ہے۔ بغیر خوبی تحریر کے بیان بے معنی ہوتا ہے اور بغیر مجاہدۂ نفس حصولِ حقیقت محال ہوتا ہے جو اس کے خلاف دعویٰ کرتا ہے مبتلائے باطل ہے۔ کائنات معرفت خالق اکبر کی دلیل ہے۔ معرفتِ نفس اور مجاہدۂ نفس اس کے وصل کا نشان ہے۔

اب گروہِ مخالف کا نقطۂ نظر دیکھنا چاہیئے۔ اس گروہ کا خیال ہے کہ نصِ قرآن کی تفسیر میں مقدم و مؤخر کا سوال ہے یعنی جو ہماری راہ میں کوشاں ہوئے ہم نے ان کو راہِ ہدایت دکھائی یا جن کو ہم نے راہِ ہدایت دکھائی وہ ہماری راہ میں کوشاں ہوئے"۔ چنانچہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لن ینجو احد کم بعملہ "تم لوگوں میں سے کوئی بھی صرف اعمال کی بنا پر نجات کا حق دار نہیں"۔ لوگوں نے کہا "کیا آپ بھی" فرمایا: ولا انا الا ان یتغمدنی اللہ برحمتہ

ہاں میں بھی جب تک اس کی رحمت کامل شامل حال نہ ہو" مجاہدہ انسانی فعل ہے اور یہ مشکل ہے کہ انسان کا فعل اس کی نجات کا باعث ہو۔ نجات اس کی مشیت پر منحصر ہے مجاہدہ پر نہیں۔ اسی لیے باری تعالیٰ نے فرمایا: فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا "اللہ جل شانہ جسے ہدایت سے مشرف کرنا چاہتے ہیں اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتے ہیں اور جسے گمراہ رہنا ہے اس کا سینہ تنگ ہو جاتا ہے اور وہ اپنا نقصان محسوس کرتا ہے"۔ اور نیز فرمایا: تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاۗءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاۗءُ "(کہو) باری تعالیٰ جسے تو چاہتا ہے حکومت عطا کرتا ہے اور جسے تو چاہتا ہے حکومت سے معزول کر دیتا ہے"۔ ظاہر ہے کہ سارے عالم کی ریاضت مشیتِ ایزدی کے سامنے ہیچ ہے۔ اگر مجاہدہ ہی ذریعہ حصول ہوتا تو ابلیس راندۂ درگاہ نہ ہوتا۔ اور اگر صرف ترکِ مجاہدہ باعثِ دوریٔ حق ہوتا تو آدم علیہ السلام قبولِ بارگاہ نہ ہوتے مقدم اس کی عنایت ہے کثرتِ مجاہدہ نہیں۔ زیادہ مجاہدہ کرنے والا زیادہ مقربِ حق نہیں ہوتا بلکہ جس پر اس کی رحمت ہو وہ نزدیک تر ہوتا ہے، خانقاہ کا عبادت گذار حق سے دور اور خرابات کا گنہ گار قریب ہو سکتا ہے۔ غیر مکلّف بچہ صاحبِ ایمان اشرف ہے اور بعینہٖ دیوانہ صاحب ایمان اشرف ہے۔ جب ایمان اشرف بغیر مجاہدہ میسّر آ سکتا ہے تو اس سے کم درجہ چیز کے لیے مجاہدہ کو ذریعہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

میں علی بن عثمان کہتا ہوں کہ اس اختلاف کی دو صورتیں ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے "جس نے ڈھونڈا اس نے پایا"۔ دوسرا گروہ بضد ہے "جس نے پایا اس نے ڈھونڈا" پانے کے لیے طلب اور طلب کے لیے پانا ضروری ہوا ایک مجاہدہ کرتا ہے مشاہدہ کے لیے دوسرا مشاہدہ کرتا ہے مجاہدہ کے لیے۔ دراصل مشاہدہ کے سلسلے میں مجاہدہ کی وہی حیثیت ہے جو طاعت کے معاملہ میں توفیق کی۔ توفیق باری تعالیٰ سے ملتی ہے۔ حصولِ طاعت بجز توفیق ممکن نہیں اور نہ توفیق بغیر طاعت حاصل نہیں ہوتی۔ اسی طرح مجاہدہ کی طاقت بھی بجز مشاہدہ میسّر نہیں آتی۔ اور مشاہدہ کی دولت بجز مجاہدہ ہاتھ نہیں آتی۔ جمالِ ایزدی کی ایک چمک مجاہدہ پر ابھارتی ہے۔ یہی چمک اس بات کی دلیل ہے کہ مشاہدہ اولیت کا مقام رکھتا ہے۔ سہیلؒ اور ان کے پیروکاروں کا استدلال یہ ہے کہ جو شخص مجاہدہ پر کاربند نہیں ہوتا وہ تمام انبیاء اور نزول کتبِ شرعیہ کا منکر ہوتا ہے۔ کیونکہ تکلّفِ شریعت کا مدار مجاہدہ پر ہے۔ یہ استدلال کسی حد تک درست نہیں۔ تکلیف کا مدار ہدایتِ خداوندی پر ہے۔ مجاہدہ صرف اثباتِ حجت کے لیے ہے حصولِ مدعا کے لیے

نہیں۔ خدائے عزوجل نے فرمایا: وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَا اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ "اگر ہم فرشتوں کو بھی مامور کر دیتے اور مردے بھی ان سے ہم کلام ہو جاتے اور ان سے پہلے ہو گزرنے والی ہر چیز کا حشر بھی بپا ہو جاتا تو یہ لوگ بغیر ہمارے منشار کے ایمان نہ لاتے ان میں اکثر جاہل ہیں"۔ کیونکہ ایمان کی بنیاد مشیتِ ایزدی ہے۔ لوگوں کے دلائل اور مجاہدہ پر نہیں۔

باری تعالیٰ نے نیز فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ "کفر کرنے والوں کو (عذاب سے) خوف دلانا یا نہ دلانا برابر ہے یہ ایمان نہیں لائیں گے"۔ کیونکہ وہ ازل سے خارج از اہل ایمان ہیں اور بوجہ شقاوت کے ان کے دلوں پر مہریں لگ چکی ہیں۔ ورودِ انبیاء، نزولِ کتب اور اثباتِ شریعت حصولِ مدعا کے اسباب ہیں۔ حصول مدعا کی علت نہیں۔ جہاں تک تکلیفِ احکام کا تعلق ہے ابوبکرؓ اور ابوجہل برابر تھے مگر ابوبکرؓ نے عدل و فضل کی بدولت منزلِ مقصود کو پا لیا اور ابوجہل عدلِ بے فضل کی نحوست میں بھٹک گیا۔ ابوجہل کا فضل سے محروم عدل اس بات کا مقتضی تھا کہ اس کے لیے ذریعہ حصول مراد ہی عین مراد ہو کر رہ جائے طلبِ مراد کا ذکر ہی کیا۔ طالب و مطلوب اگر دونوں ایک ہوں تو طالب کامران ہوگا اور طالب نہیں رہے گا کیونکہ مقصود کو پا لینے والا راحت میں ہوتا ہے اور راحت طالب کو راس نہیں آتی۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من استوی یوماہ فھو مغبون "جو شخص دو دن یکساں حالت پر رہا وہ زیاں کار ہے"۔ یعنی طالبانِ حق میں سے جس کسی نے بھی دو دن ایک ہی منہاج پر گذار دیئے وہ بیّن خسارے میں ہے۔ چاہیئے کہ ہر روز میدان طلب میں قدم آگے بڑھتا رہے۔ یہ طالب کا مقام ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے نیز فرمایا: استقیموا ولن تحصوا "استقامت اختیار کرو مگر ایک ہی مقام پر اکتفا نہ کرو"۔ مختصر یہ کہ مجاہدہ کو سبب قرار دیا سبب کو ثابت کیا اور پھر انعاماتِ الٰہیہ کے حصول کے لیے سبب کی نفی کی۔

یہ جو کہا محنت سے گھوڑے کی حیوانی صفات کو انسانی صفات میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ گھوڑے میں ایک وصف پوشیدہ ہوتا ہے جسے محنت سے معرضِ اظہار میں لایا جاتا ہے جب تک محنت نہ کی جائے وہ وصف روبکار نہیں آتا۔ گدھے میں وہ وصف پوشیدہ نہیں اسے ہرگز گھوڑے کے مقام پر نہیں لایا جا سکتا۔

نہ گھوڑے کو محنت سے گدھا بنایا جاسکتا ہے اور نہ گدھے کو ریاضت سے گھوڑے میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ یہ جبلت کو تبدیل کرنے کے برابر ہے اور ناممکن ہے۔ جو چیز جبلت کو بدلنے سے قاصر ہے جناب حق میں ثابت نہیں ہوسکتی۔

پیرِ طریقت سہیل تستریؒ مبتلائے مجاہدہ تھے اور مجاہدہ سے آزاد تھے۔ بعینِ مجاہدہ میں بھی اس کی کیفیت کو معرضِ بیان میں نہیں لاسکتے تھے۔ یہ چیز قطعاً مختلف ہے ان لوگوں سے جو مجاہدہ پر عبارت آرائی تو کرتے ہیں مگر عملاً بالکل کورے ہوتے ہیں۔ کتنا بڑا غضب ہے کہ جو چیز محض عمل سے متعلق ہو موضوعِ گفتگو ہو کر رہ جائے۔ الغرض مشائخ کبار مجاہدہ اور تہذیب نفس کے معاملے میں متفق ہیں مگر ان چیزوں کو مطمحِ نظر بنائے رکھنا غلط ہے۔ بالفاظِ دیگر جو لوگ مجاہدہ نفس کی نفی کرتے ہیں۔ ان کا مطلب نفی مجاہدہ نہیں بلکہ پندارِ مجاہدہ کی تردید اور مذمت ہے۔ مجاہدہ انسانی کوشش ہے اور مشاہدہ انعامِ خداوندی ہے جب تک انعامِ خداوندی نہ ہو انسانی کوشش بارور نہیں ہوتی۔

ص ۲۱۸/۲۸۲

تم زندگی سے دل برداشتہ نہیں اپنی آرائش میں اتنے مصروف ہو کہ اس کے فضل وکرم پر نظر نہیں رکھتے۔ اپنی کوشش اور ریاضت پر عبارت آرائی کر رہے ہو۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے دوستوں کا مجاہدہ انعامِ خداوندی ہوتا ہے۔ ان کے اپنے اختیار سے باہر ہوتا ہے۔ طاری ہوتا ہے اور ان کو بہا کرلے جاتا ہے۔ اس کے برعکس اہلِ غفلت کا مجاہدہ ان کا اپنا فعل ہوتا ہے اور ان کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کو اس مجاہدہ سے بجز پریشانی و پراگندگی کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ اپنے افعال اور مجاہدات کا ذکر مت کرو اور کسی حال میں بھی ایمائے نفس پر چلنے کی کوشش نہ کرو۔ یہ حجابِ مستعار حجاب ہے۔ عام حالات میں اگر ایک چیز حجاب بن جائے تو شاید دوسری اس حجاب کو دور کرسکے۔ مگر یہاں تو ساری زندگی مستقل حجاب ہے اور مقامِ بقا حاصل نہیں ہوسکتا جب تک مکمل فنا میسر نہ آئے۔ "نفس باغی کتا ہے جس کا چمڑہ بغیر دباغت پاک نہیں ہوتا"۔

کہتے ہیں حسین بن منصورؒ کوفہ میں محمد بن الحسین العلوی کے گھر مہمان تھے۔ ابراہیم خواصؒ بھی کوفہ آئے اور حسین بن منصورؒ کی موجودگی کی خبر سن کر ان کے پاس پہنچے۔ حسینؒ نے کہا "ابراہیم! چالیس برس طریقت پر گامزن رہے کیا ہاتھ لگا؟" جواب دیا "میں نے توکل کا مسلک اختیار کیا"۔ حسینؒ نے کہا "اپنی عمر تزکیۂ باطن میں صرف کردی فنا فی التوحید کا کیا بنا؟" توکل ذاتِ باری کے ساتھ معاملات کا نام ہے اور تزکیۂ باطن خدا پر اعتماد کرنے کا نام ہے اتنی عمر علاج باطن پر صرف کرنے کے بعد اتنی ہی عمر اور چاہیئے تاکہ علاج ظاہر بھی ہوسکے۔

ص ۲۱۹/۲۸۳ دو عمریں تلف ہو جائیں اور نشانِ حق سے بہرہ یابی ابھی باقی ہو۔

شیخ ابو علی سیاہ مروزیؒ سے متعلق مشہور ہے کہ انھوں نے فرمایا "میں نے اپنے نفس کو دیکھا بالکل میری شکل تھی۔ کسی نے اس کو بالوں سے پکڑ کر میرے حوالے کر دیا میں نے اسے ایک درخت سے باندھ کر قتل کر دینے کا ارادہ کیا اس نے کہا تردّد نہ کرو میری حیثیت خدائی لشکر کی ہے۔ میں کم نہیں ہو سکتا۔"

محمد علیان نسوی جو جنیدؒ کے اصحابِ کبار میں شامل تھے فرماتے ہیں کہ شروع میں جب مجھے آفاتِ نفسیہ اور اس کے مکر و فریب کا علم ہوا میرے دل میں اس کی عداوت کا جذبہ موجزن ہوا۔ ایک دن کوئی چیز لومڑی کے بچہ کے مشابہ میرے گلے سے باہر گری۔ بنا بر ربّانی میں نے سمجھ لیا کہ میرا نفس ہے۔ میں نے اسے پیروں میں کچلنے کی کوشش کی مگر وہ ہر ضرب پر بڑا ہوتا چلا جا رہا تھا میں نے کہا "ظالم! ہر چیز زخم کھا کر ہلاک ہو جاتی ہے مگر تو پھول رہا ہے"۔ نفس نے جواب دیا "میں فطرتاً ایسا ہوں۔ جو چیز اوروں کے لیے باعثِ تکلیف ہے میرے لیے عین راحت ہے اور جس چیز میں اوروں کو راحت نظر آئے مجھے اس سے تکلیف ہوتی ہے"۔

ابو العباس اشقانیؒ جو اپنے وقت کے امام تھے فرماتے ہیں میں ایک دن گھر لوٹا تو دیکھا کہ ایک سگِ زرد میری جگہ پر سو رہا ہے خیال کیا محلے والوں کا کتا ہوگا۔ مار کر بھگانے کی کوشش کی مگر وہ میرے دامن میں گھس کر غائب ہو گیا۔

ابو القاسم گرگانی جو اس وقت قطبِ عالم ہیں (اللہ ان کی عمر دراز کرے) کہتے ہیں کہ میں نے نفس کو سانپ کی شکل میں دیکھا۔

ایک درویش نے نفس کو چوہے کی صورت میں دیکھا۔ پوچھا تو کون ہے؟ چوہے نے جواب دیا میں غافلوں کی ہلاکت ہوں۔ ان کے فساد اور ان کی بدیوں کا چشمہ ہوں۔ دوستانِ حق کے لیے سرمایۂ نجات ہوں۔ اگر ان کو میری آفات کا علم نہ ص ۲۲۰/۲۸۴ ہو تو وہ اپنے تقدس پر اترانے لگیں اور اپنے افعال پر مغرور ہو جائیں۔ جب ان کی نظر اپنے دل کے تقدس، اپنی صفائی قلب، اپنے نورِ ولایت، اپنی استقامت اور اپنی عبادت پر پڑے تو تکبر میں مبتلا ہو جائیں مگر وہ مجھے دونوں پہلوؤں کے درمیان محسوس کرتے ہیں اور جملہ عیوب سے پاک ہو جاتے ہیں۔ یہ سب حقائق اس بات کی دلیل ہیں کہ نفس ایک عینی چیز ہے صفتی نہیں اور اس کے اوصاف بیّن طور پر نظر آتے ہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اعدیٰ عدوّك نفسك التی بین جنبیك "تیرا سب سے بڑا دشمن نفس ہے جو تیرے دو پہلوؤں کے درمیان ہے"۔ اگر تمہیں اپنے نفس کی

معرفت نصیب ہو جائے تو تم یقیناً اس پر ریاضت سے قابو پا سکتے ہو مگر اس کی اصل برباد نہیں ہو سکتی۔ معرفتِ نفس میسّر ہو تو طالبِ حق اپنے نفس کا مالک ہوتا ہے اور اسے نفس کی بقا سے کوئی گزند نہیں پہنچتا۔ "نفس بھونکنے والا کتا ہے اور کتے کو سدھانے کے بعد رکھنا مباح ہے۔" الغرض مجاہدۂ نفس اوصافِ نفس کو ملیامیٹ کرنے کی خاطر کیا جاتا ہے اس کی ذات کو مٹانے کی خاطر نہیں۔ مشائخ کبار نے اس بارے میں بہت کچھ کہا ہے مگر بخوفِ طول اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اب حقیقت ہوا اور ترک شہوات پر کچھ بیان کرنا ہے۔ انشاءاللہ عزّوجلّ سب توفیق اللہ کی طرف سے ہے۔

حقیقتِ ہوا

خدا تجھے عزت و آبرو دے۔ معلوم ہونا چاہیئے کہ ایک جماعت ہوا کو صفتِ نفس تصور کرتی ہے۔ ایک دوسری جماعت کے خیال میں ہوا ارادتِ طبع کا نام ہے جسے نفس پر اختیار ہوتا ہے اور جو مدبّرِ نفس ہے۔ بعینہٖ اسی طرح جیسے عقل پر روح کو اختیار ہوتا ہے۔ وہ روح جس کی بنیاد میں عقل شامل نہیں ناقص ہوتی ہے اور ہر نفس جو ہوا سے پرورش نہیں پاتا ناقص ہوتا ہے۔ روح کا نقص مانع قربت ہوتا ہے اور نقصِ نفس عین قربت کا باعث ہوتا ہے۔ انسان کو دو گونہ دعوت ملتی ہے۔ ایک عقل کی طرف سے دوسری ہوا کی جانب سے عقل کی دعوت قبول کرنے والا ایمان کی دولت حاصل کرتا ہے اور ہوا کا دلدادہ ضلالت اور کفر میں مبتلا ہوتا ہے۔ الغرض ہوا حجاب و گمراہی ہے۔ مریدوں کو صدر نشینی پر ابھارتی ہے۔ طالبانِ حق کے لیے قابلِ نفرت ہے۔ آدمی کو اس کی مخالفت کا حکم ہے اور اس کے ارتکاب سے منع کیا گیا ہے۔ خدائے عزّوجلّ نے فرمایا: جس نے اسے اختیار کیا وہ ہلاک ہوا جو اس کا مخالف ہوا وہ حاکم بنا۔ بقولِ خداوندی: وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى "جو خدا کے حضور خوف کے عالم میں کھڑا ہوا اور جس نے نفس کو ہوا کے تابع نہ کیا" اس کا مقام بہشتِ بریں ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اخوف ما اخاف علی امتی اتباع الھوٰی وطول الامل "زیادہ خوفناک چیز جس میں مجھے اپنی امت کے مبتلا ہونے کا ڈر ہے ہوا کی پیروی اور طولِ امل ہے"۔ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے تفسیر قولِ خدائے عزّوجلّ اَفَرَاَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ "کیا تو نے دیکھا اس شخص کو جس نے خواہشِ نفسانی کو اپنا معبود بنا لیا" کرتے ہوئے فرمایا: افسوس ہے اس پر جس کا معبود اس کی خواہشِ نفسانی ہو"۔

خواہشاتِ نفسانی (ہوا) کی دو قسمیں ہیں ایک ہوائے لذّت و شہوات دوسری ہوائے جاہ و مرتبہ و حکومت۔ لذت

ص ۲۲۱/۲۸۵

کا دل دادہ خرابات تک محدود ہوتا ہے اور عام لوگ اس کے شر سے محفوظ ہوتے ہیں۔ ھوائے جاہ و حکومت رکھنے والا خانقاہوں اور عبادت کدوں میں بھٹکتا ہے اور فتنہ و شر کا مرتکب ہوتا ہے۔ خود راہ راست سے دور سرگرداں ہوتا ہے اور لوگوں کو گمراہی کی دعوت دیتا ہے۔ "ہوا کی متابعت سے خدا کی پناہ"۔ جو کوئی بھی ہوا میں مبتلا ہوتا ہے اور اس کی متابعت میں سرگرم رہتا ہے راہِ حق سے بھٹک کر رہ جاتا ہے چاہے آسمان پر پرواز کر رہا ہو جسے ہوا سے نجات حاصل ہو اور اس کی متابعت سے نفرت ہو قریب حق ہوتا ہے چاہے اس کا مقام خرابات ہی کیوں نہ ہو۔ ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے سنا روم میں کوئی شخص ستّر برس سے بتقاضائے رہبانیت دیر نشینی اختیار کیے ہوئے ہے میں نے سوچا رہبانیت کی شرط زیادہ سے زیادہ چالیس برس ہے یہ کس قماش کا انسان ہے کہ ستر برس سے دیر نشین ہے۔ دیکھنا چاہیے۔ جب میں اس کے پاس پہنچا اس نے کھڑکی کھول کر کہا "ابراہیم! مجھے خبر ہے تم کیوں آئے ہو۔ میں یہاں ستر برس سے از راہِ رہبانیت قیام پذیر نہیں ہوں۔ میرے پاس ایک کتا ہے جو ہوائے نفسانی میں باؤلا ہو چکا ہے میں یہاں اس کتے کو روکے ہوئے ہوں تاکہ خلقت اس کے ضرر سے محفوظ رہے۔" میں نے یہ سن کر کہا یا الٰہی تو قادرِ مطلق ہے۔ عین ضلالت میں راہِ راست دکھانے والا ہے۔

دیر نشین نے مجھے پھر مخاطب کر کے کہا "ابراہیم! لوگوں کی تلاش چھوڑ کر اپنی تلاش کرو۔ جب خود کو پالو تو اس کی نگہبانی کرو۔ یاد رکھو ہوائے نفسانی ہر روز تین سو ساٹھ مختلف لباس معبودیت پہن کر گمراہی کی دعوت دیتی ہے۔ جب تک بندے کے دل میں گناہ اور نافرمانی کی ہوا ظہور پذیر نہیں ہوتی۔ شیطان کو اس کے باطن میں دخل نہیں ہوتا۔ ہوائے نفسانی رونما ہوتے ہی شیطان اسے سجا بنا کر پیش کرتا ہے اسے وسوسہ کہتے ہیں۔ اس کی ابتدا ہوائے نفسانی سے ہوتی ہے اور ابتدا کی ذمہ دار چیز سب سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔"

جب ابلیس نے کہا "میں سب کو گمراہ کروں گا"۔ تو حق سبحانہٗ و تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطَانٌ "تجھے میرے بندوں پر کوئی تسلط حاصل نہیں ہوگا"۔ فی الحقیقت نفس اور ہوائے نفسانی انسان کے لیے ابلیس ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما من احد الا وقد غلبه شیطانه الا عمر فانه غَلَبَ شیطانه "کوئی آدمی نہیں جس پر ابلیس نے غلبہ نہیں کیا بجز عمر رضی اللہ عنہ کہ اس نے ابلیس کو مغلوب کر دیا"۔

انسانی خمیر کی ترکیب میں ہوا شامل ہے اور فرزندانِ آدم کے لیے ریحانِ جان ہے جیسا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے

ص ۲۲۱/۲۸۶

ص ۲۲۲/۲۸۷

فرمایا: الھویٰ والشھوۃ معجونۃ بطینۃ ابن آدم "ہوا اور شہوت، انسانی خمیر میں گوندھی گئی ہیں" ترکِ ہوا سے آدمی بلند مرتبہ ہوتا ہے اور مبتلائے ہوا ہونے سے اسیر ہو کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ زلیخا مبتلائے ہوا ہو کر اسیر ہوئی اور یوسف علیہ السلام نے ترکِ ہوا سے کام لیا اور عالی مرتبہ پایا۔

حضرت جنیدؒ سے لوگوں نے دریافت کیا "وصل کیا ہے؟" فرمایا "ترک ہوا" وصل حق سے مشرف ہونے کا طالب تارکِ ہوائے نفس ہوتا ہے۔ حصولِ تقربِ حق کے لیے ترکِ ہوا سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں مگر یاد رکھو ناخن سے پہاڑ کھودنا آسان ہے اور ہوائے نفسانی کی مخالفت مشکل ہے۔ ذوالنون مصریؒ نے ایک آدمی کو ہوا میں اڑتے ہوئے دیکھا پوچھا یہ مقام کیسے حاصل ہوا اس نے کہا میں نے اپنی ہوائے نفسانی کو پاؤں تلے روند دیا اور مجھے ہوا کے دوش پر جگہ مل گئی۔

محمد بن الفضل البلخیؒ نے کہا مجھے تعجب اس شخص پر ہے جو ہوائے نفس کے باوجود خانہ کعبہ کا قصد کرتا ہے اور زیارت کی تمنا رکھتا ہے۔ سیدھی بات یہ ہے کہ وہ اپنی ہوائے نفس کو کچل دے تاکہ خانہ کعبہ اس کی طرف آئے اور اس کی زیارت کرے۔ ص ۲۲۳/۲۸۸

نفسِ انسانی کی ظاہر ترین صفت شہوت ہے جو تمام اعضائے انسانی پر محیط ہے اور حواس سے پرورش پاتی ہے اسی بنا پر انسان کو جملہ حواس کی حفاظت کا حکم ہے اور ہر ایک کے فعل پر اسے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ آنکھ کی شہوت دیکھنا ہے۔ کان کی سننا، ناک کی سونگھنا، زبان کی بولنا، تالو کی چکھنا، جسم کی چھونا اور دل کی سوچنا۔ طالب حق کو چاہیے اپنا خود حاکم ہو اور دن رات ان تمام چیزوں پر نظر رکھے۔ اگر حواس میں شائبہ ہوائے نفسانی پیدا ہو تو اسے ختم کر دے اور دعا کرے کہ باری تعالیٰ اسے ایسی روش پر چلائے کہ شہوانی خروش اس کی طبیعت میں باقی نہ رہے جو دریائے ہوائے نفسانی میں پھنس جاتا ہے وہ ہر حقیقت سے محجوب ہو جاتا ہے البتہ کوشش و تکلف سے نجات حاصل کرنا کارِ دراز ہے۔ کیونکہ شہوات حلقہ بحلقہ پھیلتی جاتی ہیں۔ صحیح مسلک تسلیم ہے اور یہی راہِ حصول مراد ہے

ابو علی سیاہ مروزیؒ کسی حمام میں غسل فرما رہے تھے اور بطریقِ سنت موئے زہار صاف کرنے میں مشغول تھے۔ دل میں سوچا یہ عضو منبعِ شہوات ہے اور اس قدر آفات میں مبتلا کرنے کا باعث ہے۔ اسے کاٹ ہی کیوں نہ ڈالیں۔ ہاتف غیب نے کہا۔ اے ابو علی! ہمارے نظامِ حیات میں دخل اندازی کر رہا ہے۔ ہمارے نزدیک سب عضو برابر ہیں۔ ص ۲۲۴/۲۸۹

قسم ہے اپنی عزت کی اگر تو اس کو کاٹ دے تو تیرے جسم کے ہر بال میں اس سے زیادہ شہوت اور ہوا پیدا کی جاسکتی ہے اسی مضمون پر کہا گیا ہے ؎

منیتنی الاحسان دع احسانک ⁂ اترک بجنشی ادلہ بلا ذبجانک

انسان جسمانی ترکیب بدلنے پر قادر نہیں۔ البتہ صفاتِ جسمانی کو توفیق خداوندی سے اور شیوۂ تسلیم اختیار کرنے سے اپنی طاقت اور قوت سے سرگرداں ہو کر بدل سکتا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ جب شیوۂ تسلیم اختیار کر لیا تو عصمت نصیب ہوئی اور عصمت حق کی تائید سے شہوانی آفات سے بچ نکلنا بہ نسبت مجاہدہ کے آسان تر ہے۔ بقول "مکھی کو دور کرنے کے لیے لاٹھی سے جھاڑو زیادہ کار آمد ہے"۔

عصمت حق سب آفات سے محفوظ رکھتی ہے۔ اور سب علل کو زائل کرتی ہے۔ انسان کو باری تعالیٰ سے کوئی مشارکت نہیں۔ اس کی سلطنت میں بجز فرمودۂ حق کوئی تصرف نہیں ہو سکتا۔ جب تک عصمتِ تائیدِ حق حاصل نہ ہو۔ کوئی شخص اپنی جد و جہد سے کسی شر سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ جد و جہد پھر جد و جہد ہوتی ہے۔ جب تک احسانِ خداوندی نہ ہو انسانی جد و جہد بے کار ہے اور بندگی کی استطاعت سلب ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہر قسم کی جد و جہد یا کوشش دو پہلو رکھتی ہے۔ ایک یہ کوشش ہوتی ہے کہ تقدیرِ حق پلٹ جائے۔ دوسری کوشش یہ ہوتی ہے کہ تقدیر کے خلاف کوئی کارگر حربہ ہاتھ لگ جائے۔ یہ دونوں پہلو نارواہیں۔ تقدیر کوشش سے پلٹ نہیں سکتی۔ اور کوئی چیز بجز تقدیر ظہور پذیر نہیں ہوتی۔ کہتے ہیں شبلیؒ صاحبِ فراش ہو گئے۔ طبیب ان کے پاس آیا اور کہا پرہیز کریں۔ پوچھا کس چیز سے پرہیز کروں؟ اپنی مقررہ روزی سے یا اس چیز سے جو میری روزی میں شامل نہیں؟ اپنی روزی سے پرہیز بے معنیٰ ہے اور جو میری روزی نہیں وہ مجھے مل ہی نہیں سکتی۔ پرہیز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو چیز سامنے ہو اس کے لیے کوشش نہیں کی جاتی"۔

ص ۲۲۵/۲۹۰

اجتناباً اس مسئلہ کو اور جگہ بھی بیان کروں گا ان شاء اللہ عزّ و جلّ۔

حکیمیہ

مکتبۂ حکیمیہ کے لوگ ابو عبداللہ محمد بن علی حکیم الترمذیؒ کا اتباع کرتے ہیں۔ وہ اپنے وقت کے امام تھے جملہ علوم ظاہری اور باطنی سے آراستہ۔ ان کی بہت سی تصنیفات ہیں۔ ان کے طریق اور تحریر کی بنیاد ولائت پر تھی۔

جس کی حقیقت وہ بیان کیا کرتے تھے۔ اولیائے کرام کے درجات اور مراعات کا ذکر کرتے تھے جو بجائے خود عجائبات کا ایک ناپیدا کنار سمندر ہے۔

اس مکتبۂ تصوّف کو سمجھنے کے لیے ابتداءً یہ جاننا ضروری ہے کہ خدائے عزّوجل نے اولیائے کرام کو خلقت سے برگزیدہ مقام دیا ہے اور ان کو تعلقاتِ زلیست سے بے نیاز کر کے تعلیِ نفس اور ہوا سے محفوظ کر رکھا ہے۔ ہر ولی کو ایک مقرر درجہ پر فائز کیا ہے اور حقیقت کے دروازے اس پر وا کر دیئے ہیں۔

اس موضوع پر بہت کچھ قابلِ بیان ہے مگر میں صرف چند بنیادی چیزوں کی تشریح کروں گا۔ اب مختصر طور پر اس بارے میں تحقیق شدہ چیزیں ظاہر کرتا ہوں اور ان کے اسباب و اوصاف پر لوگوں کے اقوال نقل کرتا ہوں انشاء اللہ تعالیٰ۔

اثباتِ ولایت

طریقتِ تصوّف اور معرفت کی بنیاد اور اساس ولایت اور اس کے اثبات پر ہے۔ جملہ مشائخ کبار اثباتِ ولایت پر متفق ہیں گو ہر کسی نے اپنے نقطۂ نظر کا اظہار مختلف طریقے سے کیا ہے۔ محمد بن علی حکیمؒ ترمذیؒ طریقت پر اس لفظ کے اطلاق کے بارے میں خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ص ۲۲۵/۲۹۱

لفظ وَلایت (واوَ کی زبر کے ساتھ) از روئے لغت تصرّف کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور وِلایت (واوَ کی زیر کے ساتھ) امارت کے مفہوم پر حاوی ہے۔ دونوں فعل ولیَت کے مصدر بھی ہو سکتے ہیں۔ اور یہ مانا جائے تو دَلالت اور دِلالت کے انداز پر دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے۔ نیز ولائت بمعنیٰ ربوبیت بھی استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ باری تعالیٰ نے فرمایا: ھُنَالِکَ الْوَلَایَۃُ لِلّٰہِ الْحَقِّ "یہاں ولایت صرف اللہ کے لیے روا ہے" تاکہ کفار اسی کا سہارا تلاش کریں۔ اسی کے ہو جائیں اور اپنے جھوٹے خداؤں سے بیزاری کا اظہار کریں۔ ولایت بمعنیٰ محبت بھی مستعمل ہے۔ روا ہے کہ ولی "فعیل" بمعنیٰ "مفعول" ہو چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا وَھُوَ یَتَوَلَّی الصّٰلِحِیْنَ "وہ نیک بندوں کا دوست ہے"۔ خدا اپنے بندوں کو ان کے افعال اور اوصاف میں غلطاں نہیں چھوڑتا بلکہ اپنی پناہ اور حفاظت میں رکھتا ہے۔ روا یہی ہے کہ بندہ فاعل کے روبرو فعیل (بصیغہ مبالغہ) ہو اس کی اطاعت میں مشغول ہو ہمیشہ اس کے حقوق کی پاسداری کرے اور غیر اللہ سے روگرداں رہے ایک مقام مرید کا ہے دوسرا مراد کا۔

یہ جملہ معانی روا ہیں چاہے انسان کا تعلق خدا سے زیرِ بحث ہو یا خدا کا تعلق انسان سے۔ کیونکہ باری تعالیٰ

اپنے دوستوں کا مددگار ہے جیسا کہ اصحابِ پیغمبر کی نسبت وعدۂ نصرت فرمایا اور کہا: اَلَا اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ "خبردار اللہ کی نصرت قریب ہے"۔ اور نیز فرمایا: وَاَنَّ الْكٰفِرِیْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ "کفار کا کوئی مولا نہیں اور ان کا کوئی مددگار نہیں"۔ اس کی ذاتِ پاک کفار کی مددگار نہیں۔ ظاہر ہے کہ اہلِ ایمان کی مددگار ہے۔ ان کے ادراک کی مدد کرتا ہے تاکہ وہ اس کی آیات کو استدلال سے پرکھ سکیں۔ ان کے دلوں پر بیانِ معانی کے لیے اسرار و دلائل کھل جائیں۔ وہ شیطان اور نفس کی مخالفت میں کامیاب ہوں اور اوامرِ خداوندی پر کاربند رہیں۔ یہ بھی روا ہوتا ہے کہ اس کی ذاتِ پاک ان کو اپنی دوستی میں خاص درجات عطا کرے اور شیطان کی خصومت و عداوت سے انہیں اپنی حفاظت میں رکھے چنانچہ فرمایا: یُحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗ "اللہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں"۔ وہ اس کی محبت میں سرشار اس سے محبت کرتے ہیں اور دنیا سے منہ پھیر کر اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ وہ ان کا دوست ہوتا ہے اور وہ اس کے دوست ہوتے ہیں۔ روا ہے کہ وہ کسی کو طاعت میں استقامت کی بنا پر ولایت عطا کرے۔ اس کی طاعت کو اپنی امان میں رکھے تاکہ استقامت نصیب ہو۔ وہ مخالفت سے پرہیز کرے اور شیطان اس سے دور رہے۔ یہ بھی روا ہے کہ کسی کو ولایت سے سرفراز کرے۔ اور بست و کشاد اس کے تصرف میں کر دے۔ اس کی دعائیں مستجاب ہوں اور اس کی ہر سانس مقبول ہو۔ چنانچہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رب اشعث اغبر ذی طمرین لایؤبہ بہ لو اقسم علی اللہ لابرّہ "بہت سے پریشان صورت لوگ ہیں جن کی لوگ پرواہ نہیں کرتے حالانکہ اگر وہ خدا کی قسم کھائیں تو خدا ان کی قسم پوری کرتا ہے"۔ مشہور ہے حضرت عمرؓ کے زمانے میں دریائے نیل اپنی عادت کے مطابق خشک ہو گیا۔ عہدِ جاہلیت میں ہر سال ایک خوبصورت لونڈی کو آراستہ کر کے دریا میں ڈالا کرتے تھے تاکہ پانی جاری ہو جائے۔ حضرت عمرؓ نے ایک پارہ کاغذ پر تحریر کیا کہ اے دریا اگر تو از خود ٹھہر گیا ہے تو جائز نہیں۔ اگر بحکمِ خداوندی ساکت ہے تو عمرؓ حکم دیتا ہے کہ جاری ہو جا۔ یہ رقعہ دریا میں ڈال دیا گیا۔ پانی جاری ہو گیا۔ یہ سچی امارت تھی۔ اثباتِ ولایت سے میرا مقصد یہ ہے کہ یہ بات روشن کر دوں کہ ولی کا لفظ اس شخص پر عاید ہوتا ہے۔ جو مذکورہ معانی کا حامل ہو۔ صاحبِ حال ہو اور قال سے سروکار نہ رکھتا ہو۔ اس سے قبل مشائخ کبار نے اس موضوع پر کتب تصنیف کی ہیں مگر وہ سرمایۂ عزیز تلف ہو گیا۔ اب میں اس پیر بزرگ یعنی اس مکتبۂ تصوف کے بانی کی عبارات کو معرضِ تحریر میں لاتا ہوں تاکہ تجھے اور ہر اس طالبِ حق کو جسے اس کتاب کو پڑھنے کی سعادت نصیب ہو پورا استفادہ ہو سکے۔ مجھے ان عبارات سے بہت عقیدت ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

ص ۲۲۶/۲۹۲
ص ۲۲۷/۲۹۳

فصل

خدا تجھے قوت دے۔ یہ لفظ (ولایت) عام طور پر مستعمل ہے اور کتاب و سنّت اس پر ناطق ہے۔ خدا نے فرمایا: اَلَا اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ "بتحقیق دوستانِ حق (اولیاء) کے لیے نہ خوف ہے نہ حزن" نیز فرمایا نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ "ہم دنیوی اور اُخروی زندگی میں تمہارے دوست (اولیاء) ہیں" ایک اور جگہ فرمایا: اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا "اللہ تعالیٰ دوست (ولی) ہیں اہل ایمان کے" پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: ان من عباد اللّٰہ لعبادًا یغبطھم الانبیاء والشھداء قیل من ھم یا رسول اللّٰہ صفھم لنا لعلنا نحبھم قال قوم تحابوا بروح اللّٰہ من غیر اموال ولا اکتساب وجوھھم نور علی منابر من نور لا یخافون اذا خاف الناس ولا یحزنون اذا حزن الناس ثم تلا اَلَا اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ "اللہ کے بندوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ نبی اور شہید ان کو رشک سے دیکھتے ہیں۔ پوچھا حضور وہ کون ہیں؟ ان کا نشان ارشاد فرمائیے تاکہ ہم ان سے محبّت کریں۔ فرمایا وہ لوگ روح اللہ سے محبّت کرتے ہیں بغیر مال و منال ان کے چہرے نور سے جگمگاتے ہیں۔ وہ نور کی بلندیوں پر سرفراز ہوں گے۔ لوگ خوفزدہ ہوں گے انہیں کوئی خوف نہیں ہوگا۔ لوگ مبتلائے حزن و ملال ہوں گے اور ان کو کوئی حزن نہیں ہوگا۔ بتحقیق وہ اللہ کے دوست (اولیاء) ہیں نہ خوف زدہ نہ محزون"۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے نیز فرمایا بقول باری تعالیٰ: من آذی لی ولیًّا فقد استحلّ محاربتی "جس نے میرے دوست (ولی) کو ایذا پہنچائی وہ میرے ساتھ لڑنے پر آمادہ ہوا"۔

مطلب یہ ہے کہ خدائے عزّوجلّ کے ولی وہ ہیں جن کو دوستی اور ولایت سے سرفراز کیا گیا ہے جو اس قلمرو کے حاکم ہیں۔ برگزیدہ ہیں۔ آفاتِ طبعی سے پاک ہیں۔ خدائی افعال کے اظہار کا ذریعہ ہیں۔ مختلف کرامات کی استطاعت رکھتے ہیں۔ متابعتِ نفس سے بری ہیں۔ جن کی ہمّت بجز تائیدِ حق نہیں اور جن کی روش بجز راہِ حق نہیں۔ قبل ازیں اولیاء اللہ ہو گذرے ہیں، اب بھی ہیں اور قیامت تک ہوتے رہیں گے۔ کیونکہ باری تعالیٰ نے امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو شرف عطا کیا ہے اور ضمانت دی ہے کہ شریعتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی نگہداشت ہوتی رہے گی جس طرح خبری اور عقلی دلائل علماء میں موجود ہیں۔ دلائل غیبی بھی اولیاء اور خاصانِ حق میں موجود ہونے ضروری ہیں۔

ص ۲۲۸/۲۹۴

اس موضوع پر ہمارے مخالف دو گروہ (۱) معتزلہ اور (۲) حشویہ ہیں۔ معتزلہ برگزیدگانِ حق میں سے ایک کو دوسرے

پر فوقیت رکھنے (خاص ہونے) کا انکار کرتے ہیں حالانکہ ولی کی فوقیت سے انکار نبوت سے انکار کرنے کے برابر ہے اور یہ کفر ہے۔ حشویہ گروہ کے لوگ خاصانِ حق کا انکار تو نہیں کرتے مگر کہتے ہیں کہ خاصانِ حق ہو گذرے ہیں اب موجود نہیں ہیں۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ماضی اور مستقبل کا انکار برابر ہے۔ انکار کی ایک صورت، دوسری صورت سے زیادہ شدید نہیں ہوتی

اللہ تبارک و تعالیٰ نے برہانِ نبوت کو دوام بخشا ہے اور اولیائے کرام کو ان کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ وہ ہمیشہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آیات، دلایل اور صدق کو ظاہر کرتے رہتے ہیں۔ وہ گویا والیانِ عالم ہیں۔ وہ صرف اسی ذات کے تابع فرمان ہیں اور متابعتِ نفس سے بری ہیں۔ ان کی برکت سے آسمان سے بارش ہوتی ہے۔ ان کے صفائے باطن کے طفیل زمین سے نباتات پھوٹتی ہے ان کی توجہ سے مسلمان کفار پر فتحیاب ہوتے ہیں۔

ان اولیائے کرام میں چار ہزار روپوش ہیں وہ ایک دوسرے سے ناآشنا ہیں وہ اپنی خوبی باطن سے بھی آگاہ نہیں۔ ہر حال میں روپوش رہتے ہیں۔ اس پر احادیث نبوی بھی وارد ہیں اور اقوال اولیائے کرام بھی بالتواتر موجود ہیں۔ باری تعالیٰ کا شکر ہے کہ مجھے اس معاملے میں خبرِ عیاں میسر آئی۔

اہل لبست و کشاد اور درگاہِ حق کے پہرہ دار تین سو ہیں اور اخیار کہلاتے ہیں۔ چالیس اور ہیں جن کو ابدال کہتے ہیں۔ سات اور ہیں جو ابرار مشہور ہیں۔ چار اور جنہیں اوتاد کہتے ہیں۔ تین اور جو نقیب کہلاتے ہیں اور ایک اور جسے قطب یا غوث کہتے ہیں۔ یہ سب ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں اور کاروبار میں ایک دوسرے سے اجازت کے ضرورتمند ہوتے ہیں۔ احادیث اور روایات اس پر ناطق ہیں۔ اہلِ حقیقت اس کی صحت پر متفق ہیں۔ یہاں مقصد یہ نہیں کہ اس کی طویل تشریح کی جائے۔ عام اعتراض یہ ہے کہ جب وہ ایک دوسرے کو پہچانتے اور جانتے ہیں کہ ان میں سے ہر فرد ولی ہے تو ان سب کو اپنی عاقبت سے مطمئن اور بے نیاز ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ امر محال ہے کہ ولائت کی پہچان عاقبت سے مطمئن کر دے۔ جب یہ روا ہے کہ مومن کو اپنے ایمان کی خبر ہوتی ہے اور وہ مطمئن اور بے نیاز نہیں ہوتا تو یہ بھی روا ہے کہ ولی کو اپنی ولائت کا علم ہوتا ہے اور وہ مطمئن اور بے نیاز نہیں ہوتا۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ ازراہِ کرامت باری تعالیٰ ولی کو اس کی نیک عاقبت سے آگاہ کر دے جہاں تک اس کی صورت حال اور مخالفت سے حفاظت کا تعلق ہے۔ اس نقطہ پر مشائخ میں اختلاف ہے اور میں نے وجہ اختلاف ظاہر کر دی ہے۔

ایک گروہ ان چار ہزار روپوش اولیاء سے متعلق معرفتِ ولایت کو روا نہیں سمجھتے۔ دوسرا گروہ معرفتِ ولایت کا

قائل ہے۔ اہلِ فقہ و کلام بھی کچھ قائل ہیں کچھ نہیں۔ ابو اسحاق اسفرائنی اور متقدمین کی ایک جماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ ولی اپنی ولایت سے بے علم ہوتا ہے۔ استاد ابوبکر بن فورک اور کچھ متقدمین کا خیال ہے کہ ولی خود کو ولی جانتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ولی اگر خود کو ولی جانتا ہو تو اس میں کیا نقصان یا مصیبت ہے؟ اس گروہ کا قول ہے کہ ولی خود کو ولی سمجھ کر پندار میں مبتلا ہو سکتا ہے اور شرطِ ولایت حفاظتِ حق ہے اور جب کوئی آفت سے محفوظ ہو وہ سزاوارِ ولایت نہیں ہو سکتا۔ یہ بات نہایت عامیانہ ہے۔ یہ کیا کہ کوئی ولی ہو۔ اس سے کرامات اور خوارقِ عادات ظاہر ہوں اور وہ خود کرامت سے بے خبر ہو۔ کچھ لوگ ایک گروہ کی تقلید کرتے ہیں کچھ دوسرے کی۔ ان کی بات معتبر نہیں۔

ص ۲۳۰/۲۹۶

معتزلہ کسی بندے کے خاص ہونے یا کرامت کے سرے سے منکر ہیں۔ اور ولایت کی بنیاد ہی کرامت اور خصوصیت پر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر مسلمان تابعِ فرمانِ خداوندی ہوں تو سب اولیاء ہیں۔ جو کوئی احکامِ خداوندی کے مطابق ایمان قائم کرے، خدائی صفات اور رویتِ باری کا منکر ہو، مومن کے لیے بھی خلودِ دوزخ روا سمجھے، جوازِ شریعت کو بلا واسطہ، رسل و نزولِ کتب محض عقل کی کسوٹی پر پرکھے وہ ولی ہوتا ہے۔ درست ہے! سب مسلمانوں کے نزدیک وہ ولی ہوتا ہے مگر "شیطان کا ولی"۔ معتزلہ کہتے ہیں اگر ولایت کے لیے کرامت واجب ہوتی تو چاہیے یہ تھا کہ ہر مومن سے کرامت ظاہر ہوتی کیونکہ سب مسلمان ایمان میں مشترک ہیں۔ اور اگر اشتراکِ اصل موجود ہے تو اشتراکِ فرع بھی ہونا چاہیے۔ پھر کہتے ہیں کہ مومن اور کافر دونوں کے لیے کرامت روا ہے مثلاً سفر میں کوئی بھوکا ہے اس کے لیے کوئی میزبان سامنے آ جائے یا کوئی تھکا ماندہ ہے اسے سواری کے لیے جانور مل جائے۔ اگر یہ ممکن ہوتا کہ سفر ایک رات میں کٹ جائے تو پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے قصدِ مکہ (مدینہ منورہ سے) کے موقعہ پر خداوند تبارک و تعالیٰ یہ نہ کہتے:

ص ۲۳۱/۲۹۷

وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ "اٹھاتے ہیں تمہارے بوجھ کو اس شہر تک کہ تم بلا مشقتِ نفس پہنچ نہیں سکتے۔"

معتزلہ جھوٹے ہیں کیونکہ خدائے عزّ و جلّ نے فرمایا: سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ "پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کو رات کے وقت سیر کرائی خانہ کعبہ سے مسجدِ اقصیٰ تک جس کا ماحول برکت سے معمور ہے۔" بوجھ اٹھانے اور مکہ سے جانے کے لیے صحابہ کے جمع ہونے کا مطلب یہ تھا کہ یہ کرامت خاص تھی کرامت عام نہ تھی۔ اگر سب کے سب

از راہِ کرامت مکہ جانتے تو کرامت عام ہو جاتی اور ایمانِ غیبی ایمانِ عینی ہو جاتا اور ایمانِ غیبی کے جملہ احکام ساقط ہو جاتے۔ ایمان عمومیت کا پہلو رکھتا ہے اور اس میں مطیع اور عاصی سب شامل ہیں۔ ولایت ایک خاص چیز ہے۔ باری تعالیٰ کا حکم عام تھا اس لیے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو سب کی معیت میں بوجھ اٹھانے کا حکم فرمایا۔ جب امرِ خاص کا وقت تھا تو اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک رات میں مکہ سے بیت المقدس تک پہنچایا اور وہاں سے "قاب قوسین" کے مقام پر سرفراز فرمایا اور عالم کے سب زاویے اور گوشے دکھائے جب واپس آئے تو بہت سی رات ابھی باقی تھی۔ الغرض ایمان کا مقام عام ہے اور ولایت کا خاص۔ خصوصیت کا انکار صریح کج بحثی ہے۔ شاہی دربار میں چوکیدار، دربان، اردلی اور وزیر ہوتے ہیں۔ نوکر ہونے کی حیثیت سے سب برابر ہوتے ہیں مگر مقام سب کا جداگانہ ہوتا ہے۔ اسی طرح حقیقت میں مومن یکساں ہوتے ہیں لیکن کچھ گنہ گار، کچھ طاعت گذار، کچھ عالم و عابد، کچھ جاہل و کاہل۔ ظاہر ہے کہ خصوصیت کا انکار ہر چیز سے منکر ہونے کے برابر ہے۔ واللہ اعلم۔

فصل

مشائخ کرام نے حقیقتِ ولایت کے بہت سے رموز بیان کیے ہیں۔ جو کچھ ان بیانات سے مختصراً ممکن ہے بیان کرتا ہوں تاکہ پڑھنے والے مستفید ہو سکیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

ابو علی جرجانیؒ نے فرمایا "ولی وہ ہے جو خود میں فانی ہو اور مشاہدۂ حق میں باقی۔ اسے اپنی ذات کی خبر نہ ہو اور بجز ذاتِ حق کسی چیز سے سکونِ قلب نہ پا سکے"۔ بندہ ہمیشہ اپنی ذات سے متعلق گفتگو کرتا ہے جب اپنی ذات فنا ہو جائے تو خود سے متعلق ذکر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ غیر اللہ سے مانوس ہو کر حالِ دل کہنا رازِ حبیب کو فاش کرنے کے برابر ہے۔ رازِ حبیب غیر حبیب کے سپرد نہیں کیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں مشاہدۂ حق کے عالم میں نظر سوئے غیر اٹھ ہی نہیں سکتی اور غیرِ حق کی طرف نظر تک بھی نہ اٹھے تو غیر سے سکونِ قلب کی تلاش بے معنیٰ ہے۔

جنیدؒ نے فرمایا "ولی وہ ہے جسے کوئی خوف لاحق نہ ہو کیونکہ خوف اس چیز کا ہوتا ہے جس کے احتمال سے دل میں کراہت ہو یا اس خیال سے ہوتا ہے کہ محبوب جواب سامنے ہے غمِ فراق میں مبتلا نہ چھوڑ جائے۔ ولی

صاحب وقت ہوتا ہے۔ اس کے لیے کوئی مستقبل باعثِ ہراس نہیں ہو سکتا۔ باری تعالیٰ نے فرمایا: اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ "اولیاء اللہ کے لیے کوئی حزن و ملال نہیں"۔ خوف کی طرح ولی اللہ مبتلائے رجا بھی نہیں ہوتا۔ رجا مستقبل میں وصلِ محبوب کا نام ہے۔ یا یہ کہ کوئی مکروہ چیز دفع ہو جائے گی۔ ولی کو کوئی اندوہ دامنگیر نہیں ہوتا۔ کیونکہ اندوہ کدورتِ وقت سے جنم لیتا ہے جس کا مقام فردوسِ رضا اور گلشنِ موافقت ہو اسے اندوہ کہاں؛ عوام الناس کا خیال ہے کہ جب خوف و رجا اور اندوہ نہ ہو تو امن ہو گا۔ یہ بھی غلط ہے کیونکہ امن جلوۂ غیب سے محرومی اور وقت سے دور بھٹکنے کا نام ہے۔ یہ چیز یعنی فقدانِ امن ان لوگوں کا طرّہ امتیاز ہے جو اپنی بشریت سے بے نیاز ہوتے ہیں اور صفات سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔ خوف و رجا اور امن و اندوہ کا تعلق نفسِ انسانی سے ہے۔ جب یہ فنا ہو جائیں تو رضا انسانی صفت ہو جاتی ہے۔ جب رضا حاصل ہو جائے تو سالک مستقیم الحال ہو کر خالقِ حالات (محول) میں محو ہو جاتا اور حالات سے منہ پھیر لیتا ہے۔ اس وقت کشفِ ولایت ہوتا ہے اور اس کی حقیقت ولی کے باطن پر منکشف ہوتی ہے۔

ص ۲۳۲/۳

ابو عثمان مغربیؒ نے فرمایا "ولی دنیا میں مشہور ہوتا ہے لیکن دنیا سے محبت نہیں رکھتا"۔

ایک اور بزرگ نے کہا "ولی مستور ہوتا ہے مشہور نہیں ہوتا"۔

مطلب یہ کہ ولی وہ ہوتا ہے جس نے شہرت سے پرہیز کیا اور صرف اس بنا پر کہ شہرت فتنہ پرور ہوتی ہے بقول ابو عثمان شہرت روا ہے اگر باعثِ فتنہ نہ ہو۔ فتنے کی بنا کذب پر ہے۔ ولی اللہ کذب سے پاک ہوتا ہے اور اپنی ولایت میں صادق ہوتا ہے لفظ ولی کاذب پر چسپاں ہی نہیں کیا جا سکتا۔ کرامت کاذب سے ظہور پذیر ہو ہی نہیں سکتی اور فتنہ کاذب کی زندگی سے خارج ہو ہی نہیں سکتا۔ حاصل کلام وہی اختلاف ہے کہ کیا ولی کو اپنی ولایت کا علم ہوتا ہے؟ اگر علم ہو تو وہ مشہور رہے اگر علم نہ ہو تو مفتون ہے۔ "اس کی شرح بڑی طویل ہے"۔

کہتے ہیں ابراہیم ادھمؒ نے کسی شخص سے پوچھا "کیا تو ولی اللہ ہونا چاہتا ہے؟" اس نے جواب دیا "ہاں" آپ نے فرمایا "دنیا اور عاقبت کی کسی چیز سے وابستگی پیدا نہ کر، اپنے نفس کو فارغ کر اور اپنے سامنے اسی کی ذاتِ پاک کو رکھ"۔ حق تعالیٰ سے منہ پھیر کر دنیا سے رغبت کرنا فانی چیز میں الجھنے کے برابر ہے۔ عاقبت کی تمنا حق سے باقی چیز کی طرف روگرداں ہونے کے مترادف ہے۔ فانی چیز فنا ہو جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ

روگردانی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ باقی چیز کی طرف سے روگردانی کو بقا ہے۔ باقی چیز کو فنا نہیں۔ اس سے روگردانی کبھی فنا نہیں اور نیز کہا اپنی ذات کو خدا کی دوستی کے لیے فارغ کر۔ دنیا اور عاقبت کی ہوس سے پاک ہو بجان و دل خدا کی طرف رجوع کر۔ اگر یہ اوصاف موجود ہیں تو ولائت کا مقام کچھ دور نہیں۔

ص ۲۳۳/۳۰۱

ابو یزید بسطامیؒ سے پوچھا گیا کہ ولی کون ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا" ولی اسے کہتے ہیں جو باری تعالیٰ کے امر و نہی پر قائم رہے" حق تعالیٰ کی دوستی نصیب ہو تو اس کے احکام کی تعظیم دل میں زیادہ ہوتی ہے۔ اور نواہی سے جسم زیادہ دور رہتا ہے۔

ابو یزیدؒ سے لوگوں نے بیان کیا کہ فلاں شہر میں ایک ولی اللہ ہے۔ آپ نے اس کی زیارت کا ارادہ کیا۔ جب اس کی مسجد میں پہنچے تو وہ شخص گھر سے نکل کر مسجد میں آیا اور آتے ہی تھوک دیا۔ آپ اس کو سلام کیے بغیر واپس پلٹ آئے اور کہا کہ ولی شریعت کا پاسدار ہوتا ہے تاکہ باری تعالیٰ اس کا مقام برقرار رکھیں۔ اگر یہ شخص واقعی ولی ہوتا تو مسجد میں تھوکنے کا مرتکب نہ ہوتا۔ اپنی عزت کا لحاظ رکھتا۔ اپنے مقام کا حق ادا کرتا اور صحیح کرامت کے لائق ہوتا۔ اسی رات پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ انہوں نے فرمایا" اے ابو یزید! جو تو نے کیا خدا تجھے اس کی برکات سے نوازے" ابو یزید کہتے ہیں کہ دوسرے ہی روز مجھے وہ مقام نصیب ہوا جس پر فائز مجھے لوگ دیکھتے ہیں۔

کہتے ہیں ایک شخص ابو سعید کے پاس آیا۔ اس نے اپنا بایاں پاؤں پہلے مسجد میں رکھا۔ شیخ نے اسے ہٹا دیا اور کہا جو شخص دوست کے گھر داخل ہونے کے آداب سے ناواقف ہے وہ ہماری مجلس کے قابل نہیں۔

ملحدوں کا ایک گروہ صوفیائے کرام میں شامل ہو گیا ہے۔ اس گروہ کے لوگ کہتے ہیں کہ اتنی خدمت کرو کہ ولائت حاصل ہو جائے۔ جب ولائت حاصل ہو گئی خدمت کی ضرورت نہیں۔ یہ صریح گمراہی ہے۔ راہ حق میں کوئی مقام ایسا نہیں۔ جہاں خدمت (طاعت) کا کوئی رکن ساقط ہو جائے۔ مناسب جگہ اس کا مکمل ذکر ہو گا انشاء اللہ العزیز۔

ص ۲۳۴/۳۰۲

کرامت خرقِ عادت ہے جو تکلیفِ شرعی کے دائرے میں رہ کر ولی کے ہاتھوں معرضِ ظہور میں آئے وہ مردِ حق بھی ولی ہوتا ہے۔ جو خدا کے بخشے ہوئے علم کی بدولت از راہِ استدلال صداقت کو کذب سے علیحدہ کر سکے بعض اہل سنت والجماعت کا خیال ہے کہ کرامت ہو تو سکتی ہے مگر معجزہ کی حد تک نہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ خلاف عادت دعاؤں کا قبول

وغیرہ کرامت کے احاطہ سے باہر ہے میں پوچھتا ہوں کہ اگر کسی ولی کے ہاتھوں دائرۂ شریعت میں رہتے ہوئے کوئی خلافِ عادت کرامت ظہور پذیر ہو جائے تو اس میں کیا چیز قابلِ اعتراض ہے؟ اگر وہ یہ جواب دیں کہ کرامات تقدیرِ خداوندی سے باہر ہوتی ہیں تو یہ چیز سراسر غلط ہے۔ اگر وہ یہ کہیں کہ ہوتی تو عین تقدیر کے مطابق ہیں مگر ولی کے ہاتھوں ان کا ظہور منصبِ نبوت کی تفریض ہے اور انبیاء کی خصوصیات کا انکار۔ ظاہر ہے کہ یہ استدلال بھی غلط ہے کیونکہ ولی کی خصوصیت کرامت ہے اور نبی کی معجزہ۔ ولی ولی ہوتا ہے اور نبی نبی۔ ان میں کسی مشابہت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جس سے احتراز کیا جائے۔ پیغمبروں کا شرف و مرتبہ ان کے علوِہمت اور صفائے عصمت کی وجہ سے ہوتا ہے معجزہ، کرامت یا نقضِ عادت فعل کی وجہ سے نہیں۔ بنیادی طور پر سب معجزات برابر ہیں اور درجات میں ایک کو دوسرے پر فضیلت ہو سکتی ہے۔ جب خوارقِ عادات کے اصلاً متساوی ہونے کے باوجود انبیاء علیہم السلام میں فرقِ مراتب موجود ہے تو کیوں اولیائے کرام سے ظہورِ کرامت روا نہ سمجھا جائے اور انبیاء کا مرتبہ ان سے بلند تر ہے۔ جب انبیاء کرام کے لیے معجزہ یا ناقضِ عادت فعل باعثِ خصوصیت اور وجہ مرتبت نہیں تو اولیاء کرام سے ناقضِ عادت فعل (کرامت) کا ظہور نبی کے مقابل ولی کی خصوصیت کا باعث کیسے ہو سکتا ہے؟ اور وہ نبی کی برابری کیسے کر سکتا ہے؟ جو کوئی اہلِ خرد اس استدلال کو سمجھ لے یقیناً اس کے دل سے ہر شبہ دور ہو جائے گا۔ اگر کسی کے دل میں یہ خیال ہو کہ ولی ناقضِ عادت فعل پر قادر ہوتے ہوئے نبوت کا دعویٰ بھی کر سکتا ہے تو یہ چیز محال ہے کیونکہ ولایت کی شرطِ اہم صداقت ہے حقیقت کے خلاف دعویٰ کرنا کذب ہے اور کاذب ولی نہیں ہو سکتا۔ ولی کا دعوائے نبوت معجزہ پر دست اندازی کے برابر ہے اور یہ کفر ہے۔

کرامت بجز مومنِ مطیع کسی سے معرضِ ظہور میں نہیں آتی۔ جھوٹ طاعت نہیں بلکہ گناہ ہوتا ہے۔ اس زاویۂ نظر سے دیکھا جائے تو ولی اللہ کی کرامت اثباتِ حجتِ نبوت کے موافق ہوتی ہے۔ محض نکتہ چینی سے معجزہ اور کرامت میں اشتباہ ثابت نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم معجزات سے اثباتِ نبوت کرتے ہیں۔ ولی اللہ کرامت سے اثباتِ نبوت پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ اثباتِ ولایت بھی کرتا ہے۔ ولی بنامِ ولائت وہی کہتا ہے جو نبی بزورِ نبوت ولی کی کرامت عین معجزۂ نبی ہوتی ہے۔ مومن کا ایمان ولی کی کرامت دیکھ کر نبی کی صداقت پر پختہ تر ہو جاتا ہے۔ اور شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

نبی اور ولی کی دعوت میں کوئی چیز متضاد نہیں ہوتی جو ایک دوسرے کی نفی کرے۔ فی الحقیقت ولائت نبوت کی

ص ۲۳۵/۳۰۲

ص ۲۳۶/۳۰۴

عین تائید ہوتی ہے۔ جیسے شریعت میں ورثہ کے معاملے میں جب ایک گروہ کے تمام افراد اپنے دعویٰ میں اتفاق رائے رکھتے ہوں تو ایک فرد کی اثباتِ حجت سب پر یکساں عائد ہوتی ہے۔ اگر دعویٰ متضاد ہو تو ایک کا فیصلہ دوسروں کے لیے حجت نہیں بن سکتا۔ نبی معجزہ کی دلیل پر مدعی نبوت ہوتا ہے اور ولی کرامت کی بنا پر اس کی تصدیق کرتا ہے۔ دونوں میں کوئی اشتباہ کا احتمال رونما نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

معجزہ اور کرامت کا فرق

یہ ثابت ہو چکا کہ معجزہ یا کرامت جھوٹے مدعی کے ہاتھوں ظہور پذیر نہیں ہوتے۔ اب ان کا فرق بیان کرنا ضروری ہے تاکہ بات صاف اور واضح ہو جائے۔

معجزہ کی شرط یہ ہے کہ وہ ظاہر ہو۔ کرامت کے لیے اخفا ضروری ہے کیونکہ معجزہ کا نتیجہ اوروں کے لیے ہوتا ہے اور کرامت کا صاحبِ کرامت کے لیے۔ علاوہ ازیں صاحب معجزہ کو معجزہ کا علم ہوتا ہے ولی کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ظہور پذیر ہونے والا فعل کرامت ہے یا استدراج۔ نبی حکم خداوندی کے تحت شریعت میں تصرف کرتا ہے۔ اور حکم خداوندی کے تحت اسے مرتب کرتے ہوئے استدراج کی نفی یا اثبات کرتا ہے۔ صاحبِ کرامت کو بجز تسلیم اور قبولِ احکام کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ ولی کی کرامت کسی حالت میں بھی شریعتِ نبوی کے منافی نہیں ہو سکتی۔

ص ۲۳۷/۳۰۵

اگر کوئی یہ کہے کہ تمہارے اپنے قول کے مطابق معجزہ خرقِ عادت ہے اور نبی کی صداقت کی دلیل ہے۔ اور پھر تمہارے ہی خیال کے مطابق خرقِ عادت ولی کے لیے بھی روا ہے تو یہ ایک عامیانہ بات ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ معجزہ کی حقیقت کا ثبوت کرامت کی حقیقت کی دلیل کو از خود قطع کر دیتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ معاملہ یہ نہیں ہے۔ کرامتِ ولی معجزۂ نبی کی ہم شکل ہوتی ہے۔ دونوں ایک ہی قسم کے اعجاز کا مظہر ہیں اور اعجاز منافیٔ اعجاز نہیں ہو سکتا۔

جب کفارِ مکہ حضرت خبیب رضؓ کو دار پر لٹکا رہے تھے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی میں بیٹھے ہوئے صورتِ حالات دیکھ لی اور صحابہ کرامؓ کو مطلع کر دیا۔ خدائے عزّ وجلّ نے خبیب رضؓ کی آنکھوں سے بھی پردے اٹھا دیئے۔ انہوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور سلام عرض کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام سنا اور دعائے خیر کی۔ خبیب رضؓ رو بہ قبلہ ہو گئے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں تھے۔ انہوں نے خبیب رضؓ کو دیکھا۔ یہ خرقِ عادت معجزہ تھا۔ حضرت خبیب رضؓ نے مکہ معظمہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا۔ یہ ان کی کرامت تھی۔ یہ رویتِ غیب بھی خرقِ عادت تھا۔ غیبتِ مکانی اور غیبتِ زمانی

ص ۲۳۸/۳۰۶

میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔ کرامتِ نبیب رضؓ ایسے عالم میں ظہور پذیر ہوئی۔ جب وہ مکانی طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دُور تھے۔ اس کے بعد کرامات ایسے بزرگوں سے معرضِ ظہور میں آئیں جو زمانی طور پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دور تھے۔ یہ فرق بیّن ہے اور ظاہر دلیل ہے کہ کرامت پیغمبر کے معجزہ کے منافی نہیں ہو سکتی۔ کرامت کو کرامت نہیں کہہ سکتے۔ جب تک وہ صاحبِ معجزہ پیغمبر کی تصدیق نہ کرے اور ایسے ولی کے ہاتھوں ظہور پذیر نہ ہو جو طاعت گزار اور صاحبِ ایمان ہو۔ کرامت در اصل پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا غیر معمولی معجزہ ہے۔ ان کی شریعت منتقل ہے اور اسی بنا پر ان کی حجتِ نبوت بھی منتقل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منصبِ نبوت کے اولیا رکرام گواہ ہیں اور غیر ممکن ہے کہ کرامت کسی بیگانہ کے ہاتھوں معرضِ ظہور میں آئے۔

یہاں ابراھیم خواصؒ کا ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں اپنی عادت کے مطابق گوشہ نشینی کی نیت سے جنگل میں گیا۔ گوشۂ جنگل سے ایک شخص نمودار ہوا اور مجھ سے مجالست کا خواہش مند ہوا۔ میں نے اس کو دیکھا تو میرے دل میں کراہت پیدا ہوئی۔ اس نے کہا اے ابراھیم! آزردہ دل نہ ہو۔ میں عیسائی ہوں۔ ان کے صابیوں میں شمار ہوتا ہوں اور بلادِ روم کے نواح سے آیا ہوں اور صرف تیری مجلس میں باریابی کی خواہش ہے۔ جب یہ معلوم ہوا کہ وہ بیگانہ ہے تو میرے دل کو قدرے تسکین ہوئی اور اس کے ساتھ مجالست کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ میں نے کہا "اے راہب میرے پاس کھانا پانی نہیں تجھے تکلیف ہو گی"۔ اس نے جواب دیا۔ "افسوس ہے ابراھیم اقصائے عالم میں اتنا مشہور ہے مگر ابھی تک اسے کھانے پینے کا غم ہے"۔ راہب کی خوش کلامی اور معقول گوئی سے ابراہیمؒ متعجب ہوئے اور از راہِ آزمائش اس کی مجالست پر راضی ہو گئے تاکہ اس کی بساط اور اس کا مقام دیکھ سکیں۔ سات شبانہ روز چلنے کے بعد پیاس نے غلبہ کیا۔ عیسائی راہب ٹھہر گیا اور بولا "اے ابراہیم! دنیا میں تیرے نام کے اتنے ڈھول پیٹے جا رہے ہیں۔ بارگاہِ حق میں جو اعزاز تجھے حاصل ہے بروئے کار لا۔ میں پیاس کی شدت برداشت نہیں کر سکتا"۔ ابراہیمؒ نے سربسجدہ ہو کر پکارا۔ "اے باری تعالیٰ! مجھے اس کافر کے سامنے رسوا ہونے سے بچا۔ اسے باوجود بیگانہ ہونے کے میرے متعلق خوش فہمی ہے۔ الٰہی اس کی خوش فہمی میں فرق نہ آنے دے"۔ اس دعا کے بعد ابراہیمؒ نے سر اٹھایا تو ایک طاس سامنے تھا جس میں دو روٹیاں اور دو پیالے شربت موجود تھے۔ دونوں کھا پی کر پھر چل پڑے۔ سات شبانہ روز اور گزر گئے۔ ابراہیمؒ نے سوچا کہ اس عیسائی کی آزمائش کرنی چاہیئے تاکہ اسے اپنی بے مائگی کا احساس ہو جائے اور وہ بارِ دیگر امتحان کرنے کی غرض سے معارض نہ ہو۔ کہا۔ "اے

ص ۲۳۹/۳۰۷

راہبِ نصاریٰ! اب تیری باری ہے تیرے مجاہدہ کا کوئی ثمرہ ہے تو سامنے لا"۔ اس نے بھی سر بزمین ہو کر کچھ کہا۔ ایک طشت سامنے آیا جس میں چار روٹیاں اور چار پیالے شربت کے رکھے ہوئے تھے۔ ابراہیمؒ کو سخت تعجب ہوا۔ کبیدہ خاطر ہوئے اور اپنے حال سے ناامیدی کے عالم میں بولے "میں یہ نہیں کھاؤں گا۔ یہ طعام کافر کے لیے ظاہر ہوا ہے اور وہ از راہِ اعانت پیش کر رہا ہے"۔ راہب نے کہا "کھائیے"۔ ابراہیمؒ نے فرمایا "میں نہیں کھا سکتا۔ تو اس کا سزاوار نہیں یہ چیز تیرے لیس کی نہیں۔ مجھے حیرت ہے۔ کرامت خیال نہیں کر سکتا کیونکہ کرامت کافر کے ہاتھوں ظہور پذیر نہیں ہو سکتی اور اگر تیری طرف سے اعانت سمجھ کر قبول کروں تو تجھے مدعیٔ صادق تصور کرنے میں مجھے عار ہے"۔ راہب نے پھر کہا "آپ کھائیں، میں آپ کو دو چیزوں کی بشارت دیتا ہوں۔ ایک تو میں مسلمان ہوتا ہوں (کلمۂ شہادت پڑھا) دوسرے یہ کہ جناب ربانی میں آپ کی بڑی قدر و منزلت ہے"۔ پوچھا کیسے، کہا "ہم لوگ ایسی چیزوں کے سزاوار نہیں میں آپ سے شرم محسوس کرتے ہوئے سربسجدہ ہوا تھا اور دعا کی تھی کہ اے خدا اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین سچا اور پسندیدہ ہے تو مجھے دو روٹیاں اور دو پیالہ شربت عطا فرما اور اگر ابراہیم خواصؒ حقیقتاً ولی ہے تو دیگر دو روٹیاں اور دو پیالہ شربت مرحمت فرما۔ جب سر اٹھایا تو یہ طشت موجود پایا"۔ ابراہیمؒ نے اس طعام سے نوش کیا۔ راہبِ جوانمرد نے بزرگانِ دین میں جگہ پائی۔ یہ عین معجزہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تھا جو کرامتِ ولی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک نبی کی عدم موجودگی میں کوئی عام آدمی نبوت کی دلیل پیش کرے اور ولی کی موجودگی میں کوئی غیر ولی کرامتِ ولی کا حقدار بن جائے۔ فی الحقیقت انتہائے ولایت ابتدائے نبوت ہے۔ وہ راہب فرعون کے جادوگروں کی طرح مخفی طور پر صاحبِ ایمان تھا۔ ابراہیمؒ نے اعجازِ نبوت کی صداقت ثابت کی۔ راہب بھی صداقتِ نبوت اور توقیرِ ولایت کا دلدادہ تھا۔ خدائے بزرگ نے اسے بھی دولتِ مقصود سے سرفراز فرمایا۔ یہ ہے فرق کرامتِ ولی اور اعجازِ نبی میں۔ اس بارہ میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے مگر کتاب میں گنجائش نہیں۔ قطع نظر اس سے کہ اولیاء کے لیے اظہارِ کرامات بھی کرامت ہے اور اس کے لیے اخفا شرط ہے اظہار بہ تکلف روا نہیں۔ میرے پیرِ طریقت کا قول ہے کہ اگر ولی اظہارِ ولایت کرے اور اس کا دعویدار رہو تو یہ اس کی صحتِ حال کے لیے نقصان دہ نہیں۔ البتہ تکلفاً اظہارِ ولایت کرنا رعونت ہے واللہ اعلم۔

ص ۲۳۹ / ۳۰۸

ص ۲۴۰ / ۳۰۹

مدعیانِ الوہیت کے معجزات

مشائخِ کبار اور جملہ اہل سنت والجماعت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ خوارقِ عادات از قسم معجزہ و کرامت

کافر کے ہاتھوں بھی رونما ہو سکتے ہیں تاکہ اسبابِ اشتباہ ختم ہو جائیں اور کسی کو ان کے جھوٹ ہونے سے متعلق کوئی شبہ نہ رہے۔ ظہور ہی جھوٹ کو ثابت کرتا ہے مثلاً فرعون نے چار سو سال عمر پائی اور اس عرصے میں کوئی بیماری اس کے نزدیک نہ آئی۔ پانی اس کے عقب میں بلندی پر چڑھ جاتا تھا۔ وہ ٹھہرتا تو پانی بھی تھم جاتا تھا۔ اس کی رفتار کے ساتھ ساتھ پانی بھی رواں رہتا تھا۔ ان تمام چیزوں کے باوجود کسی اہلِ خرد کو اس کے دعوائے الوہیت کے لچر ہونے میں شبہ نہیں کیونکہ اہلِ ہوش جانتے ہیں کہ خدائے عزّ وجلّ کی ذاتِ اقدس مجسم و مرکب نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح شداد (صاحبِ ارم) اور نمرود سے متعلق محیر العقول باتیں مشہور ہیں۔ ثقہ روایات کی بنا پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قربِ قیامت میں دجّال رونما ہو گا اور دعوائے الوہیت کرے گا۔ اس کے دونوں ہاتھوں پر دو پہاڑ ہوں گے۔ دائیں ہاتھ کا پہاڑ مقامِ راحت ہو گا اور بائیں ہاتھ کا جائے عذاب۔ وہ لوگوں کو دعوت دیگا اور اطاعت نہ کرنے والوں کو سزا دے گا۔ لیکن وہ ہزار حیرت انگیز مظاہروں کے باوجود اہلِ نظر کے لیے مفتری اور کاذب ہے کیونکہ خدا گدھے پر سواری نہیں کرتا اور آنکھ سے اندھا نہیں۔ یہ جملہ چیزیں استدراج کے تحت آتی ہیں۔ اسی طرح نبوت کا مدعی کاذب بھی غیر معمولی افعال کی نمائش کر سکتا ہے مگر اس کی نمائش اس کے جھوٹ کو ثابت کرتی ہے جس طرح سچے نبی کے معجزات اس کی صداقت کی دلیل ہوتے ہیں۔ مگر یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ خوارقِ عادات ظہور پذیر نہیں ہو سکتے۔ اگر اشتباہ کا احتمال ہو اور صداقت کو کذب سے تمیز کرنے میں کسی دقت کا سامنا ہو۔ یہ صورت نہ ہو تو یقیناً اصولِ بعثت پر حرف آتا ہے کیونکہ طالب نہیں جانتا کہ کسے سچا سمجھے اور کسے جھوٹا۔

ص ۲۴۱/۳۱۰

یہ روا ہے کہ مدعیِ ولائت کے ہاتھوں از قسمِ کرامت کوئی چیز ظہور پذیر ہو گو بظاہر اس کے معاملات درست نہ ہوں کیونکہ اظہارِ کرامت سے وہ صداقتِ نبوّت کو ثابت کرتا ہے اور اس فضل و مکرمت کو نمایاں کرتا ہے جو بارگاہِ حق سے اسے ارزاں ہوا ہو۔ اسے اپنی طاقت اور قدرت کا مظاہرہ مدِ نظر نہیں ہوتا۔ جو شخص ایمان کے معاملے میں بلا اظہارِ خوارق سچا ہو وہ ولایت کے معاملے میں اظہارِ خوارق کے ساتھ بھی سچا ہی ہو گا۔ کیونکہ اس کا اعتقاد ولی کے اعتقاد کے ہم پایہ ہوتا ہے اگرچہ اس کے اعمال ظاہر اس کے اعتقاد کے عین مطابق نہیں ہوتے۔ اعمالِ ظاہر کی خرابی اس کی ولائت کی نفی نہیں کرتی جس طرح یہ چیز ایمان کی نفی نہیں کرتی۔ وہ اصل کرامت اور ولائت انعامِ خداوندی ہیں، مکاسبِ انسانی نہیں۔ کسبِ انسانی حقیقتِ ہدائت کا سبب نہیں ہو سکتا۔

ص ۲۴۲/۳۱۱

میں قبل ازیں کہہ چکا ہوں کہ ولی گناہوں سے پاک نہیں ہوتا۔ کیونکہ گناہوں سے پاک ہونا صرف نبوت کی

شرط ہے۔ تاہم اولیا، ہر اُس آفت سے کترا کر نکلتے ہیں جو نفیِ ولائت کی مقتضی ہو۔ ولائت منقطع ہوتی ہے مگر صرف سقوطِ ایمان اور ارتداد سے، گناہ سے نہیں۔ یہ محمد بن علی حکیم ترمذی، جنید، ابوالحسن نوری اور حارث محاسبی رضی اللہ عنہم کا مکتبۂ خیال ہے۔ اہلِ معاملات جیسے سہیل بن عبداللہ تستری، ابوسلیمان درانی اور ابوحمدون قصار رضی اللہ عنہم کے مطابق دوامِ طاعت شرطِ ولائت ہے۔ ارتکابِ گناہ کبیرہ سے ولائت چھن جاتی ہے۔

جیسے اوپر بیان ہوا باتفاق آئمہ کرام گناہ کی وجہ سے انسان ایمان سے خارج نہیں ہوتا۔ ایک ولائت کو دوسری ولائت پر فوقیت نہیں ہوتی۔ جب ولائتِ معرفت جو سب کرامات کا سرچشمہ ہے گناہ سے ساقط نہیں ہوتی تو یہ امرِ محال ہے کہ شرف و مکرمت میں کمتر چیز گناہ سے ساقط ہو جائے۔ مشائخ کبار میں صرف اس موضوع پر طویل اختلافات ہیں۔ یہیں سب کو معرضِ بیان میں نہیں لانا چاہتا۔ اس معاملے میں اہم ترین چیز یہ ہے کہ یقینی طور پر اس بات کا علم ہو کہ صاحبِ ولائت سے کرامت کس عالم میں ظہور پذیر ہوئی ہے۔ صحو میں یا سکر میں، غلبہ یا تمکین میں۔ صحو و سکر کی مکمل تشریح مکتبۂ ابویزید کے تحت کی جا چکی ہے۔

ص ۲۴۳/۳۱۲

ابویزید، ذوالنون مصری، محمد بن خفیف، حسین بن منصور، یحییٰ بن معاذ الرازی رضی اللہ عنہم اور ان کے ساتھ ایک جماعت کا خیال ہے کہ ولی کا اظہار کرامت حالتِ سکر (مستی و بے ہوشی) میں ہوتا ہے۔ عالم صحو میں صرف معجزۂ نبی ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک کرامت اور معجزہ میں یہی واضح فرق ہوتا ہے کہ ولی اظہارِ کرامت کے وقت حالتِ سکر میں ہوتا ہے، مغلوب الحال ہونے کی وجہ سے دعوت سے معذور ہوتا ہے۔ نبی کا معجزہ عالم صحو میں ظاہر ہوتا ہے۔ وہ غالب ہوتا ہے اور لوگوں کو دعوتِ معارضہ دیتا ہے۔ اسے معجزہ کو پردۂ اخفا میں رکھنے یا ظاہر کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔ اولیاء کرام کو یہ مقام نہیں ملتا ان کو کرامت پر اختیار نہیں ہوتا بعض اوقات وہ ظہور کرامت چاہتے ہیں مگر ظاہر نہیں ہوتی اور بعض اوقات وہ کرامت نہیں چاہتے مگر وہ معرضِ ظہور میں آ جاتی ہے۔ ولی کے لیے دعوت لازمی نہیں ہوتی تاکہ اس کے اوصاف قائم رہیں۔ وہ پردۂ اخفا میں ہوتا ہے اور اس کی صحیح حالت یہی ہے کہ اس کے اوصاف روبہ فنا ہوں۔

نبی (پیغمبر) صاحبِ شریعت ہوتا ہے اور ولی صاحب دل اور اس لیے ولی سے کرامت ظہور میں نہیں آتی جب تک اس پر عالمِ بے خودی طاری نہ ہو اور وہ کلیتہً تصرف حق میں نہ ہو۔ اس حالت میں اس کی جملہ گفتار

گویا تالیفِ حق ہوتی ہے۔ صفتِ بشریت کی درستی یا لاہی کہوتی ہے یا ساھی کیا مطلق الٰہی کو بنی نہ لاہی ہوتے ہیں نہ ساہی۔ بجز انبیاء کوئی مطلق الٰہی نہیں ہوتا۔ بجز اولیاء کوئی لاھی نہیں ہوتا۔ جب تک اولیاء کی بشریت قائم ہو وہ محجوب ہوتے ہیں جب عالمِ کشف میں ہوں تو مدہوش و متحیر ہو جاتے ہیں الطافِ خداوندی کے پیشِ نظر۔ اظہار کرامت حالتِ کشف کے بغیر درست نہیں۔ کیونکہ یہ مقامِ قرب ہے اور اس وقت حاصل ہوتا ہے جب پتھر اور سونا دل کے نزدیک برابر ہوں۔ یہ مقام صرف انبیاء کرام کا ہے اور وں کو عارضی طور پر ارزاں ہوتا ہے اور وہ بھی صرف عالمِ سکر ومستی ہیں۔ چنانچہ ایک روز حارثہ اس دنیا سے منقطع اور دوسری دنیا سے دوچار تھے انہوں نے کہا "میں نے اپنے آپ کو اس دنیا سے منقطع کر لیا۔ اس کے پتھر، سونا، چاندی اور مٹی میرے لیے برابر ہیں"۔ دوسرے روز لوگوں نے اسے خرما کے درخت پر کام کرتے ہوئے دیکھا۔ پوچھا یہ کیا؟ حارثہ نے جواب دیا "طلبِ روزی میں مصروف ہوں اس کے بغیر چارہ نہیں"۔ پہلے مقام کی وہ کیفیت تھی اور دوسرے کی یہ۔ المختصر صحو اولیاء کے لیے ایک عام کیفیت ہے اور سُکر مقامِ انبیاء ہے وہ حالتِ سکر میں راجع بحق ہوتے ہیں اور جب پلٹتے ہیں تو عام لوگوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کا سکر سنورتا ہے اور وہ خلق کے لیے سنورتے ہیں۔ سب عالم ان کے لیے سونا ہو جاتا ہے۔ بقولِ شبلیؒ "ہم جہاں گئے سونا ہی سونا پایا۔ جدھر قدم اٹھائے موتی ہی موتی نظر آئے۔ تمام فضا میں چاندی پھیلی ہوئی تھی۔"

استاد ابوالقاسم قشیریؒ سے روایت ہے کہ ایک موقعہ پر انہوں نے طابرانی سے ابتدائے حال سے متعلق دریافت کیا طابرانی نے بیان کیا "مجھے ایک پتھر کی ضرورت تھی میں سرخس میں دریا کی وادی میں تلاش کر رہا تھا مگر جس پتھر کو اٹھاتا وہ موتی ہوتا تھا"۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پتھر اور موتی اس کی نظر میں یکساں تھے بلکہ موتی کم قیمت تھے کیونکہ اسے ان کی ضرورت نہ تھی۔

ص ۲۴۳/۳۱۲ ص ۲۴۴/۳۱۴

مجھے سرخس میں امام خوارزمی نے کہا میں لڑکپن میں ایک دفعہ ریشم کے کیڑوں کے لیے شہتوت کے پتے تلاش کرتے ہوئے جنگل میں گیا اور ایک درخت پر چڑھ کر پتے جھاڑنے لگا۔ شیخ ابوالفضل بن حسینؒ ادھر سے گذرے میں شہتوت پر تھا ان کی نظر مجھ پر نہ پڑی۔ میں سمجھا کہ وہ خود سے غائب ہیں اور مشغول بحق ہیں۔ انہوں نے عالم انبساط میں سر اٹھایا اور کہا "باری تعالیٰ! ایک سال سے زائد عرصہ ہو گیا مجھے بال کٹوانے کے لیے چاندی کا ایک بھی سکہ

عطا نہیں ہوا کیا دوستوں کے ساتھ یہی کچھ روا رکھا جاتا ہے۔"

ص ۲۴۵/۳۱۵

میں نے دیکھا یکبارہ درختوں کے سب پتے، ننانویں اور تنے سونے کے ہوگئے۔ شیخ ابوالفضل نے کہا۔ "واہ وا۔ ہم کنایتاً بھی کچھ کہہ دیں تو گویا راہِ وفا سے پرے ہٹ گئے۔ تیرے حضور کشائشِ دل کے لیے بھی لب کشائی نہیں ہوسکتی۔"

شبلیؒ سے متعلق مشہور ہے کہ انہوں نے چار ہزار دینار دریائے دجلہ میں ڈال دیئے لوگوں نے پوچھا یہ کیا؟ فرمایا "پتھر کو پانی ہی میں ڈالنا چاہیئے"۔ لوگوں نے کہا۔ آپ نے کسی اور کو دے دیئے ہوتے۔ فرمایا خدا کی پناہ! کیا وہ سامانِ حجاب جو مجھے اپنے لیے گوارا نہیں اپنے برادرانِ اسلام کے دلوں پر مسلط کر دوں۔ خدا کو کیا جواب دوں گا؟ کسی مسلمان بھائی کو اپنے سے کمتر سمجھنا شرطِ اسلام نہیں۔ یہ سب حالتِ سکر کا معاملہ ہے اور اس کی تشریح ہو چکی ہے۔ یہاں مدِ نظر اثباتِ کرامت ہے۔

جنید، ابوالعباس سیاری، ابوبکر واسطی، اور محمد بن علی ترمذی رضی اللہ عنہم جملہ بزرگانِ دین کا خیال ہے کہ کرامت عالمِ صحو و تمکین میں ظہور پذیر ہوتی ہے اور سکر کو اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وہ کہتے ہیں اولیاء کرام حاکمانِ وقت ہوتے ہیں۔ خدائے عزّ و جل ان کو جہان کا کارپرداز اور والی بناتا ہے۔ بند و بستِ عالم ان کی تحویل میں دے دیتا ہے۔ کوائفِ حیات ان کی ہمت سے وابستہ ہوتے ہیں۔ لازماً ان کی رائے تمام آراء سے محکم ترین ہوتی ہے۔ ان کے دل تمام دلوں سے شفیق ترین ہوتے ہیں۔ اور وہ درجۂ کمال پر متمکن ہوتے ہیں۔ شور و مستی ابتدائے حال میں رونما ہوتی ہے۔ کمال کو پہنچ کر شور مبدّل بہ تمکین ہو جاتا ہے وہ صحیح ولایت پر فائز ہو جاتے ہیں۔

اہلِ تصوف میں مشہور ہے کہ اوتاد کو ہر شب جہان کے گرد چکر لگانا ہوتا ہے اگر کوئی جگہ نظر انداز ہو جائے اور وہاں خلل رونما ہو تو یہ قطب کو اطلاع دیتے ہیں تاکہ وہ توجہ دے اور اس کی برکت سے وہ خلل یا فساد رفع ہو جائے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ سونا اور مٹی ان کے نزدیک یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ علامتِ سکر ہے اور کوتاہیٔ نظر پر مبنی ہے اس کی کوئی توقیر نہیں۔ توقیر اسی میں ہے کہ سونے کو سونا اور مٹی کو مٹی سمجھا جائے اور ان کے شر سے کما حقہٗ واقفیت ہو۔ بقول "اے زرد اور اے سفید میرے سوا کسی اور کو فریب دے"۔ یعنی اے زرِ زرد اور سیمِ سفید فریب کسی اور کو دے۔ میں تجھے دیکھ کر مغرور نہیں ہو سکتا کیونکہ تیرے شر کا مجھے علم ہے۔

جو کوئی بھی سیم و زر کے شر سے آشنا ہوتا ہے۔ وہ دونوں کو باعثِ حجاب سمجھتا ہے اور دونوں کو ترک کرنے کی دعوت دے کر ثواب کا مستحق ہوتا ہے جس کی نظر میں زر مٹی کے برابر ہو وہ مٹی کو ترک کرنے کی تلقین نہیں کر سکتا چنانچہ حارثہؓ نے عالم سکر میں کہا کہ سونا، پتھر، چاندی اور مٹی سب برابر ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ صاحب صحو تھے۔ مال و منالِ دنیا کو قبضہ و اختیار میں رکھنے کی آفت سے واقف تھے صحیح روش سے آشنا تھے۔ جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا "اپنے اہل و عیال کے لیے کیا رکھا؟" عرض کی "خدا اور خدا کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)"

ص ۲۴۶/۳۱۶

ابوبکر وراق ترمذیؒ کہتے ہیں کہ ایک روز مجھے محمد بن علیؒ نے کہا "اے ابوبکر! آج ہم تمہیں ایک جگہ لے جائیں گے" میں نے عرض کی "جیسا حکم"۔ ہم چلے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہمارے سامنے ایک سنسان جنگل تھا۔ دیکھا کہ ایک سرسبز درخت کے نیچے تخت بچھا ہوا ہے۔ پاس ہی ایک چشمہ آب رواں ہے۔ ایک آدمی تخت پر بیٹھا ہوا ہے۔ جب محمد بن علیؒ قریب پہنچے وہ آدمی کھڑا ہو گیا اور تخت ان کے لیے خالی کر دیا۔ تھوڑی دیر میں چاروں طرف سے لوگ آنے شروع ہوئے جب چالیس کے قریب جمع ہو گئے۔ انہوں نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ طعام نازل ہوا۔ ہم سب نے مل کر کھایا۔ محمد بن علیؒ نے کوئی سوال پوچھا۔ اس بزرگ نے اس کے جواب میں بہت کچھ کہا مگر میری سمجھ میں ایک لفظ بھی نہ آیا۔ کچھ دیر کے بعد اجازت طلب کی۔ مجھ سے کہا جاؤ تمہیں سعادت نصیب ہوئی۔ ترمذ واپس پہنچ کر میں نے پوچھا "یہ جگہ کیا تھی اور یہ شخص کون تھا؟" فرمایا "یہ تیہ بنی اسرائیل تھا اور وہ شخص قطب المدار تھا" میں نے پھر پوچھا "یا شیخ ہم اتنے عرصے میں تیہ بنی اسرائیل کیسے پہنچ گئے" فرمایا "تمہیں پہنچنا تھا پوچھنے سے کیا مطلب؟ اور اس کی کیفیت دریافت کرنے سے کیا غرض؟"

ص ۲۴۷/۳۱۷

یہ علاماتِ صحت حال ہیں۔ سکر کو ان میں دخل نہیں۔ میں اب بیان کو مختصر کرتا ہوں کیونکہ اگر پوری تفصیل کو سامنے لاؤں تو کتاب طویل ہو جائے گی اور مطلب فوت ہو جائے گا میں صرف چند دلائل جو اس کتاب سے متعلق ہیں اور اولیاء کی کرامات و حکایات سے وابستہ ہیں پر اکتفا کروں گا تاکہ مطالعہ سے مریدوں کو آگاہی حاصل ہو۔ عالموں کی راحت، محققین کی یادداشت اور عوام کا یقین زیادہ ہو شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہے انشاء اللہ تعالیٰ۔

کراماتِ اولیاء کرام

صحتِ کرامات عقلی دلائل سے ثابت ہو چکی اور منطقیانہ ثبوت بہم پہنچا دیا گیا۔ اب ضروری ہے کہ کتابی دلائل بھی

سامنے آجائیں اور وہ کچھ بھی بیان کیا جائے جو صحیح احادیث میں موجود ہے۔

کرامات اور اہلِ ولایت سے ظہورِ خوارقِ عادت سے متعلق قرآن و حدیث ناطق ہیں اور ان کا انکار گویا نصِ قرآنی سے منکر ہونا ہے۔

پہلی چیز تو یہ ہے کہ خدائے عزوجل نے قرآن میں فرمایا: وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ہم نے تم پر بادلوں کا سایہ کیا اور تمہارے لیے من وسلویٰ نازل ہو گیا۔ اگر کوئی منکر یہ کہے کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا تو ہم کہیں گے بالکل بجا ہے۔ کیونکہ کراماتِ اولیا رکرام بھی جملہ معجزات محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور پھر اگر کوئی یہ کہے کہ موسیٰ علیہ السلام تو موجود تھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت موجود نہیں ہیں اس لیے کوئی کرامت ان کا معجزہ نہیں ہو سکتی۔ ہم کہتے ہیں کہ جب موسیٰ علیہ السلام موجود نہیں تھے اور طور پر چلے گئے تو ابر اور من وسلویٰ کا سلسلہ بدستور قائم تھا۔ غیبتِ مکانی اور غیبتِ زمانی میں کوئی فرق نہیں اگر غیبتِ مکانی میں معجزہ روا تھا تو غیبتِ زمانی میں ناروا نہیں ہو سکتا۔

ص ۲۴۸/۳۱۸

دوسرے ہم آصف برخیا کی کرامت سے متعلق جانتے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام چاہتے تھے کہ بلقیس کا تخت اس کی آمد سے پہلے سامنے آجائے۔ حق تعالیٰ کا بھی ایما تھا کہ آصف کا شرف اہلِ علم پر ظاہر ہو اور نیز لوگ جان لیں کہ اولیاءِ کرام سے ظہورِ کرامت جائز ہے۔ چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا کون ہے جو بلقیس کا تخت اس کی آمد سے پہلے حاضر کر سکتا ہے، باری تعالیٰ فرماتے ہیں: قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ "عفریت نے کہا میں حاضر کرتا ہوں قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اٹھیں" سلیمان علیہ السلام نے کہا "اس سے بھی جلد تر" آصف نے کہا "قبل اس کے کہ آپ آنکھ جھپکیں تخت حاضر کرتا ہوں" یہی ہوا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام برآشفتہ نہیں ہوئے۔ انکار نہیں کیا۔ اور اس چیز کو محال نہیں سمجھا۔

یہ معجزہ نہیں تھا کیونکہ آصف پیغمبر نہیں تھا۔ لامحالہ کرامت تھی جو آصف کے ہاتھوں معرضِ ظہور میں آئی اگر معجزہ ہوتا تو خود حضرت سلیمان علیہ السلام سرانجام دیتے۔

قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ جب زکریا علیہ السلام حضرت مریمؑ کے پاس آتے تو موسم گرما میں سرما کا اور موسم سرما میں گرما کا میوہ موجود پاتے۔ پوچھتے "مریم! یہ تیرے لیے کہاں سے آیا۔ حضرت مریمؑ فرماتیں" یہ حق تعالیٰ کی طرف سے

آیا ہے"۔ یہ بات مسلّم ہے کہ حضرت مریم پیغمبرہ نہیں تھیں۔ نیز ان کی نسبت اللہ تبارک و تعالیٰ نے صریح الفاظ میں فرمایا:
وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا "کھجور کے درخت کو ہلا تا کہ تازہ کھجور تیرے لیے
گرے"۔ علاوہ ازیں اصحابِ کہف کا واقعہ۔ کتّے کا کلام کرنا۔ اصحاب کہف کا سونا۔ ان کا غار میں دائیں بائیں کروٹ لینا۔ ص ۲۴۸/۳۱۹
"ہم ان کی دائیں بائیں کروٹ بدلتے ہیں اور ان کا کتّا چوکھٹ پر کھڑا ہے"۔

یہ جملہ چیزیں خرقِ عادات میں شامل ہیں۔ معجزہ کے تحت تو آتی نہیں لامحالہ کرامات کہلائیں گی۔ امورِ موہوم کے حاصل ہونے کے لیے تکلیف کے وقت دعا کی قبولیت بھی کرامت کی ایک شکل ہے۔ لمبی مسافت چشم زدن میں طے ہو جانا، غیر معلوم مقام سے طعام کا نازل ہونا، خلقت کے اندیشہائے نہانی سے واقف ہونا وغیرہ کرامات میں شامل ہیں۔ احادیثِ صحیحہ میں حدیثِ غار قابلِ غور ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے استدعا کی "یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) گذشتہ امتوں کا کوئی عجیب واقعہ بیان فرمائیے"۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کسی زمانے میں تین آدمی کہیں سفر پر جا رہے تھے۔ جب رات ہوئی تو وہ ایک غار میں شب بسری کے لیے چلے گئے۔ تھوڑی رات گذری تو ایک پتھر پہاڑ پر سے سرک کر غار کے منہ پر آ گیا۔ تینوں کے تینوں پریشان ہو گئے اور ایک دوسرے سے کہنے لگے اس غار سے رہائی ناممکن ہے۔ آؤ اپنے بے ریا کاموں کی شفاعت تلاش کریں۔ ایک نے کہا "میرے ماں باپ زندہ تھے۔ میری بساط صرف ایک بکری تھی جس کا دودھ اپنے ماں باپ کو پلا دیتا تھا۔ ہر روز لکڑیوں کا ایک گٹھا لاتا تھا اس کے دام سے ان کے طعام کا انتظام کرتا تھا۔ ایک رات مجھے دیر ہو گئی۔ بکری کا دودھ دوہ کر ان کے لیے کھانا تیار کیا۔ اتنی دیر میں وہ سو گئے میں دودھ اور کھانے کا پیالہ لیے کھڑا رہا صبح کے وقت وہ بیدار ہوئے جب وہ کھا چکے تب بیٹھا"۔ یہ بیان کر کے ص ۲۴۹/۳۲۰
اس شخص نے دعا کی کہ اے باری تعالیٰ اگر یہ واقعہ میں نے سچ کہا ہے تو غار کے منہ سے اس پتھر کو سرکا دے۔
پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پتھر کو حرکت ہوئی اور تھوڑا سا راستہ بن گیا۔ دوسرے آدمی نے کہا "میرے چچا کی ایک صاحبِ جمال لڑکی تھی۔ میرا دل ہمیشہ اس کی طرف مائل تھا۔ میں اسے ترغیبِ ملاقات دیتا رہا مگر وہ کسی طرح ملتفت نہ ہوئی۔ آخر میں نے اسے ایک سو بیس دینار پیش کیے اور ایک رات کی خلوت کے لیے استدعا کی جب وہ میرے پاس آئی تو حق تعالیٰ کا خوف میرے دل پر مستلط ہو گیا۔ میں نے اس سے پرہیز کیا اور وہ رقم بھی اس کے پاس رہنے دی"۔ یہ بیان کر کے اس شخص نے دعا کی "اے باری تعالیٰ اگر یہ واقعہ

میں نے سچ کہا ہے تو اس سوراخ کو فراخی عطا فرما۔" پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پتھر کو ایک اور جنبش ہوئی اور سوراخ زیادہ ہو گیا مگر ابھی اتنا نہیں تھا کہ وہ غار سے باہر نکل سکیں۔ تیسرے آدمی نے کہا "میرے پاس مزدوروں کا ایک گروہ کام کیا کرتا تھا۔ سب نے اپنی اپنی اجرت وصول کی مگر ایک مزدور کہیں غائب ہو گیا۔ میں نے اس کی اجرت سے ایک بکری خریدی۔ دوسرے سال دو اور تیسرے سال چار بکریاں ہو گئیں اور اسی طرح سال بسال بڑھتی گئیں۔ چند سال کے اندر بہت سا مال جمع ہو گیا۔ وہ مزدور واپس آیا اور اپنی اجرت طلب کی۔ میں نے کہا وہ سب بکریاں تیرا مال اور ملکیت ہیں۔ اس نے مذاق سمجھا مگر میں نے سب کچھ اسے دے دیا۔" یہ کہنے کے بعد اس شخص نے دعا مانگی "یا رب العزت! اگر یہ واقعہ میں نے من وعن سچ بیان کیا ہے تو اس سوراخ کو اور فراخ فرما۔" پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسی وقت پتھر غار کے دہانے سے سرک گیا اور تینوں مسافر باہر نکل آئے۔ یہ چیز بھی نقضِ عادت تھی۔

ص ۲۵۰ : ۳۲۱

جریج راہب سے متعلق پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مشہور ہے اور ابوہریرہؓ اس کے راوی ہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ طفولیت کے جھولے میں صرف تین اشخاص نے گفتگو کی۔ ایک جیسا کہ تم لوگوں کو معلوم ہے حضرت عیسےٰ علیہ السلام تھے۔ دوسرا ایک اسرائیلی راہب جریج نامی تھا، مردِ مجتہد تھا۔ اس کی والدہ پردہ نشین عورت تھی۔ ایک روز اپنے بیٹے سے ملنے آئی وہ عبادت میں مشغول تھا اس نے ہیکل کا دروازہ نہ کھولا۔ دوسرے دن پھر آئی۔ پھر وہی ہوا۔ تیسرے دن اور پھر چوتھے دن وہی ہوا۔ آخر ماں نے کہا اے خدا! میرے اس بیٹے کو رسوا کر اور میری وجہ سے اسے گرفت میں لے لے۔ اسی زمانہ میں ایک فاحشہ عورت تھی اس نے دعویٰ کیا کہ میں جریج کو گمراہ کر سکتی ہوں۔ چنانچہ اس کے عبادت کدہ میں گئی۔ جریج نے اس کی طرف کوئی التفات نہ کیا۔ واپس پلٹتے ہوئے وہ ایک گڈریے سے ہم صحبت ہوئی اور اسے حمل قرار پا گیا۔ اس نے شہر میں مشہور کر دیا کہ اسے جریج سے حمل ہوا ہے۔ جب بچہ جنا تو اسے جریج کے پاس لے گئی۔ جریج دربارِ شاہی میں پیش ہوا اور بچے کو مخاطب کر کے پوچھا "تیرا باپ کون ہے؟" بچے نے جواب دیا۔ "اے جریج! میری ماں تہمت تراش رہی ہے میرا باپ تو ایک گڈریا ہے۔"

ایک اور خاتون اپنے بچے کو گود میں لیے گھر میں بیٹھی تھی۔ ایک خوش پوش خوبرو سوار پاس سے گذرا۔ خاتون نے کہا "باری تعالیٰ میرے بچے کو ایسا جوان کیجیو۔" بچے نے کہا "اے خدا مجھے ایسا نہ بنائیو" تھوڑی دیر کے بعد ایک بدنام عورت پاس سے گذری۔ اس خاتون نے کہا "اے خدا! میرے بچے کو اس عورت جیسا نہ بنانا"۔ بچے نے پھر کہا

ص ۲۵۱/۳۲۲

"اے خدا! مجھے اس عورت جیسا بنانا" خاتون کو سخت تعجب ہُوا۔ اس نے پوچھا "بیٹا یہ کیا کہہ رہے ہو"؟ بچے نے جواب دیا "یہ جوان رعنا ظالم ہے، یہ عورت صالحہ ہے لوگ اسے برا کہتے ہیں اور اسے نہیں جانتے۔ میں ظالموں میں شمار ہونا نہیں چاہتا مجھے مصلحین میں شامل ہونے کی تمنا ہے۔"

زایدہ کنیز حضرت عمرؓ سے متعلق روایت ہے کہ وہ ایک روز حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہو کر سلام بجالائی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ "اے زایدہ! اتنے عرصہ کے بعد کیوں آئی ہو تم بڑی نیکو کار ہو اور ہم تمہیں عزیز سمجھتے ہیں"۔ عرض کی "یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آج ایک عجیب واقعہ بیان کرنے آئی ہوں"۔ پوچھا گیا۔ عرض کی "صبح لکڑی کی تلاش میں باہر نکلی۔ جب میں نے لکڑیوں کا گٹھا باندھ کر اٹھانے کے لیے ایک پتھر پر رکھا تو کیا دیکھتی ہوں کہ ایک سوار آسمان سے زمین پر نازل ہوا۔ مجھے سلام کہہ کر بولا۔" اے زایدہ! محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رضوان، خازن بہشت کی طرف سے سلام پہنچا کر کہنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کی امت کے تین گروہ ہوں گے۔ ایک گروہ بلا حساب داخل بہشت ہو گا۔ دوسرے گروہ کا حساب آسان کر دیا جائے گا اور تیسرا گروہ آپ کی شفاعت سے بخش دیا جائے گا"۔ یہ کہہ کر وہ سوار پھر رو بہ آسمان ہوا بلندی پر جا کر پھر میری طرف دیکھا۔ میں گٹھے کو اکٹھا کر رہی تھی مگر اٹھانے سے قاصر تھی۔ سوار نے کہا۔ "زایدہ! لکڑیوں کا گٹھا اس پتھر پر رکھ دے"۔ پھر پتھر سے کہا "یہ گٹھا زایدہ کے ساتھ عمرؓ کے گھر تک پہنچا دو"۔ پتھر اپنی جگہ سے ہلا اور گٹھا اس کے ساتھ عمرؓ کے دروازہ تک آگیا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ کے ساتھ اٹھے اور حضرت عمرؓ کے دروازے تک پتھر کے آنے جانے کے نشانات دیکھے۔ اور پھر فرمایا۔ "الحمد للہ! دنیا سے رخصت ہونے سے قبل مجھے رضوان کی طرف سے اپنی امت سے متعلق بشارت ملی اور باری تعالیٰ نے میری امت میں سے ایک خاتون کو مریمؑ کا درجہ عطا کیا۔

ص ۲۵۲/۳۲۳

مشہور ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے علاء الحضرمیؓ کو ایک لڑائی پر بھیجا۔ راستے میں ایک بڑے دریا کا حصہ حائل تھا۔ سب پانی پر چلنے لگے اور سب پار ہو گئے اور کسی کا پاؤں تر نہ ہُوا۔

عبداللہ بن عمرؓ سے متعلق مشہور ہے کہ وہ کہیں جا رہے تھے۔ دیکھا کہ بہت سے لوگ ایک مقام پر سڑک کے کنارے کھڑے ہیں۔ ایک شیر نے ان کا راستہ روک رکھا ہے۔ عبداللہ بن عمرؓ نے آگے بڑھ کر کہا "اے کتے! اگر فرمان خداوندی ہے تو اپنا کام کر ورنہ راستہ دے"۔ شیر اپنی جگہ سے اٹھا اور لجاجت کرتا ہُوا راستہ

چھوڑ گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک شخص کو ہوا میں معلق بیٹھے ہوئے دیکھا۔ پوچھا "اے مردِ حق! یہ مقام کس طرح حاصل کیا"۔ اس نے جواب دیا "بالکل ذرا سی چیز سے میں دنیا سے روگردان ہو کر راہِ حق پر گامزن ہُوا۔ مجھ سے پوچھا گیا تیری کیا خواہش ہے؟ میں نے کہا مجھے ہوا میں جگہ ملنی چاہیئے تاکہ میرا دل اہلِ دنیا سے منقطع ہو جائے"۔

ایک عجمی جوان قتلِ عمرؓ کے ارادہ سے مدینہ منورہ آیا۔ اسے معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ کسی جنگل میں سو رہے ہوں گے۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد دیکھا کہ وہ خاک پر کوڑا زیرِ سر رکھے ہوئے سو رہے ہیں۔ سوچا سارے جہان میں فتنہ اسی کی وجہ سے ہے اب اسے قتل کر دینا آسان ہے تلوار نکالی۔ دفعتہً دو شیر نمودار ہوئے اور اس پر حملہ آور ہوئے۔ اس نے چیخ و پکار کی۔ حضرت عمرؓ بیدار ہوئے عجمی جوان نے ساری واردات بیان کی اور مشرف بہ اسلام ہُوا۔

ابوبکر صدیقؓ کے دورِ خلافت میں عراق کے علاقہ میں حضرت خالدؓ بن ولید کے پاس تحائف میں ایک ڈبیہ آئی اور آپ کو بتایا گیا کہ اس ڈبیہ میں وہ زہرِ قاتل ہے جو کسی بادشاہِ وقت کے خزانہ میں نہیں۔ خالدؓ نے وہ ڈبیہ کھولی۔ زہر نکال کر ہتھیلی پر رکھا اور بسم اللہ کہہ کر منہ میں ڈال لیا۔ کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ لوگ حیرت زدہ رہ گئے اور بہت سے راہِ ہدایت پر آ گئے۔

ص $\frac{۲۵۳}{۳۲۴}$

خواجہ حسن بصریؒ بیان کرتے ہیں کہ عبادان میں ایک بادیہ نشین حبشی تھا۔ ایک روز میں نے بازار سے کچھ خریدا اور اس کے پاس لے گیا۔ اس نے پوچھا کیا ہے؟ میں نے کہا تیرے کھانے کے لیے کچھ لایا ہوں شاید تجھے ضرورت ہو۔ وہ مجھ پر ہنسا اور ایک ہاتھ سے اشارہ کیا۔ صحرا کے سب پتھر اور کنکر سونا ہو گئے میں سخت شرمندہ ہُوا اور سب کچھ چھوڑ کر دہشت سے بھاگا۔

ابراہیم ادھمؒ کہتے ہیں میں ایک خرقہ پوش سے ملا مجھے پیاس تھی پانی طلب کیا اس نے کہا میرے پاس پانی بھی ہے اور دودھ بھی۔ میں نے کہا مجھے پانی کی ضرورت ہے وہ خرقہ پوش اٹھا اور اس نے ایک پتھر پر عصا مارا۔ پتھر سے صاف اور شیریں پانی جاری ہُوا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ گدڑی پوش نے کہا۔ حیرت نہیں ہونی چاہیئے۔ جب بندہ فرمانِ حق کے تابع ہو تو سب جہان اس کے تابع فرمان ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کہ ابوالدرداء اور سلمان رضی اللہ عنہم باہم بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے اور پیالہ سے تسبیح کی آواز آ رہی تھی۔

ابو سعید خرازؒ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک مدت تین دن میں صرف ایک مرتبہ کھانا کھاتا رہا۔ میں صحرا میں تھا، تیسرے روز مجھے محسوس ہوا طبیعت کو عادت کے مطابق طلب ہوئی مگر کچھ کھانے کو میسر نہ آیا۔ مجبور ہو کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ ہاتفِ غیب نے آواز دی۔ "اے ابو سعید! بے طعام دفعِ ضعف کی ضرورت ہے یا طعام کی یا صرف قوت کی"۔ میں نے کہا مجھے قوت چاہیے۔ میں نے قوت محسوس کی اور بارہ منزل اور بغیر خورد و نوش کے طے کر گیا۔

مشہور ہے کہ آج کل تستر میں سہیل بن عبداللہؒ کے گھر کو بیت السباع کہتے ہیں اور تستر کے باشندے بالاتفاق کہتے ہیں کہ بیت السباع میں درندے (شیر وغیرہ) آتے ہیں۔ عبداللہ انہیں کھانے کو دیتا ہے اور ان کی رکھوالی کرتا ہے۔ ابو القاسم مروزی بیان کرتے ہیں کہ میں ایک روز ابو سعید خرازی کے ہمراہ جا رہا تھا۔ دریا کے کنارے ایک خرقہ پوش جوان نظر آیا۔ جس کے ہاتھ میں کاسہ تھا اور کاسہ کے ساتھ ایک دوات آویختہ تھی۔ ابو سعیدؒ نے کہا کہ پیشانی اس جوان کی عابدانہ ہے اور صاحبِ معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ بظاہر پہنچا ہوا دکھائی دیتا ہے مگر دوات کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ابھی مقامِ طلب میں ہے۔ آؤ ذرا دریافت کریں۔ خرازؒ نے بڑھ کر پوچھا "خدا کو پہنچنے کی راہ کونسی ہے؟" جواب دیا۔ "دو راہیں ہیں ایک عوام کے لیے دوسری خواص کے لیے۔ خواص کی راہ کا تمہیں کوئی علم نہیں۔ البتہ عوام کی راہ یہ ہے کہ بڑھے چلو۔ اپنے معاملہ کو اللہ سے ملنے کی سبیل سمجھو اور دوات کو آڑ، حجاب نہ بناؤ"۔

ص ۲۵۳/۳۲۵

ذوالنون مصریؒ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دفعہ کچھ لوگوں کے ساتھ کشتی سے مصر سے جدہ جا رہا تھا۔ ایک خرقہ پوش جوان کشتی میں سوار تھا میرے دل میں ملاقات کی خواہش پیدا ہوئی مگر اس کا رعب اس قدر تھا کہ مجھے بات کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ وہ صاحبِ وقت تھا اور کسی حال میں عبادت سے فارغ نظر نہیں آتا تھا۔ ایک دن کسی شخص کی جواہرات کی تھیلی گم ہو گئی۔ مالک نے اس درویش پر تہمت تراشی۔ لوگ اسے سزا دینے کے درپے ہو گئے۔ میں نے کہا کہ اس پر سختی نہ کرو۔ مجھے پوچھنے دو۔ میں اس کے قریب گیا اور نرم لہجے میں کہا یہ لوگ تمہارے متعلق چوری کا گمان کرتے ہیں اور سختی کرنا چاہتے ہیں میں نے انہیں روکا ہے بتاؤ کیا کروں۔ درویش نے رو بہ آسمان ہو کر کچھ چپکے سے کہا۔ میں نے دیکھا مچھلیاں سطحِ آب پر آ گئیں۔ ہر ایک کے منہ میں ایک موتی تھا۔ درویش نے ایک موتی تھام کر اس شخص کو دے دیا۔ لوگ ابھی دیکھ ہی رہے تھے کہ وہ سطحِ آب پر اتر گیا اور چلتا ہوا دور نکل گیا۔ تھیلی چرانے والا اہلِ کشتی ہی میں موجود تھا اس نے تھیلی پانی میں پھینک دی۔ کشتی والے سخت نادم ہوئے۔

ص ۲۵۴/۳۲۶

ابراہیم رقیؒ کہتے ہیں کہ میں نے ابتدائے حال میں مسلم مغربی کی زیارت کا ارادہ کیا مسجد میں پہنچا تو وہ امامت کر رہے تھے مگر سورۂ فاتحہ کی قرأت غلط تھی۔ اپنی محنت اور تکلیف اکارت جانے کا احساس ہوا۔ وہ رات وہیں گذاری۔ دوسرے روز قصدِ طہارت سے دریائے فرات کی طرف جا رہا تھا۔ راہ میں ایک شیر سوتا ہوا نظر آیا میں واپس لوٹ آیا مگر ایک اور شیر میرے پیچھے لپک پڑا میں زور سے چلّایا مسلم اپنی عبادت گاہ سے باہر آیا۔ شیروں نے اسے دیکھ کر گردنیں ڈال دیں اس نے سب کی گوشمالی کی اور کہا۔ خدائی کتّو! میں نے تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ میرے مہمانوں کو تنگ نہ کیا کرو۔ پھر مجھے مخاطب کر کے کہا بھئی تم لوگ خلقت کا ظاہر درست کرنے میں مشغول ہو اس لیے خلقت سے ڈرتے ہو ہم بنامِ حق باطن کی درستی پر مامور ہیں اس لیے خلقت ہم سے خوف کھاتی ہے۔

ایک روز میں اپنے پیرِ طریقت کے ہمراہ بیت الجنّ سے دمشق جا رہا تھا۔ بارش ہو رہی تھی اور کیچڑ کے باعث بمشکل چلا جا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ پیر صاحب کے کپڑے اور جوتا خشک ہے میں نے پوچھا تو فرمایا ہاں میں نے اپنی ہمت کے بجائے توکّل کا سہارا لیا اور باطن کو حرص و ہوا سے پاک کیا میرے مولا نے مجھے کیچڑ سے محفوظ فرمایا۔

مجھے ایک مشکل درپیش تھی جس کا حل میرے لیے دشوار تھا میں شیخ ابوالقاسم کرمانیؒ کی زیارت کے لیے طوس پہنچا میں نے دیکھا کہ وہ اپنے گھر کی مسجد میں تشریف فرما ہیں اور عالمِ تنہائی میں میرا حال ایک ستون سے کہہ رہے ہیں مجھے بغیر سوال کیسے جواب مل گیا میں نے پوچھا "جنابِ شیخ! یہ آپ کسے کہہ رہے ہیں"۔ فرمایا:- "ابھی ابھی اللہ تعالیٰ نے اس ستون کو زبان دی اور اس نے یہ سوال مجھ سے پوچھا"۔

ص $\frac{۲۵۵}{۳۲۷}$

فرغانہ کے ایک گاؤں شلانک میں اوتادالارض میں سے ایک پیرِ بزرگ رہتے تھے۔ لوگ انہیں بابِ عمرو کہتے تھے۔ اس علاقے میں سب درویش مشائخِ بزرگ کو باب کہتے ہیں۔ ان کی رفیقۂ حیات ایک عفیفہ فاطمہ نام تھی۔ میں ان کی زیارت کے لیے گیا جب قریب پہنچا تو پوچھا کیوں آئے ہو۔ عرض کی "شیخ کی زیارت کے لیے اور اس امید پر کہ مجھ پر نگاہِ شفقت ہو۔" کہا میں خود فلاں دن سے تیرے لیے چشم براہ تھا تاکہ میں تجھے دیکھ لوں اور تو ادھر ادھر نہ ہو جائے میں نے حساب لگایا تو یہ دن میری ابتدائے توبہ کا دن تھا۔ پھر فرمایا سفر بچوں کا کھیل ہے۔ اب آنا ہو تو ہمت (تصور) سے آؤ کسی شیخ کی زیارت کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ حضورِ اشباح (جسمانی قرب) بیکار چیز ہے۔ پھر کہا "فاطمہ! جو موجود ہو۔ لاؤ تاکہ یہ درویش کھائے"۔ ایک طبق تازہ انگور (حالانکہ انگور کا موسم

نہیں تھا) اور تازہ کھجور (فرغانہ میں کھجور نہیں ہوتی) میرے سامنے آگیا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں مہنا میں ابوسعیدؒ کے مزار پر حسب عادت تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ ایک سفید کبوتر آیا اور قبر کے غلاف کے اندر چلا گیا۔ میں سمجھا کسی کا پالتو کبوتر اڑ کر چلا آیا ہے۔ غلاف اٹھا کر دیکھا تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ دوسرے اور تیسرے روز بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ مجھے سخت تعجب ہوا۔ ایک رات شیخ مجھے خواب میں نظر آئے میں نے پوچھا تو انہوں نے فرمایا "کبوتر میری صفائے معاملات ہے جو ہر روز میری ہم نشینی کے لیے زیر لحد آتی ہے"۔

ابوبکر وراقؒ کہتے ہیں کہ ایک روز محمد بن علی حکیم ترمذی نے چند جزو اپنی تصانیف سے نکال کر مجھے دیئے اور کہا کہ یہ دریائے جیجون میں ڈال دو۔ میں نے باہر آکر دیکھا تو عجیب و غریب تحریر تھی۔ دریا میں ڈالنے کو طبیعت نہ چاہی۔ میں نے وہ جزو اپنے گھر میں رکھ لیے اور واپس پلٹ کر کہہ دیا کہ دریا میں ڈال آیا ہوں۔ انہوں نے پوچھا، کیا دیکھا۔ میں نے کہا کچھ بھی نہیں۔ فرمایا۔ وہ جزو تم نے دریا میں نہیں ڈالے۔ جاؤ ڈال کر آؤ۔ میں نے کہا یک نہ شد دو شد۔ بھلا یہ کیوں کہتے ہیں کہ دریا میں ڈال دو اور دریا میں ڈالوں گا تو کیا کرامت رونما ہوگی؟ طوعاً و کرہاً میں واپس ہوا۔ وہ جزو اٹھائے اور بدلِ ناخواستہ دریائے جیجون میں ڈال دیئے۔ پانی کا دھارا پھٹ گیا اور ایک صندوق نمودار ہوا جس کا ڈھکنا اٹھا ہوا تھا۔ جزو اس کے اندر چلے گئے۔ ڈھکنا بند ہو گیا اور پانی پھر اپنی اصلی حالت پر آگیا۔ میں حکیم ترمذی کے پاس واپس آیا اور سارا واقعہ بیان کیا۔ بولے اب تم نے واقعی دریا برد کر دیئے میں نے کہا "یا شیخ خدا کے لیے مجھے بتایئے یہ کیا راز ہے؟" فرمایا "میں نے تصوف پر ایک کتاب لکھی تھی۔ ہر آدمی کے لیے اسے سمجھنا دشوار تھا۔ خضر علیہ السلام نے مجھ سے طلب کی۔ وہ صندوق ان کے حکم کے مطابق مچھلی لائی تھی اللہ نے پانی کو حکم دیا کہ صندوق خضر علیہ السلام کو پہنچا دے"۔

اسی طرح کی بہت سی اور حکایات بھی بیان کروں تو طبیعت سیر نہیں ہوگی۔ میری مراد اس کتاب میں تصوف کے اصول کو ثابت کرنا ہے۔ فروعات اور معاملات پر ناقلانِ آثار بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ جو منبروں پر واعظ لوگ بیان کرتے رہتے ہیں

میں اب ایک دو فصلوں میں چند ایسے نکات کی تشریح کروں گا جو اس موضوع سے پیوستہ ہیں تاکہ پھر اس کی طرف لوٹنے کی ضرورت نہ پڑے۔ ص ۲۵۷/۳۲۹

انبیاء کی فضیلت اولیاء پر

صوفی مشائخ کبار تمام اس امر پر متفق ہیں کہ اولیاء ہر حال اور ہر صورت میں انبیاء کے تابع اور ان کی دعوت کی تصدیق کرنے والے ہوتے ہیں۔ پیغمبر اولیاء سے افضل تر ہوتے ہیں کیونکہ ولایت کی انتہا نبوّت کی ابتدا ہوتی ہے۔ ہر نبی ولی ہوتا ہے مگر ولیوں میں کوئی نبی نہیں ہوتا۔ انبیاء انسانی کمزوریوں سے مستقلاً پاک ہوتے ہیں اور اولیاء صرف عارضی طور پر۔ اولیاء کا احوالِ طاری انبیاء کا مستقل مقام ہوتا ہے۔ اور جو اولیاء کے لیے مقام ہو وہ انبیاء کے لیے حجاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اہلِ سنّت اور صوفیائے کرام کا متفقہ فیصلہ ہے۔ حشویہ کا ایک گروہ یعنی مجسمہ خراسان اس کے خلاف ہے۔ یہ لوگ اصولِ توحید پر متناقض کلامی سے کام لیتے ہیں۔ صوفیائے کرام کے منکر ہیں اور اپنے آپ کو ولی سمجھتے ہیں۔ ہاں ولی ہی ہوں گے مگر شیطان کے ولی۔ کہتے ہیں کہ اولیاء انبیاء سے فاضل تر ہیں۔ یہ ضلالت ہی ان کے لیے کافی ہے کہ جاہل کو محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتر سمجھتے ہیں۔ اس قسم کا بے ہودہ عقیدہ مشبّہ جماعت کے لوگوں کا ہے جو صوفی کہلاتے ہیں۔ اور ذاتِ باری سے متعلق حلول و نزول از راہِ انتقال پر یقین رکھتے ہیں۔ تجزیہ ذاتِ حق کا جواز ثابت کرتے ہیں۔ اس مکتبہ کی دو جماعتیں ہیں جن سے متعلق میں نے اس کتاب میں تفصیلاً ذکر کرنے کا وعدہ کیا ہے انشاء اللہ تعالیٰ۔ یہ مذکورہ جماعتیں دعوائے اسلام کرتی ہیں مگر انبیاء کرام کی تخصیص کے معاملے میں برہمنوں کی ہم خیال ہیں۔ تخصیصِ انبیاء کا منکر کافر ہوتا ہے۔

انبیاء کرام دعوت دینے والے اور امام ہوتے ہیں۔ اولیاء ان کے مقتدی ہوتے ہیں۔ یہ محال ہے کہ مقتدی امام سے فاضل تر ہو۔ مختصر یہ کہ اگر جملہ اولیاء کرام کے احوال، انفاس و روزگار کو ایک جگہ رکھ کر نبی کے ایک گامِ صدق سے مقابلہ کیا جائے تو جملہ احوال و انفاس پراگندہ نظر آئیں گے۔ کیونکہ اولیاء طلب میں گامزن ہوتے ہیں اور انبیاء منزل پر پہنچ کر گوہرِ مقصود حاصل کر چکے ہوتے ہیں اور اس کے بعد دعوت سے خلقت کو راہِ حق دکھاتے ہیں۔ ان ملحدوں میں سے اگر کوئی ملعون یہ کہے کہ قاعدہ یہ ہے کسی ملک سے بھیجا ہوا سفیر مرسل الیہ سے فاضل تر نہیں ہوتا ہے۔ چنانچہ جبرائیل پیغمبروں کے پاس آتے مگر پیغمبروں کا مقام جبرئیل سے بلند تر تھا۔ ان لوگوں کی یہ خیال آرائی غلط ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ جب ایک سفیر ایک

ص ۲۵۸
۳۳۰

آدمی کی طرف بھیجا جائے تو یقیناً مرسل الیہ فاضل تر ہوگا۔ جبرائیل ایک ایک پیغمبر کے پاس آئے ہر پیغمبر جبرائیل سے فاضل تر ہوا لیکن جب رسول ایک جماعت یا قوم کی طرف بھیجا جائے تو لامحالہ وہ اس قوم سے فاضل تر ہوگا جیسے ہر امت کا پیغمبر۔ اس معاملے میں کسی ذی ہوش کو مغالطہ نہیں ہوسکتا۔ الغرض نبی کا ایک سانس ولی کی ساری زندگی سے فاضل تر ہے۔ جب ولی اپنے باطنی مجاہدہ اور ظاہری عبادت سے درجہ کمال کو پہنچتا ہے تو مقامِ مشاہدہ پہ فایز ہوتا اور حجابِ بشریت سے نجات پاتا ہے حالانکہ عین بشریت میں مبتلا رہتا ہے۔ اس کے برعکس رسول کا پہلا قدم مشاہدہ ہوتا ہے۔ رسول کی ابتدا ولی کی انتہا ہوتی ہے اس لیے ایک سے دوسرے کا تصوّر نہیں کیا جاسکتا۔ تم جانتے ہو کہ سب طالبانِ حق بالاتفاق کہتے ہیں کہ کمالِ ولایت تفریق سے منقطع ہو کر جمع کے مقام کو حاصل کرتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ بندہ ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں غلبۂ دوستی کے باعث عقل کا دستورِ نظر باطل ہوجاتا اور ہر چیز میں فاعلِ کل نظر آتا ہے۔ چنانچہ ابو علی رودباریؒ نے فرمایا "اگر ہم اُس کی رویت سے محروم ہو جائیں تو ہماری عبادت بیکار ہو جائے کیونکہ اس کی عبادت کا شرف اس کی رویت ہی سے حاصل ہوتا ہے۔" یہ حقیقت انبیاء کے لیے ابتدائے حال ہوتی ہے۔ ان کے روزگار میں کوئی تفرقہ صورت پذیر نہیں ہوتا۔ نفی، اثبات، مسلک منقطع، اقبال، اعراض، بدایت اور نہایت سب عین جمع کے عالم میں ہوتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ابتدائے حال میں سورج کو دیکھ کر کہا "یہ میرا رب ہے" جب چاند ستارے کو دیکھا تو کہا "یہ میرا رب ہے" کیونکہ ان کا دل غلبۂ حق سے مغلوب تھا۔ وہ عین جمع کے مقام پر تھے۔ انہوں نے کسی غیر چیز کو نہیں دیکھا اور اگر دیکھا تو جمع کی نظر سے دیکھا۔ عین دیدارِ حق میں محو ہو کر تابِ دیدار سے بیزاری کی حالت میں کہا "میں گم ہونے والوں سے محبت نہیں کرتا۔" ابتدا بھی جمع انتہا بھی جمع۔ ولایت کے لیے ابتدا اور انتہا ہے نبوّت کے لیے نہیں۔ انبیاء جب تک تھے نبوّت پر فائز تھے جب تک ان کو رہنا تھا نبوّت پر سرفراز رہنا تھا۔ بعثت سے پہلے بھی اللہ کے علم اور ارادے کے مطابق وہ صاحبِ نبوّت تھے۔

ص ۲۵۸/۳۳۱

بویزیدؒ سے پوچھا گیا آپ انبیاء کے بارے میں کیا فرماتے ہیں۔ کہا "خدا نا کردہ! ہم انبیاء کے بارے میں فیصلے نہیں دے سکتے۔ ان کی نسبت ہمارے تصوّرات ہماری ذاتی بساط کے مطابق ہوتے ہیں۔ باری تعالیٰ نے ان کی نفی اور اثبات ایسے مقام پر رکھی ہے جہاں انسانی نظر قاصر رہ جاتی ہے۔ اولیاء کا مرتبہ لوگوں کی نظر سے پنہاں ہے۔ اسی طرح انبیاء علیہ السلام کا مقام اولیاء کے دائرۂ تصرف سے باہر ہے۔"

ص ۲۵۹/۳۳۲

ابو یزیدؒ برہانِ روزگار تھے انہوں نے فرمایا:

"میں نے دیکھا میری روح کو آسمان پر لے گئے۔ اس نے کسی طرف توجہ نہ دی گو دوزخ اور بہشت اس کے سامنے رونما ہوئے۔ وہ حادثات اور حجابات سے معرا تھی۔ پھر میں ایک پرندہ بن گیا جس کا جسم وحدانیت تھا اور جس کے بازو ابدیت تھے۔ میں فضائے ہُوِیّت میں اڑ گیا۔ یہاں تک کہ فضائے ازلیت میں داخل ہُوا اور شجرِ احدیت کو دیکھا۔ غور کیا تو سب کچھ میں ہی تھا۔ میں پکارا خدایا! جب تک میری انا موجود ہے تیری طرف راستہ ملنا محال ہے۔ مجھے انا سے رستگاری نہیں۔ بتا میں کیا کروں"۔ حکم ہُوا "اے ابو یزید! انا سے رستگاری ہمارے دوست کی متابعت سے وابستہ ہے۔ اس کے قدموں کی خاک کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنا۔ اور اس کی تابعداری میں بسر کر"۔ یہ داستان بڑی طویل ہے۔ اہلِ طریقت اسے معراجِ بو یزید کہتے ہیں۔ معراج سے مراد قرب ہے۔ انبیاء علیہم السلام کا معراج جسمانی طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ اولیاء کرام کا معراج ہمت اور روح سے متعلق ہے۔ انبیاء کا جسم صفا اور پاکیزگی میں قرب کے معاملے میں اولیاء کے دل اور ان کی روح کی مانند ہوتا ہے۔ یہ ظاہر فضیلت کی دلیل ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ولی عالمِ سکر میں اپنے آپ سے غائب ہو جاتا ہے اور روحانی درجات سے گزر کر قربِ حق کے مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ جب عالمِ صحو میں واپس پلٹتا ہے تو تمام دلائل اس کے دل پر نقش ہوتے ہیں اور ان کا علم اسے حاصل ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جسمانی معراج اور اس فکری معراج میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ص ۲۶۰/۳۳۲

انبیاء و اولیاء کی فرشتوں پر فضیلت

جملہ اہلِ سنت والجماعت اور مشائخ طریقت متفقہ طور پر مانتے ہیں کہ انبیاء اور وہ تمام اولیاء جو آفات سے محفوظ ہیں فرشتوں پر برتری رکھتے ہیں۔ صرف معتزلہ فرشتوں کو انبیاء سے افضل تر سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ فرشتوں کا رتبہ زیادہ ہے اور وہ پیدائشی طور پر لطیف واقع ہوئے ہیں۔ بالخاصہ وہ باری تعالیٰ کی زیادہ طاعت کرتے ہیں اور اس لیے ان کا مقام بلند تر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حقیقت اس مفہوم صورت سے بالکل مختلف ہے۔ جسمانی طاعت، مقامی بلندی اور پیدائشی لطافت فضلِ خداوندی کی مقررہ علت نہیں۔ یہ تمام چیزیں تو ابلیس میں بھی موجود تھیں۔ مگر سب مانتے ہیں کہ وہ ملعون اور ذلیل ہو گیا۔ فضلِ خداوندی اسی کے لیے ہوتا ہے جسے باری تعالیٰ خود ارزاں کرے اور جسے خود اس کی رحمت

منتخب کرے۔ انبیاء کی فضیلت کے لیے دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ مسجود ساجد سے بالاتر ہوتا ہے۔ اگر اس کے خلاف یہ کہا جائے کہ خانہ کعبہ بے جان پتھر کا بنا ہوا ہے۔ مومن کا مقام بلند تر ہے مگر وہ اسے سجدہ کرتا ہے۔ اسی طرح فرشتے آدم کو سجدہ کرنے کے باوجود فاضل تر ہیں تو میں کہوں گا کہ کسی ہوشمند کے نزدیک مومن، دیوار، محراب یا پتھر کو سجدہ نہیں کرتا۔ سجدہ صرف خدا کے لیے کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف ہم جانتے ہیں کہ ملائکہ نے سجدہ صرف آدم کو کیا جیسا کہ حکم باری تعالیٰ میں مذکور ہے: اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ "آدم کو سجدہ کرو"۔ مومنوں کے سجدہ کے ذکر میں کہا: وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّکُمْ "سجدہ کرو اور اپنے رب کی بندگی کرو"۔ خانہ کعبہ آدم کی طرح نہیں ہو سکتا۔ سوار جب نماز ادا کرتا ہے تو اس کا منہ خانہ کعبہ کی طرف نہیں ہوتا اور وہ معذور ہوتا ہے۔ جب کسی جنگل میں جہتِ قبلہ معلوم نہ ہو سکے تو جدھر بھی منہ کر لیا جائے نماز ہو جاتی ہے۔ ملائکہ کو آدم کے سامنے سجدہ کرنے میں کوئی عذر نہیں تھا۔ ایک نے عذر تراشا اور ملعون و خوار ہو گیا۔ اہلِ بصیرت کے لیے یہ دلائل واضح اور روشن ہیں۔

ص ۲۶۱/۳۳۴

علاوہ ازیں ملائکہ صرف اس بنا پر کیسے افضل تر ہو سکتے ہیں کہ وہ حقِ معرفت میں بلند تر ہیں۔ ان کی تو جبلت ہی شہوات سے معرّا ہوتی ہے۔ ان کے دل حرص و آفت سے نا آشنا ہوتے ہیں۔ ان کی طبیعت مکر و فریب سے پاک ہوتی ہے۔ ان کی غذا اطاعتِ خداوندی ہے۔ اور ان کا مشرب فرمانِ حق کی بجا آوری ہے۔ اس کے برعکس انسانی طینت شہوات کا مرکب ہے۔ گناہوں کا مرتکب ہونا انسانی کمزوری ہے۔ زینتِ دنیوی کی طلب اس کے دل پر طاری رہتی ہے۔ حرص و حیلہ اس کی طبعِ ثانی ہے۔ شیطان اس پر اس قدر مسلط ہے کہ گویا اس کے رگ و پے میں خون کے ساتھ گردش کر رہا ہے۔ نفسِ امّارہ جو جملہ شر کا منبع ہے اس کے قریب ہے۔ جس کے وجود میں یہ تمام چیزیں ہوں۔ اور وہ غلبۂ شہوات کے باوجود فسق و فجور سے پرہیز کرے۔ حرص و ہوا کے باوصف دنیا سے روگرداں ہو۔ شیطانی وسوسوں کے ہوتے ہوئے گناہوں سے بچے۔ آفاتِ نفسانی سے دور رہے۔ عبادت، طاعت، مجاہدہ نفس اور مخالفتِ شیطان میں مشغول ہو۔ یقیناً ایسی مخلوق سے افضل تر ہے جس کی طبیعت میں شہوات کی کشمکش نہ ہو۔ جو غذا کی ضرورت اور لذت سے ناواقف ہو جسے زن و فرزند کا غم نہ ہو جسے خویش و اقارب سے تعلق نہ ہو جو اسباب و آلات کی محتاج نہ ہو اور امید و بیم میں مبتلا نہ ہو۔

ص ۲۶۲/۳۳۵

بخدا مجھے تعجب ہے اس شخص پر جو افعال میں فضیلت تلاش کرتا ہے جمال میں عزت طلب کرتا ہے اور مال جمع

کرنے میں بزرگی کی تمنا رکھتا ہے عنقریب یہ جاہ و منال زوال پذیر ہوگا۔ رب قدیر کے فضل پر نظر رکھنا چاہیئے۔ رضائے حق کو عزت سمجھنا چاہیئے۔ معرفت اور ایمان میں بزرگی تلاش کرنا چاہیئے تاکہ دوامِ نعمت نصیب ہو اور دونوں جہان کی دولت سے شادمانی حاصل ہو۔

جبرئیل انتظارِ خلعت میں کئی ہزار سال عبادت کرتا رہا خلعت کیا تھا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی شبِ معراج ان کی سواری کی خدمت۔۔۔۔ بھلا وہ کیسے افضل تر ہو سکتا ہے اس ذاتِ گرامی سے جس نے دنیا میں نفس کو عبادتِ شبانہ روز میں مشغول رکھا۔ مجاہدہ کیا اور باری تعالیٰ نے از راہِ کرم اس کو اپنے دیدار سے سرفراز فرمایا اور تمام آفات سے محفوظ کیا۔ جب ملائکہ نے از حد نخوت کا اظہار کیا اور ہر ایک نے اپنی صفائے معاملت کو بسبیلِ دلیل پیش کیا اور انسان پر زبان درازی کی تو حق تعالیٰ نے ان کی صحیح کیفیت ان پر آئینہ کرنا چاہی چنانچہ فرمایا کہ اپنے گروہ میں تین افراد ایسے منتخب کرو جن پر تمہیں پورا اعتماد ہو۔ وہ زمین پر جائیں۔ فرائضِ خلافت بجالائیں لوگوں کو راہِ راست دکھائیں اور عدل و انصاف کی داد دیں تین فرشتے منتخب کیے گئے۔ ایک نے تو اسی وقت مصیبت کا اندازہ کر لیا اور معذرت چاہی۔ باقی دو زمین پر آئے حق تعالیٰ نے ان کی جبلت بدل دی اور وہ طعام و شراب کے آرزو مند ہوئے۔ شہوت کا رجحان ان میں پیدا ہوا اور مستوجبِ سزا ہوئے تمام ملائکہ کو انسانی فضیلت کا قائل ہونا پڑا۔

ص ۲۶۲/۳۳۶

اہلِ ایمان میں سے خاص لوگ خاص ملائکہ سے افضل تر ہیں اور اسی طرح عام مومن عام ملائکہ پر فضیلت رکھتے ہیں۔ معصوم تر اور محفوظ تر آدمی جبرائیل اور میکائیل سے افضل تر ہیں جو معصوم ہیں وہ حفظہ اور کرام الکاتبین سے بہتر ہیں واللہ اعلم بالصواب۔

اس معاملے پر بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ مشائخ کبار میں سے ہر ایک نے کچھ نہ کچھ ضرور کہا ہے۔ باری تعالیٰ جسے چاہے اوروں پر فضیلت عطا کرتا ہے سب توفیق اسی کی طرف سے ہے۔

یہ ہیں حکیمیہ مکتبۂ تصوف اور اہلِ تصوف کے اختلافات جو مختصراً معرضِ بیان میں آئے۔ یاد رکھو کہ ولایت اسرارِ حق تعالیٰ میں شامل ہے اور سلوکِ طریقت کے بغیر ظاہر نہیں ہوتی صرف ولی ہی ولی کو پہچان سکتا ہے۔ اگر ہر کس و ناکس دانندۂ راز ہوتا تو دوست کی دشمن سے اور واصل کی غافل سے تمیز نہ ہو سکتی۔ مشیت ایزدی کا بھی تقاضا ہے کہ اس کی دوستی کا موتی ملامت کے صدف میں جان ستاں سمندر کی تہ میں چھپا رہے۔ اس کا طالب اپنی جان جوکھوں

ص ۲۶۳/۳۳۷

میں ڈالے بحرِ تلاطم انگیز میں اترے یا اپنا مقصود حاصل کرے یا جان پر کھیل جائے۔ خیال تھا کہ اس موضوع پر کچھ اور لکھوں مگر قاری کے ملال اور کراہتِ طبع کے خیال سے دست بردار ہوتا ہوں۔ مبتدئ طریقت کے لیے اسی قدر کافی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۸۔ خرازی مکتبۂ تصوف

اس مکتبۂ تصوف کے لوگ ابو سعید خرازؒ کا اتباع کرتے ہیں۔ طریقت پر ان کی بہت سی تصانیف ہیں۔ وہ تجرید اور انقطاع میں بڑی منزلت رکھتے ہیں۔ وہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے فنا اور بقا پر عبارت آرائی کی اور اپنے مکتبۂ تصوف کو ان دو الفاظ کی تشریح میں سمو دیا۔ اب میں ان کے معنی بیان کرتا ہوں اور اس گروہ کی غلطیاں ظاہر کرتا ہوں تاکہ قاری کو اس مکتبہ سے متعلق واقفیت حاصل ہو اور وہ سمجھ پائے کہ ان اصطلاحات کا مفہوم کیا ہے۔

فنا اور بقا

باری تعالیٰ نے فرمایا: مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ "تمہارے پاس جو کچھ ہے زوال پذیر ہے اور جو کچھ خدا کے پاس ہے اسے بقا ہے۔" دوسری جگہ فرمایا: كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ "ہر چیز فنا ہونے والی ہے صرف جلال و اکرام والے رب کی ذات کے لیے بقا ہے۔"

معلوم ہونا چاہیے کہ لغوی طور پر فنا اور بقا کا مطلب کچھ اور ہے حال کے نقطۂ نظر سے کچھ اور۔ اہلِ طریقت صرف ان دو الفاظ پر عبارت آرائیوں میں اتنے کھوئے ہیں کہ جس کی مثال نہیں۔ علمی زبان میں اور لغوی حیثیت سے بقا کی تین صورتیں ہیں۔ اول وہ بقا جس کا اول و آخر فنا ہو جیسے یہ جہانِ گذران جو ابتدا میں کچھ نہیں تھا اور بالآخر کچھ نہیں رہے گا گو فی الحال موجود ہے۔

دوسرے وہ بقا جو کبھی نہ تھی معرضِ وجود میں آئی اور پھر کبھی فنا نہیں ہو گی مثلاً بہشت و دوزخ کا جہان اور اس جہان والے۔

ص ۲۶۴ / ۳۳۸

تیسرے وہ بقا جو کسی وقت بھی معرضِ وجود میں نہیں آئی اور کسی وقت بھی ختم نہیں ہو گی۔ یہ بقائے حق تعالےٰ اور اس کی صفاتِ لم یزل و لایزال کی بقا ہے۔ وہ ذاتِ پاک جو اپنی صفات کے ساتھ قدیم ہے اور جس کی بقا سے مراد اس کا دوامِ وجود ہے جس کی صفات میں کوئی شریک نہیں۔ فنا کا علم یہ ہے کہ دنیا کو فانی سمجھا جائے اور بقا کا علم یہ ہے

کہ عقبیٰ کو باقی تصور کیا جائے چنانچہ باری تعالیٰ نے فرمایا: وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى "عاقبت بہتر اور باقی رہنے والی ہے"۔ یہاں لفظِ اَبْقٰى بصورتِ مبالغہ استعمال ہوا ہے۔ دوسرے جہان میں بقائے عمر کے لیے فنا نہیں۔

بروئے حال فنا اور بقا کو یوں سمجھنا چاہیئے کہ جب جہالت فنا ہوتی ہے تو لا محالہ علم بقا پذیر ہوتا ہے۔ جب معصیت فنا ہوتی ہے تو طاعت بقا کا جامہ پہنتی ہے۔ جب انسان اطاعت اور علم سے بہرہ ور ہوتا ہے تو ذکرِ حق سے غفلت فنا ہو جاتی ہے بالفاظِ دیگر جب انسان کو معرفتِ حق نصیب ہوتی ہے اور وہ معرفتِ حق میں بقا حاصل کر لیتا ہے تو اس کی غفلت فنا ہو جاتی ہے یعنی وہ کسی حال میں حق سے غافل نہیں رہتا اور یہ غفلت کی فنا ذکرِ حق میں بقا کا باعث بنتی ہے۔ اس میں صفاتِ قبیحہ سے دست بردار ہو کر صفاتِ حسنہ کو اختیار کرنا ہوتا ہے۔

خواصانِ اہلِ تصوف کو اس میں اختلاف ہے۔ وہ فنا اور بقا کو علم یا حال سے منسوب نہیں کرتے بلکہ دونوں لفظوں کو کمال درجۂ ولایت کے ضمن میں استعمال کرتے ہیں یعنی ان اولیائے کرام کے لیے جو تکلیفِ مجاہدہ سے فارغ ہو چکے ہوں۔ مقامات و تغیرِ حال سے آزاد ہوں۔ جنہوں نے میدانِ طلب میں مقامِ مقصود پا لیا ہو۔ ہر دیکھنے والی چیز دیکھ لی ہو۔ ہر سننے والی چیز سن لی ہو۔ ہر جاننے والی چیز جان لی ہو۔ ہر پانے والی چیز پالی ہو۔ اور پانے کے بعد حصول کی بے مائیگی دیکھ لی ہو۔ ہر سمت سے روگرداں ہو چکے ہوں۔ تکمیلِ مراد کے لیے اپنے قصد اور ارادے سے ہاتھ دھو لیے ہوں۔ گامزن ہوں۔ ہر دعویٰ سے بیزار ہوں۔ اہل سے منقطع ہوں۔ کرامات کو حجاب سمجھتے ہوں۔ جن کی نظر سے ہر مقام گذر چکا ہو جو لباسِ آفت زیبِ تن کیے ہوئے ہوں۔ جو مراد کو پہنچ کر نامراد ہوں۔ ہر مشرب سے روگرداں ہوں۔ ہر تعلق سے بے تعلق ہوں۔ چنانچہ کہا "جو ہلاک ہوا مشاہدہ سے ہوا اور جو زندہ ہوا مشاہدہ سے ہوا"۔ میں اسی موضوع پر کہتا ہوں: شعر:

"میں نے فنا کو اپنی خواہشات کو مٹا کر فنا کیا۔ میری ہر خواہش تیری خواہش ہو گئی" جب کسی نے اپنے ذاتی اوصاف کو فنا کیا تو گویا اس نے بقائے کامل حاصل کر لی"۔

جب آدمی عالمِ وجود میں ذاتی اوصاف کو نذرِ فنا کر دیتا ہے تو فنائے مراد کی بدولت بقائے مراد سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ پھر نہ قرب رہتا ہے نہ فاصلہ۔ نہ وحشت نہ انس۔ نہ صحو نہ سکر۔ نہ فراق نہ وصال۔ نہ ہلاکت نہ بیخ کنی۔ نہ نام نہ نشان۔ نہ کوئی سمت نہ تحریر۔ بقول یکے از مشائخ: (شعر)

"میرا مقام اور رسم و راہ پامال ہو گئے، کوئی قرب اور فاصلہ نہ رہا۔ میں اپنی ذات سے اس میں فنا ہو گیا۔ مجھے ہدایت ملی۔
یہ ظہورِ حق ہے جو قصدِ فنا سے رونما ہوا۔"

المختصر کسی چیز سے صحیح طور پر فنا ہونا یہ ہے کہ اس چیز کے ناقص ہونے کا مکمل احساس ہو جائے اور اس کی کوئی خواہش باقی نہ رہے۔ صرف یہ کافی نہیں کہ کسی چیز سے رغبت ہو اور آدمی کہے "میں اس چیز سے باقی ہوں"۔ یا کسی چیز سے نفرت ہو اور آدمی کہے "میں اس چیز سے فانی ہوں"۔ رغبت اور نفرت ایسی چیزیں تو ایسے لوگوں سے سرزد ہوتی ہیں جو ابھی جویانِ منزل ہوں۔ فنا میں کوئی رغبت و نفرت نہیں ہوتی۔ بقا میں کوئی امتیازِ فراق و وصال نہیں ہوتا۔

ص ۲۶۶/۳۴۰

کچھ لوگ غلط طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ فنا کا مطلب فُقدانِ ذات اور ازالۂ شخصیت ہے۔ اور بقائے حق میں پیوست ہو جانے کو بقا کہتے ہیں۔ یاد رکھو یہ دونوں چیزیں محال ہیں۔ ہندوستان میں مجھے ایک ایسے شخص سے سابقہ پڑا جو علمِ تفسیر وغیرہ میں کامل سمجھا جاتا تھا۔ جب میں نے اس کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ وہ فنا اور بقا کی حقیقت سمجھنے سے بالکل قاصر تھا۔ حدث و قِدم کی تفریق سے ناآشنا تھا۔ بہت سے مجہول صوفیا، فنائے کُلّی کے قائل ہیں یہ فاش غلطی ہے کیونکہ طینتی اجزا کی فنا اور ان کا انقطاع محال ہے۔ میں ان غلط رو جہلا سے پوچھتا ہوں کہ اس فنا سے ان کی مراد کیا ہے؟ اگر ان کا مطلب فنائے عین ہے تو یہ ناممکن ہے۔ اگر فنائے صفات ہے تو اس کی صورت صرف یہ ہے کہ ایک صفت کی فنا کسی دوسری صفت کی بقا سے وابستہ ہو اور دونوں صفتیں صفاتِ انسانی میں شامل ہوں۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی کسی غیر کی صفت پر قائم ہو۔ رومیوں میں نسطوریوں کا اور نصاریٰ کا مذہب یہ ہے کہ مریم رضی اللہ عنہا بزورِ مجاہدہ تمام ناسوتی اوصاف سے فانی ہو گئیں۔ ان کو بقائے لاہوتی حاصل ہوئی۔ اور اس بقا سے بقائے خداوندی میں شامل ہو گئیں۔ اس کا نتیجہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام تھے، جن کی ترکیبِ اصلیت انسانیت سے بالاتر تھی۔ کیونکہ ان کی بقا درحقیقت بقائے الٰہیت سے پیوستہ تھی۔ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ، ان کی والدہ اور حق تعالیٰ ایک ہی قسم کی بقا میں شامل تھے یعنی بقائے قدیم میں جو صرف خدائے عزّ و جلّ کی صفت ہے

ص ۲۶۶/۳۴۱

یہ سب کچھ حشوی مجسمہ اور مشبہ لوگوں کے قول سے موافق ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ ذاتِ خداوندی محلِّ حوادث ہے اور قدیم کے لیے صفتِ محدث جائز ہے۔ میں ایسے اعتقادات میں مبتلا تمام لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا فرق ہے اس میں کہ قدیم محلِ حوادث ہے اور حوادث محلِ قدیم ہیں؟ یا اس میں کہ قدیم صفاتِ حوادث سے آراستہ ہے اور حوادث صفاتِ قدیم سے مزیّن ہیں؟ یہ اعتقاد دہریت پر مبنی ہے اور حدثِ عالم کی حقیقت کے منافی ہے۔ اسے سامنے رکھ کر ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا

کہ مخلوق اور خالقِ قدیم میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں قدیم ہیں یا دونوں محدث ہیں۔ یا پھر یہ کہنا پڑے گا کہ "نا مخلوق" کا مخلوق سے ملاپ ہے یا "نا مخلوق" مخلوق میں حلول کرتا ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ بے سود اعتقاد انہیں کیوں پسند ہے؟ قدیم کو محلّ حوادث کہیں یا حادث کو محلِ قدیم ہر دو صورت میں یہ ماننا پڑے گا کہ صفت اور صانع دونوں قدیم ہیں یا از برائے دلیل اگر صفت حادث ہے تو اس کا صانع بھی حادث ہوگا۔ کیونکہ ہر چیز کا محل عین اس چیز کے مطابق ہوتا ہے۔ اس طرح لازم آتا ہے کہ حادث کو قدیم کہا جائے یا قدیم کو حادث تصوّر کیا جائے۔ یہ صریح گمراہی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ جو چیزیں ایک دوسرے سے پیوست، ملی جلی اور قریب ہوتی ہیں وہ باہم یکساں ہوتی ہیں۔ ہماری بقا ہماری صفت ہے۔ ہماری فنا ہمارا وصف ہے۔ دونوں ہمارے اوصاف میں شامل ہیں اور یہی چیز دونوں میں قدرِ مشترک ہے۔ فنا کسی ایک وصف کی فنا ہے جو کسی اور وصف کی بقا سے صورت پذیر ہوتی ہے۔ فنا بغیر بقا اور بقا بغیر فنا بھی ہو سکتی ہے۔ اس تصوّر کے پیشِ نظر فنا سے مراد فنائے ذکرِ غیر ہے اور بقا کا مطلب بقائے ذکرِ حق ہے۔ بقول "جو شخص اپنی مراد سے فانی ہوا وہ مرادِ حق سے باقی ہوا"۔ کیونکہ انسانی مراد فانی ہے اور مرادِ حق باقی ہے۔ جب انسان اپنی فانی مراد پر قائم رہا تو قیامت فنا پر ہوگی۔ جب مرادِ حق پر رہا تو گویا مرادِ باقی پر رہا اور قیامت بقا پر ہوگی۔ اس کی مثال یوں سمجھنا چاہیئے کہ جو چیز بھڑکتی ہوئی آگ میں گرتی ہے وہ اسی کے التہاب کا وصف اختیار کر لیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب آگ کی طاقت اپنے لپیٹ میں آئی ہوئی چیز کا وصف بدل سکتی ہے تو ارادتِ حق کی قوّت تو آگ سے بہت زیادہ ہے۔ مگر یاد رکھو یہ آگ کا تصرّف صرف لوہے کے وصف تک محدود ہے اس کی ذات نہیں بدلتی یعنی لوہا کبھی آگ نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم۔

ص ۲۶۷/۳۴۲

فصل

مشائخ کبار نے اس موضوع پر بہت باریک رموز بیان کیے ہیں۔ ابو سعید خرّاز جو اس مکتبہ کے امام ہیں فرماتے ہیں: "فنا احساسِ عبودیت کی فنا کا نام ہے بقا مشاہدۂ حق سے باقی ہونے کو کہتے ہیں"۔ یعنی اپنے افعال پر نظر رکھنا خام کاری کی دلیل ہے۔ بندگی کا صحیح مقام اس وقت حاصل ہوتا ہے جب انسان اپنی کارگذاری کو نظر انداز کر دے اور اس کی طرف سے اپنے آپ کو فانی سمجھے۔ صرف فعلِ خداوندی پر نظر رکھے اور اس سے خود کو باقی تصوّر کرے۔ اپنے معاملہ کو خود سے نہیں بلکہ اس کی ذات سے منسوب کرے کیونکہ ہر انسانی چیز ناقص ہوتی ہے۔ اور ہر وہ چیز جو حق تعالیٰ

سے موصول ہو کامل ہوتی ہے۔ الغرض آدمی اپنے جملہ متعلقات سے فانی ہو کر ہی الہیتِ حق کے جمال سے باقی ہو سکتا ہے۔

ص ۲۶۸/۳۴۳ ابو سعید خراز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "صحیح عبودیت فنا و بقا میں ہے۔" یعنی جب تک بندہ اپنی تمام پونجی سے بیزار نہ ہو صحیح اور مخلص بندگی کے قابل نہیں ہوتا۔ مطلب یہ ہے کہ سرمایہ آدمیت سے دست بردار ہونا فنا ہے۔ اور عبودیت میں مخلص ہونا بقا ہے۔

ابراہیم بن شیبانؒ فرماتے ہیں "علمِ فنا و بقا کی بنیاد اخلاص، وحدانیت اور صحیح عبودیت پر ہے۔ باقی سب کچھ خطا و الحاد ہے"۔ جب انسان توحیدِ خداوندی کا اقرار کرتا ہے تو اپنے آپ کو حکمِ حق تعالیٰ کے سامنے مغلوب و مقہور پاتا ہے۔ مغلوب ہمیشہ غالب کے سامنے فانی ہوتا ہے۔ وہ اپنی فنا کو صحیح سمجھ کر اپنے عجز کو محسوس کرتا ہے اور اسے عجز بندگی چارہ کار نہیں رہتا اور وہ جادۂ رضا پہ گامزن ہو جاتا ہے۔ فنا و بقا کے یہ معنی ہیں۔ جو کوئی اس کے خلاف کہتا ہے یعنی یہ کہتا ہے کہ فنا کا مطلب فنائے ذات ہے اور بقا کے معنی بقائے خداوندی ہے وہ زندقہ کا مرتکب ہے اور عیسائیت کا علمبردار جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔

میں (علی بن عثمان رض الجلابی) کہتا ہوں کہ یہ جملہ اقوال از روئے معانی برابر ہیں گو از روئے عبارت مختلف نظر آتے ہیں۔ مختصراً مطلب یہ ہے کہ فنا رویتِ جلال حق تعالیٰ اور اس کے کشفِ عظمت سے ظہور پذیر ہوتی ہے یہاں تک کہ بندہ اس کے غلبۂ جلال کے سامنے دنیا و عقبیٰ کو فراموش کر دیتا ہے۔ احوال و مقام اس کی ہمت کے سامنے حقیر ہو جاتے ہیں۔ کرامات ہیچ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ وہ عقل و نفس سے فانی ہو جاتا ہے یہاں تک کہ فنا سے بھی فانی ہو جاتا ہے اور اس حقیقی فنا کے عالم میں وہ زبانِ فنا سے اعلانِ حق کرتا ہے اور اس کی جان اور اس کا تن سراپا خشیت و طاعت ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بالکل ایسے جیسے اولادِ آدم پشت سے پاک و منزہ نکلی تھی اور سر تا بقدم عبودیت تھی۔ اسی موضوع پر ایک بزرگ نے کہا ہے:

ص ۲۶۹/۳۴۴

"اگر مجھے تیری ذات تک پہنچنے کا راستہ معلوم ہوتا تو میں اپنی ذات سے فنا ہو کر تیرے ذکر میں رو تا رہتا"۔

ایک اور بزرگ نے کہا:

"میری فنا میں میری فنا کی فنا ہے۔ میں نے اپنی فنا کو سود مند پایا۔ میں نے اپنا نام و نشان مٹا دیا۔ تو نے پوچھا

تو کون ہے میں نے کہا تو ہی تو ہے۔"

یہ ہیں احکام فنا و بقا تصوّف اور فقر کے نقطہ نظر سے جو میں نے مختصراً بیان کر دیئے۔ اس کتاب میں جہاں کہیں فنا و بقا کا ذکر ہوگا یہی کچھ مراد ہوگا۔ یہ خرازیوں کے مکتبہ کا بنیادی اصول ہے جو نمامنز روشن اور بیّن ہے۔ فی الحقیقت جو جدائی وصل کی دلیل ہو وہ بے بنیاد نہیں ہوتی۔ اس طائفہ میں یہ بات زبان زد عام ہے واللہ اعلم۔

۹۔ خفیفیہ

خفیفی مکتبہ کے لوگ ابو عبداللہ محمد بن خفیف الشیرازیؒ کا اتباع کرتے ہیں۔ اور وہ اس مکتبہ کے بزرگ سربراہوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اپنے زمانے میں صاحب عزّت و توقیر تھے۔ علوم ظاہر و باطن سے آراستہ تھے ان کی تصانیف مشہور و معروف ہیں۔ ان کے مناقب و فضائل بے شمار ہیں۔ مختصر یہ کہ عزیز روزگار تھے اور نہایت درجہ پاکیزہ نفس تھے شہوات نفسانی سے روگردانی ان کی خصوصیت تھی۔ سنا ہے کہ انہوں نے چار سو عورتوں سے نکاح کیے۔ وجہ غالباً یہ تھی کہ آپ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے جب توبہ کی ابتدا ہوئی تو اہل شیراز نے بے حد ارادت کا اظہار کیا جب بلند حال ہوئے تو شہزادیوں اور رئیس زادیوں نے تبرکاً آپ کے ساتھ رشتہ زوجیت استوار کرنا چاہا۔ تاہم آپ ابتلا سے بچے اور ہر ایک کو ہاتھ لگانے سے قبل طلاق دے دی۔ البتہ چالیس عورتیں ایسی تھیں جو مختلف اوقات میں دو دو، تین تین آپ کے حلقۂ زوجیت میں رہیں۔ ایک مکمل چالیس برس تک آپ کے ساتھ رہی وہ کسی وزیر کی لڑکی تھی میں نے شیخ ابوالحسن علی بکران الشیرازیؒ سے سنا کہ ایک روز آپ سے متعلقہ کچھ عورتیں ایک جگہ جمع تھیں اور باہم گفتگو کر رہی تھیں سب کی سب اس بات پر متفق تھیں کہ ان میں سے کسی نے بھی خلوت میں شیخ کو عالم شہوت میں نہیں دیکھا۔ ہر ایک کے دل میں وسوسہ پیدا ہوا اور وہ سخت متعجب ہوئیں۔ قبل ازیں ہر ایک اپنی جگہ یہ سمجھتی تھی کہ شیخ کا میلان طبیعت دوسری کی طرف ہے۔ سب نے سوچا کہ وزیر زادی کے سوا کوئی اس راز سے واقف نہیں ہو سکتا۔ وہ سالہا سال سے ان کی صحبت میں رہی ہے۔ سب نے مشورہ کیا اور باتفاق رائے سے دو کو وزیر زادی کے پاس بھیجا تاکہ صحیح صورت حالات معلوم ہو سکے۔ وزیر زادی نے بیان کیا "شیخ کے حلقۂ زوجیت میں آنے کے بعد مجھے پیغام پہنچا کہ آج رات شیخ میرے ہاں بسر کریں گے۔ میں نے خوب کھانے تیار کیے خوب بناؤ سنگھار کیا۔ وہ تشریف لائے۔ دستر خوان لگ چکا۔ تو مجھے طلب کیا۔ ایک نظر مجھے دیکھا۔ ایک نظر دستر خوان پر کی۔ پھر میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی آستین میں لے گئے۔ میں نے دیکھا تو سینہ

ص ۲۷۰/۳۴۵

سے ناف تک پیٹ پر پندرہ گرہیں پڑی ہوئی تھیں۔ پھر کہا اے وزیر زادی! یہ گرہیں اس سختی اور صبر کا نتیجہ ہیں جو میں اس حسن اور اس طعام سے روگردان ہو کر برداشت کرتا رہا ہوں۔ شیخ نے صرف اس قدر گفتگو کی اور اٹھ کر چلے گئے یہ ہمارے تعلق کی انتہا تھی"۔

تصوّف میں ان کے مکتبہ کا بنیادی تصوّر غیبت و حضور سے وابستہ ہے اس پر انہوں نے عبارت آرائی کی ہے میں اس موضوع پر جو ممکن ہے بیان کرتا ہوں انشاء اللہ العزیز۔

ص ۲۷۱/۳۴۶

غَیبت و حضور

یہ الفاظ حقیقی معنوں میں ایک دوسرے کا عکس ہیں گو بظاہر متضاد دکھائی دیتے ہیں اہلِ زبان اور اہلِ حقیقت میں مروّج و مستعمل ہیں۔ حضور سے مراد حضورِ دل ہے جو دلیلِ یقین ہے یعنی جو آنکھوں سے نہاں ہے۔ اس کی حیثیت ایسی چیز کی ہے جو آنکھوں کے سامنے عیاں ہے۔ غیبت سے مراد غیر اللہ سے دل کی غیبت ہے۔ یہاں تک کہ دل خود سے اور اپنی غیبت سے بھی غائب ہو جائے۔ اپنی اہمیت قطعاً موقوف ہو جائے۔ اس کی علامت رسمی تکلفات سے قطع تعلق ہے۔ نبی کی طرح جو نا بندہ ربانی سے معصوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اپنی ذات سے غیبت حضورِ حق اور حضورِ حق اپنی ذات سے غیبت کا نام ہے۔ جو اپنی ذات سے غائب ہو وہ صاحبِ حضورِ حق ہوتا ہے اور جو صاحب حضورِ حق ہو وہ اپنی ذات سے غائب ہوتا ہے۔ مالک القلوب ذات باری ہے۔ جب جذبِ حق دل پر غالب ہوتا ہے تو دل کی غیبت طالب کے لیے حضورِ حق کے برابر ہوتی ہے۔ شرکت اور تقسیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور خودی کا تصوّر مٹ جاتا ہے۔ بقولِ شیخ :

"تو بلا شرکتِ غیرے میرے دل کا مالک ہے اس کو تقسیم کیسے کیا جا سکتا ہے"۔

ذاتِ حق مالک القلوب ہے اور اسی ذات کو دلوں کی غیبت اور حضور پر پوری قدرت ہے۔ یہ ہے دراصل جملہ منطق کا لب لباب مگر فرق کو مدنظر رکھتے ہوئے مشائخ کبار کا اختلاف ہے۔ ایک جماعت حضور کو غیبت پر ترجیح دیتی ہے اور دوسری غیبت کو حضور پر۔ اس بحث کی نوعیت صحو و سکر کی سی ہے جو قبل ازیں معرضِ بیان میں آ چکی ہے مگر صحو و سکر بقائے اوصافِ انسانی کی علامات ہیں اور غیبت و حضور فنائے اوصاف کی۔ اس لیے غیبت و حضور

ص ۲۷۲/۳۴۷

در حقیقت لطیف تر ہیں۔ غیبت کو حضور پر مقدم رکھنے والوں میں ابن عطا، حسین بن منصور، ابو بکر شبلی، بندار بن الحسین، ابو حمزہ بغدادی، سمنون محب اور کئی دیگر عراقی مشائخ شامل ہیں۔ وہ کہتے ہیں "خدا اور تیرے درمیان سب سے بڑا حجاب تیری اپنی ذات ہے۔ جب تو اپنی ذات سے غائب ہو جاتا ہے تو تیرے جبلّی عیوب ختم ہو جاتے ہیں۔ تیری ذات میں ایک بنیادی انقلاب رونما ہو جاتا ہے۔ مریدوں کے مقامات تیرے لیے حجاب ہو کر رہ جاتے ہیں۔ طالبوں کے احوال سامانِ آفت بن جاتے ہیں۔ تیری اپنی ذات اور ہر غیر اللہ چیز تیری نگاہ میں ناپید ہو جاتی ہے۔ تیری انسانی صفات شعلۂ قربت سے جل کر بھسم ہو جاتی ہیں۔ یہی تیری غیبت کا عالم تھا جس میں باری تعالیٰ نے تجھے پشتِ آدم سے پیدا کیا۔ اپنا کلام مقدس تجھے سنوایا، خلعتِ توحید اور لباسِ مشاہدہ سے سرفراز کیا۔ جب تک تو اپنی ذات سے غائب تھا حضورِ حق سے سرفراز تھا۔ جب اپنی صفاتِ انسانی میں حاضر ہوا قربتِ حق سے غائب ہو گیا۔ تیرا حضور تیرے لیے باعثِ ہلاکت ہے۔ یہ مطلب ہے اس قولِ خداوندی کا: وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ "اب تم ہماری طرف تنہا آ رہے ہو جیسے ہم نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا۔"

دوسری طرف حارث محاسبی، جنید، سہل ابن عبداللہ، ابو حفص حداد، حمدون قصّار، ابو محمد جریری، حصری، بانی مکتبہ محمد بن خفیف اور کئی ایک دیگر مشائخ حضور کو غیبت پر مقدم سمجھتے ہیں کیونکہ سب خوبیاں حضور سے متعلق ہیں اپنی ذات سے غائب ہونا حضورِ حق کی راہ ہے۔ اگر منزل پر پہنچ جائے یعنی حضور حاصل ہو جائے تو راہ درکار نہیں ہوتی۔ جو خود سے غائب ہو وہ لامحالہ حاضر بحق ہوتا ہے۔ غیبت کا حاصل حضور ہے اور غیبتِ بے حضور بیکار ہے۔ غفلت

ص ۲۷۳/۳۴۸

سے دست بردار ہونا ضروری ہے۔ غیبت حضور کے لیے ذریعۂ کار ہے اور حصولِ مقصد کے بعد ذریعۂ کار کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ شعر

"غائب وہ نہیں جو اپنے شہر سے غائب ہو غائب وہ ہے جو ہر آرزو سے
غائب ہو حاضر وہ نہیں جس کی کوئی آرزو نہ ہو۔ حاضر وہ ہے جس کے دل میں دو رنگی
نہ ہو اور اس کی آرزو صرف ذاتِ باری ہو۔"

مشہور ہے کہ ذوالنون مصریؒ کے ایک مرید نے ابو یزیدؒ کی زیارت کا ارادہ کیا۔ ان کے عبادت خانہ کے دروازہ پر آ کر دستک دی۔ ابو یزید نے اندر سے پوچھا "کون ہے؟ کس کی تلاش ہے؟" مرید نے جواب دیا۔ میں

ابویزید سے ملنا چاہتا ہوں۔ جواب ملا "ابویزید کون ہے؟ کیا ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ میں مدت سے اس کی تلاش میں ہوں مجھے آج تک نہیں ملا"۔ مرید نے واپس آکر تمام واقعہ ذوالنون سے بیان کیا۔ انہوں نے فرمایا "میرا بھائی ابویزید حق تعالےٰ کی طرف جانے والوں میں چلا گیا"۔

ایک شخص جنیدؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ ایک لمحہ مجھے توجہ دیجیے میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ جنیدؒ نے فرمایا "اے جوانمرد! تو مجھ سے وہ چیز طلب کر رہا ہے جس کا میں خود مدت سے طالب ہوں سالہا سال گذر گئے ہیں حضورِ حق کے لیے کوشاں ہوں مگر مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔ اس وقت میں تیرے سامنے کیسے حاضر ہوسکتا ہوں"۔ الغرض غیبت میں حجاب کا خوف ہوتا ہے اور حضور میں کشف کی مسرت۔ حجاب کسی شکل میں بھی کشف کے برابر نہیں ہوسکتا۔ اسی مضمون پر شیخ ابوسعیدؒ نے فرمایا:

"ماہتابِ محبت سے فراق کے بادل دور ہوگئے ظلمتِ غیب سے نورانی
صبح ضوفشاں ہوگئی"۔

یہ تفریق جو مشائخ کبار نے بیان کی ہے حال سے تعلق رکھتی ہے۔ سطحی طور پر صرف اقوال کا فرق ہے ورنہ دونوں صورتیں کم و بیش برابر ہیں۔ حضورِ حق اور خود سے غیبت — دونوں میں کیا فرق ہے؟ جو خود سے غائب نہیں وہ حاضر بحق نہیں ہو سکتا۔ جو حاضر بحق ہے وہ لازماً خود سے غائب ہے۔ چنانچہ حضرت ایوب صلوات اللہ علیہ نے دردوکرب میں جو پکار کی وہ ان کے ذاتی اختیار سے باہر تھی۔ کیونکہ وہ خود سے غائب تھے۔ اسی لیے حق تعالیٰ نے اس پکار کو صبر کے منافی نہ کہا۔ جب ایوب صلوات اللہ علیہ نے کہا "مجھے تکلیف ہوئی"۔ باری تعالےٰ نے فرمایا: اِنَّهٗ كَانَ صَابِرًا "وہ صبر کرنے والا تھا"۔ اس حکایت سے موضوعِ سخن کی مکمل وضاحت ہوتی ہے۔ غور و تامل کی ضرورت ہے۔

جنیدؒ نے فرمایا "ایک ایسا وقت تھا کہ اہل آسمان اور ساکنان زمین میرے عالم حیرت پر گریاں تھے۔ پھر ایک ایسا وقت آیا کہ مجھے ان کی غیبت پر رونا پڑا اب یہ عالم ہے کہ نہ مجھے زمین و آسمان کی خبر ہے اور نہ اپنا پتہ ہے"۔ یہ موضوعِ حضور پر ایک حسین اشارہ ہے۔

یہ ہیں معانی غیبت و حضور کے جو میں نے مختصراً بیان کر دیئے ہیں تاکہ خفیفیہ مکتب کا مسلک ظاہر ہو جائے اور

غیبت و حضور سے جو مراد ہے وہ سامنے آجائے۔ مزید شرح و بسط کتاب کو طویل کردے گی اور میرا طریق تحریر اختصار ہے وباللہ التوفیق۔

۱۰۔ سیّاریہ

ص ۲۷۴/۳۵۰ سیّاری مکتبہ کے لوگ ابوالعباس سیاری کا اتباع کرتے ہیں جو مرو میں تمام علوم کے امام تسلیم کیے گئے ہیں۔ یہ ابوبکر واسطی کے مصاحب تھے۔ آج بھی نسا اور مرو میں ایک کثیر جماعت ان کے اصحاب کی موجود ہے۔ شاید یہی ایک مکتبۂ تصوّف ہے جو آج تک اپنی اصلی صورت پر قائم ہے۔ مرو اور نسا میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی راہنما موجود رہا ہے جس نے اس مکتبہ کے پیروکاروں کو آج تک آقامت کا سبق دیا۔ اہل نسا اور اہل مرو کے درمیان کئی لطیف رسائل ہیں جو مکتوبات کی صورت میں لکھے گئے ہیں میں نے خود چند مکتوبات دیکھے نہایت خوبصورت۔ زیادہ تر عبارات جمع و تفرقہ کے موضوع پر ہیں۔ یہ الفاظ اہل علم میں مشترک ہیں۔ ہر گروہ اپنے موضوعِ علم کے مطابق ان الفاظ کو مفہوم بیان کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ مراد سب کی جداگانہ ہوتی ہے۔ چنانچہ حساب دان جمع و تفرقہ سے اجتماع وافتراقِ اعداد مراد لیتے ہیں۔ نحوی لوگ لغوی طور پر اسمار کا اتفاق اور ان کے معانی کا فرق سمجھتے ہیں۔ فقہا رجمعِ قیاس اور تفرقہ صفاتِ نص یا جمعِ نص اور تفرقہ قیاس کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اہلِ اصول جمع صفاتِ ذات اور تفرقہ صفاتِ فعل پر چسپاں کرتے ہیں۔ اس مکتبۂ تصوف میں یہ الفاظ ان معنوں میں استعمال نہیں ہوتے ہیں اب اس جماعت کا مقصود اور ان کے مشائخ کے اختلافات بیان کرتا ہوں۔ تاکہ اصل حقیقت روشن ہو جائے اور مشائخ کے ہر گروہ کا مقصود جمع و تفرقہ سے متعلق واضح ہو جائے واللہ اعلم بالصواب۔

جمع و تفرقہ

ص ۲۷۵/۳۵۱ جہاں تک دعوت کا تعلق ہے حق تعالیٰ نے تمام بنی نوعِ انسان کو تخاطب کیا اور کہا: وَاللّٰهُ يَدْعُوٓا إِلٰى دَارِ السَّلٰمِ "اللہ تمہیں مقامِ سلامتی کی طرف بلاتا ہے"۔ ہدایت کے لیے فرق ظاہر فرمایا اور کہا: يَهْدِي مَن يَّشَآءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ "اللہ جسے چاہتا ہے راہِ ہدایت دکھاتا ہے"۔ ظاہر ہے کہ دعوت سب کو دی یعنی دعوت میں سب جمع تھے مگر اپنی مشیت کے مطابق ایک گروہ کو رد فرمایا یعنی تفریق فرمائی۔ سب کو ایک جا کیا۔ حکم دیا۔ تفریق فرمائی۔ ایک گروہ کو مردود کر کے بے سہارا چھوڑ دیا۔ دوسرے گروہ کو شرفِ قبولیت عطا کیا اور تائیدِ ربانی

سے سرفراز فرمایا۔ پھر دوبارہ ایک تعداد کو جمع کیا۔ تفریق فرمائی۔ ایک گروہ کو معصیت سے آزاد فرمایا۔ دوسرے گروہ کو مائل بہ کج روی چھوڑ دیا۔

المختصر جمع دراصل حق تبارک وتعالیٰ کا علم اور اس کا حکم ہے اور تفرقہ امر و نہی کا اظہار ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ اسماعیلؑ کو ذبح کرے مگر یہ نہ چاہا کہ اسماعیلؑ ذبح ہو جائے۔ ابلیس کو حکم ہوا کہ آدمؑ کو سجدہ کرے مگر نہ چاہا کہ ایسا ہو۔ آدمؑ کو دانۂ گندم چکھنے سے منع فرمایا مگر چاہا کہ چکھے وغیرہ . . . . جمع وہ ہے جو وہ اپنی صفات سے یکجا کرے اور تفرقہ وہ ہے جو وہ اپنے احکام سے جدا جدا کر دے۔ یہ دراصل انسانی تصرف و ارادت کا انقطاع اور ارادتِ حق کا اثبات ہے۔ جو کچھ جمع و تفرقہ کی نسبت بیان ہوا اس پر بجز معتزلہ تمام اہلِ سنت والجماعت اس مکتبہ کے مشائخ کبار سے متفق ہیں۔ اس سے آگے اختلاف ہے۔ کچھ توحید سے منسوب کرتے ہیں کچھ اوصاف سے اور کچھ افعال سے۔ توحید سے نسبت دینے والوں کا قول ہے کہ جمع کے دو درجے ہیں (۱) جمع اوصافِ حق اور (۲) جمع اوصاف بندہ۔ اول الذکر سرِ توحید ہے جس میں کسبِ انسانی کو کوئی دخل نہیں۔ مؤخر الذکر توحید سے متعلق صدقِ اعتقاد اور صحتِ عزم کا نام ہے۔ یہ ابو علی رود باریؒ کا عقیدہ ہے۔ ص ۲۷۶/۳۵۲

جمع و تفرقہ کو اوصاف سے منسوب کرنے والے کہتے ہیں کہ جمع حق تعالیٰ کی صفت ہے اور تفرقہ اسی ذات کا فعل ہے جس میں انسان کو دخل نہیں کیونکہ خدائی میں کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ جمع کو صرف ذاتِ حق اور صفاتِ حق سے متعلق سمجھنا چاہیئے کیونکہ جمع تسویتِ اصل کا نام ہے اور ابدیت میں بجز ذات و صفاتِ حق کوئی دو چیزیں مساوی نہیں ہو سکتیں۔ جمع ہرگز جمع نہیں۔ اگر تفصیل و تجزیہ میں ذات و صفات کو جدا جدا کیا جا سکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی صفات ازل سے ابد تک اس کی ذات سے وابستہ و موجود ہیں۔ ذاتِ حق اور اس کی صفات علیحدہ اور مختلف نہیں ہیں کیونکہ وحدانیت میں تفریق و اعداد کا وجود نہیں ہوتا۔ اس نقطۂ نظر سے جمع صرف مذکورہ صورت میں ممکن ہے۔

تفرقہ فی الحکم کی نسبت افعالِ خداوندی سے ہے جو مختلف النوع ہوا کرتے ہیں۔ ایک کے لیے حکمِ وجود ہے۔ دوسرے کے لیے حکمِ عدم۔ مگر وہ عدم جس کے لیے وجود بھی ممکن ہو۔ ایک طرف حکمِ بقا ہے دوسری طرف حکم فنا۔ پھر ایک اور گروہ ہے جو ان الفاظ کا اطلاق علم پر کرتا ہے۔ بقول اس گروہ کے "جمع علم توحید اور تفرقہ علمِ احکام" کا نام ہے۔ الغرض علم جمع کی اصل اور تفرقہ شاخوں کی مانند ہے۔ اسی سلسلہ میں کسی شیخ بزرگ کا قول ہے "جس چیز پر اہلِ علم

متفق ہوں وہ جمع اور جس چیز سے متعلق اختلاف ہو وہ تفرقہ ہے"۔

جملہ محققینِ تصوّف اپنے اقوال اور اپنی عبارات میں لفظِ تفرقہ کو انسانی افعال (مکاسب) کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ اور جمع سے انعاماتِ خداوندی (مواھب) مراد لیتے ہیں۔ یعنی مجاہدہ و مشاہدہ۔ جو کچھ آدمی بزورِ مجاہدہ حاصل کرے وہ باعث پریشانی ہے اور جو محض عنایت و ہدایت خداوندی سے میسّر آئے وہ باعث اطمینان قلب ہے۔ یہ آدمی کے لیے موجبِ افتخار ہے کہ وہ اپنے افعال و مجاہدہ کی امکانی آفات سے جمالِ حق کی بدولت محفوظ رہے۔ اپنے فعل کو فضلِ حق میں مستغرق سمجھے، اپنے مجاہدہ کو ہدایتِ حق کے سامنے ہیچ تصوّر کرے۔ کلی طور پر توکل بخدا ہو۔ اپنے تمام اوصاف کو وکالتِ حق کے سپرد کر دے۔ اور اپنے جملہ افعال کو اسی کی ذاتِ اقدس سے منسوب کرے۔ یہاں تک کہ اس کے مکاسب کو اس کی اپنی ذات سے کوئی نسبت نہ رہے۔ جیسا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جبرائیل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا "جب بندہ مجاہدہ سے ہمارا تقرب تلاش کرتا ہے ہم اسے اپنی محبّت سے نوازتے ہیں۔ جب ہماری محبّت کی نوازش ہوتی ہے تو ہم اس کے کان، اس کی آنکھ، اس کے ہاتھ اور اس کا دل ہو جاتے ہیں۔ وہ ہمارے ذریعہ سے سنتا ہے، دیکھتا ہے، بولتا ہے اور بست و کشاد کرتا ہے"۔ یعنی ہمارا ذکر کرتے ہوئے وہ ذکر میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ اس کے ذاتی مکاسب فنا ہو جاتے ہیں۔ وہ خود فراموشی کے عالم میں صرف ہمارے ذکر میں ڈوب جاتا ہے۔ انسان ہونے کا احساس مٹ جاتا ہے اور وہ کیفیتِ وجد میں ابویزیدؒ کی طرح پکار اٹھتا ہے۔ "سبحان اللہ! سبحان اللہ!! میری شان کتنی بلند ہے"۔ ابویزید کے یہ الفاظ گفتار کا ظاہری لباس تھا بولنے والے حق تعالیٰ تھے۔

ص ۲۷۷/۳۵۳

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "حق عمرؓ کی زبان سے گویا ہے"۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ جب جلالِ حق انسانی قلب پر غلبہ کرتا ہے تو انسان اپنی ذات سے فنا ہو جاتا ہے اور اس کی گفتار حق تعالیٰ کی گفتار ہو جاتی ہے۔ یہ غیر ممکن ہے کہ حق تعالیٰ کو مخلوقات یا مصنوعات سے امتزاج یا اتحاد ہو جائے یا وہ کسی چیز میں حلول کر جائے۔ اس کی ذات اس سے بہت بلند ہے اور وہ بہت اونچا ہے ان چیزوں سے جو ملاحدہ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

ص ۲۷۸/۳۵۴

ہو سکتا ہے کہ جب عشقِ حق انسان پر غلبہ کرتا ہے اور اس کے دل و دماغ اس بوجھ کے متحمل نہیں ہو سکتے اسے اپنے کسب پر کوئی اختیار نہیں رہتا۔ اس حالت کو جمع کہتے ہیں۔ مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم مستغرق و مغلوب تھے۔ ان سے ایک فعل ظہور پذیر ہوا۔ حق تعالےٰ نے اسے اپنی طرف منسوب کیا اور کہا یہ میرا فعل تھا: وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ

اللہَ رَمیٰ" اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ مٹھی خاک دشمن پر تو نے نہیں بلکہ ہم نے ڈالی"۔ حضرت داؤد علیہ السلام سے بھی اسی قسم کا فعل ظہور پذیر ہوا۔ اس پر کہا: قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ" داؤد (علیہ السلام) نے جالوت کو قتل کیا"۔ یہ تفرقہ کی حالت تھی۔ کسی کے فعل کو اسی سے منسوب کرنے اور اپنی ذات سے منسوب کرنے میں بہت فرق ہے۔ انسان محل آفات و حوادث ہے۔ حق تعالیٰ کی ذاتِ اقدس قدیم و بے آفت ہے۔ جب فعلِ حق انسان کے ہاتھوں ظاہر ہو اور انسانی امکان سے باہر ہو تو لامحالہ فعلِ حق متصوّر ہو گا۔ اعجاز و کرامات کا یہی مقام ہے۔ جملہ منہاجِ معمول پر سرانجام پانے والے کام تفرقہ کے تحت آتے ہیں اور جملہ خوارقِ عادات جمع کے۔ ایک شب میں "قَابَ قَوْسَيْنِ" کو پہنچنا فعلِ معمول نہیں اسے فعلِ حق تسلیم کرنا پڑے گا۔ اسی طرح کسی غیر موجود سے بات کرنا فعلِ معمول نہیں فعلِ حق متصوّر ہو گا۔ آگ سے بے گزند گزر جانا معمول نہیں فعلِ حق سمجھا جائے گا۔ حق تعالیٰ معجزات اور کرامات اپنے پیغمبروں اور ولیوں کو عطا کرتا ہے۔ اپنے افعال کو ان سے اور ان کے افعال کو اپنے سے منسوب کرتا ہے جیسا کہ فرمایا: اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ "تیرے ہاتھ پر بیعت کرنے والے اللہ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں"۔ پھر فرمایا: وَمَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ "پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانبردار اللہ کا فرمانبردار ہے"۔ اولیاء اللہ اسرار کے معاملے میں مجتمع اور ظاہری اطوار میں متفرق ہوتے ہیں۔ محبتِ حق جمع باطن سے مضبوط ہوتی ہے اور حقوقِ عبودیت تفرقہ ظاہر سے پایۂ تکمیل کو پہنچتے ہیں کسی شیخ کبیر کا قول ہے:

"میں نے اپنے اندرونی اسرار کو سمجھا اور تیرے ساتھ خفیہ طور پر گفتگو کی۔ ایک صورت سے ہم مجتمع ہیں اور ایک صورت سے متفرق"۔

"تیرے جلال نے تجھے میری مشتاق نگاہوں سے چھپا رکھا ہے۔ مگر عالم کیف میں تجھے دل کی گہرائیوں میں دیکھ رہا ہوں"۔

یہاں باطنی طور پر مجتمع ہونے کو جمع کہا گیا ہے اور خفیہ گفتگو (مناجات) کو تفرقہ۔ پھر جمع و تفرقہ دونوں کی اپنے اندر نشان دہی کی ہے اور ان کی بنیاد اپنی ذات کو قرار دیا ہے یہ نہایت نازک نکتہ ہے وباللہ التوفیق۔

فصل

یہاں ایک متنازعہ فیہ مسئلہ بیان کرنا ضروری ہے۔ کچھ لوگ خیال کرتے ہیں کہ جب جمع کا ظہور ہو جائے تو تفرقہ

کی نفی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ یہ متضاد چیزیں ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ہدایت من اللہ کے سامنے کسب و مجاہدہ ساقط ہو جاتے ہیں یہ خیال سراسر غلط ہے۔ تابہ امکانِ توانائی کسب و مجاہدہ سے مفر نہیں۔ جمع اور تفرقہ الگ الگ نہیں کیے جا سکتے۔ نور آفتاب سے، عرض جوہر سے اور صفت موصوف سے وابستہ ہے۔ اسی طرح مجاہدہ ہدایت سے، شریعت حقیقت اور یافت طلب سے وابستہ ہے۔ البتہ مجاہدہ مقدم و مؤخر ہو سکتا ہے۔ جہاں مقدم ہو وہاں غیبت کے پیشِ نظر زیادہ مشقّت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجاہدہ مؤخر ہو تو بوجہ حضوری رنج و کلفت سے دوچار ہونا نہیں پڑتا جس کے اعمال کی بنیاد نفی پر ہو اس کی نگاہوں میں نفی عینِ عمل معلوم ہوا کرتی ہے اور یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ انسان ایسے مقام پر پہنچ جائے جہاں اسے اپنی تمام عمدہ صفات نامکمل اور ناقص دکھائی دیں۔ اور جب اچھی صفات نامکمل اور ناقص نظر آئیں گی تو یقیناً بری صفات ناقص تر دکھائی دیں گی۔ یہ چیز میں اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ بعض جہالت میں مبتلا لوگ ایک سنگین غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں جو الحاد سے بہت قریب ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کوشش سے کوئی چیز حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہماری طاعت ناقص اور ہمارے اعمال معیوب ہیں۔ ناقص مجاہدہ نہ کرنا مجاہدہ کرنے سے بہتر ہے۔ یہ استدلال باطل ہے۔ کیونکہ بالاتفاق مانا گیا ہے کہ کردار کی بنیاد فعل پر ہے۔ اگر فعل کو مرکز علّت و آفت تصوّر کیا جائے اور یہ بھی ظاہر ہو کہ ناکردہ کو بھی بنیادی فعل کی ضرورت ہے تو ہر دو جانب بنیادی طور پر فعل کارفرما ہونا چاہیئے۔ فعل دونوں جانب علت و آفت ہے تو ناکردہ کو کردہ پر کیونکر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ یہ بیّن غلطی اور واضح بے راہ روی ہے۔ کفر اور ایمان میں بھی نمایاں فرق ہے۔ مومن و کافر متفق ہیں کہ افعال محل ملّت ہیں۔ مومن حسب الحکم کردہ کو ناکردہ پر ترجیح دیتا ہے اور کافر اپنی نافرمانی کی بنا پر ناکردہ کو کردہ سے بہتر سمجھتا ہے۔ فی الحقیقت جمع یہ ہے کہ آفتِ تفرقہ کے باوجود حکم تفرقہ کو ساقط نہ سمجھا جائے۔ اور تفرقہ یہ ہے کہ جمع کے پردے میں تفرقہ بھی جمع متصوّر ہو۔ اسی مضمون پر مزین کبیر فرماتے ہیں: "جمع مقام خصوصیت ہے اور تفرقہ عبودیّت یہ دونوں صورتیں ایک دوسرے سے کلیتہً وابستہ ہیں"۔ مطلب یہ ہے کہ عبودیت کے فرائض کو سرانجام دینا خاصانِ حق کا کام ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر فرض کو کماحقہٗ سرانجام دینے والے کے لیے محنت و مشقت کو آسان کر دیا جائے مگر یہ قطعاً ناممکن ہے کہ مجاہدۂ نفس کے آئین کو ساقط کر دیا جائے۔ جب تک شرعاً جائز تسلیم کیے جانے والی شکل موجود نہ ہو یہاں قدرے تشریح کی ضرورت ہے تاکہ بات قابلِ فہم ہو جائے۔

ص ۲۸۰ / ۳۵۷

جمع کی دو صورتیں ہیں (۱) جمع سلامت (۲) جمع تکسیر

جمع سلامت وہ ہے جو غلبۂ حال، شدّتِ وجد، قلق اور شوق کے عالم میں ظہور میں آجائے۔ حق تعالیٰ بندہ کی حفاظت کرے اس کے ظاہر کو سلامت رکھے۔ امداد کرنے کی توفیق عطا کرے اور مجاہدہ پر استقامت دے۔ چنانچہ سہل بن عبداللہ، ابوحفص حداد، ابوالعباس سیاری امام مرو و صاحبِ مکتبہ سیّاریہ، ابویزید بسطامی، ابوبکر شبلی، ابوالحسن حصری اور مشائخ کبار کی ایک کثیر جماعت قدس اللہ تعالیٰ ارواحہم مغلوب رہا کرتے تھے۔ جب تک وقتِ نماز نہ آجائے نماز کے وقت اپنے حال پر پلٹ آتے تھے۔ نماز ادا کر چکنے کے بعد پھر مغلوبیت طاری ہو جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ عالمِ تفرقہ میں کوئی شخص احساسِ خودی سے خالی نہیں ہو سکتا اور اس کے لیے تکمیلِ امر لازم ہے۔ عالمِ جذب میں یہ حق تعالیٰ کا کرم ہے کہ بندے کو خلافِ امر سے محفوظ رکھے تاکہ اس کا نشانِ عبودیت برقرار رہے اور باری تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا ہو کہ شریعتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت وہ خود کرتا ہے۔

ص ۲۸۱/۳۵۸

جمع تکسیر میں انسان دالہ و مدہوش ہو جاتا ہے اور اس کی قوتِ فیصلہ دیوانوں کی سی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس حالت میں انسان معذور ہوتا ہے یا مشکور۔ مشکور کا درجہ معذور سے بلند تر ہے۔

الغرض جمع کسی خاص مقام یا خاص حال کا نام نہیں۔ جمع سے مراد اپنے مطلوب کے لیے اپنی ہمت کو مرکوز کرنا ہے۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ مقامات میں شامل ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ یہ احوال سے متعلق ہے۔ بہرحال صاحبِ جمع کو مراد نفیٔ مراد سے حاصل ہوتی ہے۔ "تفرقہ جدائی ہے اور جمع وصل ہے"۔ یہ چیز ہر مقام پر درست اترتی ہے۔ یعقوب علیہ السلام کی ہمت یوسفؑ پر مرکوز رہی اور ان کے تصوّر میں اس کے سوا کوئی نہ رہا۔ مجنون کی ہمت لیلیٰ پر مرکوز ہوئی تو اسے دنیا میں لیلیٰ کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ ہر چیز نے لیلیٰ کی شکل اختیار کر لی۔

ایسی اور بہت سی چیزیں ہیں۔ ابویزیدؒ اپنے عبادت کدہ میں مقیم تھے۔ کسی نے آکر آواز دی "کیا ابویزید گھر میں ہے"۔ ابویزید نے جواب دیا "بجز ذاتِ خدا گھر میں کوئی نہیں"۔

ایک شیخ بزرگ نے بیان کیا ہے کہ کوئی درویش مکّہ معظمہ میں وارد ہوا۔ اور خانہ کعبہ کے سامنے ایک سال تک بیٹھا رہا۔ نہ اس نے کھایا نہ پیا۔ نہ وہ سویا اور نہ رفع حاجت کے لیے اٹھا۔ اس کی ہمت رویتِ خانۂ خدا پر جمع تھی۔ اور خانۂ خدا اس کے تن اور اس کی روح کے لیے سامانِ خورد و نوش بن گیا۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ باری تعالیٰ نے اپنی

ص ۲۸۲/۳۵۹

محبّت کو جو اصل میں ایک ہی جوہر سے منسوب ہے ٹکڑے ٹکڑے کیا اور اپنے دوستوں میں ہر ایک کے ظرف اور اشتیاق کے مطابق تقسیم فرمایا پھر اس پر انسانیت کی زرہ، طبیعت کا لباس، مزاج کا پردہ، اور روح کا حجاب ڈال دیا تاکہ وہ ریزۂ محبّت اپنی قوت سے تمام اجزائے انسانی کو اپنے رنگ میں رنگ دے۔ نتیجۂ محبّت کرنے والا سراپا محبت ہو گیا اور اس کے تمام حرکات و سکنات شرائطِ محبت ہو کر رہ گئے۔ اسی بنا پر اربابِ معانی اور اہلِ زبان نے جمع کا لفظ وضع کیا۔ اسی مضمون پر حسین بن منصور رحؒ نے فرمایا:

شعر "اے میرے آقا میں حاضر ہوں اے میرے مالک میں حاضر ہوں۔ اے میرے مقصد! اے میرے معنی! میں حاضر ہوں۔ اے میری روحِ رواں! اے میری منزلِ مقصود! اے میری عبارت! اے میری اشارت! اے میری کلیّت کے کل! اے میری قوتِ سمع! اے میری طاقتِ دید! میری جملگی، میرے عناصر، میرے اجزاء۔

الغرض جب انسان سمجھ لیتا ہے کہ اس کے ذاتی اوصاف مستعار ہیں تو اس کی نظر میں اپنی ہستی باعثِ عار ہو جاتی ہے۔ کونین کی طرف نگاہِ التفات کرنا شرک کے برابر ہو جاتا ہے۔ عالمِ موجودات کی ہر شے بے وقعت ہو کر رہ جاتی ہے۔

بعض اہلِ زبان کلام کی نزاکت اور عبارت کی باریکی کے لیے جمع الجمع کا لفظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ یہ کلمہ عبارت آرائی کے لیے خوب ہے مگر معنوی اعتبار سے بہتر یہی ہے کہ جمع کی جمع نہ بنائی جائے کیونکہ جمع کے لیے تفرقہ ضروری ہے۔ جمع موجود ہے تو اس پر اور جمع مسلط نہیں کی جا سکتی۔ اس کلمہ کا غلط مفہوم لیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ صاحبِ جمع کی نظر تحت و فوق سے بے نیاز ہوتی ہے۔ پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کو شبِ معراج ہر دو عالم دکھائے گئے۔ آپ نے کسی طرف نگاہِ التفات نہ فرمائی۔ آپ مجتمع تھے اور مجتمع کی نظر تفرقہ پر نہیں پڑا کرتی۔ اسی واسطے باری تعالیٰ نے فرمایا: مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی " نہ نظر کسی طرف مائل ہوئی نہ تجاوز کیا"۔

اوائلِ ایام میں اسی موضوع پر میں نے ایک کتاب ترتیب دی تھی اور اس کا نام "البیان لاہل العیان" رکھا تھا "بحر القلوب" میں بھی جمع کے تحت اس مضمون پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اب اختصار کے طور پر جو بیان کیا کافی ہے

یہ ہے مکتبہ سیاریہ کا طریق اور اس پر ان مکاتبِ تصوف کا احوال ختم ہوتا ہے جو مقبول ہیں اور صحیح تصوف کے علمبردار ہیں۔ اب مجھے کچھ ان ملحدوں سے متعلق بیان کرنا ہے جو صوفیائے کرام کے گروہ میں شامل ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے اقوال کو اپنے الحاد کا جامہ پہناتے ہیں۔ اور اپنی تذلیل کو ان کی عزت و توقیر میں چھپاتے ہیں۔ میرا مقصد ایسے لوگوں کے مکر و ریا کو بے نقاب کرنا ہے تاکہ عوام الناس ان سے دور رہیں۔ انشاء اللہ العزیز۔

(۱۱) حلولیہ لعنہم اللہ

باری تعالیٰ نے فرمایا: فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ "صداقت کے بعد گمراہی کے سوا کیا رکھا ہے"۔

دو مردود گروہ ہیں جو صوفیائے کرام سے منسلک ہو کر اپنی گمراہیوں کا تعلق ان سے ظاہر کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک گروہ ابی حلمان دمشقی کا اتباع کرتا ہے۔ اور اس کے متعلق ایسی حکایات بیان کرتا ہے جو مصدقہ کتب سے مختلف ہیں۔ اہل تصوف حلمان کو منجملہ صوفیائے کرام سمجھتے ہیں مگر یہ ملحدوں کا گروہ حلول، امتزاج اور تناسخ ارواح کے مسائل اس کی طرف منسوب کرتا ہے۔ میں نے یہ مقدسی میں پڑھا جس میں ابی حلمان پر اعتراض کیا گیا ہے دیگر علمائے اصول کا بھی یہی زاویۂ نظر ہے۔ تاہم اصل حقیقت کا علم صرف باری تعالیٰ کو ہے۔

ص ۲۸۳/۳۶۱

دوسرا گروہ مردود اپنی تعلیمات کو فارس سے منسوب کرتا ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ یہ طریق حسین بن منصور (حلاج) کا ہے مگر حلاج کا اتباع کرنے والوں میں صرف فارس ہی اس چیز کا مدعی ہے۔ میں نے ابو جعفر صیدلانی سے ملاقات کی۔ ان کے چار ہزار مرید جو سب کے سب حلاجی تھے عراق میں پھیلے ہوئے تھے اور سب کے سب فارس کو ملعون سمجھتے تھے۔ علاوہ ازیں حلاج کی اپنی تصنیفات میں بجز صحیح کچھ بھی نظر نہیں آتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ جاننے کی ضرورت ہی نہیں کہ فارس اور حلمان کون تھے اور انہوں نے کیا کہا؛ جو کوئی بھی کسی ایسی چیز کا قائل ہوا جو توحید اور تصوف کے منافی ہے وہ دین سے بے بہرہ ہے۔ دین جڑ ہے۔ اگر جڑ کمزور ہے تو تصوف جس کی حیثیت شاخ کی ہے کبھی مضبوط نہیں ہو سکتا۔ کرامت، کشف اور معجزہ صرف اہل دین اور اہل توحید کے لیے ہیں۔ غلط انگاری روح کے معاملے میں ہے۔ اور میں اب روح سے متعلق جملہ احکام قانونِ سنت و مقالات کے مطابق بیان کرتا ہوں۔ اور ملحدوں کی اغلاط اور ان کے شبہات کا ذکر کرتا ہوں تاکہ تیرے ایمان کو تقویت ہو۔

بیانِ رُوح

معلوم ہونا چاہیئے کہ روح سے متعلق علم کی ضرورت ہے مگر اس کی ماہیت سمجھنے سے عقلِ انسانی عاجز ہے۔ علماء،

ص ۲۸۴/۳۶۲

حکماء اور حکیمانِ امت نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اس موضوع پر قیاس آرائی کی ہے۔ اکثر کفار نے بھی روح کو موضوع بحث بنایا ہے۔ جب کفارِ قریش نے یہودیوں کی انگیخت پر نضر بن الحارث کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کیفیت رُوح کی نسبت سوال کرنے کے لیے بھیجا تو حق تعالیٰ نے پہلے از راہ اثباتِ حقیقتِ روح فرمایا: يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ "وہ لوگ آپؐ سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں"۔ اور پھر عدمِ روح کی نفی کرتے ہوئے فرمایا: قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ "آپ فرمادیں کہ روح امرِ ربی ہے"۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الارواح جنود مجندۃ فما تعارف منہا ائتلف وما تناکر منہا اختلف "ارواح کی مثال لشکروں کی سی ہے جو ایک جگہ مجتمع ہوں۔ متعارف روحوں میں اتفاق اور غیر متعارف میں اختلاف ہوتا ہے"۔ اسی طرح حقیقتِ روح کے اثبات پر بہت سے اقوال ہیں مگر ماہیتِ روح سے متعلق کوئی ثقہ چیز موجود نہیں۔ ایک جماعت کہتی ہے۔ "روح ایک حیات ہے جس سے جسم زندہ ہیں"۔ متکلمین بیشتر اسی نظریہ کے قائل ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق رُوح کی حیثیت "عرض" کی ہے جو فرمانِ خداوندی کے تحت جسم کو زندہ رکھتا ہے جو جنسِ تالیف اور حرکتِ اجتماع کا باعث ہے۔ اور ان تمام عرضی صفات کا موجب ہے جو جسم کو مختلف صورتوں میں ڈھالتے رہتے ہیں۔ ایک دوسری جماعت کا خیال ہے۔ "روح حیات نہیں اگرچہ حیات اس کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ جسم کی عدم موجودگی میں روح کا ہونا ممکن نہیں۔ دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے جیسے درد اور درد کے علم کا"۔ اس حیثیت سے بھی روح کو زندگی کی طرح "عرض" ہی تسلیم کرنا پڑے گا۔

ص ۲۸۵/۳۶۳

بیشتر اہلِ سنت والجماعت اور جمہور مشائخ کے مطابق روح بذاتِ خود ایک حقیقت ہے، صفت نہیں۔ جب تک جسم میں موجود ہے حکمِ خداوندی سے حیات آفریں ہے۔ زندگی آدمی کی صفت ہے اور اس سے زندہ ہے۔ روح جسم میں ودیعت ہے۔ روح جدا بھی ہو جائے تو وہ زندہ رہ سکتا ہے۔ چنانچہ عالمِ خواب میں روح موجود نہیں ہوتی مگر انسان زندہ ہوتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ روح کی عدم موجودگی میں عقل و علم مفقود ہوتے ہیں،

رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "شہیدوں کی روحیں پرندوں کے پوٹوں میں رہتی ہیں۔ یہ عین ہونے کی دلیل ہے۔ آپ نے ارواح کو لشکر کہا۔ لشکر باقی ہوتے ہیں۔ عرض کو بقا نہیں۔ عرض خود بخود قائم نہیں ہوتا۔ روح ایک جسم لطیف ہے جو بحکمِ خداوندی آتا ہے اور رخصت ہو جاتا ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے شبِ معراج آدم صفی اللہ، یوسف صدیق، موسیٰ، ہارون، عیسیٰ، اور ابراہیم صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین کو آسمانوں پر دیکھا۔ یقیناً یہ ان کی روحیں ہوں گی۔ اگر روح "عرض" ہی ہوتی تو بذاتِ خود قائم ہو کر نظر نہ آتی۔ کیونکہ دکھائی دینے کے لیے جوہر (محل) کی ضرورت ہے۔ یعنی وہ "جوہر" یا محل روح جس کا "عرض" ہو۔ لامحالہ "جوہر" لطیف نہیں بلکہ کثیف ہوتا ہے پس ثابت ہوا کہ روح جسیم ہے اور جسمِ لطیف رکھتی ہے جسیم ہونے کی وجہ سے نظر آ سکتی ہے مگر صرف چشمِ دل کو۔ بقول پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم روحیں پرندوں کے اندر رہ سکتی ہیں اور ان کو لشکروں کی مثال کہا جا سکتا ہے۔

ص ۲۸۶/۳۶۴

یہاں ہمیں اختلاف ہے ان ملحدوں سے جو یہ کہتے ہیں کہ روح قدیم ہے۔ اس کی پرستش کرتے ہیں اور اس کو ہر چیز کا فاعل اور مدبر سمجھتے ہیں۔ خدائے لم یزل کی طرح اس کو غیر مخلوق تصور کرتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہو جاتی ہے جس قدر خلقت اس گمراہی میں مبتلا ہوتی ہے شاید ہی کسی اور گمراہی میں ہوئی ہو۔ یہ عقیدہ عیسائیوں کا ہے گو وہ بیان کرتے وقت مختلف انداز میں بیان کر جاتے ہیں۔ ہند، تبت، چین، ماچین میں یہی عقیدہ مروج ہے۔ شیعہ، قرامطہ، اور باطنیہ کا بھی اسی پر اجماع ہے۔ مذکورہ بالا دو باطل گروہ بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ ان راہ گم کردہ جماعتوں کے چند مفروضات ہیں جن کی بنا پر وہ دلائل و براہین پیش کرتے ہیں میں ان سے ایک سوال کرتا ہوں۔ "قدیم سے تمہاری مراد کیا ہے؟ اس کا مطلب محدث قبل از وجود ہے یا قدیم ازلی ہے؟ اگر مطلب "محدث قبل از وجود" ہے تو اصولاً کوئی فرق نہ رہا۔ کیونکہ ہم بھی روح کو ایسا محدث سمجھتے ہیں جس کا وجود شخصی وجود سے پہلے معرضِ وجود میں آتا ہو۔ چنانچہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یقیناً اللہ تعالیٰ نے ارواح کو اجساد سے پہلے پیدا کیا۔" روح ایک قسم کی مخلوقِ خدا ہے وہ اسے ایک دوسری قسم کی مخلوق سے پیوند کر دیتا ہے۔ اور اس طرح پیوند کرنے میں اپنی قدرت سے زندگی پیدا کرتا ہے مگر روح ایک جسمانی قالب سے دوسرے جسمانی قالب میں منتقل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ جس طرح جسم کے لیے دو زندگیاں نہیں ہو سکتیں روح کے لیے دو جسم نہیں ہو سکتے۔ اگر اس حقیقت پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ناطق نہ ہوتیں اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت مسلّمہ نہ ہوتی تو عقلی نقطۂ نظر سے روح کو صرف زندگی کہا جا سکتا۔ اس کی حیثیت ایک صفت کی ہوتی اور وہ

ص ۲۸۷/۳۶۵

عینی حیثیت سے خارج سمجھی جاتی۔

اگر یہ لوگ میرے سوال کے جواب میں یہ کہیں کہ قِدم سے ان کا مطلب "قِدمِ ازلی" ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ یہ قِدم بذاتِ خود قائم ہے یا کسی اور چیز کے سہارے؟ اگر جواب یہ ہے کہ قِدم سے مراد وہ قدیم ہے جو بذاتِ خود قائم ہے تو میں پوچھتا ہوں کیا وہ خداوندِ عالم ہے؟ اگر جواب یہ ہے کہ وہ خداوندِ عالم نہیں تو یہ ایک اور قدیم کا ثبوت ہے۔ یہ صورت نامعقول ہے کہ قدیم محدود ہو اور ایک قدیم کا وجود اور اس کی ذات دوسرے قدیم کی حد ہو کر رہ جائے۔ اگر وہ یہ کہیں کہ ان کے تصور کا "بذاتِ خود قائم" قدیم خداوندِ عالم ہے تو میں کہوں گا خداوندِ عالم قدیم ہے اور مخلوق محدث۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ قدیم محدث سے پیوند ہو جائے۔ اس سے امتزاج یا اتحاد پیدا کرے یا اس میں حلول کر جائے۔ نہ محدث حامل قدیم ہو سکتا ہے نہ قدیم حامل محدث۔ ہر چیز اپنی جنس سے پیوند ہوا کرتی ہے۔ وصل و فصل صرف محدثات کے لیے ہے۔

اگر وہ یہ کہیں کہ "قِدم" سے مراد وہ قدیم ہے جو بذاتِ خود نہیں بلکہ کسی اور چیز کے سہارے قائم ہے۔ تو اس صورت میں روح یا "صفت" ہو سکتی ہے یا "عرض"۔ اگر "عرض" ہے تو یا اس کا کوئی محل ہے یا وہ لامحل ہے۔ اگر محل ہے تو محل کی ماہیت بھی وہی ہونی چاہیئے جو اس کی ہے یعنی دونوں میں سے کوئی بھی قدیم نہیں۔ لامحل ہونے کا تصور ہی مضحکہ خیز ہے کیونکہ "عرض" بغیر محل نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ یہ کہیں کہ روح ایک "صفت قدیم" ہے (یہ حلولیہ اور اہل تناسخ کا مذہب ہے) تو میں کہوں گا کہ حق تعالیٰ کی کوئی صفتِ قدیم اس کی مخلوق کی صفت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اگر حیاتِ حق صفاتِ خلق میں شمار ہو سکتی ہے تو اس کی قدرت بھی قدرتِ خلق ہونی چاہیئے۔ رابطہ صفت و موصوف صرف اسی صورت میں قائم سمجھا جا سکتا ہے مگر قدیم کو محدث سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس معاملے میں ملحدوں کے اقوال باطل ہیں۔ روح مخلوق ہے۔ تابع فرمانِ حق ہے۔ اس کے خلاف عقیدہ رکھنے والے صریحاً غلط راستے پر ہیں اور قِدم و حدث میں تمیز نہیں کر سکتے۔ کوئی ولی اگر اس کی ولایت صحیح ہے صفاتِ خداوندی سے بے خبر نہیں ہو سکتا۔ حق تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں بدعات اور خطرات سے محفوظ فرمایا۔ ہمیں عقل ارزاں فرمائی۔ جس کے ساتھ ہم نے غور و استدلال کیا۔ ہمیں ایمان عطا فرمایا جس کے ساتھ ہم نے اسے پہچانا حمد اسی کے لیے ہے اور حمد بھی بے حد بے انتہا کیونکہ محدود حمد اس کی لامتناہی نعمتوں کے مقابل مقبول نہیں ہو سکتی۔

ص ۲۸۷ / ۳۶۶

جب ظاہر بین لوگوں نے اس قسم کی حکایات اہل اصول سے سنیں تو خیال کیا کہ سب اہلِ تصوّف کا یہی عقیدہ

ہے وہ سخت غلطی کا شکار ہوئے اور انہیں صریح دھوکا ہوا۔ علم تصوف کا نور ان سے مستور رہا۔ اولیاء اللہ کا جمال ان سے روپوش رہا۔ نورِ حق کی چمک انہیں نظر نہ آسکی۔ یہ یاد رہے کہ بزرگانِ حق اور سادات قوم کے لیے عوام الناس کا ردّ و قبول یکساں حیثیت رکھتا ہے۔

فصل

مشائخ رضی اللہ عنہم میں سے ایک بزرگ کا قول ہے "روح جسم میں اس طرح ہے جیسے کوئلے کے اندر آگ۔ آگ مخلوق ہے اور کوئلہ مصنوعی چیز"۔ قدم صرف ذاتِ حق کے لیے ہے۔ ابوبکر واسطیؒ نے روح سے متعلق بہت کچھ کہا ہے بقول ان کے ارواح کے لیے دس مقامات ہیں (۱) مخلصین کی ارواح جو ظلمت میں مقید ہیں اور اپنے انجام سے ناواقف ہیں (۲) پارساؤں کی ارواح جن کا مقام آسمانوں پر ہے اور وہ اپنے اعمال کے اجر پر خوش ہیں اپنی طاعت سے مطمئن ہیں اور اسی کی قوت سے گامزن ہیں (۳) مریدانِ صادق کی ارواح جو چوتھے آسمان پر لذتِ صدق اور اپنے سایۂ اعمال میں ملائکہ کے ساتھ ہوں گی (۴) اہلِ مروت و احسان کی ارواح جو عرش کی نورانی شمعوں میں شامل ہوں گی۔ رحمتِ حق ان کی غذا اور لطف و قربتِ حق ان کا مشرب ہے (۵) اہلِ وفا کی ارواح جو صفا کے پردوں میں بلندی کے مقام پر خوش و خرم ہیں (۶) شہداء کی ارواح جو باغِ جناں میں طیور کے پوٹوں میں مقیم ہوں گی اور ہر جگہ آزادی کے ساتھ اڑتی پھریں گی (۷) مشتاقوں کی ارواح جو انوارِ صفات کے پردوں میں بساطِ ادب پر قیام پذیر ہوں گی (۸) عارفوں کی ارواح جو قربِ حق میں صبح و مسا کلامِ حق سے گوش آسودہ ہیں اور دنیا و جنت میں ان کا مقام ان کی نظر کے سامنے ہے (۹) دوستوں کی ارواح جو مشاہدہ جمال میں مقامِ کشف پر مستغرق ہیں بجز حق ان کی کوئی آرزو نہیں اور بجز حق انہیں کسی چیز سے اطمینان نہیں (۱۰) درویشوں کی ارواح جو مقامِ فنا پر قرار پذیر ہیں ان کے اوصاف و احوال مبدل ہو چکے ہیں۔

مشائخ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے ارواح کو متشکل دیکھا ہے۔ یہ ممکن ہے کیونکہ جیسے اوپر بیان ہوا روح موجود ہے اور جسم ہے خدا جس شکل میں چاہے دکھا سکتا ہے۔ میں (علی ابن عثمان الجلابی) کہتا ہوں کہ ہماری زندگی حق تعالیٰ کی عطا ہے، پائندگی صرف اسی ذاتِ پاک کے لیے ہے۔ ہمیں زندہ رکھنا فعلِ حق ہے۔ ہم اس کی قدرت سے بحیثیت مخلوق زندہ ہیں۔ اس کی ذات، صفات میں شامل نہیں ہے۔ روحیان کی تعلیم قطعاً باطل ہے۔ قدمِ روح کا عقیدہ صریح غلطی ہے اور اس گمراہی میں صرف غلط رو مبتلا ہوتے ہیں۔ مختلف الفاظ تراشی محض الحاد کو چھپانے کیلیے

ص ۲۸۹/۳۶۸

کی جاتی ہے۔ روح و مادہ، نور و ظلمت یا بھٹکے ہوئے گروہِ صوفیا کی اصطلاحات فنا و بقا، جمع و تفرقہ سب کفر و الحاد کو لپیٹ کر پیش کرنے کا ذریعہ اظہار ہیں۔ صحیح تصوف کے علمبردار ان سے بیزار ہیں کیونکہ اثبات ولائت اور محبتِ حق کی حقیقت کا انحصار معرفت پر ہے۔ جو قدیم و حدث میں تمیز نہیں کر سکتا وہ محض مجہولانہ گفتار کا مرتکب ہوتا ہے اور اہلِ دانش جہلا کی گفتگو پہ کان نہیں دھرا کرتے۔ ان دو باطل گروہوں سے متعلق جو ضروری تھا بیان کر دیا اگر کچھ اس سے زیادہ چاہے میری دوسری کتابوں میں تلاش کرے۔ اس جگہ ہمارا مقصد کتاب کو طول دینا نہیں۔

اب میں کشفِ حجابات کی طرف توجہ دیتا ہوں اور اہلِ تصوّف کے معاملات اور حقائق و براہینِ ظاہر کی روشنی میں بیان کرتا ہوں تاکہ حصول مقصد کا راستہ ہموار ہو جائے اور وہ منکر لوگ جو صاحبِ بصیرت ہوں راہِ راست پر آئیں۔ میرے لیے دعا کریں تاکہ مجھے ثواب ہو۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

ص ۲۶۰/۳۶۹

کشف حجاب اوّل معرفتِ حق

حق تعالیٰ نے فرمایا: مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ "انہوں نے خدا کے حق قدر کو نہ جانا" پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لو عرفتم اللہ حق معرفتہ لمشیتم علی البحور ولزالت بدعائکم الجبال "اگر تم خدا کو جاننے کی طرح جانو تو پانی پر چل سکتے ہو۔ اور پہاڑ تمہارے حکم پر حرکت میں آسکتے ہیں"۔

معرفتِ حق کی دو صورتیں ہیں (۱) معرفت علمی اور (۲) معرفت حالی۔

معرفتِ علمی دنیا و عقبےٰ کی تمام نیکیوں کی بنیاد ہے اور آدمی کے لیے ہر حال میں اور ہر مقام پر اہم ترین چیز ہے۔ باری تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ "ہم نے جنوں اور انسانوں کو محض اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے"۔ یعنی یہ کہ وہ مجھے پہچانیں۔ بیشتر لوگ اس فرض سے غافل رہتے ہیں۔ صرف وہی لوگ بروئے کار آتے ہیں جنہیں حق تعالیٰ منتخب فرمائے اور جن کے دلوں کو وہ اپنے نور سے منوّر کر دے اور جو اس کے فضل و کرم سے دنیا کی تاریکیوں سے نجات پالیں جس طرح حضرت عمر ابن الخطاب رض کے لیے باری تعالیٰ نے فرمایا: وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ "ہم نے اس کے لیے نور بنایا جس میں وہ لوگوں کے درمیان چلتا ہے"۔ اور كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ "اور کیا وہ اس کی طرح ہو سکتا ہے جو ظلمت میں ہے"۔

یعنی ابوجہل لعنۃ اللہ علیہ۔ معرفت دل کی حیات ہے اور ماسوا اللہ سے منہ پھیرنے کا نام ہے، ہر شخص کی قدر و قیمت معرفت سے ہے اور بغیر معرفت کوئی شخص قابلِ منزلت نہیں۔

علماء اور فقہاء خداوند عزوجل کے صحیح علم کو معرفت کہتے ہیں۔ اہلِ تصوف صحت حال کو معرفت کا نام دیتے ہیں، اور اسی بنا پر معرفت کو علم سے فاضل تر سمجھتے ہیں کیونکہ صحت حال بجز صحت علم نہیں ہوتی مگر صحتِ علم صحت حال کی ضامن نہیں ہوتی یعنی عارف عارف ہی نہیں ہوتا جب تک وہ عالمِ حق نہ ہو مگر یہ ہو سکتا ہے کہ عالم عارف نہ ہو۔ جو اس نکتہ سے نابلد تھے باہم بے کار مناظرے کرتے رہے اور ایک دوسرے کی تردید کرتے رہے۔ اب میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالتا ہوں تاکہ دونوں گروہ مستفید ہو سکیں۔ انشاء اللہ العزیز

ص ۲۹۱/۳۷۰

فصل

خدا تجھے سعادت دے تو یہ چیز سمجھ کہ لوگوں میں معرفتِ حق اور صحتِ علم کے معاملے میں بہت اختلاف ہے معتزلہ کا دعویٰ ہے کہ معرفتِ حق کی بنیاد عقل پر ہے اور بدونِ عقل معرفت حاصل نہیں ہوتی۔ یہ عقیدہ باطل ہے کیونکہ دیوانے جو حلقۂ اسلام میں ہوں معرفت کے حامل ہو سکتے ہیں اور بچے جو عاقل نہ ہوں صاحبِ ایمان تصوّر ہو سکتے ہیں۔ اگر معرفت کی کسوٹی عقل ہی ہو تو ان کو معرفت کا اہل قرار نہیں دیا جا سکتا اور اسی طرح صاحب عقل کفّار دائرۂ کفر میں نہیں رہ سکتے۔ اگر عقل ہی معرفت کی علت ہوتی تو چاہیئے تھا کہ ہر صاحبِ عقل عارف ہوتا اور ہر بے عقل معرفتِ حق سے عاری ہوتا مگر یہ بیّن طور پر مضحکہ خیز ہے۔

ایک دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ معرفتِ حق کی علت استدلال ہے اور سوائے استدلالیوں کے کوئی معرفت حق سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتا۔ یہ قول بھی باطل ہے ابلیس کو دیکھو کہ بہشت، دوزخ، عرش، کرسی اور دیگر آیات دیکھنے کے باوجود معرفت سے بے نصیب رہا۔ باری تعالےٰ نے فرمایا: وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَا اِلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَیْهِمْ كُلَّ شَیْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِیُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ" اگر ہم ان کے پاس فرشتوں کو بھیج دیں۔ مُردوں کو تکلّم دے دیں ہر شئے کا حشر ان کے روبرو بپا کر دیں وہ ایمان نہیں لائیں گے بجز ایمائے حق۔" اگر ان چیزوں کی رویت اور استدلال علتِ معرفتِ حق ہوتا تو باری تعالیٰ ایمائے حق پر حصر نہ کرتا۔ اہل سنت والجماعت کے نزدیک صحتِ عقل اور رویتِ آیات معرفت کا سبب ہو سکتے ہیں علت

ص ۲۹۲/۳۷۱

نہیں ہو سکتے۔ علت صرف مشیتِ ایزدی ہے کیونکہ اس کی عنایت کے بغیر عقل اندھی ہے۔ عقل کو خود اپنا علم نہیں کسی اور کا علم تو در کنار۔ ہر قسم کے ملحد استدلال کو بروئے کار لاتے ہیں اور بیشتر معرفتِ حق سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ مشیتِ حق شاملِ حال ہو تو بندگانِ حق کی سب حرکات نشانِ معرفت ہوتی ہیں۔ ایسے لوگوں کا "استدلال" "طلب" اور ترکِ استدلال "تسلیم" ہوتا ہے۔ کمالِ معرفت کے لیے تسلیم، طلب سے بہتر نہیں کیونکہ طلب کے اصول کو کسی حالت میں بھی پس پشت نہیں ڈالا جا سکتا اور "تسلیم" اصولاً فقدانِ اضطراب کی دلیل ہے۔ تاہم یاد رہے کہ ان دو اصولوں کی حقیقت بھی معرفت نہیں۔ صحیح رہنما اور دل کشا صرف ذاتِ حق ہے۔ عقل و دلائل کا وجود امکانِ ہدایت کو روبکار نہیں لاتا۔ اس کی واضح تر دلیل یہ ہے کہ باری تعالیٰ نے فرمایا: وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ "اگر کفار بارِ دیگر بھی دنیا میں آجائیں تو اپنے کفر کی طرف جائیں گے۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے معرفت سے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا "میں نے اللہ کو اللہ سے پہچانا اور جو ما سوا اللہ تھا اسے اللہ کے نور سے دیکھا"۔ اللہ نے جسم کی تخلیق کی اور اس کی زندگی روح کے سپرد کردی۔ اس نے دل پیدا کیا اور اس کی زندگی کو اپنی تحویل میں رکھا۔ جب عقل، انسانی صفات اور آیات جسم کو زندگی نہیں دے سکتیں روح کو زندگی دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا: اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ "جو مردہ تھا اسے ہم نے زندہ کیا"۔ یہاں حیات کو اپنی طرف منسوب کیا۔ پھر فرمایا: وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِى النَّاسِ "ہم نے اس کے لیے نور بنایا جس کی مدد سے وہ لوگوں میں چلتا ہے"۔ یعنی نور کا پیدا کرنے والا میں ہوں۔ پھر فرمایا: اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ "جس کا سینہ اسلام کے لیے کھولا وہ اپنے رب کی طرف سے نور میں ہے"۔ دل کے کھولنے اور بند کرنے کو بھی اپنی طرف نسبت دی اور فرمایا: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ "ان کے دلوں اور ان کے کانوں کو مہر کر دیا اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے"۔ پھر فرمایا: وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا "اور اس کا اتباع مت کر جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا"۔ پس ثابت ہوا کہ دل کی بست و کشاد، شرح اور ختم باری تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ قطعاً محال ہے کہ اس کے سوا کوئی رہنما ہو۔ جو کچھ ما سوا اللہ ہے وہ علت اور سبب سے زیادہ نہیں اور علت اور سبب بجز رضائے مسبّب رہنما نہیں ہو سکتے۔ حجاب کی حیثیت رہزن کی ہوتی ہے رہنما کی نہیں۔ نیز باری تعالیٰ نے فرمایا: وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِىْ قُلُوْبِكُمْ "اللہ نے تمہارے دلوں میں ایمان کی محبت ڈال دی اور اسے تمہارے دلوں میں آراستہ کیا"۔ یہاں زینت اور محبت کو اپنی طرف منسوب فرمایا۔ تقویٰ عاید ہونا

ص ۲۹۲/۳۷۲

جسے حقیقتِ معرفت کہنا چاہیے اسی کی عطا ہے۔ متقی کو راہِ تقویٰ اختیار کرنے یا چھوڑ دینے پر اختیار نہیں ہوتا۔ اس کی تعریف و توصیف کے سوا معرفت کا حصہ انسان کے لیے بجز عجز کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ابوالحسن نوریؒ نے فرمایا "اس کے سوا کوئی دلوں کا رہبر نہیں۔ طلبِ علم صرف صحتِ بندگی کے لیے ہے"۔ یاد رکھو مخلوقات میں کسی کو طاقت نہیں کہ حق تعالےٰ تک رسائی بہم پہنچا سکے۔ استدلال پر تکیہ کرنے والے ابوطالب سے زیادہ صاحبِ فہم نہیں ہو سکتے۔ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی رہنما نہیں ہو سکتا۔ مگر چونکہ ابوطالب کی شقاوت کا حکم لگ چکا تھا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی سے وہ مستفید نہ ہو سکا۔ استدلال کا پہلا قدم خدا سے روگردانی ہے۔ کیونکہ پہلے خیال غیر اللہ کی طرف جاتا ہے برخلاف اس کے معرفت ماسوا اللہ سے کلیۃً منہ پھیر لینے کا نام ہے۔ بالعموم ہر مطلوب شے استدلال کے دائرے میں سما جاتی ہے مگر معرفت حق عمومی مطلوبات میں شامل نہیں۔ معرفت عقل کی لامتناہی حیرت سے حاصل ہوتی ہے۔ انسانی اکتساب کو اس میں دخل نہیں۔ بجز ذاتِ حق کوئی رہنما نہیں۔ معرفت شرح قلوب ہے اور خزانۂ غیب سے ملتی ہے۔ ہر غیر اللہ چیز مُحدَث ہے۔ ایک مُحدَث دوسرے مُحدَث کو پا سکتا ہے مگر خالق کو نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ جب کوئی چیز حاصل کی جائے تو حاصل کرنے والا غالب سمجھا جاتا ہے اور حاصل کو مغلوب خیال کیا جاتا ہے۔ یہ کوئی کرامت نہیں کہ عقل استدلال سے مستدل کے وجود کو فاعل ثابت کر دے۔ کرامت یہ ہے کہ ولی نورِ حق کے سامنے اپنی ہستی کی نفی کرے۔ پہلی صورت میں معرفت صرف منطق ہے۔ دوسری صورت میں دلی کیفیت ہے۔

ص ۲۹۳/۳۷۳

عقل کو معرفت کی علت سمجھنے والوں کو دیکھنا چاہیے کہ عقل ان کے دل میں حقیقتِ معرفت کا کیا تصور پیدا کرتی ہے؟ معرفت دراصل ہر اس چیز کی نفی ہے جسے عقل ثابت کرے یعنی ذاتِ حق ہر اس تصور سے بالاتر ہے جو عقل کے دائرۂ امکان میں آسکے۔ ان حالات میں عقل کا استدلال کس طرح ذریعۂ معرفت بن سکتا ہے؟ عقل اور وہم دونوں ہم جنس ہیں اور جہاں جنس ثابت ہوئی معرفت کی نفی ہو گئی۔ عقلی دلایل سے خدا کی ہستی کو ثابت کرنا تشبیہ سے زیادہ نہیں اور اسی قسم کی منطق سے اس کا انکار کرنا تعطیل کے برابر ہے۔ عقل ان دونوں صورتوں سے باہر نہیں جا سکتی۔ اور دونوں صورتیں معرفت کے معاملے میں انکارِ حقیقت کے برابر ہیں کیونکہ مشبّہ اور معطّلہ دونوں غیر موحد ہیں۔

ص ۲۹۴/۳۷۴

جب عقل امکانی کوشش کر چکتی ہے اور اس کے چاہنے والوں کو اس کی تلاش کا سودا دامن گیر ہوتا ہے۔ تو وہ درگاہِ عجز پر سرنگوں ٹھہر جاتے ہیں مضطرب الحال ہو کر گریہ و زاری سے دستِ طلب دراز کرتے ہیں اور دلہائے مجروح کے لیے مرہم کی

آرزو کرتے ہیں۔ وہ حتی المقدور کوشش کر کے تھک جاتے ہیں تو قدرتِ حق ان کی ہمت افزائی کرتی ہے اور وہ اس کی عنایت سے اس کا راستہ پا لیتے ہیں۔ اذیتِ فراق ختم ہو جاتی ہے۔ اور وہ ریاضِ معرفت میں باریاب ہو کر آسودہ ہو جاتے ہیں۔ جب عقل دلوں کو اس طرح کامران اور بامراد دیکھتی ہے تو اپنا تصرف کرنا چاہتی ہے مگر اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ ناکام ہو کر متحیر ہوتی ہے۔ متحیر ہو کر بے کار ہو جاتی ہے۔ جب بے کار ہو جائے تو حق تعالیٰ اسے لباسِ بندگی پہنا کر فرماتا ہے۔ "تو جب تک آزاد تھی اپنے تصرف اور اپنی طاقت کے گھمنڈ میں مستور تھی جب تیرا تصرف اور تیری طاقت ٹوٹ گئی۔ تجھے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور ناکام ہو کر تجھے کچھ حاصل ہوا"۔ پس دل کو قربت اور عقل کو بندگی نصیب ہوئی۔ حق تعالیٰ انسان کو اپنی معرفت خود عطا کرتا ہے اور یہ معرفت کسی انسانی طاقت سے منسلک نہیں ہوتی۔ انسان کی اپنی حیثیت سراسر بے حقیقت ہوتی ہے۔ اہلِ معرفت کے لیے خود ستائی خیانت کے برابر ہے۔ وہ یادِ حق سے کسی حالت میں بھی غافل نہیں ہوتے۔ ان کا ہر لمحہ مقدس ہوتا ہے۔ معرفت ان کے لیے خالی الفاظ تراشی نہیں بلکہ صحیح کیفیتِ قلبی ہوتی ہے۔

کچھ اور لوگ ہیں جو معرفت کو الہامی تصور کرتے ہیں۔ یہ بھی ناممکن ہے کیونکہ معرفت کی صداقت و بطلان کے لیے دلیل کی ضرورت ہے۔ اور اہلِ الہام کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی مثلاً ایک کہتا ہے میں الہاماً جانتا ہوں کہ حق تعالیٰ "مکان" میں محدود ہے دوسرا کہتا ہے کہ میں الہاماً سمجھتا ہوں کہ وہ "لامکان" ہے۔ ان میں سے صرف ایک بات درست ہو سکتی ہے۔ دونوں طرف الہام کے مدعی ہیں۔ فرق سمجھنے کے لیے دلیل کی ضرورت ہے اور دلیل کا مہیا ہونا الہام کا بطلان ہے۔ یہ عقیدہ براہمہ اور الہامیہ کا ہے میں نے خود دیکھا ہے کہ اس زمانے کے کچھ لوگ اس معاملے میں نہایت درجہ مبالغہ سے کام لیتے ہیں اور پارسائی کا جامہ پہنے پھرتے ہیں۔ سب گمراہ ہیں اور ان کا عقیدہ ہر صاحبِ عقل کے لیے کافر ہو یا مسلمان قابلِ مذمت ہے۔ دس مدعیانِ الہام دس متناقض چیزوں کا دعویٰ کرتے ہیں ایک ہی بات پر سب غلط ہوتے ہیں اور کسی میں ذرہ برابر صداقت نہیں ہوتی۔ اگر کوئی یہ کہے کہ الہام وہی ہے جو شریعت کے خلاف نہ ہو تو کہنے والا سخت غلطی میں مبتلا ہے۔ جب حکمِ شریعت ہی الہام کے صدق و کذب کی کسوٹی ہے تو معرفت شرعی، نبوتی اور ہدایتی، الہامی ہونے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔

کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو معرفت کو فطری (ضروری) سمجھتے ہیں۔ یہ بھی ناممکن ہے۔ اگر معرفت فطری طور پر حاصل ہو سکتی تو سب اہلِ دانش کو برابر طور پر اہلِ معرفت ہونا چاہیئے تھا مگر ہم دیکھتے ہیں کہ کتنے اہلِ دانش حق تعالیٰ کی ہستی ہی کے منکر ہیں اور تشبیہ اور تعطیل ایسے عقائد کے علم بردار ہیں۔ علاوہ ازیں اگر معرفتِ حق فطری (ضروری) ہوتی تو "تکلیف" بے کار تھی۔ کیونکہ

جب کسی چیز کا علم فطری (ضروری) ہو تو اس کی معرفت کے معاملے میں تکلیف چہ معنی دارد۔ انسان کا اپنی ذات سے متعلق علم آسمان اور زمین، دن اور رات، مسرت اور غم وغیرہ کا علم ایسا ہے جس سے کوئی ذی شعور بے بہرہ نہیں ہو سکتا۔ اور کسی کو بھی اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی چاہے بھی کہ ان چیزوں کے علم سے منہ پھیر لے تو نہیں پھیر سکتا۔ البتہ کچھ صوفیائے کرام نے اپنے ایقان کے پیش نظر معرفتِ حق کو فطری (ضروری) قرار دے دیا۔ ان کے دلوں میں کوئی شک یا وسوسہ موجود نہ تھا۔ انہوں نے اپنے یقین کا نام ضرورت (فطرت) رکھ دیا۔ بنیادی طور پر وہ غلط نہیں تھے مگر عبارتاً خطا کر گئے کیونکہ فطری (ضروری) علم صرف ایک طبقے کے لیے مختص نہیں ہو سکتا۔ تمام اہلِ دانش کی حیثیت یکساں تسلیم کرنا پڑے گی۔ علاوہ ازیں فطری (ضروری) علم دل میں بے سبب وبے دلیل پیدا ہوتا ہے اور معرفتِ حق بلا سبب حاصل نہیں ہوتی۔

استاد ابو علی دقاق، شیخ ابو سہل صعلوکی اور اس کے والد جو نیشاپور کے رئیس اور امام تھے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ابتداءً معرفت کی بنیاد استدلال ہے اور انتہاءً معرفت فطری (ضروری) ہو جاتی ہے جیسے کہ علم صنعت وبضاعت کہ شروع میں اکتسابی ہوتا اور بالآخر فطری (ضروری) ہو جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بہشت میں معرفت حق فطری (ضروری) ہو گی اگر وہاں ضروری ہو گی تو کیا وجہ ہے کہ اس دنیا میں ضروری نہ ہو۔ پیغمبران صلوات اللہ علیہم نے جب پیام حق سنا یا بواسطہ یا بلاواسطہ تو اسے فطری (ضروری) سمجھا۔ میں کہتا ہوں کہ اہل بہشت کی معرفت فطری ہوگی۔ کیونکہ وہاں شرعی تکلیف کا سوال پیدا نہیں ہوگا۔ پیغمبران صلوات اللہ علیہم مامون العاقبت ہوتے ہیں اور حق تعالیٰ سے ان کا سلسلہ منقطع ہونے کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ اس لیے ان کے لیے معرفت اہل بہشت کی طرح فطری (ضروری) ہوتی ہے۔ ایمان اور معرفت کی خوبی یہ ہے کہ ان کا تعلق "غیب" سے ہوتا۔ اگر مدعائے ایمان ومعرفت سامنے ہے تو "جبر" کی صورت پیدا ہو گئی۔ اور "اختیار" معدوم ہو گیا۔ شرعی احکام کی کوئی وقعت نہ رہی۔ اصولِ الحاد معطّل ہو گیا۔ بلعم باعور، ابلیس اور برصیصا کی تکفیر بے معنی ہو گئی کیونکہ وہ عارف تو تھے جیسا کہ ابلیس سے متعلق باری تعالیٰ نے بیان فرمایا اور اس کے ردّ ورجم کا ذکر کیا۔ بقول حق تعالیٰ ابلیس نے کہا: فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ "مجھے تیری عزّت کی قسم میں ان سب کو گمراہ کروں گا۔" ظاہر ہے کہ مکالمہ معرفت کی سند ہے۔ عارف جب تک عارف ہے حق تعالیٰ سے منقطع نہیں ہوتا۔ منقطع ہونے کی صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب معرفت میں زوال رونما ہو۔ علم ضروری (فطری) میں زوال ناممکن ہے۔ یہ مسئلہ عام لوگوں کے لیے بہت پیچیدہ ہے۔ یہ کافی ہے کہ تو صرف اس قدر ذہن نشین کر لے کہ بندہ کو علم اور معرفتِ حق بجز ہدایتِ خداوندی حاصل نہیں

ہوتی۔ انسان کے دل میں یقینِ معرفت کم و بیش ہو سکتا ہے مگر حقیقتِ معرفت کم و بیش نہیں ہوتی کیونکہ کمی اور بیشی دونوں نقصانِ معرفت کا پیش خیمہ ہیں۔ کورانہ تقلید کو معرفتِ حق میں دخل نہیں۔ اس کی شناخت اسی کی صفاتِ کمال سے ہوتی ہے اور محض اس کی رعائت اور عنائت سے حاصل ہوتی ہے۔ دلیل اور عقل اسی کی ملکیت ہیں اور ہر چیز پر اسی کا تصرف ہے۔ اگر وہ چاہے تو اپنے کسی فعل کو بھی انسان کے لیے دلیل راہ بنا دے اور اسے منزل آشنا کر دے اور اگر چاہے تو اسی فعل کو حجاب کی شکل دے دے اور انسان منزل سے بھٹک جائے۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام ایک جماعت کے لیے رہبرِ معرفت تھے اور دوسری جماعت کے لیے حجابِ معرفت۔ ایک جماعت نے ان کو بندۂ خدا سمجھا اور دوسری نے ابنِ خدا۔ بت، آفتاب، چاند وغیرہ اسی قبیل میں شامل ہیں۔ کچھ لوگ ان کو دیکھ کر راہ معرفتِ حق پا لیتے ہیں اور کچھ گمراہ ہو جاتے ہیں۔ اگر استدلال ہی معرفت کی بنیاد ہوتا تو ہر منطقی کو عارف ہونا چاہیئے تھا یہ سراسر غلط ہے۔ باری تعالیٰ ایک شخصیت کو چن لیتا ہے اور باقیوں کی راہنمائی اس کے سپرد کر دیتا ہے اور وہ اسی کے سبب منزل مقصود تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ رہنما سبب بنتے ہیں۔ علتِ معرفت نہیں ہوتے۔ مسبب الاسباب کی نظر میں ایک سبب دوسرے سبب پر فوقیت نہیں رکھتا۔ عارف کے لیے اثباتِ سبب خدا کے لیے عدیل تلاش کرنے کے برابر ہے اور غیر اللہ کی طرف التفات شرک کے مترادف ہے۔

مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ "جس کو اللہ گمراہی میں مبتلا کر دے اسے کون ہدایت دے سکتا ہے"۔

جب لوحِ محفوظ پر رقم ہو کہ کسی شخص کا مقدر بجز شقاوت نہیں۔ دلیل و استدلال کس طرح اسے راہِ ہدایت پر لا سکتے ہیں جس کسی نے غیر اللہ کی طرف توجہ دی وہ معرفت میں تعدیل کا مرتکب ہوا۔ جو انسان قہرِ خداوندی میں پراگندہ اور غلطاں ہو اس کی کون رہنمائی کر سکتا ہے۔

ص ۲۹۷/۳۷۸

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام دن کے وقت غار سے باہر نکلے تو انہوں نے کسی چیز کی طرف التفات نہیں کیا حالانکہ دن کی روشنی میں بیشتر برہان و دلائل رونما ہوتے ہیں۔ اور بزرگ صاحب کرامت لوگوں کے لیے بیّن آیات موجود ہوتے ہیں۔ رات ہوئی تو آپ نے "ستاروں کو دیکھا" اگر ان کی معرفت کا انحصار دلائل پر ہوتا تو ظاہر ہے دن کے وقت بیشتر دلائل روبرو تھے۔ مختصر یہ کہ حق تعالیٰ جس کو بھی چاہے جس طرح بھی چاہے اپنا راستہ دکھا دیتا ہے اور اس کے لیے اپنی معرفت کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ یہاں تک کہ معرفت کا وہ مقام میسر آ جاتا ہے کہ خود حقیقتِ معرفت ہی غیر نظر آنے لگتی ہے۔ صفتِ معرفت آفت ہو کر رہ جاتی ہے اور وہ معروف سے محجوب ہو جاتا ہے۔ اس عالم میں

ص ۲۹۸/۳۷۹

حقیقتِ معرفت کا یہ درجہ ہوتا ہے کہ معرفت بجائے خود ایک کھوکھلا دعویٰ نظر آتی ہے۔ ذوالنون مصریؒ نے فرمایا "ہوشیار! معرفت کا دعویٰ نہ کر"

ایک شعر ہے: عارف معرفت کا دعویٰ کرتے ہیں میں اقرارِ جہل کرتا ہوں یہ میری معرفت ہے

تجھے چاہیئے کہ معرفت کا دعویٰ نہ کرے مبادا وہ تیری ہلاکت کا باعث بن جائے۔ معرفت کی حقیقت سے تعلق پیدا کرتا کہ تجھے نجات نصیب ہو جب کسی کو جلالِ حق کے کشف کا اعزاز ملتا ہے اس کی ہستی وبال ہو جاتی ہے اور اس کی تمام صفات اس کے لیے آفت کا سرا یہ بن جاتی ہیں جس کا خدا ہو اور وہ خدا کا ہو وہ دونوں عالم کی کسی چیز سے تعلق نہیں رکھتا۔ معرفت کی اصل حقیقت یہ ہے کہ بادشاہی حق تسلیم کی جائے جب اس کی بادشاہت تسلیم ہو اور بادشاہت غیر کے تصرف سے پاک سمجھی جائے تو مخلوق سے کیا تعلق، خلقت عارف اور خدا کے درمیان کیوں حائل ہو، یہ حائل ہونے والے حجابات جہل کا نتیجہ ہوتے ہیں جب جہل اٹھ گئی تو حجاب ختم ہو گئے اور دنیا و عقبیٰ میں کوئی فرق نہ رہا۔

فصل

مشائخ کرام نے اس معاملے میں بہت سے رموز بیان فرمائے ہیں۔ میں تیرے حصول فائدہ کے لیے کچھ اقوال بیان کرتا ہوں۔

عبداللہ بن مبارکؒ کا قول ہے: "معرفت کسی چیز پر متعجب نہ ہونے کا نام ہے۔" کیونکہ تعجب اس وقت ہوتا ہے جب کوئی کام کرنے والا اپنے مقدور سے تجاوز کر جائے۔ حق تعالیٰ قادرِ مطلق ہے اس لیے اس کے کاموں پر صاحبِ معرفت کو کسی حالت میں تعجب نہیں ہو سکتا۔ البتہ یہ چیز قابلِ تعجب ہے کہ اس نے ایک مشتِ خاک کو وہ سرافرازی عطا فرمائی کہ وہ اس کے احکام کے قابل ہو گئی۔ ایک قطرۂ خون کو وہ منزلت عطا کی کہ وہ اس کی محبت اور اس کی معرفت کا ذکر کرنے لگا۔ اس کے دیدار کا طلب گار اور اس کے قرب کا مشتاق ہوا۔

ص ۲۹۹/۳۸۰

ذوالنون مصریؒ نے فرمایا "معرفت درحقیقت وہ علم ہے جو حق تعالیٰ اپنے لطائفِ انوار سے دلوں میں ودیعت کرے۔" یعنی جب تک حق تعالیٰ اپنی عنایتِ بے غایت سے انسان کے دل کو روشنی نہیں بخشتا اور اسے آفات سے مصئون نہیں فرماتا یہاں تک کہ دنیا و مافیہا کی قدر و قیمت اس کے سامنے رائی کے دانے کے برابر ہو جاتے۔ اس وقت تک باطنی اور ظاہری امرار کے مشاہدہ کا غلبہ نہیں ہوتا اور جب ہوتا ہے تو غیب و شہود کا تفرقہ ختم ہو جاتا ہے۔

شبلیؒ نے کہا "معرفت دوامِ حیرت کا نام ہے"۔ حیرت دو قسم کی ہے (۱) حیرت ہستی سے متعلق اور (۲) حیرت کیفیت سے متعلق۔

حیرت ہستی سے متعلق شرک اور کفر کے برابر ہے کیونکہ حق تعالیٰ کی ہستی سے متعلق عارف کو کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا حیرتِ کیفیت لازماً ہونی چاہیئے کیونکہ ذاتِ حق کی کیفیت کو سمجھنا عقل کی مجال سے باہر ہے۔ اس واسطے کسی نے کہا ہے۔ "اے متحیّر دلوں کے رہنما! میری حیرت کو اور زیادہ کر"۔ یہاں پہلے ہستیٔ حق اور کمالِ صفات کا اقرار ہے۔ اس بات کے علم کا اظہار ہے کہ اس کی ذاتِ پاک مقصودِ خلق ہے وہی دعاؤں کو قبول کرنے والا ہے۔ وہی متحیّروں کو حیرت دینے والا ہے۔ اس کے بعد زیادتیٔ حیرت کی التجا کی گئی ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ راہ مطلوب میں عقل کے لیئے بجز حیرت و سرگردانی کوئی تحریک کا اور کوئی مقام نہیں۔ یہ نکتہ نہایت لطیف ہے۔ علاوہ ازیں اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ عرفان ہستی حق انسان کو اپنی ہستی سے متعلق معرضِ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ جب بندہ خدا کو پہچانتا ہے۔ اپنے آپ کو اس کی قدرتِ مطلق کے حلقۂ اختیار میں دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ انسان کا عدم و وجود سکون و حرکت سب اس کے قبضۂ اختیار میں ہے تو وہ حیرت میں ڈوب جاتا ہے اور سوچتا ہے "میں کون ہوں اور کیا ہوں"۔ اسی واسطے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس نے اپنے آپ کو پہچانا تحقیق اس نے اپنے رب کو پہچانا" یعنی جسے اپنی فنا کا علم ہوتا ہے اسے بقائے حق کا عرفان ہوتا ہے۔ فنا عقل اور دیگر انسانی صفات کو ختم کر دیتی ہے اور جب کسی چیز کی حقیقت مفقود ہو جائے تو وہاں حیرت کے سوا کچھ نہیں رہتا۔

ص ۳۰۰ / ۳۸۱

ابویزیدؒ نے فرمایا "معرفت اس بات کا علم ہے کہ انسانی سکون و حرکت اللہ کی طرف سے ہے"۔ یعنی اس کے حکم کے بغیر اس کی بادشاہت میں کسی کو دخل نہیں۔ جب تک وہ کسی کام کرنے کی توفیق عطا نہ کرے اور دل میں کام کرنے کا ارادہ مرحمت نہ فرمائے کوئی آدمی کچھ نہیں کر سکتا۔ حقیقت اسی کے کرم سے حقیقت ہے۔ اثر اسی سے اثر ہے۔ صفت اسی سے صفت ہے۔ ساکن اسی سے ساکن اور متحرک اسی سے متحرک ہے۔ ہر انسانی فعل مجازی ہے اور حقیقت کو نسبت اسی کی ذاتِ پاک سے ہے۔

محمد بن واسعؒ عارف سے متعلق فرماتے ہیں "عارف وہ ہے جس کا کلام مختصر ہو اور حیرت دوامی ہو"۔ کیونکہ بیان اسی چیز کا ہو سکتا ہے جو معرضِ بیان میں آ سکے۔ اصولاً بیان ایک حد تک ہی ہو سکتا ہے اور اگر وہ جس کا بیان کرنا مقصود ہے غیر محدود ہے تو محدود بیان کس طرح کامیاب ہو سکتا ہے۔

جب بیان سے مقصد حاصل نہ ہو تو انسان بے بس ہوتا ہے اور سوائے دائمی حیرت و استعجاب کے چارہ نہیں رہتا۔

شبلیؒ نے فرمایا: "حقیقی معرفت معرفتِ حق سے معذوری کا نام ہے"۔ جس چیز کے عرفان سے بندہ عاجز ہو اس کے ص ۳۰۰/۳۸۲ ادراک کا دعویٰ بے کار ہوتا ہے۔ عجز بدونِ طلب ہوتا ہے۔ جب تک طالب خود کو آلۂ کار سمجھتا ہے اور صفاتِ بشری پر قائم ہے۔ لفظ "عجز" کا اطلاق اس پر نہیں ہو سکتا جب یہ آلیت و صفات ختم ہو جائیں تو وہ عجز نہیں بلکہ فنا کا مقام ہوگا۔ بعض مدعی صفاتِ بشری کا اثبات بھی کرتے ہیں، صحتِ خطاب کی ذمہ داری بھی تسلیم کرتے ہیں۔ قیامِ حجتِ حق کے بھی قائل ہیں اور یہ بھی اعلان کرتے ہیں کہ معرفت عجز ہے۔ ہم عاجز ہو گئے ہیں اور کسی چیز کو حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ ضلالت اور خسران ہے۔ میں پوچھتا ہوں کس چیز کی طلب میں عاجز ہو گئے ہو۔ "عجز" کے دو نشان ہیں اور دونوں میں سے تمہارے پاس ایک بھی نہیں۔ ایک نشان تو طلب اور ذریعہ حصولِ طلب کی فنا ہے اور دوسرا اظہارِ تجلی ہے۔ جہاں ذریعہ حصول طلب کی فنا واقع ہو جاتی ہے وہاں عبارت آرائی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ عجز پر عبارت آرائی اظہارِ عجز کے سوا کیا ہوگی؟ جہاں اظہارِ تجلی ہو وہاں سب نشان مٹ جاتے ہیں اور کوئی تفرقہ باقی نہیں رہتا۔ عاجز یہ نہیں جانتا کہ وہ عاجز ہے اور جو کچھ اس سے منسوب کیا جاتا ہے اس کا نام "عجز" ہے۔ ورنہ "عجز" بذاتِ خود غیر ہے۔ اور اثباتِ معرفتِ غیر معرفت نہیں ہوتی۔ جب تک دل میں غیر کے لیے جگہ ہے معرفت صحیح نہیں ہوتی۔ عارف جب تک غیر سے کنارہ کش نہ ہو عارف نہیں ہو سکتا۔

ابوحفص حدادؒ نے فرمایا "جب مجھے معرفت نصیب ہوئی حق و باطل کا گذر میرے دل میں ختم ہو گیا"۔ جب کوئی ہوس و ہوا میں مبتلا ہوتا ہے تو اپنے دل کی طرف رجوع کرتا ہے۔ دل اس کی رہنمائی نفس کی طرف کرتا ہے جو محلِ باطل ہے۔ اسی طرح جب دلیلِ معرفت میسر آتی ہے انسان دل کی طرف رجوع کرتا اور دل اس کو روح کی طرف لے جاتا ہے ص ۳۰۱/۳۸۳ جو منبعِ حق و حقیقت ہے۔ اگر دل میں کسی غیر اللہ کا گذر ہو اور عارف اس کی طرف مائل ہو تو یہ بطلانِ معرفت ہے۔ الغرض دلیلِ معرفت کا مقام دل ہے اور اسی طرح ہوس و ہوا کی منزل دل ہے۔ اہلِ معرفت ہوا و ہوس سے پاک ہوتے ہیں۔ وہ دل کی طرف رجوع نہیں کرتے بجز حق کسی چیز سے راحت حاصل نہیں کرتے اور ان کا رجوع ہمیشہ دل کی طرف نہیں بلکہ حق کی طرف ہوتا ہے اور یہی نشانِ دلیل معرفت ہے۔ بہت فرق ہے دل کی طرف رجوع کرنے والے میں اور حق کی طرف راجع ہونے والے میں۔

ابوبکر واسطیؒ نے فرمایا: جس نے حق تعالےٰ کو پہنچانا وہ ہر چیز سے منقطع ہُوا بلکہ گونگا اور مفلوج ہو گیا۔" نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا؛" ہم تیرے اوصاف شمار نہیں کر سکتے" جسے معرفتِ حق حاصل ہوئی۔ وہ عبارات کے معاملے میں گونگا ہُوا اور اپنے سب اوصاف سے فانی ہُوا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم حالتِ غلبیت میں عرب کے فصیح ترین سردار تھے۔ چنانچہ فرمایا" عرب اور عجم میں کوئی میری فصاحت کی برابری نہیں کر سکتا" جب آپ حضورِ حق باریاب ہوئے تو اقرار کیا" میری زبان کو تیری ثنا ادا کرنے کا یارا نہیں" میں کیا کہوں؛ میری زبان معذور ہے۔ میں حال سے بے حال ہوں۔ تو خود ہی میری گفتار ہے۔ اگر میں اپنی طرف خطاب کروں تو میری گفتار ہی میرا حجاب ہے۔ اگر روئے سخن تیری طرف ہو تو تیری قربت کی حقیقت پر حرف آتا ہے۔ کیسے زبان کھولوں۔ حکم ہُوا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو ثناگو ہے میں تمام اجزائے عالم کو تیرا نائب بناتا ہوں کہ وہ میری ثنا کریں اور وہ ثنا تیری طرف سے شمار ہو واللہ اعلم بالصواب؛

کشفِ حجاب دوئم۔ توحید

ص ۳۰۲/۳۸۴

باری تعالیٰ نے فرمایا: وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ۔ "تمہارا خدا ایک خدائے واحد ہے" پھر فرمایا: قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ" کہو اللہ واحد ہے" نیز فرمایا: لَا تَتَّخِذُوْۤا اِلٰـهَیْنِ اثْنَیْنِ اِنَّمَا هُوَ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ" دو معبود نہ ٹھیراؤ۔ سوا اس کے کوئی معبود نہیں"۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:" تم سے پہلے ایک شخص ہو گذرا ہے۔ اس کا کوئی عمل نیک نہیں تھا مگر وہ توحید پر قائم تھا۔ جب وہ قریب المرگ ہُوا تو اہل خانہ سے کہا تم لوگ میری موت کے بعد مجھے جلا ڈالنا اور میری راکھ کو پیس کر جس دن ہوا تیز چلے آدھی دریا میں ڈال دینا اور آدھی ہوا میں اڑا دینا۔ تاکہ میرا کوئی نشان باقی نہ رہے۔ پس ماندگان نے ایسا ہی کیا۔ باری تعالیٰ نے ہوا اور پانی کو حکم دیا کہ اس کی راکھ کو روزِ حشر تک محفوظ رکھیں۔ جب قیامت کے روز سالم ہو کر حضورِ داور پیش ہو گا تو اس سے پوچھا جائے گا" تو نے ایسا کیوں کیا" عرض کرے گا۔" میں شرمسار تھا"۔ اس کو بخش دیا جائے گا۔

فی الحقیقت توحید کسی چیز کے یگانہ ہونے کا اقرار اور اس کی یگانگی سے متعلق صحیح علم ہونے کا نام ہے۔ چونکہ ذاتِ حق ایک ہے۔ اپنی ذات و صفات میں تقسیم سے بالاتر ہے۔ بے مثال ہے۔ لاثانی ہے اور اپنے افعال میں لاشریک

ص ۳۰۳/۳۸۵

ہے۔ موحدوں نے اسے یگانہ سمجھا ہے۔اس علم یگانگی کو توحید کہتے ہیں۔ توحید کے تین مختلف پہلو ہیں:

۱۔ توحید حق برائے حق یعنی حق تعالیٰ کا علم اپنی یگانگی سے متعلق

۲۔ توحید حق برائے خلق یعنی حکم حق کہ بندہ اس کی توحید کا اقرار کرے اور اس کے یعنی بندے کے دل میں توحید حق کا تصور جاگزین ہو۔

۳۔ توحیدِ خلق برائے حق یعنی حق تعالیٰ کی وحدانیت سے متعلق مخلوق کا علم۔

عارفِ حق، وحدانیت کا اقرار کرتا ہے کہ حق تعالیٰ ایک ہے۔ وصل و فصل سے آزاد ہے۔ دوئی اس کے لیے روا نہیں۔ اس کی یگانگی عدد کی نہیں۔ وہ محدود نہیں کہ شش جہات میں گھرا ہُوا ہو اور ہر جہت کے لیے ایک اور جہت ہو۔ وہ کسی مکان میں مکین نہیں اگر اس کا مکان ہوتا تو مکان کے لیے بھی مخصوص مکان کی ضرورت تھی اور فعل و فاعل اور قدیم و محدث کا حکم باطل ہو جاتا۔ وہ "عرض" نہیں کہ اسے "جوہر" کی ضرورت ہو۔ وہ "جوہر" نہیں کہ اپنی قبیل کی کسی اور چیز کا محتاج ہو طبعی نہیں کہ حرکت و سکون کا مبدء رہو۔ روح نہیں کہ جسم کی ضرورت مند ہو جسم نہیں کہ اس کی تالیف اجزاء سے ہو۔ وہ کسی چیز میں مدغم نہیں کہ اس چیز کا جزو جنسی بن جائے۔ کسی چیز کو اس سے رشتہ نہیں کہ اس کا جزو بن کر رہ جائے۔ ہر نقصان سے بری ہے۔ ہر نقص سے پاک ہے۔ سب آفات و عیوب سے مصؤن ہے۔ اس کی کوئی مثال نہیں کہ اپنی مثل سے مل کر دوئی کا مظہر ہو۔ اس کا کوئی فرزند نہیں کہ وہ اصلِ جد کہلائے۔ اس کی ذات و صفات میں تغیر نہیں کہ اس کا وجود "متغیر" ہو جائے۔ وہ

ص ۳۰۴/۳۸۶

ان صفاتِ کمال کا مالک ہے جو اہلِ معرفت اپنی بصیرت سے اس کی طرف منسوب کرتے ہیں اور جو اس نے خود بیان فرمائی ہیں۔ وہ بری ہے ان صفات سے جو ملحد اپنی خواہشات کے مطابق اس سے منسوب کرتے ہیں اور جو اس نے خود بیان نہیں فرمائیں۔ حیّ و علیم ہے۔ رؤف و رحیم ہے۔ مرید و قدیر ہے۔ سمیع و بصیر ہے۔ متکلّم و باقی ہے۔ اس کا علم اس کے لیے مقام حال نہیں۔ اس کی قدرت و طاقت اس پر سختی سے مسلّط نہیں۔ اس کا سمع و بصر تجدّد کا محتاج نہیں۔ اس کا کلام اس سے جدا اور کٹا ہُوا نہیں۔ وہ اپنی قدیمی صفات پر قائم ہے۔ معلومات اس کے علم سے باہر نہیں۔ موجودات اس کے ارادوں کے سامنے بے چارہ ہیں۔ وہی کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ وہی چاہتا ہے جو جانتا ہے کسی مخلوق کو اس کے حضور اختیار نہیں۔ اس کے احکام اٹل ہیں۔ اور اس کے دوستوں کو بجز تسلیم چارۂ کار نہیں۔ وہی خیر و شر کی قدریں قائم کرتا ہے۔ امید و بیم اسی سے ہے۔ نفع و ضرر کا خالق وہی ہے۔ حکم صرف اسی کا رواں ہے۔ اس کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں۔ قضا و قدر

کا وہی مالک ہے۔ کوئی اس کے وصل کی خوشبو سے سرفراز نہیں۔ کسی کو اس تک پہنچنے کا یارا نہیں۔ اس کا دیدار اہلِ بہشت کے لیے ہے۔ اس کے چہرے کو کسی چیز سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی۔ اسے بالمقابل اور آمنے سامنے دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اولیاء کے لیے دنیا میں اس کا مشاہدہ جائز ہے مشاہدے کا انکار صحیح نہیں۔ جو اسے اس طرح سمجھتے ہیں وہ منقطع ہونے والے نہیں اور جو اس کے خلاف سمجھتے ہیں وہ دیانت دار نہیں۔ اس امر میں اور بہت سی اصولی اور وصولی چیزیں ہیں۔ مگر بخوف طوالت اختصار کرتا ہوں۔ میں (علی بن عثمان الجلابیؒ) نے اس فصل کے شروع میں کہا تھا کہ توحید کسی چیز کی وحدانیت کے اقرار کا نام ہے۔ اقرار بجز علم نہیں ہو سکتا۔ اہلِ سنت والجماعت نے اقرارِ وحدانیت کی بنیاد تحقیق پر رکھی ہے۔ ہمارے سامنے کارخانۂ کائنات ہے جس میں بے حد و بے شمار بدیع عجیب اور لطیف چیزیں موجود ہیں۔ یہ از خود معرضِ وجود میں نہیں آ گئیں۔ ہر چیز میں علاماتِ حدث موجود ہیں۔ لامحالہ ان کا کوئی فاعل ہونا چاہیئے جس نے ان کو عدم سے وجود کی صورت دی۔ زمین، آسمان، آفتاب، ماہتاب، خشکی، (زمین)، سمندر، پہاڑ، صحرا، اشکال، حرکت، سکون، نطق، موت، حیات الغرض سب چیزوں کے لیے صنعت گر لازمی ہے اور صنعت گر بھی دو ممکن نہیں ہو سکتے۔ صرف ایک حیّ۔ عالم قادر۔ لاشریک، شرکائے کار سے بے نیاز صانع کامل ہو سکتا ہے۔ فعل کے لیے صرف ایک فاعل ہونا چاہیئے۔ اگر ایک سے زائد فاعل ہوں تو ایک دوسرے کے دستِ نگر ہوں گے۔ بے شک۔ بلاریب۔ باھمہ علم الیقین صرف ایک فاعل ہو سکتا ہے یہاں ہمیں اختلاف ہے ثنویوں سے جو اثباتِ نور و ظلمت کرتے ہیں۔ گبر پرستوں سے جو اثباتِ یزداں و اھرمن میں مبتلا ہیں۔ طبائعیوں سے جو اثباتِ طبع و قوت کے دلدادہ ہیں۔ فلکیوں سے جنہیں اثباتِ ہفت ستارہ کی دھن ہے۔ معتزلیوں سے جو کئی خالق اور کئی صانع مانتے ہیں۔ میں نے سب کے رد میں مختصر دلیل سے کام لیا ہے۔ کیونکہ اس کتاب میں ان کی جملہ کو اس پر تبصرہ کرنے کی گنجائش نہیں۔ طالبِ علم کو اس مسئلہ پر مزید واقفیت حاصل کرنے کے لیے میری ایک دوسری کتاب "الرعایۃ بحقوق اللہ" سے استفادہ کرنا چاہیئے۔ یا دیگر متقدمین کی کتب کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اب میں وہ رموز بیان کرتا ہوں جو توحید کے بارے میں مشائخ کبار سے مروی ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

ص ۳۰۵ / ۳۸۷

فصل

مشہور ہے کہ جنیدؒ نے کہا "توحید قدیم کو حوادث سے جدا رکھنے کا نام ہے"۔ "قدیم" محلِ حوادث نہیں سمجھنا

ص ۳۰۵ / ۳۸۸

چاہیئے۔ اور حوادث محلِ قدیم نہیں ہو سکتے۔ صرف ذاتِ حق قدیم ہے ہم محدث ہیں۔ ہماری کوئی چیز اس سے پیوند نہیں ہو سکتی۔ اور اس کی کسی صفت کو ہم جذب نہیں کر سکتے۔ قدیم کو محدث سے کوئی جنسیت نہیں۔ قدیم وجودِ حوادث سے پہلے تھا اور جس طرح اسے حوادث کے وجود سے قبل حوادث سے کوئی تعلق نہ تھا اسی طرح حوادث کا وجود ختم ہونے کے بعد بھی وہ بے نیاز ہو گا۔ یہ چیز ان لوگوں کے خلاف ہے جو روح کو قدیم سمجھتے ہیں اور جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ جب قدیم کو حدث میں شریک سمجھا جائے یا محدث کو قدیم کا جزو تصور کیا جائے تو قِدمِ حق اور حدوثِ عالم سے متعلق کوئی دلیل باقی نہیں رہتی۔ اور یہ دہریوں کا مذھب ہے (خدا اس کی برائیوں سے محفوظ رکھے)

جملہ محدثات کی حرکات دلائل توحید ہیں۔ قدرتِ حق تعالیٰ پر گواہ ہیں اور اس کے قِدم کا ثبوت ہیں۔ مگر انسان غافل ہے کہ اپنے دل میں غیر کو جگہ دیتا ہے اور غیر کے ذکر سے تسکین حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یاد رکھو جب انسانی مرگ و حیات کو روبکار لانے میں ذاتِ حق کا کوئی شریک نہیں تو انسانی تربیت و پرورش میں بھی کوئی اس کا شریکِ کار نہیں ہو سکتا۔

حسین بن منصورؒ کا قول ہے: "توحید میں پہلا قدم تفرید کو ختم کر دینا ہے"۔ "تفرید" آفات سے جدا ہونے کا نام اور "توحید" وحدانیت کا اقرار ہے۔ "فرید" ہونا یا فردیت غیر اللہ کے لیے بھی ثابت ہو سکتی ہے اور اس صفت کو اوروں کی طرف بھی منسوب کر سکتے ہیں۔ "واحدانیت" میں غیر کا تصور نہیں سما سکتا اور بجز ذاتِ حق کوئی اس صفت کا موصوف نہیں ہو سکتا۔ المختصر "تفرید" عبارۃً مشترک طور پر استعمال ہو سکتا ہے۔ "توحید" صرف شرک کی نفی کرنے کا نام ہے۔ پس "توحید" میں پہلا قدم شریکِ حق کی نفی کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ طریقِ حق پر متفرقات سے دستبردار ہونا ضروری ہے کیونکہ متفرق تصورات کو لے کر راہ اختیار کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی چراغ لے کر راستہ تلاش کر رہا ہو۔

حصریؒ نے فرمایا: "توحید میں ہمارا اصول پانچ چیزوں پر مشتمل ہے":

(۱) نفیٔ حدث (۲) اثباتِ قدم (۳) ھجرِ وطن (۴) مفارقتِ برادران (۵) نسیانِ علم اور جہل

نفیٔ حدث کا مطلب یہ ہے کہ عرفانِ توحید کے پیشِ نظر جملہ محدثات کی نفی کی جائے اور ذاتِ حق پر فروعِ محدثات کو ناممکن سمجھا جائے۔ اثباتِ قدم سے مراد ذاتِ حق کے قدیم ہونے کا ایقان ہے۔ اس چیز کی تشریح جنیدؒ کے قول میں ہو چکی ہے۔ ہجرِ وطن نفسانی طور پر مرغوب، دل کو تسکین دینے والی چیزوں کو چھوڑ دینے اور ایسے مقامات سے

روگردان ہونے کا نام ہے جہاں آسائش و راحت کی امید ہو۔ اہلِ حق کے لیے دنیوی رسوم سے دست بردار ہونا بھی ہجرِ وطن ہے۔ مفارقتِ برادران کے معنی مخلوق سے روگردانی اور حق تعالیٰ کی طرف گریز ہے۔ غیر کے تصور سے موحّد کا دل محجوب ہوتا ہے جس قدر تصورِ غیر غالب ہو اسی قدر حجاب مسلّط رہتا ہے۔ اتفاق آرا اسی پر ہے کہ جب توحید ذہنی قوی کو حق پر مرکوز کرنے کا نام ہے تو تصورِ غیر سے تسکین حاصل کرنا ہمت کو متفرق کر دینے کے مترادف ہے۔ نسیانِ علم و جہل کو یوں سمجھنا چاہیے کہ انسانی علم یا ماہیت و کیفیتِ اشیاء پر مشتمل ہوتا ہے یا جنس و طبیعت سے متعلق ہوتا ہے۔ مگر انسانی علم جو کچھ توحید حق کے بارے میں ثابت کرتا ہے توحید اس کی نفی کرتی ہے اور جس چیز کو جہالت ثابت کرے وہ بذاتہ منافی علم ہوتی ہے۔ کیونکہ جہالت کو توحید سے کوئی تعلق نہیں۔ حقیقی توحید کا علم تصرفِ غیر کو ختم کیے بغیر حاصل نہیں ہوتا اور انسانی علم اور جہل تصرفِ غیر کے سوا کچھ بھی نہیں بصیرت پر غلبہ ہو تو علم حاصل ہوتا ہے لیکن انسان پر غفلت کا غلبہ ہو جائے تو وہ جاہل رہتا ہے۔

ص ۳۰۷/۳۹۰

ایک بزرگ نے کہا کہ میں حصریؒ کے پاس حاضر تھا۔ مجھے نیند نے غلبہ کیا۔ میں نے خواب میں دیکھا۔ دو فرشتے آسمان سے آئے اور کچھ دیر تک حصریؒ کو گفتگو کرتے ہوئے سنتے رہے پھر ایک نے دوسرے سے کہا۔ کہ جو کچھ حصریؒ فرما رہے ہیں وہ توحید کا علم ہے عینِ توحید نہیں۔ جب میں بیدار ہوا تو حصریؒ نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا "میں بجز علمِ توحید کے اور کچھ بیان نہیں کر سکتا"۔

حضرت جنیدؒ سے روایت ہے "توحید کا مفہوم یہ ہے کہ انسان حق تعالیٰ کے سامنے اپنے اختیار اور ارادے سے قطعاً دست بردار ہو جائے۔ اس پر توحید کے بحرِ بےکراں میں صرف قدرتِ حق کے احکام مسلّط ہوں اور صرف اسی کی تدبیر روبکار ہو۔ وہ قربِ حق اور حقیقتِ توحید سے سرشار ہو۔ اپنے نفس اور خلقت کی آواز سے بے نیاز ہو۔ اس مقامِ فنا کے حصول کے بعد اس کا اپنا کوئی ارادہ نہ رہے اور وہ ایسے نقطہ پر پہنچ جائے جہاں اس کا اول و آخر ہمکنار ہو جائے یعنی ایسا ہو جائے جیسا دنیا میں آنے سے قبل تھا" مطلب یہ کہ اہلِ توحید کو اختیارِ باری تعالیٰ میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وہ اپنی طرف نہیں دیکھتے کیونکہ قربِ حق میں وہ اپنا آپ کھو بیٹھتے ہیں اور ان کی اپنی کوئی حس و حرکت باقی نہیں رہتی۔ جو حق تعالیٰ چاہے۔ ان پر طاری کرے حتیٰ کہ حیثیت اس ذرۂ ناچیز کی سی ہو جاتی ہے جو یومِ الست تھی یعنی سوال کرنے والا بھی حق اور جواب دینے والا بھی حق۔ گو بظاہر نشان اسی ذرے کا تھا۔ اس عالم میں مخلوق کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہتا۔ کوئی چیز دعوتِ نظارہ نہیں دیتی اور توحید کا علمبردار کسی طرف ملتفت نہیں ہوتا۔

ص ۳۰۸/۳۹۱

اس قول میں صفاتِ بشری کی فنا اور غلبۂ کشفِ جلال حق کے سامنے صحیح تسلیم و رضا کی طرف اشارہ ہے۔ انسان کے اپنے اوصاف فنا ہو جاتے ہیں۔ اس کی حیثیت فقط ایک آلۂ کار کی ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ ایک ایسا جوہر لطیف بن جاتا ہے کہ اگر اس کے جگر پر نیزہ لگے تو اسے احساس نہ ہو۔ ایسا نیزہ جو مسیلمہ (کذّاب) کی پیٹھ پہ لگے تو اسے دو پارہ کر دے۔ القصہ اس کی تمام صفات فنا ہو جاتی ہیں۔ اس کا جسم اسرارِ الٰہی کا مظہر ہو جاتا ہے۔ اس کی گفتگو کا تعلق بھی ذاتِ حق سے ہوتا ہے۔ اس کے افعال کی نسبت بھی اسی سے اور اس کی ہر صفت کا قیام بھی اسی سے۔ شریعت کا حکم اس پر اتمام حجت کے لیے رہ جاتا ہے ورنہ وہ خود کسی چیز کو دیکھنے کے قابل نہیں ہوتا۔

یہ عالم رسول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تھا۔ آپ شبِ معراج مقامِ قرب پر تشریف فرما ہوئے۔ اس قرب کے لیے مسافت نہ تھی مگر آپ کو قرب بے مسافت حاصل ہوا۔ یہ مقام انسانی عقل و دانش سے بالاتر اور وہم و قیاس کی حدود سے باہر تھا۔ عالمِ امکان نے آپ کو گم کر دیا اور آپ فنائے صفاتِ بشری میں گم ہو گئے۔ فنائے صفات میں آپ متحیر تھے۔ طبعی ترتیب اور اعتدالِ مزاج پریشان ہو گیا۔ نفس دل کے، دل جان کے، جان باطن کے اور باطن قربِ حق کے مرتبہ پر پہنچ گیا۔ آپ ہر چیز کی موجودگی میں ہر چیز سے آزاد ہو گئے۔ آپ نے چاہا کہ وجود کا جامہ اتار دیں۔ مگر باری تعالیٰ کو اتمام حجت مدنظر تھا۔ حکم ہوا اپنے حال پر قائم رہیے۔ یہ حکم وجہ قوت ہوا۔ اس قوت نے آپ کو سہارا دیا۔ اپنی فنا سے بقا باللہ سے سرفراز ہوئے واپس آئے اور فرمایا "میں تم لوگوں جیسا نہیں ہوں میں حضورِ حق میں شب گزاری کرتا ہوں۔ وہی مجھے کھلاتا پلاتا ہے" یعنی میری زندگی اور بقا اسی سے وابستہ ہے۔ نیز فرمایا "مجھے حضورِ حق ایک ایسا وقت میسر آتا ہے کہ اس وقت کوئی مقرب فرشتہ یا نبی مرسل درمیان میں حائل نہیں ہوتا"

ص ۳۰۹/۳۹۲

سہل بن عبداللہ تستری رح کا قول ہے "حق تعالیٰ علم کی صفت سے موصوف ہے۔ مگر اس کا ادراک حواسِ ظاہری باطنی سے نہیں ہو سکتا۔ نظر اس کو نہیں دیکھ سکتی۔ وہ حقیقت ایمان میں بے حد و حلول و دریافت موجود ہے۔ حق تعالیٰ نے انسان کو اپنی ذات کی حقیقت سمجھنے سے قاصر رکھا ہے اور اپنی قدرت کے دلائل کو مخلوق کی رہبری کا ذریعہ بنایا ہے۔ اہلِ عرفان کے دل اس کو جانتے ہیں عقل معلوم نہیں کر سکتی۔ اہلِ ایمان قیامت کے دن ذات باری کی نہایت وغایت جانے بغیر اس کا دیدار کریں گے" یہ جملہ توحید کے جملہ احکام کا نچوڑ ہے۔

ص ۳۱۰/۳۹۳

حضرت جنیدؒ نے فرمایا "توحید حق سے متعلق سب سے مستحکم اور پُرحکمت قول حضرت ابوبکر صدیق رض کا ہے۔" پاک

ہے وہ ذات جس نے اپنی معرفت کے لیے بندوں کے واسطے بجز اظہارِ عجز کوئی راستہ نہیں رکھا۔" عام لوگ حضرت ابوبکرؓ
کے اس قول سے متعلق غلطی کے مرتکب ہو جایا کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ معرفت سے عاجز ہو جانا گویا معرفت کے نہ ہونے کے
برابر ہے۔ یہ ناممکن ہے۔ کیونکہ عاجز ہونا موجود ہونے سے وابستہ ہے۔ معدوم سے اس کا تعلق نہیں ہو سکتا۔ مردہ حیات
سے عاجز نہیں ہوتا بلکہ موت میں موت سے عاجز ہوتا ہے کیونکہ اس کی قوت کو عجز کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ اسی طرح اندھا بینائی سے
عاجز نہیں ہوتا بلکہ نابینائی کے عالم میں نابینائی سے عاجز ہوتا ہے۔ اپاہج ایستادہ ہونے سے عاجز نہیں ہوتا بلکہ بیٹھے ہوئے
بیٹھنے سے عاجز ہوتا ہے۔ اور اس عالم میں حصولِ معرفت ایک احتیاج کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کا
یہ قول کم و بیش وہی ہے جو بوسہل صعلوکی اور ابوعلی دقاق نے بیان کیا یعنی معرفت ابتداءً کسبی ہوتی ہے اور بالآخر ضروری
ہو جاتی ہے۔ علم ضروری وہی ہوتا ہے جو موجود ہو تو اسے حاصل کرنے یا اسے ٹال دینے پر صاحبِ علم قادر نہ ہو پس اس
قول کے مطابق توحید قلب انسانی میں فعلِ حق تعالیٰ ہے۔

حضرت شبلیؒ نے فرمایا: "توحید جمالِ احدیت اور موحد کے درمیان پردہ ہوتی ہے"۔ کیونکہ توحید کو فعلِ بندہ کہیں تو
فعلِ بندہ مشاہدۂ حق کی علت نہیں ہو سکتا اور عینِ مشاہدہ میں جو چیز علتِ مشاہدہ نہ ہو وہ حجاب ہے۔ بندہ اپنے کُل
اوصاف کے ساتھ غیر اللہ ہوتا ہے کیونکہ جب بندے کی کسی صفت کو جزوِ حق سمجھا جائے تو لامحالہ خود بندے کو بھی حق سمجھنا
پڑے گا۔ اس صورت میں موحّد، توحید اور احد تینوں ایک دوسرے کی علت ہو جائیں گے اور یہ بالکل نصاریٰ کا عقیدہ "تین
میں تیسرا" ہو کر رہ جائے گا۔ جو صفت طالب کے لیے راہِ توحید میں مانع فنا ہو وہ صفتِ حجاب ہے اور طالب موحد نہیں۔ جب یہ
ثابت ہے کہ ذاتِ حق کے سوا ہر چیز باطل ہے۔ خود طالب ذاتِ حق کے سوا ہے اس لیے اس کی جملہ صفات مشاہدۂ جمالِ حق
میں باطل ہیں۔ "لا الٰہ الا اللہ" کی یہی تفسیر ہے۔

ص ۳۱۰/۳۹۴

مشہور ہے کہ حضرت ابراہیم خواصؒ حسین ابن منصورؒ کی زیارت کے لیے کوفہ گئے۔ حسینؒ نے پوچھا۔ "اے ابراہیم! تم نے
اپنا وقت کس طرح گزارا؟" انہوں نے فرمایا۔ "میں نے اپنے آپ کو توکل پر چھوڑ دیا۔" حسینؒ نے کہا۔ "ابراہیم تم نے اپنی عمر باطن
کو آباد کرنے میں برباد کر دی۔ طریقِ توحید حق پر تیری فنا کہاں گئی؟" یعنی تجھے توحید میں فنا ہو جانا چاہیئے تھا۔

توحید کی تعبیرات میں بہت سے اقوال ہیں۔ ایک گروہ اسے بقا کا نام دیتا ہے کیونکہ صفت بجز بقا موجود نہیں ہوتی۔ دوسرا
گروہ سمجھتا ہے کہ فنا کے سوا توحید کی کوئی صفت نہیں ہو سکتی۔ ان اقوال کو "جمع و تفرقہ" کے زاویۂ نظر سے دیکھنا چاہیئے۔

ابقائے بندہ جمع اور فنائے بندہ تفرقہ ہے، میں (علی بن عثمان الجلابی رح) کہتا ہوں کہ توحید کے اسرار عطائے حق میں جو معرضِ بیان میں نہیں آسکتے اور کوئی شخص انہیں عبارت آرائی سے ظاہر نہیں کر سکتا کیونکہ عبارت اور معبر ایک دوسرے سے غیر ہوتے ہیں، غیر کو ثابت کرنا شریک کو ثابت کرنے کے برابر ہے، یہ تو تماشہ بن کر رہ جائے گا اور موحّد بندۂ حق ہوتا ہے، کھیل تماشا دیکھنے والا نہیں ہوتا۔

ص ۳۱۱/۳۹۵

توحید کے احکام اور اہلِ معرفت کے اقوال یہی ہیں جو میں نے مختصراً بیان کر دیئے۔ واللہ اعلم۔

کشفِ حجاب سوئم ایمان

حق تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ "اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ"۔ کئی دوسرے مقامات پر مخاطب فرمایا: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ "اے ایمان والو"۔ پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ایمان یہ ہے کہ تم حق تعالیٰ، اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں پر ایمان لاؤ"۔ از روئے سنت ایمان دل سے تصدیق کرنے کا نام ہے۔ شریعت میں ایمان سے متعلق مختلف لوگوں کے مختلف اقوال ہیں۔ معتزلہ کے مطابق سب علمی اور عملی عبادات جزوِ ایمان ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق گناہِ کبیرہ کا مرتکب خارج از ایمان ہوتا ہے۔ خارجی لوگوں کا بھی یہی عقیدہ ہے وہ ہر اس آدمی کو جس سے گناہ سرزد ہو کافر قرار دیتے ہیں۔ ایک دوسرا گروہ ایمان کو صرف قول تک محدود سمجھتا ہے۔ ایک اور گروہ صرف معرفت کو ایمان سمجھتا ہے۔ اہل سنت والجماعت کے متکلمین کی ایک جماعت مطلق تصدیقِ قلب کو ایمان کہتے ہیں۔ ان کے مطابق ایمان ایک وسیع کیفیت قلب ہے۔ اور یہی کیفیت اقرار وعمل میں کارفرما ہوتی ہے۔ میں نے بھی ایمان سے متعلق ایک کتاب سپردِ قلم کی ہے۔ مگر یہاں صرف صوفیا رمشائخِ کبار کے اعتقاد کا بیان مقصود ہے۔ مشائخ صوفیہ کے دو گروہ ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ ایمان قول، تصدیق اور عمل پر مشتمل ہوتا ہے۔ فضیل بن عیاض، بشر حافی، خیر النساج، سمنون المحب، ابو حمزہ بغدادی، محمد حریری اور دیگر بہت سے بزرگ، فقہا۔ اور اہل یقین رضی اللہ عنہم اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

دوسرا گروہ سمجھتا ہے کہ ایمان قول وتصدیق کا نام ہے۔ ابراہیم بن ادھم، ذوالنون مصری، بایزید بسطامی، ابوسلیمان دارانی، حارث محاسبی، جنید بغدادی، سہل بن عبداللہ تستری، شفیق بلخی، حاتم اصم، محمد بن فضل البلخی، رحمہ اللہ علیہم اس مکتبہ کے بزرگ ہیں۔ ان کے علاوہ امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہم پہلے گروہ کے ہم خیال ہیں۔ امام ابوحنیفہ رح

ص ۳۱۲/۳۹۶

کے خلفاء مثلاً امام ابو یوسف، محمد بن حسن اور داؤد طائی رضی اللہ عنہم دوسرے مکتبہ کے مطابق ہیں۔ حقیقت میں اختلاف لفظی ہے۔ معنوی طور پر کوئی اختلاف نہیں۔ اب میں ایمان کے معنی مختصراً بیان کرتا ہوں تاکہ حقیقت آشکارہ ہو اور کوئی ایمان میں اصل کے خلاف نہ سمجھا جائے انشاء اللہ تعالیٰ۔ توفیق قبضۂ قدرت میں ہے۔

فصل

معلوم ہونا چاہیئے کہ جملہ اہل سنت والجماعت اور اہلِ تصوّف و معرفت اس بات پر متفق ہیں کہ ایمان کی "اصل" بھی ہے اور "فرع" بھی۔ ایمان کی اصل تصدیق بالقلب ہے اور اس کی فرع احکاماتِ حق کی پیروی۔ عام طور پر فرع کو استعارہ کے طور پر اصل کا نام دے دیا جاتا ہے جیسا کہ آفتاب کے نور کو آفتاب ہی کہہ دیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے عبادت کو ایمان کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے بغیر عذاب سے مفر نہیں۔

جب احکاماتِ حق بجا نہ لائے جائیں محض تصدیق بالقلب کافی نہیں جس کی عبادت زیادہ ہوگی وہ عذاب سے زیادہ محفوظ ہوگا چونکہ عبادت تصدیق کے ساتھ عذاب سے محفوظ رکھنے کی علّت ہوئی اس لیے ایک گروہ نے عبادت ہی کو ایمان کہہ دیا۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ عذاب سے محفوظ رہنے کی وجہ عبادت نہیں معرفت ہے کیونکہ اگر عبادت موجود ہو اور معرفت عدم موجود تو عبادت ہرگز کارآمد نہیں ہو سکتی۔ اس کے برعکس اگر معرفت موجود ہو اور عبادت عدم موجود تو بندہ بالآخر نجات پالے گا۔ حق تعالیٰ اپنے فضل سے ان لغزشوں سے درگذر فرماوے۔ یا پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت بروئے کار آوے یا اسے گناہ کے برابر سزا دے کر جہنم سے نجات دے دیں اور وہ بہشت میں پہنچ جاوے۔ اہلِ معرفت خطا کار بھی ہوں تو معرفت کی بدولت ہمیشہ جہنم میں نہیں رہیں گے۔ اہلِ عمل صرف عمل کی بنا پر بغیر معرفتِ حق داخلِ بہشت نہیں ہوں گے اس سے ثابت ہوا کہ عبادت عذاب سے نجات کی علت نہیں۔ اسی موضوع پر ایک حدیث بھی ہے۔ پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "تم میں سے کوئی صرف اپنے عمل کی بنا پر نجات نہیں پائیگا۔" صحابہ نے عرض کی "یا رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیا آپ بھی؟" ارشاد ہوا "ہاں میں بھی مگر اس صورت میں کہ حق تعالیٰ مجھے اپنی رحمت کی آغوش میں لے لے"۔

ص ۳۱۳ / ۳۹۷

پس ظاہر ہوا کہ ایمان دراصل معرفتِ حق، اقرار اور اعمال کے قابلِ قبول ہونے کا نام ہے۔ اس پر ہر گروہ کو اتفاق ہے

معرفتِ حق صفاتِ حق کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے۔ صفاتِ حق خاص طور پر تین صورتوں میں نمایاں ہوتی ہیں۔ اول وہ صفات جو اس کے جمال سے تعلق رکھتی ہیں۔ دوم وہ جو جلال سے اور سوئم وہ جو کمال سے۔ کمال تک کوئی راستہ نہیں ہاں اس قدر ہے کہ اس کے کمال کا اعتراف کریں اور نقائص کی اس سے نفی کریں۔ رہا جلال اور جمال۔ اب جس کے سامنے جمالِ حق ہے وہ ہمیشہ طالبِ دید رہتا ہے جس کا شاہد معرفت میں جلال ہے۔ وہ ہمیشہ اپنی صفات سے متنفر رہتا ہے اور اس کا دل ہمیشہ خوف و ھیبت میں مبتلا رہتا ہے۔ شوق محبت کا اثر ہوتا ہے۔ نفرت صفاتِ بشری میں شامل ہے۔ اسی لیے حجابِ بشری کے کشف کے لیے محبت کا ہونا ضروری ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ ایمان و معرفت محبت پر منحصر ہے اور محبت کا تقاضا طاعت ہے۔ کیونکہ جب دل میں دوستی جاگزیں ہو۔ آنکھ باریابِ دیدار ہو۔ جان مقامِ عبرت بلکہ دل محلِ مشاہدہ ہو تو جسم کے لیے لابدی ہے کہ ترکِ احکام نہ کرے۔ اگر کوئی اس کے برعکس کہتا ہے اور تارکِ اوامر ہے وہ معرفت سے قطعاً نابلد ہے۔ اس زمانے میں یہ فتنہ صوفیا میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ لوگوں نے جن کی روش ملحدانہ تھی۔ اس قسم کے صوفیا کی ظاہری بزرگی اور قدر و منزلت کو دیکھا اور اپنے آپ کو ان کے راستہ پر ڈال دیا اور کہا کہ طاعت کی تکلیف اسی وقت تک ہے کہ معرفت حاصل نہ ہو جب معرفت حاصل ہو گئی تو دل کو مقامِ شوق حاصل ہو گیا اور طاعت کی چنداں ضرورت نہ رہی۔ یہ قطعاً غلط ہے۔ معرفت حاصل ہو تو چاہیئے کہ دل میں شوق جاگزیں ہو اور اوامر کی تکریم اور زیادہ ہو جائے۔ یہ ٹھیک ہے کہ طاعت گزار ایسے مقام پر پہنچ جائے کہ طاعت اس کے لیے باعثِ تکلیف نہ رہے مگر اس طرح کہ توفیقِ طاعت زیادہ ہو جائے یہاں تک کہ تعمیلِ احکام میں جو تکلیف محسوس ہوتی ہے وہ تکلیف نہ رہے مگر یہ چیز ایک والہانہ شوق کے سوا حاصل نہیں ہوتی۔ کچھ لوگ ایمان کو کلیتہً من اللہ سمجھتے ہیں۔ اور کچھ صرف بندے کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ماوراء النہر کے علاقے میں یہ اختلاف بہت زیادہ رونما ہوا ہے۔ یاد رکھو ایمان کو من اللہ سمجھنا مکمل جبر کا اقرار کرنا ہے۔ کیونکہ بندہ مجبورِ محض ہو کر رہ جائے گا۔ اسی طرح اگر ایمان فقط بندے کی طرف منسوب کیا جائے تو یہ اثباتِ قدر ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ انسان بغیر حق تعالیٰ کی رہنمائی کے عرفان حاصل نہیں کر سکتا۔ دراصل توحید کا راستہ جبر سے باہر اور قدر سے بالاتر ہے۔ ایمان بندے کا فعل ہے جو ہدایتِ حق کے تحت ظہور پذیر ہوتا ہے کیونکہ جسے حق تعالیٰ گم کردہ منزل چھوڑ دے اسے کوئی راہ نہیں دکھا سکتا اور جسے وہ راہ راست دکھا دے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا چنانچہ فرمایا: فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ

ص ۳۱۴/۳۹۸

ص ۳۱۵/۳۹۹ وَمَنْ یُّرِدْ اَنْ یُّضِلَّہٗ یَجْعَلْ صَدْرَہٗ ضَیِّقًا حَرَجًا۔ "جس کے مقدر میں ہدایت ہو اس کا سینہ اسلام کے لیے کھل جاتا ہے جسے گمراہ کرنا مقصود ہوتا ہے اس کے سینہ میں تنگی اور صلابت آجاتی ہے" پس ایمان اور مداومِ سلامتی کی آرزو حق تعالیٰ کا انعام ہے۔ اور آرزو کرنا بندے کا فعل ہے۔ دل میں آرزو نے ہدایت کا نشان توحیدِ حق پر اعتقاد رکھنا ہے۔ آنکھ کا حرام چیزوں سے بچنا اور دلائلِ قدرت دیکھ کر عبرت حاصل کرنا۔ کان کا کلامِ حق سُننا۔ معدے کا حرام غذا سے خالی ہونا۔ زبان کا سچ بولنا اور جسم کا حرام باتوں سے پرہیز کرنا۔ یہ اس لیے کہ اعتقاد، دعوائے اعتقاد کے دوش بدوش رہے یعنی جو دعویٰ زبان نے ایمان سے متعلق کیا ہے وہ عملاً پورا ہو۔ یہ لوگ (جبر و قدر کے قائل) ایمان اور معرفت میں کمی بیشی کے قائل ہیں۔ حالانکہ یہ چیز بالاتفاق تسلیم کی جاتی ہے کہ معرفتِ حق کم یا بیش ہونے سے آزاد ہے کیونکہ اگر معرفت زیادہ ہو سکتی یا اسے نقصان کا احتمال ہوتا تو لازمی تھا کہ معروف بھی زیادتی اور نقصان کا محتمل ہوتا۔ معروف اس چیز سے بری ہے اس لیے معرفت بھی بری ہے۔ ناقص معرفت تو معرفت ہی نہیں۔ البتہ عمل و فرع میں کمی بیشی ممکن ہے اور چنانچہ بالاتفاق طاعت میں کمی بیشی روا ہے۔ حشوی مکتبہ کے لوگ جو ان دونوں فرقوں سے نسبت کے دعویدار ہیں یہ مسئلہ گوارا نہیں کرتے کیونکہ حشویوں کی ایک جماعت طاعت کو منجملۂ ایمان سمجھتی ہے۔ اور دوسری ایمان کو صرف قولِ مجرد کی حیثیت دیتی ہے۔ یہ دونوں رخ انصاف کے منافی ہیں۔

ایمان دراصل بندے کی تمام صفات کا طلبِ حق میں صرف ہو جانے کا نام ہے۔ سب طالبانِ حق کو یہ تسلیم کر لینا چاہیئے کہ سلطانِ معرفت جب غالب آتا ہے تو ناشناسی ذکرت مفقود ہو جاتی ہے۔ جہاں ایمان ہے وہاں ناشناسی کا کیا کام۔ بزرگوں نے کہا ہے: "جب صبح ہوئی چراغ بے کار ہو گیا" یعنی گویا اس نے دلیلِ صبح پیش کر دی گفتگو کا مقام نہیں تھا۔ کیونکہ روزِ روشن کے لیے دلیل آرائی بے معنی ہے۔ ص ۳۱۶/۴۰۰

باری تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَةً اَفْسَدُوْهَا "جب بادشاہ کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اسے تباہ و برباد کر دیتے ہیں" مطلب یہ کہ جب عارف کا دل نورِ معرفت سے جگمگا اٹھتا ہے تو ناشناسی، وہم، ظن اور گمان ختم ہو جاتے ہیں اور انتہائی معرفت حواس اور خواہشات کو مسخر کر لیتی ہے چنانچہ نہ ہونے والے کام وہ کر لیتا ہے اور نہ کہی جا سکنے والی باتیں وہ کہہ دیتا ہے۔ سب کچھ دائرۂ معرفت میں ہوتا ہے۔ ایک دفعہ ابراہیم خواص رح سے ایمان کی حقیقت سے متعلق سوال کیا گیا۔ فرمایا: "میں کچھ کہہ نہیں سکتا میری تقریر محض عبارت آرائی

ہوگی۔ جواب صرف عمل سے دیا جاسکتا ہے۔ میں مکہ معظمہ کا ارادہ رکھتا ہوں۔ تمہارا ارادہ بھی ہو تو میرے ساتھ رہو تاکہ تمہیں اپنے سوال کا جواب مل سکے"۔ سائل نے ایسا ہی کیا جب جنگل میں پہنچے تو یہ ہوا کہ ہر رات دو روٹیاں اور دو پیالے پانی کے نازل ہوتے ایک وہ خود اٹھا لیتے اور دوسرا سائل کو مل جاتا۔ ایک دن ایک بوڑھا گھڑ سوار نمودار ہوا۔ ابراہیم خواص رح کو دیکھ کر وہ گھوڑے سے اترا۔ دونوں نے آپس میں کچھ باتیں کیں اور اس کے بعد وہ مسافر پھر گھوڑے پر سوار ہوا اور چلا گیا۔ سائل نے پوچھا" یہ بوڑھا سوار کون تھا"۔ فرمایا" تیرے سوال کا جواب" عرض کی "کیسے"۔ فرمایا" یہ خضر علیہ السلام تھے۔ اور مجھے اپنا ہم نشین بنانا چاہتے تھے مگر میں نے انکار کر دیا۔ کیونکہ مجھے خوف تھا کہ ان کی ہم نشینی میں کہیں حق تعالیٰ کو چھوڑ کر ان پر بھروسہ نہ کرنے لگوں اور میرا توکل برباد نہ ہو جائے"۔ حقیقت ایمان توکل کی حفاظت کرتا ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ "حق تعالیٰ پر بھروسہ کرو اگر تم ایمان دار ہو"۔

ص ۳۱۷/۴۰۱ حضرت محمد بن خفیف رح فرماتے ہیں" ایمان اس چیز کو باور کرنے کا نام ہے جو غیب سے دل پر ظاہر ہو"۔ کیونکہ صحیح ایمان غیب ہی پر ایمان لانا ہے۔ حق تعالیٰ کو ظاہری آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے اور بجز تائیدِ حق ہمارا ایمان قائم نہیں ہو سکتا۔ عارفوں کی معرفت اور عالموں کو علم صرف اس کی آگاھی سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی نے دلوں کو عرفان اور علم مرحمت فرمایا ہے۔ علم و معرفت کسبِ انسانی میں داخل نہیں۔ جو آدمی معرفت حق سے دل میں یقین پیدا کرتا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں مومن ہے اور واصل باللہ ہے۔

اسی موضوع پر میں اپنی کسی اور کتاب میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ یہاں اسی پر اکتفا کرتا ہوں تاکہ کتاب طویل نہ ہو جائے۔ اب میں معاملت (اعمال) کی طرف رجوع کرتا ہوں اور اس کے پردے ہٹاتا ہوں۔ انشاء اللہ العزیز۔

کشفِ حجاب چہارم۔ طہارت

ایمان کے بعد سب سے پہلی چیز جو بندۂ حق پر فرض ہوتی ہے وہ نماز کے لیے طہارت ہے جس کا مطلب بدن کو نجاست اور جنابت سے پاک کرنا ہے اور جسم کے تین اعضا کو دھونا اور سر پر مسح کرنا ہے حسبِ احکام شریعت یا اگر پانی نہ ہو یا شدّتِ مرض ہو تو تیمم کرنا۔ اس کے متعلق جملہ احکام سب کو معلوم ہیں۔ طہارت کی دو صورتیں

ہیں۔ ایک جسم کی طہارت ہے اور دوسری دل کی۔ طہارتِ بدن کے بغیر نماز درست نہیں ہوتی۔ اور اسی طرح دل کی طہارت بغیر معرفت درست نہیں ہوتی۔ طہارت تن کے لیے صاف پانی کی ضرورت ہے۔ گدلا اور مستعمل پانی درکار نہیں ہوتا۔ اسی طرح دل کی طہارت کے لیے خالص توحیدِ حق کی ضرورت ہے۔ متفرق اور پریشان اعتقاد درکار نہیں۔ صوفیہ کرام ہمیشہ بدنی طہارت کے علاوہ باطنی طہارت کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک صحابی سے فرمایا "ہمیشہ باوضو رہو تاکہ دونوں محافظ فرشتے تمہیں دوست رکھیں"۔ باری تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَہِّرِیْنَ "حق تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور صاف ستھرا رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے"۔ پس جو ظاہری طہارت پر مداومت کرتا ہے ملائکہ اس کی دوستی کا دم بھرتے ہیں جو باطنی طہارت یعنی توحیدِ حق پر قائم ہے حق تعالیٰ اسے دوست رکھتے ہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ دعا کرتے تھے۔ "اے اللہ! میرے دل کو نفاق سے پاک فرما"۔ حالانکہ آپ کے قلبِ مبارک میں نفاق کسی شکل میں بھی متمکن نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن اپنی کرامت کا احساس ہی اثباتِ غیر کے برابر محسوس ہو۔ اور اثباتِ غیر محل توحید میں نفاق پیدا کرنے والا ہے۔ ہر چند مشائخ کرام کی کرامات کا ہر پہلو مریدوں کے لیے بصیرت افروز ہوتا ہے۔ تاہم یہی پہلو کمال کے نقطہ نظر سے حق تعالیٰ اور بندے کے درمیان ایک ثقیل پردے کی شکل میں حائل ہو جاتا ہے کیونکہ غیر اللہ کی طرف التفات آفت کے برابر ہے۔ اسی بنا پر حضرت بایزیدؒ نے فرمایا: "اہلِ معرفت کا نفاق اہل عشق (اہل طلب) کے اخلاص سے بہتر ہے"۔ یعنی جو مرید کا مقام ہوتا ہے وہ کامل کا حجاب ہوتا ہے۔ کیونکہ مرید کرامت حاصل کرنے کے درپے ہوتا ہے۔ اور کامل کرامت عطا کرنے والے یعنی ذاتِ حق کا طالب ہوتا ہے۔ الغرض اثباتِ کرامات اہلِ حق کے لیے نفاق کے برابر ہے۔ اور یہی حال ہر اس چیز کا ہے جس کا دیکھنا غیر اللہ کی طرف نظر کرنے کے مترادف ہو۔ پس دوستانِ حق پر آفت سب عاصیوں کے لیے معاصی سے نجات ہے۔ عاصیوں پر آفت جملہ اہلِ ضلالت کے لیے ضلالت سے نجات ہے۔ کیونکہ اگر کفار کو معلوم ہو کہ ان کا کفر حق تعالیٰ کو ناپسند ہے جیسا کہ گنہ گار جانتے ہیں تو وہ کفر کے چنگل سے نکل جائیں اگر گنہ گاروں کو یہ علم ہو کہ ان کے سب عمل نقصان کا عمل ہیں جیسے کہ دوستانِ حق کو علم ہے تو وہ سب گناہوں سے نجات پا جائیں اور سب آفتوں اور برائیوں سے پاک ہو جائیں۔ پس ظاہری طہارت اور باطنی طہارت کو ہم رکاب ہونا چاہیئے۔ یعنی جب ہاتھ دھوئے تو دل کو بھی دنیا کی محبت سے پاک کرے۔ جب منہ میں پانی ڈالے تو منہ کو ذکرِ غیر سے خالی کرے۔ جب ناک میں پانی ڈالے تو نفسانی خواہشات اپنے اوپر حرام کرے منہ دھوئے تو جملہ مالوفات سے یک بارگی

ص ۳۱۷/۲۰۳

ص ۳۱۸/۲۰۳

اعراض کرے اور رو بحق ہو جائے۔ جب ہاتھ دھوئے تو اپنے جملہ دنیوی نصیب سے دست بردار ہو جائے۔ جب مسح کرے تو اپنے تمام امور کو سپرد خدا کرے۔ اور جب پاؤں دھوئے تو جب تک احکام خدا کے مطابق نہ دھوئے نماز کیلئے کھڑا نہ ہوتا کہ دو گونہ طہارت نصیب ہو۔ کیونکہ شریعت کے جملہ احکام ظاہری امور باطنی سے وابستہ ہیں۔ ایمان، زبان کا اقرار ہے مگر تصدیقِ دل کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ شریعت میں عبادت کے احکام بدن پر نیتِ قلب کے ساتھ مربوط ہیں۔ دل کی طہارت دنیا کی برائیوں پر غور و فکر کرنے اور دنیا کو ایک عالم غدّار اور مقامِ فنا سمجھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ دل دنیا سے خالی ہونا چاہیئے۔ اور یہ مقام سخت مجاہدہ سے ملتا ہے اور سب سے زیادہ اہم مجاہدہ آداب ظاہر کو ملحوظ رکھنا اور اس طریقِ کار پر مداومت کرنا ہے۔

ابراھیم خواصؒ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا مجھے حیاتِ ابدی چاہیئے۔ اگر سب لوگ نعیمِ دنیا میں مستغرق ہو کر حق تعالیٰ کو فراموش کر دیں تو میں اس مصیبت کے گھر یعنی دنیا میں آدابِ شریعت بجالاتا رہوں اور حق تعالیٰ کو یاد رکھوں۔

ص ۳۱۹/۳۰۲

کہتے ہیں کہ ابوطاہر حرمیؒ چالیس برس تک حرمِ مکہ میں مقیم رہے مگر حرم کے اندر طہارت نہیں کی۔ ہر بار حرم سے باہر جاتے اور فرماتے جس زمین کو حق تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے میں اپنا مستعمل پانی اس پر نہیں گرا سکتا۔ ابراہیم خواصؒ سے متعلق مشہور ہے کہ آپ رے کی جامع مسجد میں بعارضہ پیچش مبتلا تھے۔ ایک دن رات میں آپ کو ساٹھ بار غسل کرنا پڑا اور بالآخر آپ کی وفات بھی پانی ہی میں ہوئی۔

ابوعلی رودباریؒ کچھ مدت طہارت کے معاملے میں شک میں مبتلا رہے کہتے ہیں ایک دن میں علی الصباح دریا میں اتر گیا اور سورج نکلنے تک پانی میں رہا۔ دل کو تکلیف ہوئی۔ فریاد کی کہ اے رب العزت مجھے عافیت عطا فرما۔ ہاتفِ غیب نے آواز دی۔ "عافیت علم میں ہے"۔

حضرت سفیان ثوریؒ سے متعلق مشہور ہے کہ بیماری کے عالم میں آپ نے وفات کے دن ساٹھ بار طہارت فرمائی اور فرمایا میں چاہتا ہوں کہ حکمِ حق آئے تو میں باطہارت لبیک کہوں۔

حضرت شبلیؒ وضو کر کے مسجد میں داخل ہو رہے تھے کہ غیب سے آواز آئی "تو نے ظاہر کو پاک کر لیا۔ باطن کی صفائی کہاں ہے؟" آپ وہیں سے واپس ہو گئے۔ سب مال و دولت راہِ خدا میں تقسیم کر دی اور ایک سال تک صرف اتنے کپڑے پر اکتفا کیا کہ جو نماز کے لیے کافی تھا۔ آپ حضرت جنیدؒ کے پاس آئے تو انہوں نے فرمایا "کیا خوب طہارت تھی جو تم نے کی۔ خدا تمہیں

ہمیشہ پاک رکھے"۔ اس کے بعد آپ کبھی بے طہارت نہیں رہے۔ جب آپ دنیا سے رخصت ہو رہے تھے تو وضو ٹوٹ گیا۔ ایک مرید کو اشارہ کیا۔ اس نے وضو کروایا۔ مگر ریشِ مبارک میں خلال کرنا بھول گیا۔ آپ بولنے سے قاصر تھے۔ مرید کا ہاتھ پکڑ کر اشارہ کیا اور مرید نے خلال کیا۔ آپ نے فرمایا ہے "میں نے طہارت کے آداب میں سے کبھی کسی چیز کو نظر انداز نہیں کیا سوائے اس وقت کے کہ میرے باطن میں کوئی پندار جاگزین ہو"۔

ص ۳۲۰/۵۰۴

حضرت بایزیدؒ نے فرمایا "جب کبھی میرے دل میں کوئی دنیوی خیال گذرے میں وضو کر لیتا ہوں اور عقبیٰ کا خیال آئے تو غسل کر لیتا ہوں کیونکہ دنیا محدث ہے اس کا خیال بھی حدث ہے۔ عقبیٰ محلِ غیبت و آرام ہے اور اس کا خیال بمنزلہ جنابت ہے۔ حدث سے صرف وضو لازم آتا ہے اور جنابت سے غسل"۔

حضرت شبلیؒ وضو کر کے مسجد میں داخل ہوئے دل میں آواز محسوس کی "کیا تیری طہارت اس قابل ہے کہ تو ہمارے دربار میں حاضر ہو؟" یہ سن کر آپ واپس ہوئے تو پھر آواز آئی "ہماری درگاہ سے پلٹ کر کہاں جاؤ گے؟" آپ نے نعرہ بلند کیا آواز آئی "کیا ہمارے اوپر طعنہ زنی کرتے ہو؟" آپ اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے پھر آواز آئی "کیا ہماری برافروختگی کے تحمل کا بھی دعویٰ ہے؟" حضرت شبلی نے عرض کی "میرے مالک میں تجھ سے تیری پناہ مانگتا ہوں"۔

طہارت سے متعلق مشائخ کبار کے بہت سے اقوال ہیں۔ سب نے اپنے مریدوں کو اللہ کی طرف رجوع کرتے وقت ظاہر و باطن کی طہارت پر مداومت کا حکم دیا ہے۔ جو کوئی عملِ ظاہر کا قصد کرے تو لازمی ہے کہ وہ ظاہر کی طہارت کرے جب باطن میں قربِ حق کا قصد کرے تو چاہیئے کہ باطن کی طہارت کرے۔ ظاہر کی طہارت پانی سے ہوتی ہے۔ اور باطن کی توبہ اور رجوع الی اللہ سے۔

اب میں توبہ اور اس سے متعلقہ امور کا حجاب اٹھاتا ہوں تاکہ اس کی حقیقت بھی نمایاں ہو جائے انشاء اللہ العزیز۔

۱۵

پندرھواں باب

توبہ اور توبہ سے متعلقہ امور

ص ۳۲۱/۴۰۶

سالکانِ حق کا پہلا قدم توبہ ہے۔ جیسے داعیانِ عمل کا پہلا درجہ طہارت ہے۔ چنانچہ باری تعالیٰ نے فرمایا: یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا "اے ایمان والو! حق تعالیٰ کے حضور سچی توبہ کرو۔" اور نیز فرمایا: تُوْبُوْا اِلَی اللّٰہِ جَمِیْعًا اَیُّھَا الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ "اے ایمان والو! سب اللہ کے حضور توبہ کرو تاکہ بہبود پاؤ۔" پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ما من شیءٍ احب الی اللّٰہ من شاب تائبٍ "حق تعالیٰ کو توبہ کرنے والا نوجوان سب سے زیادہ عزیز ہے۔" اور نیز فرمایا: التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ "توبہ کرنے والا اس شخص کی مانند ہے جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔" پھر آپ نے فرمایا: اذا احب اللہ عبدا لم یضرہ ذنب "جب اللہ تعالیٰ کسی کو دوست رکھتا ہے۔ تو گناہ سے اس کو نقصان نہیں ہوتا۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَھِّرِیْنَ "اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاک رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔" صحابہ نے عرض کیا توبہ کی کیا علامت ہے؟ فرمایا "ندامت و پشیمانی"۔ اور آپ نے یہ جو فرمایا۔ کہ گناہ دوستانِ حق کو نقصان نہیں دیتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ گناہ سے کافر نہیں ہوتا اور اس کے ایمان میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ ایسا نقصان جس کا انجام نجات ہو فی الحقیقت نقصان نہیں ہوتا۔

توبہ کے لغوی معنی رجوع کرنا ہے۔ چنانچہ عرب کہتے ہیں تَابَ یعنی اس نے رجوع کیا۔ نہی سے یعنی ایسی چیز سے جسے کرنے سے حق تعالیٰ نے منع فرمایا محض حق تعالیٰ کے خوف سے باز آجانا توبہ کی حقیقت ہے۔ پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "فعلِ بد سے پشیمانی توبہ ہے"۔ اس قول میں توبہ کی جملہ شرطیں موجود ہیں۔ ایک شرط مخالفتِ احکامِ حق تعالیٰ سے پشیمانی ہے۔ دوسری شرط مخالفتِ احکام کو فوراً چھوڑ دینا ہے۔ اور تیسری شرط گناہ کی طرف دوبارہ نہ لوٹنے کا ارادہ ہے۔ یہ تینوں شرطیں ندامت میں مضمر ہیں۔ کیونکہ جب لغزش پر ندامت ہو تو باقی دو شرطیں از خود پوری

ص ۳۲۲/۷

ہو جاتی ہیں۔ لغزش پر ندامت کے تین اسباب ہیں جیسا توبہ کی تین شرطیں ہیں یعنی (۱) عذاب کا خوف دل پر طاری ہو جائے برے افعال کی وجہ سے دل مغموم ہو جائے اور اس طرح ندامت کا احساس پیدا ہو جائے (۲) نعمت کی خواہش ہو اور یہ احساس ہو کہ برے افعال اور نافرمانی سے نعمت حاصل نہیں ہو گی اور اس کا نتیجہ ندامت ہو (۳) روزِ قیامت کی رسوائی کا خوف ہو اور اس خوف کی وجہ سے انسان نادم ہو جائے۔

پہلی صورت میں توبہ کرنے والا "تائب" کہلاتا ہے۔ دوسری صورت میں "منیب" اور تیسری میں "اوّاب"۔ اسی طرح توبہ کے تین مقام ہیں یعنی توبہ۔ انابت اور اَوبت۔ توبہ خوفِ عذاب سے۔ انابت طلبِ ثواب سے اور اَوبت تعظیم فرمانِ حق سے وابستہ ہوتی ہے۔ توبہ عام اہلِ ایمان کے لیے ہے اور کبیرہ گناہوں سے متعلق ہوتی ہے چنانچہ حق تعالےٰ نے فرمایا: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا "اے ایمان والو! خدا کے حضور صحیح اور پکی توبہ کرو"۔ انابت اولیاء اور مقربانِ حق کا شیوہ ہے۔ باری تعالیٰ نے فرمایا: مَنْ خَشِیَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَیْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِیْبٍ "جو شخص خدائے رحیم سے بن دیکھے ڈرے گا اور جس کے پہلو میں حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا دل ہے"۔ اوبت انبیاء اور مرسلین کا مقام ہے۔ چنانچہ باری تعالیٰ نے فرمایا: نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ "بہت اچھا ہے وہ بندہ جو اللہ کی طرف بہت رجوع کرے"۔ پس توبہ گناہِ کبیرہ سے اللہ کی فرمانبرداری میں دست بردار ہونا ہے۔ انابت گناہِ صغیرہ سے اللہ کی محبت میں اس کی طرف رجوع کرنا ہے۔ اور اوبت اپنے آپ سے منہ موڑ کر اللہ کی طرف رجوع کرنے کا نام ہے۔ احکامِ حق کے پیشِ نظر فواحش سے روگرداں ہونے والے، صغیرہ گناہوں اور غلط خیالات سے بچ کر حق تعالیٰ کی محبت میں توبہ کرنے والے اور خودی کو ترک کرکے ذاتِ حق کی طرف رجوع کرنے والے میں بڑا فرق ہے۔ اصلِ توبہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی تنبیہات ہیں، خوابِ غفلت سے دل کی بیداری ہے اور اپنے عیوب پر نظر کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ جب انسان اپنے برے احوال و افعال پر نظر کرتا ہے اور ان سے نجات کا متمنی ہوتا ہے تو باری تعالیٰ اسبابِ توبہ آسان فرما دیتا ہے۔ گناہوں کی سیاہ بختی سے بچا کر اسے طاعت کی حلاوتوں سے آشنا کر دیتا ہے۔

ص ۳۲۲/۸

اہلِ سنت والجماعت اور جملہ مشائخ معرفت کے نزدیک اگر کوئی شخص ایک گناہ سے توبہ کرے اور دیگر گناہوں میں مبتلا رہے تو حق تعالیٰ اسے اس ایک گناہ سے بچنے کا ثواب عطا کرتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ اسی کی برکت سے وہ باقی گناہوں سے بھی نجات حاصل کر لے۔ مثلاً ایک شخص شراب نوشی کرتا ہے اور زانی بھی ہے۔ وہ زنا سے تائب ہو جاتا ہے مگر

شراب نوشی کو ترک نہیں کرتا۔ اس کی توبہ روا ہے۔ باوجودیکہ دوسرے گناہ کا ارتکاب ابھی اس سے سرزد ہو رہا ہے معتزلہ کا قحشمی فریق کہتا ہے کہ جب تک ایک ہی بار جملہ گناہِ کبیرہ سے توبہ نہ کی جائے توبہ بے کار ہے۔ بعض گناہوں سے توبہ کرنا اور بعض میں مبتلا رہنا توبہ کی توہین ہے۔ یہ چیز محال ہے کیونکہ انسان جملہ گناہوں کے لیے قابلِ مواخذہ ہے۔ جب ایک گناہ سے تائب ہو جائے (اس کا مرتکب نہ ہو) تو اس پر کوئی مواخذہ اس گناہ سے متعلق نہیں ہو سکتا اور یہی چیز اس کی توبہ کی محرک ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کچھ فرائض ادا کرتا ہے اور کچھ نہیں کرتا، یقیناً اسے ادا کردہ فرائض کا ثواب ہو گا جس طرح ادا ناکردہ فرائض کے بدلے وہ عذاب کا مستحق ہو گا۔ اگر کسی گناہ کی قدرت ہی حاصل نہ ہو یا اس کے اسباب ہی موجود نہ ہوں مگر بندہ توبہ کرے تو وہ تائب کہلائے گا۔ کیونکہ توبہ کا ایک رکن پشیمانی ہے۔ اس توبہ سے اسے گذشتہ پر ندامت ہو گی۔ فی الحال وہ اس گناہ سے اعراض کرتا ہے اور ارادہ رکھتا ہے کہ اگر اسباب میسّر بھی ہوں تو وہ ہرگز گناہ میں مبتلا نہیں ہو گا۔

ص ۳۲۳ / ۴۰۹

وصفِ توبہ اور صحتِ توبہ سے متعلق مشائخ میں اختلاف ہے۔ سہل بن عبداللہؒ اور ان کے ساتھ ایک جماعت کا خیال ہے "توبہ یہ ہے کہ جو گناہ سرزد ہو چکا ہو وہ ہمیشہ یاد رہے یعنی انسان ہمیشہ اس سے متعلق پشیمان رہے۔ اگر بہت سے نیک عمل موجود ہیں تو ان کی وجہ سے طبیعت میں عجب پیدا نہ ہو۔ برے کام پر ندامت اور پشیمانی نیک اعمال سے زیادہ اہم ہوتی ہے جو شخص معاصی کو فراموش نہیں کرتا۔ اپنے نیک اعمال پر کبھی مغرور نہیں ہو سکتا۔

حضرت جنیدؒ اور ایک جماعت کا یہ خیال ہے۔ "توبہ یہ ہے کہ تو اپنے گناہوں کو بھول جائے"۔ کیونکہ تائب محبّ حق ہوتا ہے اور محبّ حق ہونے کی وجہ سے صاحبِ مشاہدہ ہوتا ہے اور مشاہدہ میں گناہ کی یاد ظلم ہے۔ یہ کیا کہ کچھ جفا (گناہ) میں گزر گئی کچھ یادِ جفا (یادِ گناہ) میں۔ وفا (مشاہدہ) میں جفا (یادِ گناہ) حجاب کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس اختلاف کا تعلق مجاہدہ اور مشاہدہ کے اختلاف سے ہے اور اس کا مفصل ذکر مکتبۂ سہیلیہ کے بیان میں ملے گا۔ جب تائب کو قائم بخود سمجھا جائے تو نسیانِ گناہ غفلت پر محمول کرنا پڑے گا۔ اگر تائب قائم بحق ہو تو یادِ گناہ بمنزلہ شرک ہے۔ الغرض تائب باقی الصفت ہے تو اس کے اسرار کا عقدہ ابھی حل نہیں ہوا۔ اگر فانی الصفت ہے تو اپنی صفت کا بیان روا نہیں۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے باقی الصفت ہونے کے عالم میں کہا "میں تیری طرف رجوع

کرتا ہوں"۔ اور پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فانی الصفت ہو کر کہا" میں تیری ثنا بیان نہیں کر سکتا" مقصود یہ ہے کہ قربِ حق میں وحشت کا ذکر تمام تر وحشت ہے: تائب کو تو خودی سے بھی دستبردار ہو جانا چاہیئے یادِ گناہ کا کیا ذکر ؟ فی الحقیقت یادِ گناہ خود گناہ ہے کیونکہ جب گناہ باعثِ اعراض ہے تو اس کی یاد بھی باعثِ اعراض ہونی چاہیئے۔ اسی طرح غیر اللہ کا ذکر بھی حق تعالیٰ سے اعراض کرنا ہے جس طرح جرم کا ذکر جرم ہے اسی طرح جرم کو فراموش کر دینا بھی جرم ہے۔ بھول جانے اور یاد رکھنے کا تعلق انسان سے ہے۔ حضرت جنیدؒ نے فرمایا میں نے بے شمار کتب کا مطالعہ کیا مگر اس بیت سے بڑھ کر مجھے کسی چیز نے فائدہ نہیں دیا۔

ص ۳۲۲/۴۱۰

"جب میں نے اپنے حبیب سے کہا کہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا (تو جواب ملا) تیری زندگی
خود اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کے مقابل کسی اور جرم کا تصوّر بھی نہیں ہو سکتا"۔

جب دوستی کے مقام پر دوستی کا دم بھرنے والے کا وجود ہی گناہ ہو تو اس کی صفات کا کیا ذکر ؟ الغرض توبہ تائید ربانی اور گناہ فعلِ جسمانی ہے۔ جب ندامت دل میں جاگزین ہو جاتی ہے تو جسم کو اس ندامت کے ختم کر دینے پر قدرت نہیں ہوتی۔ جب ابتدائے فعل میں اس کی ندامت توبہ کو روک نہیں سکتی۔ تو انتہائے فعل میں بھی توبہ کی حفاظت نہیں کر سکتی۔ باری تعالیٰ نے فرمایا: فَتَابَ عَلَيْهِ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ "اس کی (آدمؑ کی) توبہ قبول کی بلاشبہ وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور بڑا رحم والا ہے"۔ کتاب اللہ میں اس کی نظیریں بہت ہیں اور اتنی مشہور ہیں کہ یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ پس توبہ تین قسم کی ہوتی ہے (۱) توبہ گناہ سے نیکی کی طرف (۲) توبہ نیکی سے بلند تر نیکی کی طرف اور (۳) توبہ خودی سے حق تعالیٰ کی طرف۔

خطا سے نیکی کی طرف توبہ کی مثال یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا: وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ "اور وہ لوگ جن سے کوئی فعلِ بد سرزد ہوا یا انہوں نے اپنی جان پر ظلم کیا پھر حق تعالیٰ کو یاد کیا اور گناہوں کی معافی مانگی"۔ نیکی سے بلند تر نیکی کی توبہ کی مثال یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: تُبْتُ إِلَيْكَ "میں نے تیری طرف رجوع کیا"۔ اور خودی سے حق تعالیٰ کی طرف توبہ کی مثال یہ ہے کہ پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا وانہ لیغان علی قلبی وانی کنت لاستغفر اللہ فی کل یوم سبعین مرّۃً "اور توبہ مجھ پر آسان ہو جاتی ہے حتیٰ کہ میں ہر روز ستر بار حق تعالیٰ سے معافی مانگتا ہوں"۔

خطا کا مرتکب ہونا مذموم ہے۔ خطا سے نیکی کی طرف رجوع کرنا قابلِ ستائش ہے۔ یہ توبہ عام ہے اور اس کے احکام ظاہر ہیں۔ بلند تر نیکی حاصل کرنا چاہیئے۔ کیونکہ معمولی نیکی پر تھم جانا راستے میں ٹھہر جانے کے برابر ہے اور ایک پردۂ حائل ہے۔ نیکی سے بلند تر نیکی کی طرف رجوع کرنا اہلِ ہمت اور اولیاء کے طریق میں نہایت درجہ قابلِ ستائش ہے۔ یہ خاص توبہ ہے۔ حق تعالیٰ کے خاص بندے گناہ سے کیا توبہ کریں گے وہ تو گناہ کے مرتکب ہی نہیں ہوتے۔

معلوم ہے کہ سارا عالم رویتِ باری کے لیے بے قرار ہے اور موسیٰ علیہ السلام رویت سے توبہ فرما رہے ہیں۔ وجہ یہ کہ انہوں نے دیدار اپنے اختیار سے طلب کیا۔ محبت میں اپنا اختیار حیرانی ہے۔ اور حیرانی کو ترک کرنا حق کو اختیار کرنا ہے اس لیے انہوں نے دیدارِ حق ترک کر دیا۔ خود کو ترک کر کے رجوع الی اللہ کرنا محبت کا درجہ ہے۔ بلند تر مقام کے حصول پر پس ماندہ بلند مقام سے توبہ اور تمام مقامات و احوال سے توبہ لازم ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقامات ہمیشہ رو بہ ترقی تھے۔ جب آپ بلند تر مقام پر پہنچتے تو اس سے پچھلے مقام سے استغفار اور اس کو دیکھنے سے توبہ فرماتے واللہ اعلم۔ ص ۳۲۵/۴۱۱

فصل

معلوم ہونا چاہیئے کہ معصیت سے بچنے کا عزمِ راسخ کرنے کے بعد ضروری نہیں کہ تائب توبہ پر قائم رہ سکے۔ اگر توبہ کے بعد توبہ میں فتور واقع ہو جائے اور عزمِ راسخ کے باوجود انسان معصیت میں الجھ جائے تو ثوابِ توبہ فسخ نہیں ہوتا۔ اہلِ تصوف میں کچھ مبتدی سالکانِ طریقت ایسے گذرے ہیں جو توبہ کرنے کے بعد لغزش کے مرتکب ہوئے۔ گناہ میں الجھ گئے اور پھر کسی تنبیہ پر درگاہِ حق کی طرف لوٹ آئے۔ مشائخ میں سے ایک بزرگ نے کہا ہے کہ میں نے ستر بار توبہ کی اور ہر بار معصیت کا شکار ہوا۔ اکہترویں بار میری توبہ کو استقامت نصیب ہوئی۔ حضرت ابو عمر جنیدؒ بیان کرتے ہیں کہ ابتداءً میں نے توبہ حضرت عثمان حیریؒ کی محفل میں کی۔ کچھ عرصہ اپنی توبہ پر قائم رہا۔ میرے دل میں خواہشِ گناہ نے پھر سر اٹھایا اور میں لغزش کا مرتکب ہوا۔ اس کے بعد میں عثمان حیریؒ کی مجلس سے گریز کرتا رہا۔ جہاں کہیں بھی وہ دور سے نظر آتے میں ندامت سے راہِ فرار اختیار کر لیتا۔ ایک روز سامنا ہو ہی گیا۔ آپ نے فرمایا۔ "بیٹا! دشمنوں کی صحبت اختیار کرنے سے کیا حاصل جب تک گناہوں سے دامن بالکل پاک نہ ہو۔ دشمن تو ہمیشہ عیب ڈھونڈتا ہے اگر تو عیب میں ملوث ہے تو دشمن خوش ہو گا۔ اگر تو عیوب سے پاک ہو گا تو اسے تکلیف ہو گی۔ اگر گناہوں کا مرتکب ہونا ہی ہے تو ہمارے پاس آ۔

تیری مصیبت ہم برداشت کرلیں گے۔ دشمن کی خواہش کے مطابق خوار ہونے کی کیا ضرورت ہے"۔ حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد مجھے گناہ کی رغبت نہیں ہوئی اور میری توبہ کو استقامت مل گئی۔

ص ۳۲۶/۴۱۲

میں نے سنا ہے کہ کسی شخص نے توبہ کی، پھر گناہ کا مرتکب ہوا، پھر پشیمان ہوا۔ ایک روز دل میں سوچا اگر اب درگاہِ حق میں جاؤں تو میرا کیا حال ہو گا۔ ہاتفِ غیب نے کہا "تو ہمارا فرماں بردار تھا تو ہم نے تجھے شرفِ قبولیت بخشا۔ تو نافرمانبردار ہوا تو ہم نے تجھے مہلت دی۔ مگر اب بھی تو ہماری طرف آئے تو ہم تجھے قبول کریں گے"۔

اب ہم توبہ سے متعلق مشائخ کبار کے اقوال بیان کرتے ہیں۔

فصل

ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں۔ "عام لوگ معصیت سے توبہ کرتے ہیں اور خواص غفلت سے"۔ مطلب یہ کہ عوام سے ظاہر کے متعلق سوال ہو گا اور خواص سے اعمال کی حقیقت سے متعلق باز پرس ہو گی۔ کیونکہ غفلت عوام کے لیے نعمت اور خواص کے لیے حجاب ہوتی ہے۔

حضرت ابو حفص حدادؒ فرماتے ہیں۔ "توبہ میں بندے کا اپنا کچھ اختیار نہیں ہوتا کیونکہ توبہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہے" (اس کا انعام ہے، بندے کی طرف سے نہیں)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی اپنی سعی کا نتیجہ نہ ہو بلکہ حق تعالیٰ کی عطا ہو۔ یہ حضرت جنیدؒ کا طریق ہے۔

ابوالحسن بوشنجیؒ کا قول ہے۔ "اگر گناہ کی یاد میں لذت نہ رہے تو یہ توبہ ہے۔ گناہ کی یاد یا تو ندامت کی وجہ سے ہوتی ہے یا دلی خواہش کی وجہ سے۔ جب ندامت کی وجہ سے ہو تو انسان تائب ہوتا ہے جب ارادت سے یاد آئے تو گناہ ہے۔ گناہ کا مرتکب ہونے میں وہ آفت نہیں جو اس کی ارادت میں ہے۔ کیونکہ ارتکاب تو ایک بار ہو چکتا ہے مگر ارادت مستقل طور پر دل میں جاگزیں رہتی ہے۔ گھڑی بھر جسم سے گناہ کرنا اتنا سنگین نہیں جتنا کہ رات دن ارادتِ گناہ میں منہمک رہنا ہے۔"

ص ۳۲۷/۴۱۳

حضرت ذوالنونؒ فرماتے ہیں۔ "توبہ دو قسم کی ہے ایک توبۂ انابت یعنی خوفِ عذاب سے توبہ کرنا۔ دوسری توبۂ استحیاء یعنی شرمسار ہو کر توبہ کرنا"۔ توبہ جس کی بنا خوف پر ہو کشفِ جلالِ حق سے حاصل ہوتی ہے اور توبہ جو شرمساری سے جنم لیتی ہے جمالِ حق کے مشاہدہ پر منحصر ہے۔ ایک جلالِ حق کے سامنے خوف کی آگ میں جلتا ہے۔ دوسرا جمالِ حق میں حیا کے نور سے روشن ہے۔ گویا ایک مست (سکر میں) ہوتا ہے اور دوسرا ہوش۔ اہلِ حیا اصحابِ سکر ہوتے ہیں اور اصحابِ خوف اہلِ صحو

بات بہت طویل ہے مگر میں نے مختصراً بیان کر دی۔ وباللہ التوفیق۔

کشفِ حجاب پنجم ۔ نماز

حق تعالیٰ نے فرمایا: وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ "نماز قائم کرو" پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "نماز اور جو کچھ ملک میں ہے اس کا خیال کرو" لغت کے لحاظ سے نماز، ذکر و دعا ہے اور فقہا، کی اصطلاح میں وہ مخصوص عبادتِ حق ہے جو ہر روز خاص احکام کے ساتھ کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ مقررہ وقت پر روزانہ پانچ نمازیں ادا کرو۔ نماز ادا کرنے سے قبل کچھ شرائط ہیں (۱) جسم کی طہارت ظاہر میں نجاست اور باطن میں ہوا و ہوس سے (۲) لباس کی طہارت۔ ظاہر میں نجاست اور باطن میں مالِ حرام سے (۳) مکان کی طہارت۔ ظاہر میں گندگی سے اور باطن میں فساد و معصیت سے (۴) قبلہ رو ہونا۔ ظاہر کا قبلہ کعبۂ معظم ہے اور باطن کا عرش اعظم یعنی سِرّ مشاہدۂ حق (۵) قیام۔ ظاہر حسبِ طاقت اور باطن روضۂ قربِ حق۔ قیام ظاہر مقررہ وقت کی حدود میں اور قیامِ باطن مقامِ حقیقت پر ہمیشہ (۶) نیت بطیب توجہ (۷) خوفِ حق اور فنائے صفاتِ بشری کے مقام پر تکبیر پڑھنا۔ وصل کے مقام پر قیام کرنا اور ترتیل کے ساتھ قرأت کرنا۔ گڑگڑا کر رکوع۔ عجز و انکسار کے ساتھ سجود۔ اطمینانِ دل کے ساتھ تشہد ادا کرنا اور بشری صفات کی فنا پر سلام پھیرنا۔

ص ۳۲۸/۲۱۴

احادیث میں آیا ہے کہ جب پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز پڑھا کرتے تھے تو ان کے باطن میں اس دیگ کی طرح جوش ہوتا تھا جس کے نیچے آگ جل رہی ہو۔ جب حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ قصد نماز فرماتے تھے تو آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا اور فرماتے تھے اس امانت کو ادا کرنے کا وقت آگیا جسے اٹھانے سے زمین و آسمان عاجز تھے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں میں نے حاتم اصمؒ سے پوچھا کہ آپ نماز کس طرح ادا کرتے ہیں۔ فرمایا جب وقت نماز ہو تو ایک ظاہری وضو کرتا ہوں اور دوسرا باطنی۔ ظاہری وضو پانی سے اور باطنی توبہ سے۔ پھر مسجد میں داخل ہوتا ہوں بیت الحرام میرے سامنے ہوتا ہے۔ مقامِ ابراہیم دونوں ابروؤں کے درمیان ہوتا ہے بہشت دائیں، جہنم بائیں۔ صراط تحتِ قدم۔ فرشتۂ موت کو اپنے پیچھے تصوّر کرتا ہوں۔ پھر نہایت تعظیم و احترام کے ساتھ تکبیر پڑھتا ہوں۔ حرمت کے ساتھ قیام۔ خوف کے عالم میں قرأت۔ انکساری کے ساتھ رکوع۔ تضرع کے ساتھ سجود۔ حلم و وقار کے ساتھ جلوس اور شکر کے ساتھ سلام۔

ص ۳۲۹/۲۱۵

توفیق اللہ کی طرف سے ہے اور وہ صحیح جاننے والا ہے۔

فصل

یاد رکھو نماز ایک ایسی عبادت ہے جو ابتدا سے انتہا تک راہِ حق پر اہلِ طلب کی راہنمائی کرتی ہے۔ وہ ہمیشہ اسی میں مشغول رہتے ہیں اور ان کے مقامات اسی میں کشف ہوتے ہیں۔ طالبانِ حق کے لیے طہارت توبہ۔ روبقبلہ ہونا پیر طریقت سے تعلق۔ قیام مجاہدۂ نفس۔ قرأت ذکرِ دوام۔ رکوع تواضع۔ سجود معرفتِ نفس۔ تشہد اُنسِ حق۔ سلام دنیا سے علیحدگی اور مقامات کی قید سے باہر نکلنے کا نام ہے۔ اسی لیے جب پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیوی تعلقات سے منقطع ہوتے۔ کمالِ حیرت کے مقام پر طالبِ دید ہوتے اور صرف ذاتِ حق سے تعلق رہ جاتا تو فرماتے "اے بلال ہمیں نماز سے راحت دے"۔ یعنی نماز کی اذان دے تاکہ نماز ادا کرکے راحتِ قلب حاصل ہو۔

اس امر سے متعلق مشائخ کے مختلف اقوال ہیں اور سب اپنی اپنی جگہ پر قابلِ قدر ہیں۔ مشائخ کی ایک جماعت کہتی ہے کہ نماز درگاہِ حق میں حاضر ہونے کا ذریعہ ہے۔ دوسری جماعت کہتی ہے کہ نماز خود سے غائب ہو جانے کا نام ہے جو لوگ غائب ہوتے ہیں وہ نماز میں حاضر ہوتے ہیں اور جو پہلے ہی حاضر ہوں وہ نماز میں غائب ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ قیامت میں رویتِ باری کے مقام پر۔ جو لوگ رویت سے بہرہ یاب ہوں گے وہ پہلے غائب ہوں گے تو حاضر ہو جائیں گے۔ جو حاضر ہوں گے وہ غائب ہو جائیں گے۔ اور میں (علی بن عثمان الجلابیؒ) کہتا ہوں کہ نماز حکمِ حق ہے۔ نہ حاضری کا سبب ہے نہ غائب ہونے کا ذریعہ۔ حکمِ حق کسی چیز کا آلۂ کار نہیں ہوتا۔ حضور کا سبب عینِ حضور ہے اور اسی طرح غیبت کی علت عینِ غیبت ہے۔ حکمِ حق کسی شکل میں بھی ناقص نہیں ہوتا۔ اگر نماز آلۂ حضور ہوتی تو یقیناً نماز کے سوا کوئی چیز حضورِ حق حاصل نہ کر سکتی اور اسی طرح اگر نماز وجہِ غیبت ہوتی تو "غائب" ترکِ نماز سے بھی حضورِ حق سے بہرہ یاب ہو سکتا ہے۔ جب حاضر اور غائب دونوں میں سے کوئی نماز ادا کرنے سے معذور نہیں ہو سکتا تو نماز بنفسہٖ ایک قوت ہے۔ غیبت اور حضور سے اس کو کوئی تعلق نہیں۔ اہلِ مجاہدہ اور صاحبانِ استقامت نماز میں کثرت کرتے ہیں اور دوسروں کو حکم دیتے ہیں۔ مشائخ اپنے مریدوں کو شبانہ روز چار سو رکعت ادا کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ تاکہ جسم کو عبادت کی عادت ہو جائے۔ اہلِ استقامت بھی بہت نماز ادا کرتے ہیں تاکہ حضورِ حق شکرِ قبولیت ادا کریں۔ باقی رہے "اہلِ احوال"۔ ان کے دو گروہ ہیں۔ ایک وہ لوگ جن کی نماز کمالِ سلوک اور محویت کے سبب "جمع" کے مقام پر ہوتی ہے۔ اور وہ اپنی نماز میں "مجتمع" ہوتے ہیں۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے۔

ص ۳۲۹ / ۱۶ / ۲

جن کی نماز قطع سلوک فقدانِ محوبت کے عالم میں "تفرقہ" کے مقام پر ہوتی ہے۔ وہ اس "تفرقہ" سے دوچار ہوتے ہیں۔ مجتمع لوگ شبانہ روز نماز میں مصروف رہتے ہیں۔ اور فرائض و سنن کے علاوہ نوافل کثرت سے ادا کرتے ہیں۔ اہلِ تفرقہ فرائض و سنن ادا کرتے ہیں۔ نوافل کم پڑھتے ہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "میری آنکھوں کی روشنی نماز میں ہے" یعنی میری جملہ راحت نماز میں ہے۔ اہل استقامت کا طریق نماز میں مشغول رہنا ہے۔

/ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شبِ معراج قربِ حق میں باریاب ہوئے تو آپ بند عالم کون و فساد سے آزاد ہو گئے اور حضورِ حق ایسے مقام پر پہنچ گئے کہ نفس کو دل کا درجہ مل گیا۔ دل کو جان کا۔ جان کو باطن کا اور باطن درجات سے فانی اور مقامات سے محو ہو کر نشان بے نشان ہو گیا۔ آپ عین مشاہدہ میں مشاہدہ سے غائب اور عینِ دید میں دید سے الگ تھے۔ انسانی خواص ختم ہو گئے۔ مادۂ نفسانی بھسم ہو گیا۔ طبعی رجحان نیست و نابود ہو گیا۔ شواہدِ حق اپنی سلطانی میں عیاں ہوئے۔ خود سے بے خود ہو گئے۔ حقیقت حقیقت سے مل گئی۔ مشاہدۂ لم یزلی میں محو ہو گئے۔ کمالِ شوق سے بے اختیار ہو کر عرض کی "بار خدایا! اب مجھے اس مصیبت کدہ میں نہ ڈال اور طبعی ہوا و ہوس کی قید سے آزاد رکھ۔" حکم ہوا "ہمارا حکم یہی ہے کہ آپ دنیا میں قیامِ شریعت کے لیے واپس جائیں جو کچھ ہم نے عالمِ ملکوت میں آپ کو مرحمت کیا ہے وہ دنیا کو عطا کریں۔" چنانچہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا میں تشریف لائے تو جب کبھی دل میں معراج کا شوق ہوا تو آپ نے فرمایا "اے بلال! ہمیں نماز سے راحت دے"۔ ہر نماز آپ کے لیے معراج تھی اور ایک نئے تقرب کا باعث تھی۔ لوگ آپ کو مصروفِ نماز دیکھتے تھے۔ آپ کی جان نماز میں ہوتی تھی۔ دل محوِ نیاز باطن سرگرم راز اور نفس مبتلائے گداز ہوتا تھا حتیٰ کہ نماز آنکھوں کا نور ہو جاتی تھی۔ آپ کا جسم دنیا میں مگر جان عالمِ ملکوت میں ہوتی تھی۔ آپ کا بدن بظاہر انسانوں کی معیت میں ہوتا تھا مگر روح مبارک انس حق کے مقام پر ہوتی تھی۔

/ سھل بن عبداللہؒ نے فرمایا: "صدق کی یہ علامت ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے بندے پر ایک فرشتہ مقرر ہو۔ جب نماز کا وقت آئے وہ اس کو اٹھا دے یا وہ سو رہا ہو تو اس کو جگا دے" یہ چیز سھل بن عبداللہ پر طاری تھی آپ بوڑھے اور معذور ہو چکے تھے مگر ہنگام نماز ٹھیک ہو جاتے تھے اور نماز کے بعد پھر معذور کھڑے رہ جاتے تھے۔ //

ص ۲۳۰ ۔ ۲۱۶ *

* صفحہ ۲۱۶ اصل نسخہ میں دوبارہ آیا ہے ۱۲

مشائخ میں سے ایک بزرگ فرماتے ہیں: "نماز ادا کرنے والا چار چیزوں کا حاجت مند ہوتا ہے۔ فنائے نفس۔ تحلیلِ طبع۔ صفائی باطن اور کمالِ مشاہدہ"۔ نماز فنائے نفس کے بغیر بے کار ہے اور یہ چیز جمع ہمت سے حاصل ہوتی ہے۔ جمع ہمت ہو تو غلبۂ نفس ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ نفس کی بنیاد تفرقہ پر ہے۔ اور تفرقہ جمع اور مشاہدہ حق کی تاب نہیں لا سکتا تحلیلِ طبع کے لیے اثباتِ جلال حق تعالیٰ ضروری ہے۔ کیونکہ جلالِ حق زوالِ غیر کا باعث ہوتا ہے۔ صفائی باطن محبتِ حق تعالیٰ سے حاصل ہوتی ہے اور کمالِ مشاہدہ بجز بہ صفائی باطن نصیب نہیں ہوتا۔

سنا ہے کہ حسین بن منصورؒ شب و روز چار سو رکعت نماز ادا کرتے تھے۔ لوگوں نے پوچھا آپ کا مقام اتنا بلند ہے آپ کیوں اس قدر مشقت اٹھاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: "یہ مشقت و راحت تم لوگوں کے لیے ہے۔ سالکانِ حق فانی الصفت ہوتے ہیں نہ وہ مشقت محسوس کرتے ہیں نہ راحت۔ خبردار کہیں کاہل کو حق رسیدہ اور حریص کو طالب حق نہ کہہ دینا"

ایک شخص نے بیان کیا کہ میں حضرت ذوالنونؒ کے پیچھے نماز ادا کر رہا تھا۔ ہنگامِ تکبیر جب آپ نے "اللہ اکبر" کہا تو بے ہوش ہو کر گر گئے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ روح جسم سے پرواز کر گئی ہے اور بدن میں کوئی حس باقی نہیں رہی۔

حضرت جنیدؒ عالمِ پیری میں جوانی کے تمام اوراد و وظائف دہرایا کرتے تھے۔ کسی نے کہا اب آپ ضعیف ہو گئے ہیں۔ ان اوراد کو مختصر کر لیجیے۔ آپ نے فرمایا "ابتدائے سلوک میں سب کچھ انہیں اوراد کی بدولت پایا یا محال ہے کہ انتہائے سلوک میں ان سے دست بردار ہو جاؤں"۔

فرشتے ہمیشہ عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔ عبادت ہی ان کا کھانا پینا ہے اور عبادت ہی ان کی غذا ہے کیونکہ وہ روحانی ہیں۔ نفس سے بری ہوتے ہیں۔ نفس امارہ ہی طاعت میں سدِّ راہ ہوتا ہے جتنا نفسِ امّارہ کو زیر کیا جائے اتنا ہی طاعت کا مرحلہ آسان ہو جاتا ہے۔ نفس فنا ہو جائے تو فرشتوں کی طرح عبادت ہی شرب اور عبادت ہی غذا ہو جاتی ہے۔

ص ۲۳۲/۱۸

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے فرمایا کہ میں نے لڑکپن میں ایک عبادت گزار عورت کو دیکھا۔ وہ نماز میں تھی کہ بچھو نے اسے چالیس مرتبہ کاٹا مگر اس پر کسی قسم کا تغیر رونما نہ ہوا۔ وہ نماز سے فارغ ہوئی تو میں نے پوچھا "مادرِ من! تو نے اس بچھو کو کیوں نہ ہٹایا"۔ عابدہ نے جواب دیا۔ "بیٹا تو نہیں سمجھتا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ حق تعالیٰ کا کام کرتے ہوئے میں اپنے کام کی طرف رجوع کر لیتی"۔

ابو الخیر اقطعؒ کے پاؤں میں آکلہ کی بیماری تھی۔ اطبا نے پاؤں کاٹ دینے کا فیصلہ کیا مگر آپ راضی نہ ہوئے۔ مریدوں

نے مشورہ کیا کہ دورانِ نماز پاؤں کاٹ دیا جائے کیوں کہ نماز میں ان کو اپنی بھی خبر نہیں ہوتی۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو پاؤں کٹا ہوا تھا۔ "

صحابہؓ کے بیان میں ذکر ہو چکا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضہ رات کے وقت قرآن آہستہ آواز سے پڑھتے اور حضرت عمرؓ بلند آواز سے۔ پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ سے پوچھا تو انہوں نے کہا میں حسنِ قرأت سے رازونیاز کی بات کرتا ہوں۔ سننے والا سنتا ہے خواہ آہستہ پڑھوں خواہ بلند آواز سے۔ اس کے بعد حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے دریافت فرمایا تو انھوں نے عرض کی کہ میں سونے والے کو جگاتا ہوں اور شیطان کو بھگاتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ابوبکرؓ تم ذرا بلند آواز سے پڑھا کرو۔ عمرؓ تم ذرا آہستہ پڑھا کرو تاکہ عادت بدل جائے۔

ص ۳۳۳/۲۱۹

صوفیاء کبار میں سے کچھ لوگ فرائض تو ظاہر طور پر ادا کرتے ہیں مگر نوافل مخفی طور پر۔ غرض یہ ہوتی ہے کہ ریا کا شائبہ نہ رہے۔ اعمال میں نمائش کا پہلو ہو اور خلقت کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کی آرزو ہو تو ریاکاری ہے۔ چاہے یہ کہا جائے کہ ہم تو عبادت کر رہے ہیں ہم یہ نہیں دیکھتے کہ لوگ دیکھ رہے ہیں۔ یہ بھی ریا ہے۔ کچھ اور لوگ فرائض اور نوافل آشکارا ادا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ریا ایک باطل چیز ہے اور عبادت طاعت حق ہے یہ غلط ہے کہ باطل کے لیے حق کو چھپایا جائے۔ ریا دل سے نکلنی چاہیئے عبادت کہیں بھی ہو سکتی ہے۔

مشائخ کبار آدابِ عبادت کو ہمیشہ مدنظر رکھتے ہیں اور اس کے لیے مریدوں پر زور دیتے ہیں۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں میں نے چالیس برس سفر کیا مگر کوئی نماز بغیر جماعت کے نہیں ادا کی۔ ہر جمعہ کے دن میں کسی نہ کسی قصبہ میں ہوتا تھا۔

نماز کے احکام معرضِ حصر میں نہیں آسکتے۔ مقامات سے جس چیز کا تعلق نماز سے ہے وہ محبّتِ حق ہے۔ اب محبّت کے احکام بیان ہوں گے انشاء اللہ۔

۱۶
سولھواں باب

محبّت اور محبت سے متعلقہ امور

حق تعالیٰ نے فرمایا: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ۔ "اے ایمان والو! تم میں سے جو شخص مرتد ہو جائے قریب ہے اللہ تعالیٰ ایک ایسی قوم پیدا کرے جس کا وہ دوست ہو اور وہ اس کی دوست ہو۔" نیز فرمایا: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَنْدَادًا یُّحِبُّوْنَھُمْ کَحُبِّ اللّٰہِ۔ "بعض انسان ایسے ہیں کہ اللہ کے سوا معبود بنا لیتے ہیں اور ان سے اس طرح محبت کرتے ہیں جیسے اللہ سے کرنی چاہیئے۔ اہلِ ایمان اللہ سے شدّت کے ساتھ محبّت کرتے ہیں۔" پیغمبر صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے جبریل علیہ السلام سے سنا کہ خدائے عزوجل نے فرمایا: من اھان لی ولیاً فقد بارزنی بالمحاربۃ وماترددتُ فی شیءٍ کترددی فی قبض نفس عبدی المؤمن یکرہ الموت واکرہ مسائتہ ولابدلہ منہ وما تقرب الیّ عبدی بشیءٍ احبّ الیّ من اداء ما افترضت علیہ ولا یزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتّٰی احبہ فاذا احببت کنت لہ سمعا وبصرا ویدا ومویّدا (الحدیث) "جس نے میرے دوست کی اہانت کی اس نے میرے ساتھ لڑائی کی۔ مجھے ایک صاحبِ ایمان کی روح قبض کرنے میں سب سے زیادہ تردّد ہوتا ہے کیونکہ وہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور میں اسے ایذا دینا پسند نہیں کرتا حالانکہ موت اس کے لیے لابدی ہے۔ ادائے فرض سے کوئی چیز زیادہ عزیز نہیں جو میرے قرب کا باعث ہو۔ میرا بندہ ہمیشہ نوافل ادا کرکے میرا قرب حاصل کرتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب یہ عالم ہو تو میں اس کا کان، اس کی آنکھ، اس کا پاؤں اور اس کی زبان ہو جاتا ہوں۔" اور نیز فرمایا: من احبّ لقاء اللہ احبّ اللہ لقاءہ ومن کرہ لقاء اللہ کرہ اللہ لقاءہ "جسے اللہ سے ملنے کی خواہش ہو اللہ اس کو ملنا چاہتا ہے اور جسے اللہ کو ملنا ناپسند ہو اللہ اس سے ملنا پسند نہیں کرتا۔" پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: اذا احبّ اللہ العبد قال

ص ۳۳۴/۴۲۰

لجبرئیل یا جبرئیل انی احب فلانا فاحبہ فیحبہ جبرئیل ثم یقول جبرئیل لاھل السماء ان اللہ قد احب فلانا فاحبوہ فیحبہ اھل السماء ثم یصنع لہ القبول فی الارض فیحبہ اھل الارض وفی البغض مثل ذلک۔" جب حق تعالیٰ کسی کو دوست رکھتا ہے تو جبرئیل علیہ السلام سے فرماتا ہے میں فلاں شخص کو دوست رکھتا ہوں تو بھی اس کو دوست رکھ جبرائیل اس کو دوست رکھتا ہے۔ اور اہل آسمان سے کہتا ہے فلاں شخص اللہ کا دوست ہے تم بھی اسے دوست بناؤ۔ اہلِ آسمان اسے دوست بنالیتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ اس بندہ کو اہلِ زمین میں مقبولیت عطا کرتا ہے۔ اہلِ زمین بھی اسے محبت کرتے ہیں۔ بغض اللہ کی مثال بھی یونہی سمجھنی چاہیئے۔

حق تعالیٰ کی محبت بندہ کے لیے اور بندہ کی حق تعالیٰ کے لیے درست ہے۔ کتاب اور سنت اس پر ناطق و شاہد ہیں اور ساری امت کا اس پر اتفاق ہے۔ حق تعالیٰ کی ذاتِ پاک میں ایسے اوصاف ہیں کہ اولیاء اس کو دوست رکھتے ہیں۔ اور وہ اولیاء کو۔

لغت کے لحاظ سے کہتے ہیں کہ لفظ "حُبّ" "حِبّہ" (حا کی زیر) سے ماخوذ ہے۔ حِبّہ اس بیج کے دانہ کو کہتے ہیں جو صحرا میں پڑا ہو۔ لوگوں نے محبّت کے لیے لفظ حُبّ وضع کر لیا۔ صحرا میں گرے ہوئے بیج میں اصلِ حیات موجود ہوتا ہے دیگر نباتات کے بیجوں کی طرح وہ صحرا میں مٹی میں دفن ہوتا ہے۔ بارش ہوتی ہے۔ آفتاب چمکتا ہے۔ سردی اور گرمی ہوتی ہے مگر وہ تمام تغیرات سے بے نیاز رہتا ہے۔ جب اس کا وقت آتا ہے تو وہ پھوٹ پڑتا ہے اور پھولتا پھلتا ہے۔ اسی طرح محبّت دل میں جاگزیں ہوتی ہے۔ حضور، غیب، بلا، محنت، راحت، لذت، فراق، وصال وہ کسی چیز سے متغیر نہیں ہوتی۔ اس مفہوم کو کسی شاعر نے یوں ادا کیا ہے۔ شعر

"اے کہ تیری چشم بیمار عاشق کی بیماریوں کا علاج ہے۔ تو نے دل میں محبت کا بیج بو دیا۔ تیرا حضور و غیب میرے لیے برابر ہے۔"

یہ بھی کہتے ہیں کہ لفظ حُبّ (محبّت) "حُبّ" سے ماخوذ ہے جس کے معنی گڑھا ہے جس میں پانی بہت ہو۔ پانی نظر کی راہ میں حائل ہو اور آنکھ اس میں دیکھ نہ سکتی ہو۔ اسی طرح جب محبّت دل میں جاگزیں ہو کر دل کو لبریز کر دیتی ہے تو اس میں بجز محبوب کسی چیز کے لیے جگہ نہیں رہتی۔ جب حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ کو اپنی محبت کی خلعت سے سرفراز فرمایا تو وہ محض طاعتِ حق کے لیے دنیا سے الگ ہو گئے۔ اور سب اہلِ عالم ان کے سامنے ایک پردۂ حائل کی شکل ہو کر رہ گئے۔ آپ اس پردۂ حائل سے بیزار تھے۔ حق تعالیٰ نے ان کے حال اور ان کے مقام کو یوں بیان فرمایا: فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْ اِلَّا رَبَّ

ص ۳۳۵ / ۴۲۱

العالمین" بلاشبہ حق تعالیٰ کے سوا سب میرے دشمن ہیں۔" اور اس موضوع پر شبلیؒ فرماتے ہیں۔ "محبت کا نام اس لیے محبت ہے کہ وہ دل سے محبوب کے سوا ہر چیز کو مٹا دیتی ہے۔"

بعض کہتے ہیں کہ حُب دراصل وہ چار چوبہ ہے جس پر پانی کا برتن رکھا جاتا ہے۔ محبتِ حق کو حُب اس لیے کہتے ہیں کہ جو کچھ بھی من اللہ ہو یعنی عزت، ذلت، راحت، تکلیف، آفت، آسائش، وفا اور جفا سب بطیب خاطر برداشت کرنا ہوتا ہے اور کسی حالت میں بھی کوئی چیز گراں نہیں گزرتی۔ کیونکہ محبت کا مقصود ہی یہ ہے جیسے کہ وہ چار چوبہ جو پانی کے برتن کا بوجھ برداشت کرتا ہے۔ محبت کی تکلیف اور خلقت ہی دوست کا بوجھ اٹھانے کے لیے ہے۔ اس مضمون پر ایک شاعر کہتا ہے۔ شعر

"تو کچھ مرحمت فرمایا اپنا ہاتھ روک لے۔ دونوں چیزیں تیرے کرم میں شامل ہیں۔"

بعض کا خیال ہے کہ لفظ حُبّ سے ماخوذ ہے اور یہ حبّہ کی جمع ہے جس کا مطلب حبّہ، دل یا دل کا سیاہ نقطہ ہے۔ دل ایک لطیف مقام ہے۔ اس کا طبعی نظام ہی لطافت ہے۔ محبت بھی اسی سے اقامت پذیر ہوتی ہے۔ محبت کو اس کے محل کا نام دے دیا گیا کیونکہ اس کا قیام سویدائے دل میں ہوتا ہے۔ اہلِ عرب اکثر اشیاء کو اس کے محل اور مقام کے نام سے موسوم کر لیا کرتے ہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں محبت مشتق ہے حباب الماء (پانی کا بلبلا) سے کہ شدید بارش کے جوش میں نمودار ہوتا ہے۔ محبت کا نام حبّ کر دیا کیونکہ وہ دل کا جوش ہوتا ہے دوست کے اشتیاقِ دید میں۔" اہل محبت کا دل ہمیشہ شوقِ دید میں بے قرار و مضطرب رہا کرتا ہے۔ جسم روح کے لیے بے قرار ہوتا ہے اور اس کا قیام ہی روح پر منحصر ہے۔ اسی طرح دل محبت پر قائم ہے اور محبت کا قیام محبوب کی دید اور ملاقات پر موقوف ہے۔ اسی مضمون پر ایک شاعر کہتا ہے۔ شعر

ص ۲۳۶ / ۴۲۲

"جب دنیا راحت و سکون کی تلاش میں ہوتی ہے تو میری تمنا ہوتی ہے کہ میں تجھے ملوں تاکہ تجھے میرے حال کی خبر ہو جائے۔"

بعض لوگ کہتے ہیں کہ لفظ حُبّ ایک اسم ہے جو صفائے محبت کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ عرب آنکھ کی پتلی کے تل کو "حبۃ الانسان" کہتے ہیں۔ اور اسی طرح سویدائے قلب کو "حبۃ القلب" کا نام دیتے ہیں۔ سویدائے دل محبت کا مقام ہے اور آنکھ کی پتلی دید کا محل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دل اور آنکھ محبت میں برابر کے شریک ہیں۔ اسی موضوع

پر کوئی شاعر کہتا ہے۔ شعر

"دل کو آنکھ سے یہ خواہش ہے کہ وہ لذتِ دید سے بہرہ ور رہے۔ آنکھ دل سے کھٹکتی ہے کہ وہ تصورِ محبوب سے بہرہ مند ہے۔"

فصل

واضح ہو کہ لفظِ محبّت کو علما کئی طریق پر استعمال کرتے ہیں۔ نفس کی بے قراری۔ رغبت۔ خواہش، دلی آرزو اور اُنس کے ساتھ ارادت کو بھی محبّت کا نام دیتے ہیں۔ مگر ان جملہ چیزوں کو حق تعالیٰ سے کوئی نسبت نہیں یہ سب کچھ مخلوقات اور موجودات سے تعلق رکھتی ہیں۔ باری تعالیٰ کی ذاتِ مقدس بے نیاز و بالاتر ہے۔

دوسرے یہ لفظ احسان کے معنیٰ میں مستعمل ہے یعنی جہاں بندہ عنایاتِ حق سے مخصوص ہو کر برگزیدگی کا مقام حاصل کر لیتا ہے اسے درجۂ کمال عطا ہوتا ہے اور نوازشاتِ باری سے بہرہ ور ہوتا ہے۔

تیسرے معنیٰ ثنائے جمیل کے ہیں۔ اہلِ کلام کی ایک جماعت کہتی ہے کہ محبت حق تعالیٰ ہمارے لیے سماعت ہونے والی صفات میں سے ایک ہے۔ چہرہ، ہاتھ اور استوار (بیٹھنے کی صفت) عقلاً حق تعالیٰ کے لیے محال چیزیں تھیں اگر کتاب اور سنت میں ان کا بیان نہ ہوتا یہی وجہ ہے کہ ہم حق تعالیٰ کی محبّت کا اثبات تو کرتے ہیں اور اس میں مبتلا ہوتے ہیں مگر اس کے تصرف میں ہمیں توقف ہوتا ہے۔ ص ۳۳۷/۴۲۲

اہلِ طریقت جب لفظِ محبّت حق تعالےٰ کے لیے استعمال کرتے ہیں تو ان کی مراد یہ اقوال نہیں ہوتے جو اوپر بیان ہوئے میں اس کی حقیقت بیان کرتا ہوں۔ انشاء اللہ العزیز۔

معلوم ہونا چاہیئے کہ حق تعالیٰ کی محبت انسان کے لیے اس کی بھلائی کا ارادہ اور اس پر رحمت کرنے کو کہتے ہیں۔ محبت ارادہ سے متعلق اسمائے حق میں سے ایک اسم ہے جیسے رضا، سخط، رحمت، رافت وغیرہ۔ ان چیزوں کو صرف ارادۂ حق پر محمول کیا جا سکتا ہے اور ارادہ حق تعالیٰ کی صفتِ قدیم ہے جس سے اس کے افعال ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ مبالغہ اور اظہارِ افعال سے متعلق ان میں سے بعض صفات دوسری صفات سے زیادہ مخصوص ہیں۔ حاصل کلام حق تعالیٰ محبت سے بندہ کے لیے زیادتی نعمت کرتا ہے۔ دنیا و عقبیٰ کا ثواب عطا کرتا ہے۔ عذاب سے محفوظ فرماتا ہے۔ گناہ سے بچاتا ہے۔ بلند احوال و مقامات سے نوازتا ہے۔ باطن کو تصورِ غیر سے پاک کرتا ہے۔ اور اپنے ازلی لطف و کرم سے بہرہ ور کرتا ہے۔

تاکہ وہ سب سے کٹ کر صرف اس کی رضا کے لیے منفرد ہو جائے۔ جب باری تعالیٰ کسی کو اس طرح مخصوص فرماتا ہے تو اس تخصیص کو محبت کہتے ہیں۔ یہ حارث محاسبیؒ، جنیدؒ اور مشائخ کی ایک کثیر جماعت کا مذہب ہے۔ مختلف فریقوں کے فقہا اور بیشتر متکلمین اہل سنت کا بھی یہی مسلک ہے۔

ص ۳۳۸/۴۲۴

اگر یہ کہا جائے کہ محبتِ حق بندہ کے لیے ثنائے جمیل ہے تو لامحالہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ ثنا اللہ ہی کا کلام ہے حالانکہ اس کا کلام نامخلوق ہے (قدیم ہے) اور انسان (حادث ہے) اگر یہ کہیں کہ محبتِ حق بمعنی احسانِ حق ہے تو یقیناً احسان اس کا اپنا فعل ہے۔ یہ سب اقوال معنوی طور پر ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں۔

بندے کی محبت حق تعالیٰ کے لیے ایک صفت ہے جو فرمانبردار صاحبِ ایمان کے دل میں تعظیماً تکبیراً اور تکریماً پیدا ہوتی ہے تاکہ وہ محبوبِ حق کی رضا جوئی کرے۔ اس کے دیدار کی طلب میں بے قرار ہو۔ سوا اس کے کسی چیز سے اسے راحت نہ ہو۔ اس کے ذکر کی عادت ہو۔ غیر اللہ کے ذکر سے بیزار ہو۔ آرام اس کے لیے محال ہو۔ راحت اس سے دور ہو۔ دنیا کی مطلوب و مرغوب چیزوں سے الگ ہو۔ نفسانی خواہشات سے روگرداں ہو۔ سلطان محبت کے سامنے سرنگوں ہو۔ اس کے سامنے سرخمیدہ ہو اور اسی کی ذاتِ پاک کو کمالِ صفات کے ساتھ پہچانے۔ یہ روا نہیں کہ محبتِ حق ایسی ہو جیسے خلق کو ایک دوسرے کے ساتھ ہوتی ہے۔ مخلوق کی باہمی محبت محبوب کو گھیر لینے اور اسے حاصل کر لینے کی تمنا ہوتی ہے۔ یہ جسمانی محبت ہے۔ حق تعالیٰ کے دوست اس کے قرب میں جان دینے والے ہوتے ہیں۔ اس کی کیفیت کے طالب نہیں۔ طالب دوست معرضِ دوستی میں بذاتِ خود قائم ہوتا ہے اور طالب ہلاکت بنامِ دوست قائم ہوتا ہے۔ محبانِ حق میں دوستی کے بلند ترین مقام پر وہی لوگ ہوتے ہیں جو جان نثار ہوں اور مقہور ہوں۔ اس لیے کہ محدث (مخلوق) کی وابستگی قدیم (خالق) کے ساتھ اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک قدیم (خالق) اپنے قہر کے ذریعے (بندے کے دل سے تمام خواہشات نکال کر) اپنی ذات میں فنا نہ کر لے۔ جو حقیقت محبت سے آشنا ہو اس کے دل میں کوئی ابہام نہیں۔ یعنی محبت کی دو شکلیں ہیں (۱) جنس کی جنس کے ساتھ محبت یہ نفس کا میلان اور اس کی جستجو ہے محبوب کے جسم کو چھونا اور ذوقِ تسکین کے لیے چمٹ جانا اور (۲) محبت بغیر جنس سے اس محبت کا تقاضا ہوتا ہے کہ محبوب کی کسی صفت کو اپنا لیا جائے مثلاً بے لفظ و کلام سننا یا بغیر آنکھ دیکھنا۔

ص ۳۳۹/۴۲۵

عاشقانِ حق دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو وہ ہوئے جو حق تعالیٰ کے انعامات و احسانات دیکھ کر اپنے منعم اور محسن کی محبت کا دامن تھام لیتے ہیں۔ دوسرے وہ جو جملہ انعامات کو غلبۂ دوستی کے عالم میں حجاب سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ وہ انعامات سے منعم کی طرف رجوع کرتے ہیں پہلے گروہ سے دوسرے گروہ کا مسلک بلند تر ہے۔ واللہ اعلم

فصل

الغرض محبت ایک معروف لفظ ہے جو سب اقوام اور سب زبانوں میں موجود ہے۔ دانش وروں کی کوئی بھی جماعت اسے چھپا نہیں سکتی۔ مشائخ طریقت میں حضرت سمنون المحب رح محبتِ حق کے بارے میں ایک خاص مسلک رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں محبت راہِ حق کی اصل اور بنیاد ہے۔ احوال و مقامات کی حیثیت منازل کی ہے۔ ہر منزل زوال پذیر ہوتی ہے سوائے محبتِ حق کے۔ محبت پر کوئی زوال نہیں آتا۔ باقی مشائخ بھی اس پر متفق ہیں۔ مگر محبت کو ایک عام اور صاف لفظ سمجھتے ہوئے انہوں نے اسے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ معنوی حیثیت کو بدلے بغیر انہوں نے محبت کا نام "صفوت" رکھ دیا اور محبِ حق کو صوفی کہنے لگے۔ ایک دوسرے گروہ نے اختیارِ حبیب کے اثبات اور اختیارِ محب کے ترک کو "فقر" اور محب کو "فقیر" کا نام دیا۔ کیونکہ محبت کا ادنیٰ درجہ ہر عالم میں موافقتِ حبیب ہے اور موافقت بہر صورت مخالفت سے الگ ہوتی ہے۔ میں نے کتاب کے شروع میں فقر اور صفوت کا حال کھول کر بیان کیا ہے۔ اس موضوع پر اس شیخ بزرگ نے کہا ہے "محبت زاہدوں کے نزدیک اجتہاد نیکی کی کوشش سے زیادہ نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ اہلِ توبہ کیلئے محبت نالہ و فریاد سے سہل تر ہے۔ اسپ سواروں کو شکار بند سے زیادہ کار آمد ہے۔ ترکوں کے لیے سواری سے زیادہ اہم ہے۔ اہلِ ہنود کے لیے محبت کی غلامی محمود کی غلامی سے بہتر ہے۔ اہلِ روم میں محبت اور محبوب کی داستان صلیب سے مشہور تر ہے۔ عرب میں محبت کی حکایات ادب کا ایک جزو ہیں۔ جو زندگی کے ہر پہلو خوشی، ہلاکت، کامرانی، حزن اور جنگ وغیرہ پر محیط ہے۔" مقصد یہ ہے کہ انسانی معاشرے میں کوئی بھی ایسا نہیں جسے عالمِ غیب سے یہ جوہر عطا نہ ہوا ہو جسے دل میں محبت کا حوصلہ یا فرحت نہ ہو۔ جو بادہ محبت میں سرشار نہ ہو یا اس کے قہر کا خمار نہ رکھتا ہو۔ دل طبعی طور پر بے قرار و مضطرب ہے۔ محبت کے سامنے تمام سمندروں کی حیثیت سراب سے زیادہ نہیں۔ محبت غذا ہے جس پر انسان کی زندگی منحصر ہے۔ محبت سے خالی دل بے کار ہے۔ کوشش سے نہ محبت حاصل کی جا سکتی ہے اور نہ اس کو دفع کیا جا سکتا ہے۔ نفس ان لطائف سے آگاہ نہیں جو دل میں رونما ہوتے ہیں۔

ص ۳۳۹/۴۲۶

حضرت عمر بن عثمان مکی رح اپنی کتاب "محبت" میں فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے دلوں کو اجسام سے سات ہزار برس پہلے پیدا کیا اور مقامِ قرب میں رکھا۔ روحوں کو دلوں سے سات ہزار برس قبل پیدا کیا اور اُنس کے مقام پر رکھا۔ باطن کو روحوں سے سات ہزار برس پیشتر پیدا کیا اور مقامِ وصل میں رکھا۔ ہر روز ۳۶۰ بار اپنے جمالِ ظاہر

ص ۳۴۰/۴۲۷

سے باطن پر تجلّی فرمائی اور تین سو ساٹھ بار عنایت فرمائی اور روحوں کو کلمۂ محبت سنایا اور تین سو ساٹھ لطائف سے دلوں کو نوازا۔ سب نے عالمِ کائنات پر نظر کی تو اپنے سے بڑھ کر کسی کو نہ پایا۔ غرور و تفاخر رونما ہوا۔ حق تعالیٰ نے اسی واسطے انہیں آزمائش میں ڈال دیا۔ باطن کو جان میں، جان کو دل میں اور دل کو جسم میں مقید کر دیا۔ پھر عقل کو ان میں سمو دیا۔ انبیاء علیہم السلام کے ذریعے احکام دیئے اور اس طرح سب اپنے اپنے مقام کے جویا ہوئے۔ نماز کا حکم ہوا تو جسم نماز میں مشغول ہو گیا۔ دل محبت سے سرشار ہو گیا۔ جان کو قربِ حق کی تلاش ہوئی۔ اور باطن وصلِ حق میں تسکین کا طالب ہوا۔ المختصر محبت کا مضمون لطیف لفظ و بیان میں نہیں سما سکتا۔ محبت حال ہے اور حال، قال کے دائرۂ امکان سے باہر ہوتا ہے۔ اگر سب کائنات چاہے کہ محبت بزور پیدا ہو جائے تو نہیں ہو سکتی اگر کوئی اسے بزور دور کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔ محبت انعامِ خداوندی ہے۔ اکتساباً حاصل نہیں ہو سکتی۔ سب اہلِ عالم طالبِ محبت کے لیے زبردستی محبت پیدا نہیں کر سکتے اور اہلِ محبت سے زبردستی محبت چھین نہیں سکتے۔ محبت عطیۂ حق ہے۔ انسان کھیل تماشے میں بہل جانے والا ہے۔ محبت انوارِ الٰہی کا مرقع ہے۔ کھیل تماشے کے ذریعے انوارِ الٰہی سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتے۔

فصل

عشق کے بارے میں مشائخ طریقت کے بہت سے اقوال ہیں۔ ایک جماعت خدا کے لیے بندے کی محبت کو جائز سمجھتی ہے۔ مگر خدا کی محبت بندے کے لیے روا نہیں سمجھتی۔ ان کے خیال میں عشق محبوب سے رکاوٹ کی صفت ہے بندہ کو حق تعالیٰ سے ملنے میں رکاوٹ ہو سکتی ہے۔ حق تعالیٰ کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں۔ اس لیے بندہ حق تعالیٰ سے عشق کر سکتا ہے حق تعالیٰ بندہ سے عشق نہیں کرتا۔

دوسری جماعت کا خیال ہے کہ بندہ سے بھی حق تعالےٰ کا عشق روا نہیں کیونکہ دراصل عشق حد سے متجاوز ہونے کا نام ہے اور حق تعالیٰ کی کوئی حد نہیں۔

ص ۳۴۱/۴۲۸

متاخرین کا خیال ہے کہ عشق دونوں عالم میں صرف اسی کے لیے روا ہو سکتا ہے جو ذاتِ حق کے ادراک کا طلب گار ہو۔ ادراک ذاتِ حق دائرۂ امکان سے باہر ہے۔ اس لیے ذاتِ حق سے محبت و اخلاص ممکن ہے عشق روا نہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ عشق کا انحصار دید پر ہے۔ محبت صرف سننے سے بھی ہو سکتی ہے۔ چونکہ عشق کا تعلق نظر سے ہے اس لیے ذاتِ حق سے عشق نہیں ہو سکتا۔ اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ اس کے متعلق صرف سنا ہے اس لیے سب نے دعویٰ کر دیا۔ کیونکہ سب کو

اذنِ گفت گو ہے۔ ذاتِ حق محسوس نہیں ہوسکتی اور احاطہ ادراک سے باہر ہے اس لیے عشق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ حق تعالےٰ اپنے افعال اور صفات سے اپنے اولیاء پر احسان اور رحمت کرتا ہے۔ اس کی صفات سے محبت درست ہے۔ جب حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام کی محبت میں فراق کے کرب میں مبتلا تھے۔ تو پیراہنِ یوسف کی خوشبو سے آپ کی آنکھوں کا نور واپس آگیا۔ زلیخا عشقِ یوسف میں فنا تھی جب تک دولتِ وصال میسر نہ آئی اس کی آنکھیں روشن نہ ہوئیں۔ یہ طرفہ طریق ہے ایک ہوا و ہوس میں مبتلا ہے دوسرا دست بردار۔

یہ بھی کہتے ہیں کہ ذاتِ حق میں کوئی تناقص نہیں اور عشق بھی تناقص سے معرا ہوتا ہے۔ اس لیے عشق ذاتِ حق کے لیے روا ہونا چاہیئے۔

اس سلسلے میں بہت سی لطیف باتیں ہیں مگر بخوفِ طوالت اتنے ہی بیان پر اکتفا کرتا ہوں۔ واللہ اعلم۔

فصل

حقیقتِ محبت سے متعلق مشائخ کبار کے بیان کردہ رموز اتنے ہیں کہ معرضِ بیان میں نہیں آسکتے۔ میں ان کے اقوال میں سے چند ٹکڑے بیان کرتا ہوں تاکہ حق تعالیٰ کو منظور ہو تو یہ چیز باعثِ برکت ہو۔

ص ۳۴۲/۲۲۹

استاد ابو القاسم قشیریؒ فرماتے ہیں: "محبت، محبت کرنے والے کی صفات کا محو ہونا اور محبوب کی ذات کا ثابت ہونا ہے۔" یعنی محبت یہ ہے کہ محبّ اپنے تمام اوصاف کو طلبِ محبوب میں اس کی اثباتِ ذات کے لیے نفی کر دے۔ محبوب باقی ہے اور محبت کرنے والا فانی۔ ضروری ہے کہ محبت کرنے والا بپاس غیرتِ دوستی اپنی نفی سے بقائے محبوب کو ثابت کرے تاکہ اسے مکمل ولایت حاصل ہو۔ ذاتِ محبوب کا اثبات محبت کرنے والے کی صفات کے فنا ہونے سے وابستہ ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ محبت کرنے والا اپنی صفات میں قائم رہے کیونکہ اگر وہ اپنی صفات پر قائم ہے تو گویا جمالِ محبوب سے بے نیاز ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کی زندگی جمالِ محبوب ہے اس واسطے وہ اپنی صفات کی نفی کا طالب ہوتا ہے کیونکہ اپنی صفات کی موجودگی میں وہ محبوب سے محجوب ہوتا ہے۔ پس محبتِ حق میں وہ اپنا دشمن ہوتا ہے۔ جب حسین بن منصور کو دار پر لٹکایا گیا تو آخری الفاظ یہ تھے: "صاحبِ حال کی محبت یہ ہے کہ اللہ کو واحد کہے۔" محبت کرنے والے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ محبت کے راستے میں مٹ جائے۔ اور وہ اپنے حال میں نفس کے طغیان سے محفوظ ہو جائے (نفس کا غلبہ تباہ ہو جائے)

حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں: "محبت یہ ہے کہ اپنے بہت کو تھوڑا اور حبیب کے تھوڑے کو بہت سمجھا

جائے"۔ یہی معاملہ حق تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ دنیا کی نعمتوں کو اس نے تھوڑا کہا ہے چنانچہ فرمایا: قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ "اے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان سے کہو دنیا کا مال و متاع قلیل ہے"۔ پھر تھوڑی عمر، تھوڑی جگہ اور تھوڑے سامان کے ہوتے ہوئے بندوں کے ذکر کرنے کو کثیر کہا۔ چنانچہ فرمایا: وَالذَّاكِرِينَ اللّٰهَ كَثِيرًا وَّالذَّاكِرَاتِ "اور اللہ تعالیٰ کو بہت یاد کرنے والے مرد اور عورتیں"۔ تاکہ لوگ جان لیں کہ دوست درحقیقت وہی ہے۔ یہ صفت خلقت کے لیے روا نہیں۔ حق تعالیٰ سے جو کچھ پہنچتا ہے اس میں کوئی چیز تھوڑی نہیں۔ انسان کی طرف سے جو کچھ بھی ہے وہ تھوڑا ہے۔

ص ۳۴۳/۴۳۰

شیخ ابو سہل بن عبداللہ التستری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: محبّت یہ ہے کہ تو محبوب کی طاعت سے ہمکنار رہے اور مخالفت سے اعراض کرے"۔ جب دل میں محبت قوی ہو تو طاعتِ دوست سہل ہو جاتی ہے۔ یہ ملحدین کی اس جماعت کی تردید ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ محبت میں بندہ ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں طاعت کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ سراسر الحاد ہے۔ کیونکہ اگر عقل صحیح کام کر رہی ہے تو شرعی تکلیف ساقط نہیں ہوتی۔ تمام امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت کبھی منسوخ نہیں ہو سکتی۔ اگر عقل و صحت کے ہوتے ہوئے کسی ایک شخص پر ساقط سمجھی جائے تو سب کے لیے یکساں طور پر ساقط ہو سکتی ہے۔ یہ بالکل زندقہ ہے۔ البتہ فاتر العقل اور دیوانے کی دوسری بات ہے اور اس کے لیے عذر بھی موجود ہے۔ یہ روا کہ حق تعالیٰ کسی بندے کو دوستی کا وہ مقام عطا کرے جہاں طاعت کی تکلیف کا احساس ختم ہو جائے۔ کسی بات کی تکلیف بمقدار محبت ہوتی ہے محبت جتنی قوی ہو گی۔ طاعت کی تکلیف کو برداشت کرنا اتنا ہی سہل ہو گا یہ بات پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احوال سے ظاہر ہے جب حق تعالیٰ نے ان کی قسم کھائی "لعمرك" تو آپ نے اتنی عبادت کی کہ پائے مبارک پر ورم آ گیا۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا: طٰهٰ مَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰى "ہم نے قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ آپ ناقابلِ برداشت تکلیف اٹھائیں"۔ یہ بھی روا کہ فرمانِ حق ادا کرنے کی حالت میں ادا کرنے کا تصوّر محو ہو جائے۔ چنانچہ پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: انه ليغان على قلبى وانى لاستغفر الله فى كل يوم سبعين مرّة "میرے دل پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے اور میں ہر روز ستّر بار استغفار کرتا ہوں"۔ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر اپنے فعل اور اپنی ذات پر نہیں تھی یعنی پندارِ طاعت سے بری تھے۔ ہمیشہ احکامِ خداوندی کی تعظیم پیشِ نظر تھی اور یوں فرماتے تھے کہ میری طاعت سزاوارِ حق نہیں۔

ص ۳۴۴/۴۳۱

سمنون محب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ذهب المحبون لله بشرف الدنيا والاخرة لان النبىّ صلى الله عليه وسلم

قال المرء مع من احب۔" دوستانِ حق دونوں عالم کی بزرگی کے حق دار ہیں کیونکہ حضور صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن ہر آدمی اپنے دوست کے ساتھ ہوگا۔"

دوستانِ حق دنیا و عقبیٰ میں حق تعالیٰ کے ساتھ ہیں اور جو حق تعالیٰ کے ساتھ ہیں انہیں کوئی گھاٹا نہیں۔ دنیا کا شرف یہ ہے کہ حق تعالیٰ ان کے ساتھ ہے اور آخرت کا یہ کہ وہ حق تعالیٰ کے ساتھ ہوں گے۔

یحیٰی بن معاذؒ فرماتے ہیں "محبت کی حقیقت نہ جفا سے کم ہوتی ہے نہ عطا و مرحمت سے زیادہ ہوتی ہے"۔ کیونکہ یہ دونوں پہلو محبت کے اسباب ہیں۔ اور اسباب اصل چیز کے ہوتے ہوئے بے سروپا ہوتے ہیں۔ دوست سے پہنچی ہوئی مصیبت دوست کے لیے وجہ مسرت ہوتی ہے۔ محبت کی راہ میں جفا و وفا کا کوئی فرق نہیں۔ محبت حاصل ہو تو جفا بھی وفا اور وفا بھی جفا ہے۔

مشہور ہے کہ شبلیؒ کو تہمتِ جنون میں شفاخانے میں داخل کر دیا گیا۔ کچھ لوگ زیارت کے لیے آئے۔ آپ نے فرمایا "تم لوگ کون ہو؟" لوگوں نے کہا "آپ کے دوست"۔ آپ نے ان پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ سب بھاگ گئے۔ آپ نے فرمایا "اگر تم میرے دوست ہوتے تو راہِ فرار کیوں اختیار کرتے بلکہ میری اس زیادتی پر صبر کرتے"۔ دوست تو دوست کی دی ہوئی تکلیف سے نہیں بھاگا کرتے۔ الغرض اس موضوع پر بہت سی باتیں ہیں۔ میں اسی قدر بیان کرنا پسندیدہ سمجھتا ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ص ۳۴۵/۴۳۲

کشف حجاب ششم۔ زکوٰۃ

حق تعالیٰ نے فرمایا: اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ "نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو"۔ اس سے متعلق بہت سی آیات و احادیث ہیں۔ زکوٰۃ، ارکان و فرائض اسلام میں شامل ہے۔ جس پر واجب ہو اس پر واجب ہے اور اس سے روگردانی روا نہیں۔ زکوٰۃ اتمام نعمت پر واجب ہوتی ہے یعنی جب ۲۰۰ درھم جو نعمتِ تمام ہے کسی کے تصرف میں ہوں اور ایک سال گذرنے کے باوجود ان کی ضرورت نہ پڑے تو اس پر پانچ درھم زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے۔ بیس دینار سونا بھی نعمت تمام ہے اور اس پر نیم دینار واجب الادا ہے۔ پانچ اونٹ بھی نعمتِ تمام ہے اور اس پر ایک بھیڑ یا بکری زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ باقی جو اموال اسی طرح ہوں ان پر زکوٰۃ واجب ہے۔ یاد رکھو مال کی طرح "مرتبہ" پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ کیونکہ وہ بھی نعمتِ تمام

ہے، پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ "حق تعالیٰ نے تمہارے اوپر جاہ و مرتبہ کی زکوٰۃ بھی فرض کی ہے جس طرح مال کی زکوٰۃ فرض ہے"۔ اور نیز فرمایا "ہر چیز کی زکوٰۃ ہے مثلاً گھر کی زکوٰۃ مہمان خانہ ہے۔" زکوٰۃ درحقیقت شکر نعمت ہے۔ تندرستی بڑی نعمت ہے۔ ہر عضو کی زکوٰۃ ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ اپنے تمام اعضاء کو مشغول عبادت رکھے۔ اور صرف کھیل کود کے لیے وقف نہ کردے تاکہ زکوٰۃِ نعمت کا حق ادا ہو۔ باطنی نعمتوں کی بھی زکوٰۃ ہے۔ سب کی حقیقت

ص ۳۴۵/۴۳۳

احاطۂ بیان میں نہیں آسکتی۔ جو چیز بھی کثرت سے ہو اس کی کثرت کے مطابق زکوٰۃ واجب ہے۔ زکوٰۃ دراصل ظاہری اور باطنی نعم کا عرفان ہے۔ جب بندہ سمجھتا ہے کہ اس پر نعمتِ حق تعالیٰ بے شمار ہے تو وہ شکرِ نعمت بھی بے حساب کرتا ہے بے حساب شکر نعمت بھی بے حساب نعمت ہے۔

اہلِ تصوف کے نزدیک مالِ دنیا کی زکوٰۃ کچھ ایسی قابل ستائش نہیں ہوتی۔ بخل انسان کے لیے مذموم ہے اور دو سو درہم بچا کر اپنی ملکیت میں سال بھر محفوظ رکھنا مکمل بخل ہے۔ اور اس کے بعد صرف پانچ درہم از راہِ زکوٰۃ نکالنا؟ اہل کرم مال بانٹتے ہیں اور سخاوت کرتے رہتے ہیں زکوٰۃ ان پر کس طرح واجب ہو سکتی ہے۔

کہتے ہیں کسی عالم نے از راہ آزمائش حضرت شبلیؒ سے زکوٰۃ سے متعلق مسئلہ پوچھا۔ آپ نے فرمایا جب بخل موجود ہو اور مال حاصل ہو تو دو سو درہم میں سے پانچ دینے واجب ہیں یعنی تمہارے مذہب کے مطابق بیس دینار میں سے نصف دینار دینا چاہیے۔ میرے مذہب میں کوئی ملکیت ہی نہیں بنانا چاہیے تاکہ زکوٰۃ کے معاملہ میں آزاد ہو جائے۔ یہ سن کر اس عالم نے دریافت کیا اس مسئلہ میں آپ کا امام کون ہے؟ فرمایا حضرت ابوبکر صدیق رضؓ۔ جو کچھ ان کے پاس تھا وہ سب راہِ حق میں دے دیا۔ اور جب پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا۔ "اپنے اہل و عیال کے لیے کیا چھوڑا؟" عرض کی اللہ اور اس کا رسول۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ایک شعر روایت ہے:

"مجھ پر مال کی زکوٰۃ واجب نہیں اور کیا سخی پر زکوٰۃ واجب ہوا کرتی ہے؟"

ص ۳۴۶/۴۳۴

اہلِ کرم کا مال خرچ کے لیے ہوتا ہے اور ان کا خون معاف ہوتا ہے۔ نہ وہ مال میں بخل کرتے ہیں نہ خون پر خصومت کیونکہ ان کی ملک ہی میں کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن اگر کوئی جہالت کا مرتکب ہو اور یہ کہے کہ میرے پاس مال ہی نہیں لہذا مجھے زکوٰۃ سے متعلق علم کی ضرورت نہیں تو یہ سخت غلطی ہے۔ علم حاصل کرنا ہر مومن پر فرض ہے اور علم سے روگرداں ہونا کفر ہے۔ دورِ حاضر کی خرابیوں میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ نیکی اور فقر کے مدعی اپنی جہالت میں رہ کر علم سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ ایک

موقع پر میں بندی صوفیوں کی ایک جماعت کو فقہ پڑھا رہا تھا۔ ایک جاہل آ گیا۔ اس وقت اونٹوں کی زکوٰۃ پر مسائل بیان ہو رہے تھے۔ اونٹ کے تین سالہ۔ دو سالہ اور چار سالہ بچے کا ذکر تھا۔ وہ جاہل تنگ آ گیا اور اٹھ کر کہنے لگا میرے پاس کوئی اونٹ نہیں کہ مجھے اونٹ کے تین سالہ بچے وغیرہ کا علم درکار ہو۔ میں نے اسے سمجھایا بھلے آدمی جتنا علم زکوٰۃ دینے کے لیے درکار ہے اتنا ہی زکوٰۃ لینے کے لیے بھی چاہیئے۔ اگر کوئی شخص تجھے اونٹ کا تین سالہ بچہ دے تو تجھے بھی تین سالہ بچے سے متعلق علم ہونا چاہیئے۔ اگر کسی کے پاس مال نہ ہو اور وہ مال کا ضرورت مند بھی نہ ہو تو بھی علم کی فرضیت ساقط نہیں ہوتی۔ جہالت سے اللہ کی پناہ مانگنا چاہیئے۔

فصل

صوفیہ مشائخ میں بعض نے زکوٰۃ لی ہے اور بعض نے نہیں لی جنہوں نے فقر از خود اختیار کیا ہوا تھا زکوٰۃ نہیں لی۔ اور اس خیال سے کہ نہ ہم مال جمع کریں گے نہ ہمیں زکوٰۃ دینا پڑے گی۔ اہل دنیا سے ہم نہیں لیتے تاکہ ان کا ہاتھ اونچا اور ہمارا نیچا نہ ہو۔ جن کا فقر مجبوراً غربت کی وجہ سے تھا انہوں نے زکوٰۃ لی اپنی ضرورت کے لیے نہیں بلکہ مسلمان بھائی کی گردن سے فرض کا بوجھ اتارنے کے لیے۔ اس نیت کے پیش نظر ان کا ہاتھ اونچا رہا دینے والے کا نہیں۔ اگر دینے والے کا ہاتھ بلند تر ہوتا تو یہ صورت باطل ہوتی۔ بقولہ تعالیٰ: وَيَأْخُذُ الصَّدَقَاتِ "وہ صدقات وصول کرتا ہے"۔ اس طرح لازم ہوتا کہ زکوٰۃ دینے والا زکوٰۃ لینے والے سے افضل ہے حالانکہ یہ اعتقاد صریح گمراہی ہے۔ ہاتھ اس کا بلند ہے جو واجب کی تکمیل کے لیے مسلمان بھائی کی گردن پر سے بوجھ اٹھا لے۔ فقرا دنیا دار نہیں ہوتے۔ ان کی نظر عقبیٰ پر ہوتی ہے۔ اور عقبیٰ پر نظر رکھنے والے اگر اہل دنیا کی گردن سے بوجھ نہ اٹھائیں تو قیامت کے دن اس کوتاہی کے لیے وہ جوابدہ ہوں گے۔ حق تعالیٰ نے اہل عقبیٰ کا مناسب اور آسان امتحان لیا ہے تاکہ ان کے ذریعہ اہل دنیا اپنا بوجھ اتار سکیں۔ یقیناً ہاتھ فقرا ہی کا بلند ہوتا ہے۔ جو احکام شریعت کے مطابق اس شخص سے حق لیتے ہیں۔ جس پر باری تعالیٰ کا حق واجب ہوتا ہے۔ اگر زکوٰۃ لینے والوں کا ہاتھ نیچا ہوتا جیسے حشویہ لوگوں کی ایک جماعت کا خیال ہے تو چاہیے تھا کہ پیغمبروں کا ہاتھ بھی نیچا ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حق بندوں سے وصول کرتے ہیں اور حسب شرائط اس کا صحیح مصرف کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگ غلطی پر ہیں اور نہیں جانتے کہ پیغمبر امر الٰہی کے مطابق زکوٰۃ لیتے ہیں۔ پیغمبروں کے بعد دین کے امام بھی اسی طریق پر عمل پیرا رہے ہیں اور بیت المال کا حق لیتے رہے ہیں۔ جو کوئی زکوٰۃ

ص ۳۴۷ / ۳۵۴

لینے والے ہاتھ کو نیچا اور زکوٰۃ دینے والے ہاتھ کو اونچا سمجھتا ہے وہ سخت غلطی میں مبتلا ہے۔ ان باتوں کو تصوف میں ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس موضوع سے جود و سخا کا قریبی تعلق ہے۔ اس لیے میں جود و سخا سے متعلق بھی کچھ بیان کیے دیتا ہوں۔ توفیق و عصمت اللہ کی طرف سے ہے۔

ص ۳۴۸/۴۳۵

۱۷
سترھواں باب

جود و سخا

پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: السخی قریب من الجنۃ وبعید من النار والبخیل قریب من النار وبعید من الجنۃ "سخی بہشت سے قریب اور دوزخ سے بعید ہے بخیل دوزخ سے قریب اور بہشت سے بعید ہے"
علماء کے نزدیک انسانی صفات کے بارے میں جود و سخا دونوں ایک ہی مفہوم کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ مگر حق تعالیٰ کو جواد کہتے ہیں سخی نہیں کہتے۔ اور حق تعالیٰ نے اپنا یہ نام ظاہر نہیں فرمایا اور پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی حدیث بھی اس پر ناطق نہیں۔ تمام امت اور اہل سنت کا اس بات پر اجماع ہے کہ حق تعالیٰ کا عقل اور لغت کی رو سے کوئی ایسا نام نہیں رکھنا چاہیئے جس پر کتاب اور سنت گواہ نہ ہو۔ چنانچہ حق تعالیٰ عالم ہے اور اس پر اجماع امت ہے کہ اسے عالم کہنا چاہیئے۔ لیکن ہم عاقل یا فقیہ نہیں کہہ سکتے حالانکہ تینوں الفاظ ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ ہم اسے عالم کہتے ہیں کیونکہ اس کے لیے توقیف موجود ہے۔ باقی دو نام اس کے لیے استعمال نہیں کرتے کیونکہ توقیف موجود نہیں۔

ص ۳۴۹/۴۳۶

بعض لوگ جود و سخا میں فرق بیان کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ سخی سخاوت کرتے وقت اپنے پرائے کی تمیز برقرار رکھتا ہے اور اس کا فعل کسی دنیوی غرض یا سبب کی بناء پر ہوتا ہے۔ یہ سخاوت کا ابتدائی مقام ہے۔ جواد سخاوت میں اپنے بیگانے کی تفریق نہیں کرتا اور اس کی سخاوت بے غرض اور بلا سبب ہوتی ہے۔ یہ چیز دو پیغمبروں کے حال سے

نمایاں ہے یعنی حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور حضرت محمد حبیب اللہ صلوات اللہ علیہم۔ احادیث میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کھانا نہیں کھاتے تھے جب تک دستر خوان پر کوئی مہمان نہ ہو۔ ایک دفعہ تین روز گذر گئے۔ کوئی مہمان وارد نہ ہُوا بالآخر کوئی آتش پرست دروازے پر آیا۔ آپ نے پوچھا تو کون ہے؟ جواب ملا میں آتش پرست ہوں۔ آپ نے فرمایا چلے جاؤ تم میرے مہمان ہونے کے قابل نہیں ہو۔ حق تعالیٰ کی طرف سے عتاب ہُوا کہ ہم نے اس شخص کی ستّر برس تک پرورش کی اور تم سے یہ بھی نہ بن پڑا کہ اسے ایک روٹی دے دو۔ اس کے برعکس جب حاتم کا بیٹا "عدی" پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پیش ہُوا تو حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی چادر اس کے لیے بچھادی اور فرمایا "کسی قوم کا بھی کوئی صاحبِ کرم شخص آئے تو اس کی تکریم کرو۔" حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیگانے کی تفریق کو پیش نظر رکھا اور ایک غیر مذہب والے کو ایک نان بھی دینے سے دریغ کیا۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ فرق نظر انداز کر دیا۔ اور اپنی چادر کا فرش کر دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام سخاوت تھا اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا جود کا۔ اس معاملے میں سب سے اچھا راستہ یہ ہے کہ خیال اول پر عمل پیرا ہونے کو جود کہتے ہیں۔ جب دوسرا خیال پہلے کو مغلوب کر دے تو گویا بخل رو نما ہو جاتا ہے۔ کامگار لوگوں کے نزدیک خیال اول کو ترجیح دینا چاہیئے کیونکہ وہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔

ص ۳۵۰ ؛ ۴۳۷

کہتے ہیں نیشا پور میں ایک سوداگر تھا جو اکثر حضرت شیخ ابوسعیدؒ کی مجلس میں حاضری دیا کرتا تھا۔ ایک دن شیخ نے کسی درویش کے لیے کچھ طلب کیا۔ سوداگر کا بیان ہے کہ اس وقت اس کے پاس ایک دینار اور ایک چھوٹا چاندی کا سکہ تھا۔ پہلے اس نے سوچا کہ دینار دے دے۔ پھر خیال آیا کہ چاندی کا سکہ دینا چاہیئے۔ چنانچہ وہی دے دیا۔ جب شیخ فارغ ہو کر باتیں کرنے لگے تو سوداگر نے پوچھا۔ "کیا حق تعالیٰ سے تنازع کرنا روا ہے؟" شیخ رحؒ نے فرمایا "تو نے ابھی ابھی حق تعالیٰ سے تنازع کیا۔ اس کا حکم تھا مانگنے والے کو دینار دو مگر تم نے چاندی کا سکّہ دیا۔"

کہتے ہیں حضرت عبداللہ رودباری کسی مرید کے گھر پر آئے وہ گھر پر موجود نہیں تھا۔ آپ کے حکم کے مطابق اس کے گھر کا سب سامان فروخت کر دیا گیا۔ جب مرید گھر پر آیا تو اس نے خوشی کا اظہار کیا اور شیخ طریقت کی خوشنودی کے پیشِ نظر ایک حرف بھی زبان پر نہ لایا۔ اس کی بیوی بھی آ گئی۔ جب اس نے صورت حالات دیکھی۔ تو گھر کے اندر جا کر اپنے کپڑے اتار کر پھینک دیئے اور کہا کہ یہ بھی گھر کے سامان میں شامل ہیں۔ اور ان پر بھی وہی حکم لاگو ہوتا ہے۔ مرد نے چلا کر کہا یہ تکلّف ہے اور تو اپنے اختیار سے کر رہی ہے۔ یہ شیخ کا حکم نہیں۔ عورت نے کہا شیخ نے جو کچھ کیا وہ

ص ۳۵۰/۴۳۸ اس کا جود تھا۔ ہمیں بھی چاہیئے کہ تکلیف برداشت کریں تاکہ ہمارا جود بھی ظاہر ہو۔ آدمی نے کہا۔ یہ صحیح ہے مگر ہم نے شیخ کو تسلیم کر لیا ہے اس لیے اس نے جو کچھ کیا۔ وہ ہمارے لیے عین جود تھا۔ جود انسانی صفت ہونے کی حیثیت سے محض تکلف اور مجاز ہوتا ہے۔ مرید کو ہمیشہ اپنی ملکیت اور اپنے نفس کو امرِ حق کے موافق صرف کرنا چاہیئے۔ اس لیے سہل بن عبداللہ رضؓ نے فرمایا۔ "صوفی کا خون حلال اور اس کی ملکیت عام لوگوں کے لیے جائز ہے"۔

شیخ ابو مسلم فارسیؒ فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ ایک جماعت کے ساتھ حجاز کو جا رہا تھا۔ حُلوان کے قریب کردوں نے ہمارا راستہ روک لیا۔ ہماری گدڑیاں چھین لیں میں ان سے الجھنے کی بجائے ان کی دل جوئی کرتا رہا۔ ہمارے درمیان ایک آدمی تھا جو قدرے مضطرب تھا۔ ایک کرد نے اس پر تلوار کھینچ لی اور اس کو قتل کرنے کے لیے بڑھا۔ ہم سب نے مل کر اس کی سفارش کی مگر کرد نے کہا کہ اس جھوٹے کو زندہ چھوڑنا روا نہیں۔ میں تو اسے ضرور قتل کروں گا۔ ہم نے وجہ پوچھی تو اس نے کہا یہ صوفی نہیں۔ اولیاء کی صحبت میں خیانت کا مرتکب ہوتا ہے اس کا نہ ہونا ہی بہتر ہے۔ میں نے پوچھا وہ کیسے؟ کرد نے جواب دیا صوفیوں کے لیے کمتر ین درجہ یہ ہے کہ وہ "جود" کریں۔ اس کی گدڑی میں چند ٹکڑے ہیں یہ اپنے دوستوں کے ساتھ اس قدر جھگڑا کرتا ہے صوفی نہیں ہو سکتا۔ ہم ایک مدت سے تمہاری خدمت کر رہے ہیں۔ تمہیں راستے میں لوٹ کر دنیا کے تعلقات سے آزاد کر دیتے ہیں۔

کہتے ہیں حضرت عبداللہ بن جعفر رضؓ ایک بار کسی نخلستان کے قریب ایک جماعت سے ملے۔ دیکھا کہ ایک حبشی غلام بھیڑ بکریاں چرا رہا ہے۔ ایک کتا آکر اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔ غلام نے ایک روٹی نکال کر کتے کے آگے ڈال دی پھر

ص ۳۵۱/۴۳۹ اسی طرح دوسری اور تیسری بھی ڈال دی۔ عبداللہ رضؓ نے بڑھ کر پوچھا تجھے ہر روز کتنی روٹیاں ملتی ہیں؟ غلام نے جواب دیا جتنی آپ نے دیکھیں۔ آپ نے کہا کہ ساری روٹیاں تو نے کتے کے آگے ڈال دیں؟ غلام نے کہا جی ہاں۔ دراصل یہ کتوں کی جگہ نہیں۔ خبر نہیں وہ کتنی دور سے اس امید پر آیا ہے۔ میں اس کی تکلیف کو ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ حضرت عبداللہ کو اس کی بات بہت پسند آئی۔ اور آپ نے غلام کو بھیڑ بکریوں اور نخلستان سمیت خرید لیا۔ پھر غلام کو راہِ خدا میں آزاد کر کے سب کچھ اس کے سپرد کر دیا۔ غلام نے آپ کو دعا دی اور بھیڑ بکریاں وغیرہ سب اللہ کی راہ میں دے کر وہاں سے چلا گیا۔

روایت ہے کہ کوئی شخص حضرت حسن بن علی رضؓ کے دروازے پر گیا اور عرض کی اے فرزندِ رسول! میرے ذمے چار سو درہم چاندی قرض ہیں۔ حضرت حسن رضؓ نے اسی وقت چار سو درہم دینے کا حکم دیا اور خود روتے ہوئے گھر کے اندر چلے

گئے۔ لوگوں نے پوچھا آپ کیوں روتے ہیں۔ فرمایا اس لیے کہ میں نے اس شخص کا پہلے ہی حال کیوں نہ دریافت کیا تاکہ اسے سوال کرنے کی ذلّت برداشت نہ کرنا پڑتی۔

کہتے ہیں حضرت ابوسہل صعلوکی صدقہ کبھی کسی درویش کے ہاتھ میں نہیں دیتے تھے اور جو کچھ دینا ہوتا تھا اس کے ہاتھ پر نہیں رکھتے تھے بلکہ زمین پر رکھ دیتے تھے تاکہ وہ خود اٹھالے۔ آپ سے پوچھا گیا تو فرمایا کہ دنیوی مال کی اتنی وقعت نہیں کہ کسی کے ہاتھ پر رکھا جائے اور اس کی وجہ سے میرا ہاتھ اونچا اور اس کا نیچا ہو۔

روایت ہے کہ فرمانروائے حبشہ نے دو سیر مشک پیغمبر صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں بھیجا۔ آپ نے سب کا سب پانی میں ڈال دیا اور اپنے اصحاب پر چھڑک دیا۔ حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ کوئی شخص حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس آیا۔ اور آپ نے اسے دو پہاڑوں کے درمیان ایک وادی بمعہ بھیڑ بکریوں کے عطا فرمائی۔ اس نے اپنے قبیلے کے لوگوں سے جا کر کہا مسلمان ہو جاؤ۔ پیغمبر صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم ایسے سخی ہیں کہ عطا کرتے وقت اپنے فقر و فاقہ سے نہیں ڈرتے۔ حضرت انسؓ ہی سے روایت ہے کہ ایک بار حضور صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس اسی ہزار درھم آئے۔ آپ نے اپنی جھولی میں ڈال لیے اور جب تک سب تقسیم نہ ہو گئے اپنی جگہ سے نہیں اٹھے۔

ص ۳۵۲/۴۴۰

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ایک بار ایسی حالت میں دیکھا کہ آپ نے بھوک کی وجہ سے اپنے پیٹ پر پتھر باندھ رکھا تھا۔

میں نے متاخرین میں سے ایک درویش کو دیکھا۔ کسی بادشاہ نے تین سو درھم وزنی سونا اسے بھیجا۔ وہ ایک حمام میں گیا اور سب کا سب سونا اہل حمام کو دے دیا۔ قبل ازیں نوری فرقہ کے بیان میں ایثار کے ضمن میں کچھ حکایات لکھی جا چکی ہیں یہاں اتنے ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔ واللہ اعلم

کشف حجاب ہفتم۔ روزہ

خدائے عزّوجلّ نے فرمایا: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ "اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا"۔ پیغمبر صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ جبریل علیہ السلام نے خبر دی کہ حق تعالیٰ نے کہا: الصوم لی وانا اجزی بہ "روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا"۔ روزہ ایک باطنی عبادت ہے جس کا

ظاہر سے کوئی تعلق نہیں کوئی غیر اس میں حصہ دار نہیں ہوتا اور اسی لیے اس کی جزا بھی عظیم ہے۔ لوگوں کا داخلہ بہشت میں رحمتِ الٰہی سے ہوگا۔ درجات بقدرِ عبادات ملیں گے مگر ہمیشہ بہشت میں رہنے کا ضامن روزہ ہوگا۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے خود اس کی جزا دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔

ص $\frac{۳۵۳}{۴۴۱}$ حضرت جنیدؒ نے فرمایا۔ "روزہ آدھی طریقت ہے"۔ میں ایسے مشائخ کرام سے مل چکا ہوں جو ہمیشہ روزہ رکھتے تھے اور کچھ ایسے بزرگوں سے بھی ملا ہوں جو صرف ماہ رمضان میں روزے رکھتے تھے۔ اور یہ (ماہِ رمضان کے روزے) طلبِ اجر کے لیے تھے۔ غیر از رمضان روزہ نہ رکھنا ترکِ اختیارِ خود اور ترکِ ریا کے لیے تھا۔ یہ بھی دیکھا کہ بعض مشائخ نفلی روزہ رکھتے ہیں مگر کسی کو خبر نہیں ہوتی اور اگر کوئی کھانا لے آئے تو کھا لیتے ہیں۔ یہ بات سنت سے زیادہ قریب ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک روز پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر پر تشریف لائے تو دونوں نے عرض کی "ہم نے آپ کے لیے حیسا (کھجور کا حلوہ) تیار کیا ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ آج میرا ارادہ روزے کا تھا مگر لاؤ میں روزہ کسی اور دن رکھ لوں گا۔ میں نے دیکھا کہ مشائخ ایام بیض (ہر ماہ کی تیرہ، چودہ اور پندرہ) ماہ مبارک (محرم) سے رجب اور شعبان تک کے ہر عشرہ روزہ رکھتے تھے۔ یہ بھی دیکھا کہ داؤد علیہ السلام کا روزہ رکھتے تھے جسے پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خیر الصیام کہا ہے اور وہ ایک دن روزہ رکھا جاتا ہے اور دوسرے دن افطار کیا جاتا ہے۔

میں ایک دفعہ شیخ احمد بخاریؒ کے پاس حاضر ہوا ان کے سامنے ایک حلوے کی پلیٹ رکھی ہوئی تھی اور وہ کھا رہے تھے۔ مجھے بھی اشارہ کیا۔ میں نے بچوں کی عادت کے مطابق اظہار کر دیا کہ روزے سے ہوں۔ پوچھا کیوں؟ میں نے عرض کی فلاں بزرگ کی موافقت میں۔ فرمایا مخلوق کو کسی مخلوق کی موافقت درست نہیں۔ میں نے روزہ توڑنے کا ارادہ کیا تو فرمایا یہ بھی غلط ہے۔ اگر اس بزرگ کی موافقت سے بیزاری کا اظہار کر رہے ہو تو میری موافقت بھی نہ کرو۔ میں بھی مخلوق ہوں۔ دونوں پہلو برابر ہیں۔ روزہ درحقیقت نفس کو روکنا ہے (امساک) سب طریقت کا راز اسی میں مضمر ہے۔ روزہ کا کمترین پہلو بھوکا رہنا ہے: والجوع طعام اللہ فی الارض "بھوک زمین پر حق تعالیٰ کا طعام ہے"۔ بھوک سب زمانوں میں اور

ص $\frac{۳۵۴}{۴۴۲}$ ہر قوم میں شرعاً اور عقلاً پسندیدہ ہے۔ رمضان کے ایک ماہ کے روزے ہر عاقل و بالغ، تندرست اور مقیم مسلمان پر فرض ہیں۔ ان کی ابتدا ماہ رمضان کا چاند دیکھ کر ہوتی ہے اور اختتام ماہِ شوال کا چاند دیکھ کر۔ ہر روزے کے لیے درست نیت

اور سچی شرط لازمی ہے۔ نفس کو روکنے کی بہت سی شرائط ہیں مثلاً پیٹ کو کھانے سے بچانا۔ آنکھ کو نظرِ شہوت سے۔ کان کو غیبت سننے سے۔ زبان کو لغو اور بیہودہ باتوں سے جسم کو دنیا کی پیروی اور شریعت کی مخالفت سے۔ صرف ان شرائط کی تکمیل کی صورت میں روزہ درست ہو سکتا ہے۔ پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک صحابی سے فرمایا۔ "جب تو روزہ رکھے تو تیرے کان۔ آنکھ۔ زبان۔ ہاتھ الغرض تیرا ہر عضو روزہ دار ہونا چاہیئے۔" اور نیز حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ "بہت سے روزہ دار ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو روزہ سے بھوک اور پیاس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔"

میں (علی بن عثمان الجلابیؒ) نے سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور عرض کی "یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم! مجھے وصیت فرمایئے۔" آپ نے فرمایا "اپنی زبان اور دیگر حواس کو حبس کر۔ حواس کو حبس میں رکھنا ہی مکمل مجاہدہ ہے۔ جملہ علوم حواس کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ حواس دیکھنے، سننے، چکھنے، سونگھنے اور چھونے کی قوتیں ہیں۔ حواس علم و عقل کے سالار ہیں۔ چار حواس کا مقام مخصوص ہے اور ایک حس سارے بدن پر پھیلی ہوئی ہے۔ آنکھ نظر کا مقام ہے۔ اور یہ رنگ و اجسام کو دیکھتی ہے۔ کان شنوائی کا محل ہے اور آواز کو سنتا ہے۔ حلق ذائقہ کا محل ہے اور بامزہ اور بے مزہ چیزیں امتیاز کرتا ہے۔ ناک سونگھنے کا محل ہے اور خوشبودار اور بدبودار اشیاء میں تمیز کرتا ہے۔ لمس یعنی چھونے کا کوئی خاص محل نہیں۔ تمام اعضائے جسم گرمی۔ سردی۔ نرمی اور سختی کو محسوس کرتے ہیں۔ بدیہی اور الہامی امور کے سوا ہر چیز کا علم ان حواس خمسہ کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ الہامی امور ہر خرابی سے مبرا ہوتے ہیں مگر حواس خمسہ میں صفائی بھی ہوتی ہے اور کدورت بھی جس طرح علم، عقل اور روح کو حواس میں دخل ہے بالکل اسی طرح نفس اور خواہشاتِ نفس اور وہم کو بھی ہے۔ دوسرے لفظوں میں طاعت و معصیت۔ سعادت و شقاوت میں حواس کی حیثیت مشترک آلہ کار کی ہے۔ کان اور آنکھ کے لیے دوستئ حق نیک چیزوں کو سننا اور دیکھنا ہے۔ نفس پرستی لغویات کو سننا اور نظرِ شہوت رکھنا ہے۔ چھونے۔ چکھنے اور سونگھنے میں دوستئ حق احکامِ حق کے مطابق چلنا اور سنت کی پیروی کرنا ہے اور نفس پرستی فرمانِ حق اور احکامِ شریعت کی مخالفت ہے۔ روزہ دار کو چاہیئے کہ وہ ہر حالت میں ان پانچ حواس کو قابو میں رکھے۔ احکامِ خداوندی کی مخالفت چھوڑ کر شریعت کی مکمل پیروی کرے تاکہ صحیح روزہ دار کہلانے کا مستحق ہو۔ صرف کھانے پینے سے پرہیز کرنے کا روزہ بچوں اور بوڑھی عورتوں کا کام ہے۔ روزہ دراصل ماسوا کو بنا نگاہ سمجھنے سے احتراز، بغیر اسلامی طور طریقوں اور ممنوعات و نواہی سے بچنے کا نام ہے۔

ص ۳۸۴ / ۴۴۳

حق تعالیٰ نے فرمایا: مَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا لَّا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ "ہم نے ان کے (انسانوں کے)

جسم ایسے نہیں بنائے کہ وہ کھائے پیئے بغیر رہ سکیں"۔ اور فرمایا: اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ "کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں بیکار پیدا کیا ہے اور یقیناً تم ہماری طرف لوٹائے جاؤ گے" ہم نے طبائع کو ضرورتمند بنایا ہے اور مخلوق کو کھیل کود کی خاطر پیدا نہیں کیا۔

پس روزہ لہو اور لعمۂ حرام سے بچنے کا نام ہے صرف اکل حلال سے بچنا روزہ نہیں مجھے تعجب ہے ایسے آدمی پر جو فرضی روزہ کا تارک ہو اور نفلی روزہ رکھے۔ فرضی روزہ کو ترک کرنا تو نافرمانی ہے اور نافرمانی گناہ ہے ہمیشہ نفلی روزہ رکھنا محض سنت ہے۔ اس شقاوت سے خدا کی پناہ مانگنا چاہیئے۔

ص ۳۵۵/۴۴۱

جب کوئی انسان حق تعالیٰ کی نافرمانی سے مکمل طور پر محفوظ ہو جاتا ہے تو وہ ہر حال میں روزہ دار ہوتا ہے۔

مشہور ہے کہ حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ پیدائش کے دن روزہ سے تھے اور وفات کے دن بھی روزہ دار تھے لوگوں نے پوچھا یہ کیسے ممکن ہے۔ جواب ملا کہ آپ نے روزِ پیدائش تا نمازِ شام دودھ نہیں پیا۔ وفات کے دن ایسے ہی روزہ رکھا ہوا تھا۔ اس روائت کے ابوطلحہ مالکیؒ راوی ہیں۔

روزۂ وصال (نفلی روزوں کو متواتر رکھنے) سے پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم روزۂ وصال رکھا کرتے تھے صحابہ کرامؓ نے موافقت کی۔ آپ نے فرمایا تم لوگ روزۂ وصال نہ رکھو "میں تم میں سے کسی ایک کی طرح نہیں ہوں میں اپنے مولا کے پاس رات بسر کرتا ہوں۔ وہ مجھے کھانے پینے کو دیتا ہے۔" اہلِ مجاہدہ کہتے ہیں کہ آپ نے از راہِ شفقت منع فرمایا۔ ایک دوسری جماعت کا خیال ہے روزۂ وصال خلاف سنت ہے درحقیقت روزۂ وصل ممکن ہی نہیں کیونکہ دن گذر جائے تو رات کو روزہ نہیں ہوتا اور اگر روزہ کی نیت رات کو کی جائے تو وصال نہیں رہتا۔

حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہر پندرہ روز کے بعد کھانا کھاتے تھے اور ماہ رمضان میں عید تک کچھ نہیں کھاتے تھے۔ ہر رات چار سو رکعت نوافل ادا کرتے تھے۔ بظاہر یہ چیز انسانی طاقت سے باہر معلوم ہوتی ہے اور بجز توفیق الٰہی ناممکن ہے۔ دراصل توفیق حق ہی غذا ہو جاتی ہے۔ ایک دنیوی غذا پر جیتا ہے دوسرا تائیدِ حق پر۔

ص ۳۵۶/۴۴۵

طاؤس الفقرا، شیخ ابو نصرؒ صاحبِ لمعؒ سے متعلق یہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ آپ ماہِ رمضان میں بغداد پہنچے۔ مسجد شونیزیہ میں آپ کو ایک الگ حجرہ مل گیا اور درویشوں کی امامت بھی آپ کے سپرد ہوئی۔ آپ عید تک امامت کرتے رہے۔ تراویح میں آپ نے پانچ بار قرآن دہرایا۔ ہر شام خادم ایک نان حجرہ میں پہنچا دیا کرتا تھا۔ عید کے دن آپ تشریف لے گئے۔ خادم نے

دیکھا تو تینیس کی تینیس روٹیاں حجرہ میں اسی طرح موجود تھیں۔

علی بن بکارؒ کہتے ہیں کہ میں نے حفص مصیصیؒ کو دیکھا۔ کہ رمضان میں آپ نے پندرھویں روزے کے علاوہ کسی دن کچھ نہیں کھایا۔

ابراہیم ادھمؒ سے متعلق مشہور ہے کہ رمضان میں آپ نے شروع سے اخیر تک کچھ نہیں کھایا۔ گرمی کا موسم تھا۔ ہر روز گندم کاٹنے کی مزدوری کرتے۔ جو کچھ مزدوری کماتے تھے درویشوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ شب بھر نوافل ادا کرتے تھے۔ حق تعالیٰ نے ان کو محفوظ رکھا نہ انہوں نے کچھ کھایا نہ سوئے۔

شیخ عبداللہ بن خفیفؒ اپنی وفات سے پہلے چالیس چلّے پے درپے کاٹ چکے تھے میں نے ایک بزرگ کو دیکھا ہر سال جنگل میں دو بار چلّہ کیا کرتے تھے۔

دانشمند ابو محمد بابلغزیؒ کی رحلت کے وقت میں حاضر تھا۔ اسّی روز سے آپ نے کچھ نہیں کھایا تھا اور ہر نماز با جماعت ادا کی تھی۔

میں نے متاخرین میں سے ایک بزرگ کو دیکھا اسّی روز تک دن رات فاقہ کیا اور کوئی نماز بغیر جماعت ادا نہیں کی۔

مرو میں دو بزرگ تھے۔ مسعود اور ابو علی بیاہ۔ مسعود نے ابو علی کو پیغام بھیجا۔ یہ فقر کا دعویٰ کب تک؟ آئیے چالیس روز تک بیٹھیں اور کچھ نہ کھائیں۔ ابو علی نے کہلوایا آؤ ہم ہر روز تین بار کھائیں اور چالیس روز تک ایک ہی وضو قائم رکھیں۔ یہاں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے جس کا دور کرنا ضروری ہے۔ جاہل لوگ یہ اخذ کر لیتے ہیں۔ روزۂ وصال جائز ہے اور اطبار کے نزدیک بھی یہ قابلِ عمل ہے۔ میں اسے ذرا کھول کر بیان کرتا ہوں تا کہ شبہ دور ہو جائے۔

ص ۳۵۶/۴۴۶

روزۂ وصال اس طریق پر رکھنا کہ امرِ حق کی تعمیل میں کوئی فرق نہ آئے کرامت ہے اور کرامت خاص لوگوں کا حصہ ہے۔ خاص چیز عوام کے لیے نہیں ہوتی۔ اگر اظہار کرامت عام ہوتا تو ایمان کی شکل جبر کی ہو جاتی اور معرفت اہلِ عرفان کے لیے وجہ ثواب نہ ہوتی۔ پیغمبر صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم صاحبِ اعجاز تھے۔ اس لیے آپ نے روزۂ وصال اعلانیہ رکھا۔ اہلِ کرامت کو اظہار سے منع فرمادیا۔ کرامت کی شرط پوشیدہ رکھنا اور معجزہ کی اعلان کرنا ہے۔ معجزہ و کرامت کا یہ فرق بیّن ہے۔ اہلِ ہدایت کے لیے اسی قدر کافی ہے۔ چلّہ در اصل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے احوال سے تعلق رکھتا ہے۔ مکالمہ (گفتگو) مقام کی حالت میں درست ہوتا ہے۔ اولیاء جب کلامِ حق باطن میں سننا چاہتے ہیں۔ تو چالیس روز

بھوکا رہتے ہیں۔ تیس روز کے بعد صرف مسواک کرتے ہیں اور اس کے بعد دس روز اور بھوکا رہتے ہیں۔ لامحالہ حق تعالیٰ ان کے باطن سے کلام کرتا ہے۔ جو چیز انبیاء کو بظاہر حاصل ہوتی ہے وہ اولیاء کو باطن میں میسر آتی ہے۔ کلامِ حق انسانی کمزوریوں کے ہوتے ہوئے نہیں سنا جا سکتا۔ چار عناصرِ طبع کو چالیس روز تک خورد و نوش کو ترک کر کے مغلوب کرنا چاہیئے تاکہ صفائے محبت اور لطافتِ رُوح پوری طرح حاصل ہو جائے۔ اس کا تعلق بھوک سے ہے اور اب ہم اس کی حقیقت آشکار کرتے ہیں۔ انشاء اللہ العزیز۔

۱۸

اٹھارھواں باب

بھوک اور بھوک سے متعلق امُور

حق تعالیٰ نے فرمایا: وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالثَّمَرَاتِ "اور ہم تمہیں کچھ خوف، بھوک، مال و جان اور پھلوں کے نقصان سے معرضِ امتحان میں ڈالیں گے"۔ پیغمبر صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: بطن جایع احبّ الی اللہ من سبعین عابدًا غافلاً "بھوکے پیٹ والا حق تعالیٰ کے نزدیک ستر غافل عبادت گذاروں سے زیادہ محبوب ہے"۔ پس بھوکا رہنے کا مقام بہت بلند ہے۔ اور تمام امتوں اور ملتوں میں پسندیدہ ہے۔ ظاہر ہے کہ بھوکے انسان کے دل و دماغ بہت تیز ہوتے ہیں اور اس کی طبیعت صحت مند ہوتی ہے۔ "کیونکہ بھوک نفس کو انکساری اور دل کو عجز سکھاتی ہے"۔ بھوکے آدمی کا جسم منکسر اور دل عاجز ہوتا ہے۔ قوتِ نفس بھوک سے ختم ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: اجیعوا بطونکم و اعروا اجسادکم و اظمأوا اکبادکم لعلکم قلوبکم تری اللہ عیانا فی الدنیا "شکم کو خالی اور جگر کو پیاسا رکھو اور جسم کو لباس سے آزاد تاکہ تمہارے دل دنیا میں دیدِ حق سے فیضیاب ہوں"۔ جسم کو بھوک سے تکلیف ہوتی ہے مگر دل کو روشنی ملتی ہے۔ روح کو صفا اور باطن کو بقا۔ جب باطن کو بقا، روح کو صفا اور دل کو ضیا نصیب ہو تو جسمانی تکلیف سے

ص ۳۵۸/۴۴۷

کیا نقصان ہو سکتا ہے۔ بسیار خوری کوئی قابلِ توقیر چیز نہیں ورنہ مویشیوں کو زیادہ نہ کھلایا جاتا۔ بسیار خوری مویشیوں کا کام ہے اور بھوک بیماروں کا علاج ہے۔ بھوک باطن کی پرورش کرتی ہے۔ پیٹ بھر کر کھانا تن پروری ہے۔ بھلا وہ آدمی جو ساری عمر تن پروری میں مصروف رہے اور جسمانی خواہشات پر خرچ کرے۔ اس شخص کی کس طرح برابری کر سکتا ہے جو ساری عمر اپنے باطن کی پرورش کرے۔ راہِ حق میں منفرد ہو اور علائق دنیا سے آزاد۔ ایک دنیا دار ہے جسے دنیا صرف کھانے کے لیے درکار ہے اور دوسرا دوستِ حق ہے جسے کھانا صرف عبادت کے لیے ضروری ہے۔ دونوں میں بہت فرق ہے۔ "پہلے لوگ صرف اس لیے کھاتے تھے کہ زندہ رہیں اور تم اس لیے زندہ ہو کہ کھاتے رہو۔" نیز "بھوک صدیقوں کا طعام، مریدوں کا مسلک اور شیاطین کی قید ہے۔" آدم علیہ السلام کا بہشت سے نکلنا اور قربِ الٰہی سے محروم ہونا قضائے حق سے ایک لقمہ کھانے کی بنا پر تھا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ جو شخص بے چارگی میں بھوکا ہو وہ بھوکا نہیں ہوتا۔ اسے کھانے کی خواہش ہوتی ہے اور کھانے کی خواہش رکھنے والا کھانے والے سے کم نہیں ہوتا۔ جسے بھوک کا مقام ملتا ہے وہ کھانے کو ترک کرنے والا ہوتا ہے کھانے سے منع کیا ہوا نہیں ہوتا۔ جو شخص کھانے کا سامان سامنے ہوتے ہوئے اسے ترک کرے اور بھوک کی تکلیف برداشت کرے اسے بھوکا کہا جا سکتا ہے۔ شیطان کو مقید کرنا اور ہوائے نفس روکنا بجز بھوکا رہنے کے ممکن نہیں۔

ص ۳۵۹/۴۴۸

کتانیؒ فرماتے ہیں: "مرید میں تین چیزیں ضرور ہونی چاہئیں۔ نیند غلبہ کی وجہ سے، کلام ضرورت کے سبب اور کھانا فاقہ کی بنا پر۔"

بعض کے نزدیک فاقہ دو رات دن بھوکا رہنا ہے۔ بعض کے نزدیک تین رات دن۔ بعض کے نزدیک ایک ہفتہ اور بعض کے نزدیک چالیس روز۔ کیونکہ اہلِ تحقیق اس بات پر متفق ہیں کہ سچی بھوک چالیس دن رات میں صرف ایک بار ہوتی ہے اور وہ بھی جان کی حفاظت کے لیے۔ اس عرصہ کے درمیان جو بھوک ہوتی ہے وہ طبیعت کا شر اور غرور ہوتا ہے۔

معلوم ہونا چاہیئے (اللہ تجھے معاف کرے) کہ اہلِ معرفت کے رگ و پے اللہ تعالیٰ کے اسرار کے مظہر ہوتے ہیں۔ ان کے دل نگاہِ حق کے مقام ہوتے ہیں۔ دلوں کے دروازے کھلے ہوتے ہیں۔ عقل و ہوا ان کی درگاہ پر سرنگوں ہوتی ہیں۔ روح عقل کی مددگار ہوتی ہے اور نفس ہوا کا مددگار ہوتا ہے۔ جس قدر طبیعت خوراک سے پرورش پاتی ہے نفس قوی

ص ۳۵۹/۴۴۹

ہوتا ہے اور ہوائے نفس میں بالیدگی آتی ہے اور اس کا غلبہ اعضاء پر ہوتا ہے۔ اور ہر رگ میں ایک نیا حجاب رونما ہوتا ہے جب نفس کو غذا اسے قوت نہیں پہنچتی تو نفس اور ہوائے نفس میں ضعف پیدا ہوتا ہے۔ عقل کو قوت حاصل ہوتی ہے اور وہ نفس سے منقطع ہو جاتی ہے۔ اسرارِ الٰہی اور اس کے نشانات زیادہ نمایاں ہو جاتے ہیں۔ جب نفس اپنی حرکات میں سرنگوں ہو جاتا ہے۔ ہوس اپنے وجود سے خالی ہو جاتی ہے۔ جھوٹی ارادت جلوۂ حق کے سامنے محو ہو جاتی ہے۔ اس وقت مرید کو دولت مقصود نصیب ہوتی ہے۔

حضرت ابوالعباس قصابؒ فرماتے ہیں۔ میری طاعت و معصیت دو چیزوں سے وابستہ ہے۔ طعام کے بعد معاصی کا مادہ طبیعت میں موجزن ہوتا ہے جب طعام سے دستبردار ہوتا ہوں تو طاعت کی حقیقت اپنے اندر دیکھتا ہوں۔ مشاہدہ بھوک کا ثمر ہے کیونکہ مشاہدہ مجاہدہ سے قائم ہوتا ہے۔ اگر سیر ہو کر مشاہدۂ حق حاصل ہو جائے تو وہ اس بھوک سے بہتر ہے جو صرف مجاہدہ اور ریاضت تک محدود ہو اور اس سے مشاہدہ حاصل نہ ہو۔ مشاہدہ مردانِ حق کی معرکہ گاہ ہے اور مجاہدہ بچوں کا کھیل۔ "وہ سیری بہتر ہے جس میں مشاہدہ حق ہو اس بھوک سے جس میں صرف مشاہدۂ خلق ہو"۔ اس موضوع پر بہت سی چیزیں ہیں مگر میں بخوف طوالت اسی پر اکتفا کرتا ہوں اور توفیق قبضۂ حق میں ہے ::

کشفِ حجاب ہشتم۔ حج

حق تعالیٰ نے فرمایا: وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا "بندوں پر بیت اللہ کا حج فرض ہے جس کو اس تک پہنچنے کی استطاعت ہو"۔ صحیح العقل، بالغ اور صاحبِ استطاعت مسلمان پر حج فرض ہے۔ میقات (احرام باندھنے کی جگہ) پر احرام باندھنا۔ میدانِ عرفات میں کھڑے ہونا۔ کعبہ کا طواف کرنا۔ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا (اس میں علماء کا اختلاف ہے) اور بغیر احرام حرم میں داخل نہ ہونا۔ حرمِ مکّہ کو مقامِ ابراہیم کی وجہ سے حرم کہتے ہیں۔ وہ مقامِ امن ہے اور جنگ و جدل اس میں حرام ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو مقام ہیں۔ ایک جسم کا مقام دوسرا دل کا۔ جسم کا مقام تو مکّہ معظّمہ ہے اور دل کا مقام "خُلّت"۔ جو ان کے جسم کے مقام کا قصد کرے اس پر لازم ہے کہ جملہ لذاتِ نفسانی اور شہوات سے منہ پھیرے۔ احرام باندھ لے گویا کفن پہن لے۔ حلال شکار سے بھی دستبردار ہو۔ تمام حواس کو حبس کرے۔ عرفات میں حاضری دے اور پھر مزدلفہ اور مشعر الحرام جائے۔ کنکریاں اٹھا کر طواف کرے۔ پھر منیٰ میں تین روز تک قیام

ص ۳۶۰ / ۳۵۰

کرے اور سنگریزے حسبِ شرائط پھینکے۔ سر منڈائے اور قربانی کے بعد اپنا معمولی لباس پہن لے۔

جو شخص حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقامِ دل کا قصد کرے۔ اس کے لیے لازمی ہے کہ اپنی پسندیدہ چیزوں سے منہ پھیر لے۔ دنیوی لذتوں اور راحتوں کو ترک کرے۔ ذکرِ اغیار سے روگرداں ہو۔ کیونکہ عالمِ کون و فساد کی طرف ملتفت ہونا منع ہے۔ پھر معرفت کے عرفات میں قیام کرے۔ الفت کے مزدلفہ کا رُخ کرے۔ باطن کو تنزیہ حق کے طواف میں مشغول کرے۔ نفسانی خواہشات اور پراگندہ خیالات کے سنگریزے حفاظتِ ایمان کے منیٰ میں پھینکے۔ نفس کو مجاہدہ کے مذبح پر قربان کرے اور مقامِ خُلّت پر پہنچ جائے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جسم کا مقام حرم کعبہ ہے۔ اور وہاں دشمن اور اس کی تلوار سے امان ہے۔ آپ کے دل کے مقام یعنی "خُلّت" میں داخل ہونا قطعِ علائق ہے اور دوریٔ حق اور اس قسم کے دیگر شرور سے مصئون ہونا ہے۔

پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: الحاج وفد اللہ یعطیھم ما سألوا ویستجیب لھم ما دعوا۔ "حجاج حق تعالیٰ کا کارواں ہیں۔ جو کچھ وہ مانگیں انہیں دیا جاتا ہے وہ جو دعا کریں قبول کی جاتی ہے" کچھ لوگ جو مانگتے ہیں اور جو انہیں جواباً دیا جاتا ہے اس پر سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ کچھ لوگ جاہ و مرتبہ مانگتے ہیں۔ کچھ لوگ نہ کچھ چاہتے ہیں نہ دعا کرتے ہیں جیسا کہ ابراہیم پیغامبر صلوات اللہ وسلامہ علیہ نے کہا: اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ "جب اس کے خدا نے کہا فرماں بردار ہو جا۔ عرض کی میں پروردگارِ عالم کا فرمانبردار ہوں"۔ یہ "خُلّت" کا مقام تھا۔ وہ علائق دنیوی سے آزاد ہو گئے۔ اور ان کا دل غیرِ حق سے منقطع ہو گیا۔ حق تعالیٰ نے آپ کو عالم آشکار کرنا چاہا۔ یہ کام نمرود کے سپرد ہوا۔ اس نے پہلے آپ کو والدین سے جدا کیا۔ آگ بھڑکائی۔ ابلیس نے منجنیق (گوپیا) بنائی۔ آپ کو گائے کی کچی کھال میں بند کرکے گوپیا میں رکھ دیا گیا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے گوپیا تھام کر کہا "کیا آپ کو میری مدد چاہیئے؟" آپ نے فرمایا "نہیں مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں"۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا "کیا آپ کو حق تعالیٰ کی حاجت نہیں"۔ آپ نے فرمایا "اس کو میرے حال کا علم ہے اور اس چیز نے مجھے سوال کرنے سے روک دیا ہے۔ مجھے وہ پسند ہے جسے وہ پسند کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ محض اس کے لیے مجھے آگ میں ڈال رہے ہیں۔ اب سوال کرنے کی ضرورت نہیں"۔

ص ۳۶۱
۴۵۱

محمد بن فضیلؒ فرماتے ہیں مجھے تعجب ہے کہ لوگ دنیا میں اس کے (اللہ کے) گھر کی تلاش کرتے ہیں۔ اپنے دل میں اس کا مشاہدہ طلب نہیں کرتے۔ حالانکہ خانہ کعبہ کبھی موجود ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا۔ دل میں مشاہدہ حق لامحالہ ہوتا ہے۔

سنگِ کعبہ کی زیارت فریضہ ہے اور اس پر سال میں اس کی صرف ایک بار نظر ہوتی ہے۔ اس کے برعکس دل پر شب و روز تین سو ساٹھ بار چشمِ رحمت ہوتی ہے۔ دل کعبہ سے بڑھ کر قابلِ زیارت ہے۔ تاہم اہلِ تحقیق کے لیے راہ مکہ میں ہر قدم ایک نشانِ حق ہے۔ اور حرم میں پہنچ کر تو ہر ایک کو خلعت نصیب ہوتا ہے۔

ص ۳۶۲/۴۵۲

بایزیدؒ فرماتے ہیں کہ آخرت میں ثوابِ طاعت پر نظر رکھنے والے سے کہو کہ آج اس کی طاعت طاعت نہیں کیونکہ عبادت اور مجاہدہ کے ہر سانس کا ثواب آج ہی میسر آنا چاہیئے۔ فرماتے ہیں کہ پہلی بار حج میں مَیں نے سوائے خانہ کعبہ کے اور کچھ نہیں دیکھا۔ دوسری بار خانہ کعبہ کو بھی دیکھا اور خانہ کعبہ والے کو بھی دیکھا۔ تیسری بار صرف خانہ کعبہ والے ہی کو دیکھا خانہ کعبہ کو نہیں دیکھا۔ الغرض حرم جائے مشاہدہ پر ہوتا ہے جائے مجاہدہ پر نہیں ہوتا۔ اور اس کے لیے تعظیم ہے جس کی نظر میں سارا عالم قربِ حق کا مقام اور محبت کی خلوت گاہ نہ ہو وہ محبتِ حق سے بے بہرہ ہوتا ہے۔ صاحبِ مشاہدہ کے لیے سارا عالم حرم ہے اور مشاہدہ حق سے محروم کے لیے حرم کعبہ بھی تاریک ترین مقام ہے۔ ع

محبوب کا گھر محبوب کے بغیر تمام جگہوں سے زیادہ تاریک ہوتا ہے

قدر و قیمت تو مشاہدۂ رضا کی ہوتی ہے جو مقامِ دوستی (خُلّت) پر حاصل ہو اور جس کا ذریعہ حق تعالیٰ نے زیارتِ کعبہ کو رکھا ہے۔ زیارتِ کعبہ بذاتِ خود کوئی چیز نہیں۔ تاہم ہر سبب (ذریعہ) کا مسبب سے تعلق ہوتا ہے۔ کیا خبر عنایتِ حق تعالیٰ کا ظہور کہاں سے ہو اور طالب کی مراد کدھر سے رونما ہو۔ مردانِ حق دشت و بیابان میں جو دیدارِ الٰہی کے لیے سرگرداں ہوتے ہیں کیونکہ دوست کو حرمِ دوست دیکھنا جائز نہیں۔ ان کا مقصد اک شوقِ بے تاب اور محبت میں ایک آرزوئے بے گداز کے ساتھ مجاہدہ کرنا ہوتا ہے۔

کوئی شخص حضرت جنیدؒ کے پاس آیا۔ آپ نے پوچھا تم کہاں سے آئے ہو۔ عرض کی میں حج کے لیے گیا ہوا تھا۔ آپ نے پوچھا کیا حج کر لیا؟ اس نے جواب دیا "جی ہاں"۔ فرمایا "کیا گھر اور وطن چھوڑتے وقت سب گناہوں کو بھی چھوڑا؟" اس نے نفی میں جواب دیا۔ آپ نے فرمایا۔ "تم نے وطن سے سفر نہیں کیا۔ اچھا جب تم گھر سے نکلے اور رات کے وقت کسی جگہ قیام کیا تو کیا طریقِ حق کی بھی کوئی منزل طے کی؟" جواب پھر نفی میں تھا۔ آپ نے پھر فرمایا۔ "تم نے کوئی منزل طے نہیں کی"۔ اچھا جب تم نے میقات پر احرام باندھا تو کیا اپنی صفاتِ بشری سے بھی روگرداں ہوئے؟" جواب نفی میں پا کر آپ نے پھر فرمایا، "تم نے احرام نہیں باندھا"۔ اچھا۔ جب تم عرفات کے میدان میں کھڑے ہوئے تو

ص ۳۶۲/۴۵۳

کیا کشف و مشاہدہ میں بھی کھڑا ہونا نصیب ہُوا۔ جواب نفی تھا۔ آپ نے فرمایا "تم عرفات میں کھڑے نہیں ہوئے۔ اچھا۔ جب تم مزدلفہ میں گئے اور تمہارا مقصد پورا ہو گیا تو کیا اپنی نفسانی خواہشات کو ترک کر دیا" جواب ملا نہیں۔ فرمایا "تم مزدلفہ بھی نہیں گئے۔ اچھا جب بیت اللہ کا طواف کیا تو باطن کی آنکھ سے تنزیہہ (حق تعالیٰ کو ہر عیب سے منزہ سمجھنا) کے مقام میں حق تعالیٰ کے لطائفِ جمال کو دیکھا؟" جواب پھر نفی میں تھا۔ آپ نے پھر کہا "تم نے طواف بھی نہیں کیا۔ اچھا صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے وقت کیا تم نے صفا اور مروہ کا درجہ سمجھا" جواب نفی میں تھا۔ آپ نے فرمایا "تم نے سعی بھی نہیں کی۔ اچھا جب منیٰ میں آئے تو کیا تمہاری حسرتیں ساقط ہو گئیں"؟ عرض کیا نہیں۔ آپ نے فرمایا "تم منیٰ بھی نہیں گئے۔ اچھا جب قربان گاہ پر قربانی دی تو کیا خواہشاتِ نفس کو قربان کیا؟" عرض کیا نہیں۔ آپ نے پھر فرمایا "تم نے قربانی بھی نہیں دی۔ اچھا۔ جب کنکر پھینکے تو تمام نفسانی امور پھینک دیئے؟" جواب پھر نفی میں تھا۔ آپ نے فرمایا "تم نے کنکر بھی نہیں پھینکے۔ تمہارا حج بھی نہیں ہُوا۔ واپس جاؤ اور اس طریق پر حج کرو تاکہ مقامِ ابراہیم نصیب ہو۔

میں نے سُنا ایک بزرگ کعبہ کے سامنے گریہ و زاری کر رہے تھے اور یہ اشعار ان کی زبان پر تھے:

واصبحت یوم النحر والعیس ترحل

وکان حدّ الحادی بنا دھو مُعجل

اسایل عن سُلمی فھل من مُخَبِّرِ

بانّ لہ علماً بھا این تنزل

لقد افسدت حجی و نسکی و عمرتی

و فی السرّ لی شغل عن الحجّ مشغل

سارجع من عامی لحجّۃ قابلٍ

فانّ الذی قد کان لا یتقبّل

ص ۳۶۳/۲۵۴

ترجمہ: حج میں قربانی کے روز صبح ہوئی سفید اونٹ کوچ کر رہے تھے۔ حدی خواں حدی پڑھ کر اونٹوں کو چلا رہا تھا اور جلدی کر رہا تھا۔

میں اپنی محبوبہ سلمیٰ سے متعلق پوچھ رہا تھا کوئی بتائے کہ وہ کہاں اترے گی؟

اس محبوبہ نے تو میرا حج، میری قربانی اور میرا عمرہ سب فاسد کر دیئے۔ اس کے فراق نے دل میں وہ کیفیت پیدا کر دی ہے جو حج سے دور رکھے دیتی ہے۔ میں آئندہ سال حج کے لیے لوٹ جاؤں گا۔ کیونکہ جو حج ہو چکا ہے وہ قبول نہیں ہوگا۔

حضرت فضیل بن عیاضؒ فرماتے ہیں میں نے ایک نوجوان کو حج کے دوران خاموش کھڑے ہوئے دیکھا۔ لوگ دعا مانگ رہے تھے وہ سر جھکائے کھڑا تھا۔ میں نے پوچھا تم کیوں دعا میں شریک نہیں ہوتے۔ اس نے جواب دیا میں وحشت میں مبتلا ہوں۔ میرا وقت فوت ہو گیا ہے۔ اب دعا کی کوئی صورت نہیں۔ میں نے کہا دعا کر خدا اس اجتماع کی برکت سے تیری مراد پوری کرے۔ اس نے چاہا کہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے مگر بے اختیار اس نے ایک آہ بھری۔ اور جان بحق ہو گیا۔

حضرت ذو النون مصریؒ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک جوان کو منیٰ میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔ سب لوگ قربانی میں مشغول تھے۔ میں اسے دیکھتا رہا وہ کون ہے اور کیا کرتا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا "بار خدایا! سب لوگ قربانی کر رہے ہیں۔ میں اپنے نفس کو تیری راہ میں قربان کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے قبول فرما" یہ بات کہی اور انگشت شہادت سے اپنے گلے کی طرف اشارہ کیا اور گر پڑا۔ میں نے دیکھا تو روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ اللہ اس پر رحم کرے۔

حج دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک غیبت میں ایک حضوری میں۔ جو آدمی حرم کعبہ میں حاضر ہو کر بھی غیبت میں مبتلا ہو اس کی مثال ایسے شخص کی ہے جو اپنے گھر میں موجود ہو اور غیب ہو۔ غیبت بہر حال غیبت ہوتی ہے۔ جو شخص اپنے گھر میں ہوتے ہوئے بھی حاضر بحق ہو۔ وہ گویا حاضر بارگاہِ کعبہ ہے۔ کیونکہ حضورِ حق ہر جگہ حضورِ حق ہے۔ حج ایک صورتِ مجاہدہ ہے کشفِ مشاہدہ کے لیے۔ اور مجاہدہ علتِ مشاہدہ نہیں۔ بلکہ سببِ مشاہدہ ہوتا ہے۔ اور سبب کو حقیقتِ معانی میں نہ زیادہ رسوخ نہیں ہوتا۔ مقصودِ حج زیارت خانہ کعبہ نہیں ہوتی۔ مقصد کشفِ مشاہدہ ہوتا ہے۔ اب میں اسی موضوع پر ایک باب رقم کرتا ہوں جو تیرے مقصد کی تکمیل میں کام آئے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ص ۳۶۴/۲۵۵

۱۹

انیسواں باب

مشاہدہ

پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا : اجیعوا بطونکم دعوا الحرص واعروا اجسادکم قصروا الامل واظماؤا اکبادکم دعوا الدنیا لعلکم ترون اللہ بقلوبکم " اپنے پیٹوں کو خالی رکھو، حرص کو چھوڑو، جسموں کو لباس سے آراستہ نہ کرو، تمناؤں کو کم کرو، جگروں کو پیاسا رکھو، دنیا سے روگردانی اختیار کرو تاکہ تمہیں دلوں میں مشاہدۂ حق حاصل ہو"۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے ماہیتِ احسان سے متعلق سوال کیا۔ تو آپ نے فرمایا۔ احسان یہ ہے کہ : اعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک "عبادت گذار اس طرح عبادت کرے کہ گویا وہ حق تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے اگر تو حق تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتا تو حق تعالیٰ یقیناً تجھے دیکھ رہا ہے۔ حق تعالیٰ نے حضرت داود علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی : یاداود اتدری ما المعرفۃ قال لا قال ھی حیوۃ القلب فی مشاھدتی " اے داؤد! معلوم ہے میری معرفت کیا ہے! عرض کیا نہیں۔ فرمایا میرے مشاہدہ سے دل کا زندہ ہونا"

اہلِ تصوف کے نزدیک مشاہدہ ذاتِ حق کو چشمِ باطن سے دیکھنے کا نام ہے یعنی جلوۂ حق دل میں تجزیہ کیے بغیر دیکھے خلوت ہو یا جلوت۔

حضرت ابوالعباس بن عطاؒ اس قولِ حق کی تفسیر کر رہے تھے : اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا "بلاشبہ جن لوگوں نے کہا ہمارا پروردگار تو اللہ ہے اور پھر اس پر مضبوطی سے ثابت قدم رہے"۔ تفسیر کے دوران میں فرمایا" جن لوگوں نے مجاہدہ میں یوں کہا کہ ہمارا پروردگار تو اللہ تعالیٰ ہے۔ اور پھر مشاہدۂ حق کی بساط پر مضبوطی سے ثابت قدم رہے"۔

مشاہدہ کی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ ایک مشاہدہ صحیح یقین سے اور دوسرا غلبۂ محبت حق سے یعنی غلبۂ محبت

کا وہ مقام حاصل ہو۔ جہاں طالب ہمہ تن حدیثِ محبوب ہو کر رہ جائے اور اسے بجز اس کے کچھ نظر نہ آئے۔

محمد بن واسع فرماتے ہیں "میں نے صحیح یقین کے ساتھ ہر چیز میں جلوۂ محبوب حق دیکھا" ایک اور شیخ طریقت نے فرمایا۔ "میں نے کوئی چیز نہیں دیکھی جس کی سمت مجھے دیدارِ حق نہ ہوا ہو"

ص ۳۶۵/۴۵۶ حضرت شبلیؒ فرماتے ہیں: ما رایت شیئاً قط الا اللہ یعنی بغلبات المحبۃ وغلیان المشاھدۃ "میں نے غلبۂ محبت حق میں اور مشاہدۂ حق کے ظہور میں جز باری تعالیٰ کسی چیز کو نہیں دیکھا"۔ ایک آدمی کسی چیز کو ظاہری آنکھ سے دیکھتا ہے اور اس کے فاعل پہ ظاہری نظر پڑتی ہے۔ دوسرا فاعل کی محبت میں مستغرق ہو کر ہر چیز سے قطع نظر کر لیتا ہے اور صرف فاعل کو دیکھتا ہے۔ پہلا طریق استدلال ہے دوسرا جذبۂ باطن۔ استدلال میں حق کو دلائل سے ثابت کیا جاتا ہے۔ دوسری صورت میں طالب مجذوب و بے خودِ شوق ہوتا ہے۔ دلائل و حقائق اس کے لیے حجاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ "جو شخص کسی چیز کو پہچان لیتا ہے۔ اس کے بغیر اسے تسکینِ خاطر نہیں ہوتی۔ جب کوئی شخص محبت کرتا ہے تو وہ سوائے محبوب چیز کے کسی پر نظر نہیں ڈالتا۔ وہ (محبوب کے) افعال و احکام پر اعتراض کرنے یا ان کی مخالفت کرنے سے اعراض کرتا ہے" تاکہ خلاف اور تصرف میں مبتلا نہ ہو جائے۔

حق تعالیٰ نے پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معراج کے متعلق بیان کرتے ہوئے فرمایا: مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی "آپ کی نظر نہ تجلیات حق سے بھٹکی اور نہ (حد سے) آگے بڑھی"۔ یہاں تک کہ آپ کی چشم باطن نے ہر دیکھنے والی چیز کو دیکھ لیا۔ جب محبّ حق موجودات سے نظر پھیر لیتا ہے۔ تو چشمِ باطن سے مشاہدہ حق میں مشغول ہو جاتا ہے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ "اہلِ ایمان سے کہہ دو کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں"۔ یعنی ظاہری آنکھ کو نفسانی خواہشات سے اور باطنی آنکھ کو مخلوقات سے"۔ جو آدمی مجاہدہ کر کے ظاہری آنکھ کو مرغوبات سے روک لیتا ہے وہ یقیناً باطنی آنکھ سے مشاہدۂ حق سے بہرہ یاب ہوتا ہے کیونکہ "جو مجاہدہ میں مخلص ہو وہ مشاہدہ میں صادق ہوتا ہے"۔

ص ۳۶۶/۴۵۷ باطن کی نظر مشاہدہ مجاہدۂ ظاہر سے وابستہ ہے حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ فرماتے ہیں: "جو چشم زدن کے لیے اپنی نظر حق تعالیٰ سے پھیر لیتا ہے وہ ساری عمر ہدایت نہیں پا سکتا"۔ کیونکہ غیر پر نظر ڈالنا غیر کی طرف رجوع کرنا ہے۔ اور جس کو قضا و قدر نے غیر اللہ کے اختیار میں چھوڑ دیا وہ ہلاکت کا شکار ہو گیا۔ اہلِ مشاہدہ کی زندگی یہی

ہے کہ وہ مشاہدۂ حق میں مشغول رہیں۔ جو زندگی کا حصہ حق تعالیٰ سے دوری میں گذرتا ہے وہ اسے زندگی میں شمار ہی نہیں کرتے اور حقیقت میں ان کے لیے موت کے برابر ہوتا ہے۔

حضرت بایزید بسطامیؒ سے آپ کی عمر پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا چار سال یا بروایتِ دیگر چالیس سال۔ لوگوں کو تعجب ہُوا تو آپ نے فرمایا میں ستر برس تک دنیوی حجابات میں رہا ہوں۔ صرف چار سال سے مشاہدۂ حق میں مصروف ہوں۔ حجاب کا زمانہ شاملِ زندگی نہیں ہوتا۔

شبلیؒ دعا میں کہا کرتے تھے "اے خدا! دوزخ و جنت کو چھپا لے تاکہ تیری عبادت بلا واسطہ اور بغیر کسی لالچ کے ہو"۔ طبیعت میں بہشت کی خواہش ہوتی ہے اور اکثر عبادت اسی لیے کی جاتی ہے۔ دل میں محبت حق جاگزین نہیں ہوتی اور آدمی اپنی غفلت کی وجہ سے مشاہدۂ حق سے محروم رہتا ہے۔ پیغمبر صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے واقعۂ معراج بیان کرتے ہوئے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ میں نے حق تعالیٰ کو نہیں دیکھا حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے حق تعالیٰ کو دیکھا۔ لوگوں میں اس بات پر اختلاف رونما ہُوا۔ مگر دوستانِ حق نے جو بہتر صورت تھی اسے چن لیا یعنی آپ نے جو یہ فرمایا کہ میں نے حق تعالیٰ کو نہیں دیکھا۔ اس سے مراد ظاہر کی آنکھ سے دیکھنا تھا۔ دونوں میں ایک صاحبِ باطن تھا۔ اور دوسرا اہلِ ظاہر۔ آپ نے ہر ایک سے بقدرِ فہم بات کی جب چشم باطن سے دیکھ لیا تو چشمِ ظاہر سے نہ دیکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ص ۳۶۸ / ۲۵۸

جنیدؒ فرماتے ہیں کہ اگر حق تعالیٰ فرمائے کہ مجھے دیکھ تو میں نہ دیکھوں کیونکہ محبت میں آنکھ کی حیثیت غیر اور بیگانے کی ہے۔ رشکِ غیر مانع دیدار ہے۔ جب دنیا میں اس کو واسطۂ چشم کے بغیر دیکھتا رہا ہوں تو آخرت میں اس کا واسطہ کیوں تلاش کروں۔ شعر (ترجمہ)

مجھے تیرے دیکھنے والوں پر رشک آتا ہے۔ جب میں تیری طرف دیکھتا ہوں تو اپنی آنکھ بند کر لیتا ہوں۔

غالب نے اسی مضمون کو یوں ادا کر دیا ہے (مترجم)

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے

میں تجھے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

کسی بزرگ سے پوچھا گیا "کیا آپ خدا کو دیکھنا چاہتے ہیں" فرمایا نہیں۔ پوچھا کیوں؟ فرمایا۔ موسیٰ علیہ السلام نے درخواست کی تو دیکھ نہ پائے۔ حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے درخواست نہیں کی اور دیدار سے سرفراز ہوئے۔ دراصل ہماری خواہش ہی ایک حجاب ہے۔ ارادہ مخالفت کی دلیل ہے اور مخالفت وجہ حجاب ہوتی ہے۔ ارادہ ختم ہو تو مشاہدہ حاصل ہوتا ہے اور مشاہدہ حاصل ہو تو دنیا و عقبیٰ برابر ہو جاتے ہیں۔

حضرت بایزیدؒ فرماتے ہیں "اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں جو دنیا و آخرت میں رویت حق سے محروم ہوں تو مرتد ہو جائیں" یعنی ان کی پرورش دائمی مشاہدہ سے ہوتی ہے۔ محبت کی زندگی سے وہ زندہ ہیں۔ صاحب مشاہدہ اگر محرومِ مشاہدہ ہو تو گویا راندۂ درگاہ ہو جاتا ہے۔

حضرت ذوالنون مصریؒ کہتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ مصر میں دیکھا کہ کچھ لڑکے ایک جوان کو پتھر مار رہے ہیں میں نے پوچھا ایسا کیوں کرتے ہو۔ لڑکوں نے کہا یہ دیوانہ ہے۔ پوچھا تم نے اس کا کیا دیوانہ پن دیکھا؟ لڑکوں نے کہا۔ یہ کہتا ہے کہ میں خدا کو دیکھ رہا ہوں میں نے جوان کو مخاطب کر کے پوچھا کیا یہ سچ ہے یا لڑکے صرف تہمت تراش رہے ہیں۔ جوان نے جواب دیا کہ ہاں۔ اگر حق تعالیٰ ایک لحظہ میری نظر سے چھپ جائے تو حجاب حائل ہو جائے۔ اور میں طاعت سے محروم ہو جاؤں۔

ص $\frac{۳۶۸}{۴۵۹}$

یہاں ایک جماعت کو اہل طریقت سے متعلق ایک مغالطہ ہوا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ رویتِ حق اور چشم باطن کا مشاہدہ ایک صورت ہے جو ذکر و فکر کی حالت میں واہمہ کی بدولت دل میں پیدا ہوتی ہے۔ یہ محض شعبہ اور صریح گمراہی ہے۔ حق تعالیٰ کی ذات اندازہ و مقدار سے بالاتر ہے کہ کسی کی عقل اس کا ادراک کر سکے خدا تعالیٰ کے متعلق جو کچھ انسانی عقل میں آئیگا وہ سراسر وہم ہوگا۔ حق تعالیٰ کسی جنس کا متحمل نہیں اور جملہ لطائف و کثائف ایک دوسرے سے جنسی طور پر وابستہ ہیں۔ تضاد کی حالت میں بھی ہم جنسیت قائم رہتی ہے۔ توحید کی حقیقت بھی قدیم کے مقابل ایک جنس کی ہے کیونکہ متضاد چیزیں سب حادث ہوتی اور سب حادث ہم جنس ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان باتوں سے اور ہر اس چیز سے جو ملحد اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ پاک اور بالاتر ہے۔ اس دنیا میں مشاہدۂ حق اور عقبیٰ میں رویتِ حق برابر ہے۔ اگر رویتِ حق آخرت میں جملہ صحابہ کرام کے اتفاق اور اجماع کے ساتھ ثابت ہے تو مشاہدہ دنیا میں بھی روا ہونا چاہیئے۔ رویتِ عقبیٰ کی خبر دینے والے اور مشاہدۂ دنیا کی خبر دینے والے میں کوئی فرق

نہیں اور جو کوئی بھی ان دونوں سے متعلق خبر دے گا۔ وہ از روئے مشاہدہ اجازت سے خبر دے گا دعویٰ سے نہیں۔ وہ یہی کہہ سکتا ہے کہ آخرت میں دیدارِ حق اور دنیا میں مشاہدۂ حق روا ہے۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے مشاہدہ ہوا ہے یا اس وقت مشاہدہ کر رہا ہوں۔ مشاہدہ باطن کا وصف ہے اور اس کا اظہار عبارت آرائی ہے۔ اگر زبان باطن سے آشنا ہو اور کیفیتِ مشاہدہ کو الفاظ میں ڈھال سکے تو مشاہدہ نہیں۔ دعوائے مشاہدہ ہے۔ کیونکہ جس کیفیت کی اصل عقل سے باہر ہو۔ زبان اس کو الفاظ کا جامہ کیسے پہنا سکتی ہے بجز ایک مجازی صورت کے کیونکہ مشاہدہ دل کے حاضر اور زبان کے قاصر ہو جانے کا نام ہے۔ یہی سبب ہے کہ خاموشی گفتگو سے بہتر ہے۔ خاموشی علامتِ مشاہدہ ہے اور گفتگو شہادتِ مشاہدہ۔ شہادت اور مشاہدہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قربِ حق کے اس بلند مقام پر جو آپ کو عطا ہوا فرمایا" میں تیری ثنا پر حاوی نہیں ہو سکتا (احاطہ نہیں کر سکتا)" حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم مقامِ مشاہدہ پر تھے۔ اور مشاہدہ کمال اتحاد ہوتا ہے۔ اتحاد کے عالم میں زبان کو کام میں لانا بے گانگی کا اظہار ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا" تو وہ ہے کہ بس اپنی ثنا آپ کر رہا ہے"۔ یعنی یہاں جو تو کہے وہ گویا میں نے کہا ہے۔ جو تو اپنی ثنا کرے وہ گویا میں نے کی ہے۔ میری زبان اس قابل نہیں کہ میرے حال کو معرضِ بیان میں لا سکے اور بیان خود اس لائق نہیں کہ میری کیفیت کا اظہار کر سکے۔ اسی موضوع پر کسی کا شعر ہے (ترجمہ)

اس سے ملنے کی تمنا تھی جب ملا تو حیرت کا یہ عالم ہے کہ نہ زبان پر اختیار ہے نہ آنکھ پر۔

یہ ہیں جملہ احکامِ مشاہدہ مختصراً۔ اور توفیق من اللہ ہے۔

ص ۳۶۹/۳۷۰

کشفِ حجاب نہم۔ صحبت اور اس کے آداب و احکام

حق تعالیٰ نے فرمایا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا ای ادّبوھم "اے ایمان والو! اپنی ذات کو اپنے اہل و عیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ . . . . . ان کو ادب سکھاؤ"۔ پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا حسن الادب من الایمان "اچھا ادب ایمان کا جزو ہے"۔ اور نیز فرمایا: ادّبنی ربّی فاحسن تادیبی "میرے پروردگار نے مجھے ادب سکھایا اور اچھا ادب سکھایا"۔ دین اور دنیا کے تمام کاموں کی آرائش ادب پر منحصر ہے۔ سب لوگ کافر، مسلمان، ملحد، موحد، سنی اور بدعتی متفق ہیں کہ معاملات میں حسنِ ادب ایک پسندیدہ چیز ہے۔ دنیا کی کوئی رسم بھی

جز بحسنِ ادب پوری نہیں ہو سکتی۔ لوگوں میں حفظِ مروّت، دین میں حفظِ سنت اور محبت میں حفظِ حرمت کا نام ادب ہے۔ تینوں چیزیں ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں جسے پاسِ مروّت نہیں وہ تابع سنت نہیں اور جو تابع سنت نہیں اسے پاسِ حرمت نہیں۔ اعمال میں پاسِ ادب مطلوب کی تعظیم سے حاصل ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ اور اس کی آیات کی تعظیم جزوِ تقویٰ ہے جو شخص بے ادبی سے تجلیاتِ حق کی تعظیم کو نظر انداز کرتا ہے۔ اسے طریقت میں کوئی مقام نہیں ملتا۔ کسی حالت میں بھی جذب و غلبۂ حال طالب حق کو پاسِ ادب سے منع نہیں کرتا۔ ادب طالبان حق کی عادت میں شامل ہوتا ہے۔ اور عادت طبیعتِ ثانیہ ہوا کرتی ہے۔ طبیعت کبھی ساقط نہیں ہوتی۔ زندگی ہو تو طبیعت موجود ہوتی ہے۔ جب تک وجود قائم ہے طالبانِ حق پاس ادب کو کبھی تکلّف سے اور کبھی بے تکلّف ملحوظِ خاطر رکھتے ہیں۔ عالمِ ہوشیاری میں اگر پاس ادب تکلف سے ہوتا ہے تو عالمِ جذب میں حق تعالیٰ ان کے پاسِ ادب کی حفاظت کرتا ہے۔ یاد رکھو ولی اللہ کسی عالم میں بھی تارک ادب نہیں ہوتا۔ ولایت کے لیے سنتِ پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی ضروری ہے اور تارکِ ادب اخلاقِ محمدی سے بہت دور ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ترکِ ادب فقدانِ محبّت کی دلیل ہے۔ کیونکہ محبّت ادب ہونے کی صورت میں ہوتی ہے اور اچھا ادب دوستی کی صفت ہے۔ جسے کرامت نصیب ہو اللہ تعالیٰ اُسے آدابِ دین کی پاسداری کی توفیق عطا کرتا ہے۔ اس کے برعکس ملحد (اللہ ان پر لعنت کرے) کہتے ہیں کہ جب بندہ مغلوبِ محبّت ہو جاتا ہے تو دین کی متابعت ساقط ہو جاتی ہے۔ میں اس چیز کو کسی دوسرے مقام پر زیادہ وضاحت سے بیان کروں گا۔ انشاءاللہ۔

ص ۳۷۰/۴۶۲

آداب کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ اوّل آدابِ توحید یعنی خلوت وجلوت میں بے ادب نہ ہونے پائے۔ اعمال میں ایسا رویہ اختیار کرے جیسے بادشاہوں کے حضور کیا جاتا ہے۔ احادیث میں مذکور ہے کہ ایک دن پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پاؤں پھیلا کر بیٹھے ہوئے تھے کہ جبرائیل علیہ السلام نے آکر کہا "اے رسول (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) بارگاہِ حق میں غلاموں کی طرح بیٹھیے۔" کہتے ہیں حضرت حارث محاسبی رحمہ اللہ تعالیٰ چالیس برس تک دیوار سے پیٹھ لگا کے دوزانو بیٹھے رہے لوگوں نے کہا آپ کیوں اس قدر تکلیف برداشت کرتے ہیں۔ فرمایا مجھے شرم آتی ہے کہ میں مشاہدۂ حق میں غلاموں کی طرح نہ بیٹھوں۔

میں (علی بن عثمان جلابیؒ) خراسان کے ایک گاؤں کمند میں پہنچا۔ وہاں ایک معروف آدمی "ادیب کمندی" رہتا تھا۔ بزرگ آدمی تھا۔ چوبیس برس سے کھڑا تھا اور نماز میں صرف تشہد کے لیے بیٹھتا تھا۔ میں نے پوچھا تو کہا مجھے

ابھی وہ مقام نصیب نہیں کہ مشاہدۂ حق میں بیٹھ سکوں۔

حضرت بایزیدؒ سے لوگوں نے دریافت کیا" آپ کو یہ مقام کس وجہ سے ملا؟" فرمایا میں نے کبھی حق تعالیٰ کے حد آدابِ صحبت کو نظر انداز نہیں کیا۔ خلوت وجلوت میں یکساں رہا ہوں۔ کسی حالت میں پاسِ ادب کو نہیں چھوڑا معبود کے مشاہدہ میں پاسِ ادب زلیخا سے سیکھنا چاہیئے۔ جب یوسف علیہ السلام کے سامنے خلوت میں اپنی خواہش کی قبولیت کی درخواست کی تو پہلے بت کا چہرہ ڈھانپ دیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے پوچھا یہ کیوں؟ کہا میں نہیں چاہتی کہ میرا معبود مجھے تمہارے ساتھ اس بے حرمتی کے عالم میں دیکھے۔ یہ شرطِ ادب نہیں۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام حضرت یعقوب علیہ السلام کو مل گئے۔ زلیخا کو حق تعالیٰ نے از سرِ نو جوان کر دیا۔ اسے راہِ اسلام نصیب ہوئی اور وہ حضرت یوسف علیہ السلام کی زوجیت میں آ گئی۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے قریب جانے کا قصد کیا تو پیچھے ہٹ گئی۔ آپ نے کہا اے زلیخا! میں تیرا وہی محبوب ہوں۔ دور کیوں ہٹ رہی ہو۔ کیا میری محبت ختم ہو گئی۔ زلیخا نے کہا ہرگز نہیں بلکہ اب بہت زیادہ ہے۔ مگر میں نے ہمیشہ آدابِ معبود کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ پہلے دن عالمِ خلوت میں میرا معبود ایک بت تھا۔ اس کی آنکھیں نہیں تھیں مگر اس پر کوئی چیز ڈال دی تاکہ تہمتِ بے ادبی سے بچ سکوں۔ اب تو میرا معبود وہ ہے۔ جو بغیر آنکھ یا اور کسی آلۂ کار کے دیکھ رہا ہے۔ ہر حالت میں اس کی نظر میرے اوپر ہے۔ میں نہیں چاہتی۔ مجھ سے ترکِ ادب سرزد ہو۔

جب پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم معراج پر تشریف لے گئے۔ تو بپاسِ ادب ہر دو عالم کو نظر انداز کر دیا۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا: مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی مازاغ البصر ای برؤیۃ الدنیا وما طغی ای برؤیۃ العقبیٰ " آپ کی نظر دنیا کے مناظر میں نہیں کھوئی اور نہ عقبیٰ کی طرف تجاوز کیا۔"

ادب کی دوسری قسم اپنی ذات سے متعلق ہے یعنی آدمی کو چاہیئے کہ ہر حالت میں اپنے نفس کے ساتھ مروت ملحوظِ خاطر رکھے۔ یہاں تک کہ جو چیز حق تعالیٰ کے لیے یا عام خلقت کے لیے خارج از ادب ہے اسے اپنی ذات کے لیے بھی روا نہ رکھے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ہمیشہ صداقت پر کاربند رہے جس چیز کے وہ خود خلاف ہو وہ زبان پر نہ لائے کیونکہ یہ بے مروتی ہے۔ کم کھائے تاکہ طہارت گاہ میں کم جانا پڑے۔ اپنی کسی ایسی چیز کو نہ دیکھے جس پر کسی غیر کی نظر پڑنا بھی حرام ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کبھی اپنی عریانی کو نہیں دیکھا تھا۔ لوگوں نے پوچھا تو فرمایا مجھے شرم آتی

ص ۱/۴۶۳
ص ۳۸۲/۴۶۳

ہے کہ ایسی چیز کو دیکھوں جس کی ہم جنس چیز کو دیکھنا میرے لیے حرام ہے۔

ادب کی تیسری قسم باقی مخلوق سے متعلق ہے۔ اس میں عظیم ترین چیز یہ ہے کہ سفر و حضر میں مخلوق کے ساتھ حسنِ معاملت سے پیش آئے اور پیروی سنت کو پیش نظر رکھے۔ ان تینوں قسموں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتے۔ اب میں تینوں اقسام کو ترتیب وار بیان کروں گا تاکہ تیرے لیے اور دیگر پڑھنے والوں کے لیے بات سہل ہو جائے۔ انشاء اللہ العزیز۔

۲۰

بیسواں باب

صحبت اور صحبت سے متعلقہ امور

باری تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا "جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے اللہ تعالیٰ ان کو دوست رکھتا ہے" یعنی اس لیے کہ وہ اپنے بھائیوں کے حقوق ادا کرتے ہیں۔ اور ان کو اپنے اوپر فضیلت دیتے ہیں۔ پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ثلث تصفین لك ودّ اخیك ان تسلم علیہ ان لقیتہ وتوسع لہ فی المجلس وتدعوہ باحب اسمائہ "تین چیزیں بھائی کے دل میں دوستی کو محکم کرتی ہیں۔ اول یہ کہ اگر سرِ راہ ملے تو سلام کرے۔ دوسرے یہ کہ مجلس میں اس کے لیے کشادہ جگہ دے۔ اور تیسرے یہ کہ تو اسے اس نام سے پکار جو اسے زیادہ پسند ہو"۔

ص ۳۷۳/۴۶۵

اور نیز حق تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْكُمْ "سب مومن بھائی بھائی ہیں بھائیوں میں صلح اور آشتی پیدا کرو" سب کے لیے حکم ہے کہ دو مسلمان بھائیوں میں لطف و مہربانی کے جذبات پیدا کرو، تاکہ کسی کے دل میں ایک دوسرے سے خلش نہ رہے۔ پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اکثروا من الاخوان فانّ ربکم حیّ کریم یستحی ان یعذّب عبدہ بین اخوتہ یوم القیمۃ "اپنے بھائی زیادہ بناؤ۔ تمہارا پروردگار حیّ کریم ہے۔ روز قیامت وہ اپنے کرم کی بدولت کسی کو اس کے بھائیوں کے درمیان عذاب نہیں دے گا"۔

یہ ضروری ہے کہ ہم نشینی حق تعالیٰ کے لیے ہو خواہشِ نفس کے حصول کے لیے نہ ہو۔ اور نہ اپنی کوئی غرض یا مراد مدنظر ہو تاکہ انسان حفظِ ادب کی بدولت مشکور رہو۔

مالک بن دینارؒ نے اپنے داماد مغیرہ بن شعبہؒ سے فرمایا: "اے مغیرہ! جس بھائی یا دوست کی مصاحبت سے کوئی دینی فائدہ نہ ہو اسے ترک کر سلامتی اسی میں ہے۔"

مقصد یہ ہے کہ ہم نشینی یا اپنے سے بڑے کی اختیار کر یا چھوٹے کی۔ اگر ہم نشین بڑا ہے تو تجھے فائدہ ہوگا اور اگر چھوٹا ہے تو بھی تجھے فائدہ ہوگا۔ کیونکہ وہ تجھ سے کچھ سیکھ لے گا۔ بہرحال ہر روز دینی مفاد حاصل ہوگا۔ اسی لیے پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ان من تمام التقوىٰ تعليم من لم يعلم "جو شخص نہیں جانتا اس کو سکھانا بڑی پرہیزگاری میں داخل ہے۔"

ص ۳۷۲/۲۷۶

حضرت یحییٰ بن معاذؒ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: بئس الصديق صديق تحتاج ان تقول له اذكرني في دعائك وبئس الصديق صديق تحتاج ان تعيش معه بالمداراة وبئس الصديق صديق يلجيك الى الاعتذار في زلة كانت منك "برا ہے وہ دوست جسے یہ کہنا پڑے کہ مجھے دعا میں یاد رکھنا (کیونکہ ایک ساعت کا حقِ صحبت ہمیشہ دعائے خیر میں یاد رکھنا ہے) اور برا ہے وہ دوست جس کے ساتھ مدارات سے بسر کرنی پڑے (کیونکہ صحبت تو ہے ہی سرمایۂ مسرت) اور برا ہے وہ دوست جس کے سامنے قصور کے لیے معذرت کرنا پڑے (کیونکہ عذر دلیلِ بے گانگی ہے اور بے گانگی ہم نشینی میں ظلم ہے)

پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: المرء على دين خليله فلينظر احدكم من يخالل "آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے اس لیے تم میں سے ہر ایک کو سوچنا چاہیئے کہ اس کا ہم نشین کون ہے۔" کیونکہ اگر کوئی نیک لوگوں کا ہم نشین ہے تو باوجود برا ہونے کے نیک کہلائے گا اور ان کی ہم نشینی اسے نیک کر دے گی۔ بروں کی صحبت میں بیٹھنے والا نیک بھی ہو تو برا ہو جائے گا کیونکہ وہ ان کے افعالِ بد کی تائید کرتا رہے گا اور برائی کی تائید کرنے والا بھی برا ہوتا ہے۔

ایک شخص کعبہ کا طواف کر رہا تھا اور یہ دعا اس کے لب پر تھی: "اے اللہ میرے بھائیوں کی اصلاح فرما" لوگوں نے کہا اس بلند مقام پہ اپنے لیے دعا کیوں نہیں کرتا۔ اس نے جواب دیا "میرے بھائی ہیں جن کے پاس میں لوٹ کر جاؤں گا۔ اگر درست ہوئے تو میں بھی ان کی صحبت میں درست ہو جاؤں گا۔ اگر وہ خراب ہوئے تو میں بھی

لامحالہ خراب ہو جاؤں گا۔" مطلب یہ ہے کہ جب میری بہبودی میرے بھائیوں کی بہبودی پر موقوف ہے تو میں کیوں نہ ان کے لیے دعا کروں تاکہ میرا مقصود بھی ان کی وجہ سے حاصل ہو جائے۔ ان سب امور کی بنیاد اس چیز پر ہے کہ نفس کو تسکین دوستوں میں حاصل ہوتی ہے جس مجلس یا محفل میں انسان ہو گا اس کے عادات و افعال جذب کر لیتا ہے۔ کیونکہ وہ جملہ معاملت و ارادت حق و باطل کا ایک مرکب ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے وہی اس کی طبیعت پر غالب آجاتا ہے۔ طبیعت پر صحبت کا اثر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ عادت ایسی سخت چیز ہے کہ آدمی فیضِ صحبت سے عالم ہو جاتا ہے۔ طوطا تعلیم سے آدمی کی طرح بولنا سیکھ لیتا ہے۔ گھوڑا محنت سے حیوانیت کی عادات چھوڑ کر انسانی عادات اختیار کر لیتا ہے۔ ایسی اور بہت سی مثالیں ہیں جہاں صحبت کی تاثیر نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ مشائخ رضی اللہ عنہم ایک دوسرے سے فیضِ صحبت حاصل کرتے ہیں اور اپنے مریدوں کو اس بات کی تلقین کرتے ہیں۔ مشائخ کے درمیان یہ بات فریضہ کی طرح ہو گئی ہے۔

ص ۳۷۵/۴۶۷

اکثر مشائخ نے گروہِ صوفیا کے لیے آدابِ صحبت پر بسیط کتابیں لکھی ہیں۔ چنانچہ حضرت جنیدؒ نے ایک کتاب تحریر کی اور اس کا نام "تصحیح الارادت" رکھا۔ ایک کتاب احمد بن خضرویہؒ بلخی نے لکھی اور اس کا نام "الرعایۃ بحقوق اللہ" رکھا۔ محمد بن علی ترمذیؒ کی ایک کتاب "آداب المریدین" ہے۔

ص ۳۷۶/۴۶۸

ابوالقاسم حکیمؒ، ابوبکر وراق، سہل بن عبداللہ تستری، ابوعبدالرحمن سلمی اور استاد ابوالقاسم قشیری رحمہم اللہ تعالیٰ سب نے اس موضوع پر مفصل کتابیں لکھی ہیں اور سب لوگ اس فن کے امام ہوئے ہیں۔ میرا مقصود اس کتاب سے یہ ہے کہ اسے پڑھنے والا دوسری کتابوں کا حاجتمند نہ ہو۔ میں قبل ازیں تمہارے سوال کے جواب میں کہہ چکا ہوں کہ یہ کتاب تمہارے لیے اور دیگر طالبانِ طریقت کے لیے کافی ہونی چاہیئے۔ اس لیے میں ان صوفیائے کرام کے خیالات آدابِ معاملات کی مختلف اقسام پر ابواب کی صورت میں مرتب کرتا ہوں۔ واللہ اعلم۔

۲۱

اکیسواں باب

آدابِ صحبت

یہ تو واضح ہوگیا کہ مرید کے لیے سب سے اہم چیز ہم نشینی ہے اور لامحالہ ہم نشینی کے حقوق کی پاسداری فرض ہے۔ مرید کے لیے تنہائی ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔ اسی لیے پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: الشیطان مع الواحد وھو من الاثنین ابعد "ابلیس تنہا آدمی کے ساتھ ہوتا ہے اور دو سے دور ہوتا ہے"۔ حق تعالیٰ نے فرمایا: مَا یَکُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلٰثَۃٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ "اگر تین آدمی باہم مشورے کر رہے ہوں تو چوتھا باری تعالیٰ ہوتا ہے"۔ المختصر مرید کے لیے تنہائی سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں۔ حکایات میں آیا ہے کہ حضرت جنیدؒ کے ایک مرید کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ وہ درجۂ کمال کو پہنچ چکا ہے۔ اور اب اس کے لیے تنہائی ہم نشینی سے بہتر ہے۔ اس نے گوشۂ تنہائی اختیار کر لیا اور جماعتِ مشائخ سے روگرداں ہوگیا۔ رات کے وقت اس کے پاس ایک اونٹ لایا جاتا اور اسے کہا جاتا چلو تمہیں بہشت جانا ہے۔ وہ اونٹ پر سوار ہوتا اور وہ ایک پرفضا مقام پر پہنچ جاتے۔ خوبرو لوگوں کی معیّت میں عمدہ کھانے اس کے لیے مہیّا کیے جاتے۔ صبح تک وہ وہاں رہتا۔ پھر اسے نیند آجاتی اور بیدار ہوتا تو اپنے زاویہ (تکیہ) میں ہوتا۔ رفتہ رفتہ انسانی غرور اس کے دل و دماغ پر مسلّط ہوگیا اور تکبّر نے اسے پوری طرح جکڑ لیا۔ اور وہ اپنے اوپر اس حالت کے وارد ہونے کا دعویدار ہوگیا۔ حضرت جنیدرضؓ کو علم ہوا تو وہ اس کے زاویہ پر تشریف لائے اور دیکھا کہ وہ غرور اور تکبّر میں مبتلا ہے۔ حال دریافت کیا تو اس نے سب واقعہ بیان کر دیا۔ حضرت جنیدؒ نے کہا کہ آج رات اس مقام پر جانا ہو تو وہاں پہنچ کر تین بار پڑھنا "لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم"۔ ہنگام شب اسے پھر وہیں لے گئے۔ وہ دل ہی دل میں حضرت جنیدؒ کا منکر ہو رہا تھا۔ کچھ وقت گزرنے پر اس نے از راہ آزمائش تین بار "لاحول" پڑھا۔ جملہ حاضرین میں ایک خروش اٹھا اور سب کے سب چلے گئے۔ اور اس نے اپنے آپ کو ایک کوڑے کرکٹ کے

ص ۳۷۷/۴۶۹

ڈھیر پر بیٹھا ہوا پایا اور اس کے گرد مردار جانوروں کی ہڈیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے توبہ کی۔ الغرض مرید کے حق میں تنہائی سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں۔

ہم نشینی کی اہم شرط یہ ہے کہ ہر شخص کا درجہ ملحوظِ خاطر رہے۔ پیرِ طریقت کے ساتھ حرمت کا لحاظ۔ اپنے جیسوں کے ساتھ خوش وقتی۔ بچوں کے ساتھ شفقت اور بوڑھوں کے ساتھ پاسِ توقیر و حرمت۔ الغرض بوڑھوں کو باپ کا درجہ دے تو اپنے ہم عمروں کو بھائی سمجھے اور اپنے سے چھوٹوں کو فرزند۔ کینہ اور حسد سے دست بردار ہو، عداوت سے روگرداں ہو، جہاں نصیحت کی ضرورت ہو دریغ نہ کرے۔ ہم نشینی میں غیبت اور خیانت ناروا ہے۔ آپس میں ایک دوسرے کے قول و فعل کی قطع و برید منع ہے کیونکہ ہم نشینی صرف اللہ کے لیے ہے۔ اور وہ کسی قول یا فعل سے قطع نہیں ہو سکتی۔

ص ۳۷۸/۴۷۰

مصنف (علی بن عثمان الجلابیؒ) فرماتے ہیں کہ میں نے شیخ المشائخ ابوالقاسم گرگانیؒ سے پوچھا کہ شرط ہم نشینی کیا ہے؟ فرمایا شرطِ ہم نشینی یہ ہے کہ تو اپنے حصے کا طالب نہ ہو۔ ہم نشینی میں جملہ خرابیاں اسی چیز سے پیدا ہوتی ہیں کہ ہر شخص اپنا حصہ طلب کرتا ہے۔ حصہ طلب کرنے والے کے لیے ہم نشینی سے تنہائی بہتر ہے۔ حقیقی ہم نشینی یہ ہے کہ اپنے حصے سے دست بردار ہو کر ہم نشینوں کے حصے کی پاسداری کرے۔ ایک درویش نے کہا۔ کہ میں ایک دفعہ کوفہ سے مکہ معظمہ جا رہا تھا۔ راستے میں حضرت ابراہیم خواصؒ سے ملاقات ہوگئی۔ میں نے ہمراہی (صحبت) کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا اس کے لیے ضروری ہے کہ ایک امیر ہو ایک خادم۔ اگر تم چاہتے ہو امیر کا کردار لے لو۔ میں نے کہا۔ یہ کام آپ کریں۔ فرمایا ٹھیک ہے مگر تمہیں میرے حکم کے مطابق کام کرنا ہوگا۔ عرض کیا بجا ہے۔ منزل پر پہنچے تو آپ نے فرمایا بیٹھ جاؤ۔ میں حکم بجا لایا۔ آپ نے کوئیں سے پانی کھینچا۔ سردی کا موسم تھا لکڑیاں جمع کر کے آگ جلائی اور مجھے گرم کیا۔ میں جب بھی کوئی کام کرنے کو اٹھتا فرماتے بیٹھ جاؤ۔ مجھے حکم بجا لانا تھا۔ خاموش ہو جاتا۔ رات کو سخت بارش ہونے لگی۔ آپ نے اپنا خرقہ نکالا اور تا سحر میرے سر پر تان کر کھڑے رہے۔ میں شرم سے ڈوبا جا رہا تھا۔ مگر از روئے شرط کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ جب صبح ہوئی تو میں نے کہا آج میں امیر ہوں۔ فرمایا ٹھیک ہے۔ جب پھر منزل پر قیام کیا تو پھر آپ نے خدمت اپنے اوپر لے لی۔ میں نے کہا میں امیر ہوں۔ میرے حکم سے آپ باہر نہیں ہو سکتے۔ آپ نے فرمایا نافرمان وہ ہوتا ہے جو اپنی خدمت امیر کے سپرد کر دے۔ مکہ معظمہ تک آپ اسی طرح میرے ہمسفر رہے۔ مکہ معظمہ پہنچ کر میں شرمساری کے عالم میں بھاگ گیا۔ آپ نے منیٰ میں مجھے دیکھ لیا اور فرمایا دیکھو بیٹا! درویشوں کے ساتھ ہم نشینی کا طریقہ یہی ہے جو میں

نے تمہارے ساتھ اختیار کیا۔

حضرت انس بن مالک رضؓ نے فرمایا: صحبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وخدمته عشر سنین ص ۳۷۹/۷۱م

فواللہ ما قال لی اُفّ قطّ وما قال لی بشیٔ فعلتہٗ لم فعلت کذا ولا بشیٔ لم افعلہ لما لا فعلت کذا

"میں دس برس تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں رہا۔ بخدا آپ نے کبھی اف تک نہیں کہا۔ نہ کبھی کچھ کرنے پر کہا کہ کیوں کیا نہ ہی کچھ نہ کرنے پر کہا کہ کیوں نہیں کیا۔"

درویش دو طرح کے ہوتے ہیں۔ مقیم اور مسافر۔ سنتِ مشائخ یہ ہے کہ مسافر مقیموں کو اپنے آپ پر ترجیح دیں۔ کیونکہ مسافر اپنے حصّے کی تلاش میں پھر رہے ہیں اور مقیم خدمتِ حق میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ مسافروں کو طلب لاحق ہوتی ہے اور مقیم لوگ طمانیتِ حصول میں مگن ہوتے ہیں۔ فضیلت صاحبِ حصول کے لیے ہوتی ہے طالبِ حصول کے لیے نہیں۔ مقیموں کو بھی چاہیئے کہ مسافروں کو ترجیح دیں کیونکہ وہ تعلق سے وابستہ ہیں اور مسافر تعلقات سے منقطع اور مجرّد۔ مسافر تلاش میں ہوتے ہیں اور مقیم توقف میں۔ بوڑھوں کو چاہیئے کہ جوانوں کو ترجیح دیں۔ کیونکہ جوان دنیا میں مقابلتاً نووارد ہیں اور ان کی معصیت کا بوجھ کم ہے۔ جوانوں کو بھی بوڑھوں کی فوقیت تسلیم کرنا چاہیئے کیونکہ وہ عبادت اور خدمت میں ان سے مقدم ہیں۔ ایسا ہو تو جانبین کے لیے باعثِ نجات ہے ورنہ ہلاکت۔

فصل

آداب، ستودہ عادات کا یکجا ہونا ہے۔ ادیب کو ادیب اور مودِب کو مودِب اس لیے کہتے ہیں کہ اس کی جو بات بھی ہوتی ہے نیک ہوتی ہے جس کسی میں نیک عادتیں جمع ہوں وہ ادیب ہے"۔ اصطلاحِ عام میں لغت اور صرف و نحو کے عالم کو ادیب کہتے ہیں۔ مگر صوفیائے کرام کے نزدیک الادب الوقوف مع المستحسنات ومعناہ ان تعامل اللہ فی الادب ص ۳۸۰/۷۲م

سرًّا وعلانیۃً واذا کنت کذلک کنت ادیبًا وان کنت اعجمیًا وان لم تکن کذلک تکون علی ضدّہ

ادب نیک کاموں پر استقامت کا نام ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ سے ہر معاملہ با ادب ہو خفیہ ہو یا علانیہ۔ اگر معاملہ با ادب ہے تو آدمی ادیب ہے چاہے عجمی ہو ورنہ اس کا برعکس۔ عبارت آرائی کو معاملت میں کوئی دخل نہیں۔ اور ہر حالت میں صاحبِ عمل لوگ صاحبِ قال لوگوں سے بہتر ہوتے ہیں۔

ایک بزرگ سے لوگوں نے دریافت کیا کہ ادب کی شرط کیا ہے؟ جواب دیا جو کچھ میں جانتا ہوں وہ ایک جملے میں بیان کیے دیتا ہوں۔ ادب یہ ہے کہ جو کچھ تیری زبان سے نکلے سچ ہو۔ اگر کوئی معاملہ کرے تو اس کی بنیاد حق و انصاف پر ہو۔ کلام سچا ہونا چاہیئے خواہ کڑوا ہی کیوں نہ ہو۔ عمل نیک ہونا چاہیئے خواہ سخت ہی کیوں نہ ہو۔ بولو تو سچ بولو۔ خاموش رہو تو خاموشی کو راستی پر مبنی رکھو۔

شیخ ابونصر سراجؒ "مصنّف" لمع "نے اپنی کتاب میں ادب کی مختلف صورتیں بیان کی ہیں فرماتے ہیں: الناس فی الادب علی ثلث طبقات امّا اھل الدنیا فاکثر آدابھم فی الفصاحۃ والبلاغۃ وحفظ العلوم واسمار الملوک واشعار العرب واما اھل الدین فاکثر آدابھم فی ریاضۃ النفس وتأدیب الجوارح وحفظ الحدود وترک الشھوات واما اھل الخصوصیۃ فاکثر آدابھم فی طھارۃ القلوب ومراعاۃ الاسرار والوفاء بالعھود وحفظ الوقت وقلۃ الالتفات الی الخواطر وحسن الادب فی مواقف الطلب واوقات الحضور ومقامات القرب۔" ادب کے لحاظ سے لوگ تین قسم کے ہوتے ہیں۔ اہل دنیا جن کے نزدیک فصاحت، بلاغت، علوم و فنون کی تحقیق و تدوین، بادشاہوں کی داستانیں، مختلف شعراء کے اچھے شعر، علمی چیزوں، شاہی نسب ناموں اور عربی زبان کے اشعار کو حفظ کرنا ادب ہے۔

ص ۳۸۱/۴۷۳

اہل دین جو ادب نفس، ریاضت و مجاہدہ کی عادت، اعضائے جسمانی کی تادیب، حدود حق کی حفاظت اور ترک خواہشات نفسانی کو ادب کہتے ہیں۔

خاص لوگ جن کے نزدیک دل کو پاک رکھنا، اسرار باطن پر نظر رکھنا، ایفائے عہد، وقت کی پاسداری، پراگندگیٔ خیالات کا استیصال اور پھر طلب و قرب میں حضورِ حق میں مؤدب رہنا ادب ہے"۔ یہ عبارت جامع ہے اور اس کی تشریح اس کتاب میں مختلف مقامات پر آئے گی۔

۲۲

بائیسواں باب

آدابِ صحبتِ اقامت

جب کوئی درویش اقامت پذیر ہو تو اس کے لیے شرطِ ادب یہ ہے کہ اگر کوئی مسافر اس کے دروازے پر آئے تو اس کی عزت و توقیر کرے اور اس کے ساتھ دلی مسرت سے پیش آئے اور احترام سے اپنے پاس ٹھہرائے۔ یہ سمجھے کہ گویا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں میں سے ہیں۔ اور وہ برتاؤ کرے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے مہمانوں سے کیا کرتے تھے۔ بلاتکلف ماحضر سامنے رکھے جیسا کہ باری تعالیٰ نے فرمایا: فَجَآءَ بِعِجۡلٍ سَمِیۡنٍ "(آپ) بھنا ہوا تندرست بچھڑا سامنے لے آئے"۔ بپاسِ ادب یہ نہ پوچھے کہ تم کہاں سے آئے ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟ اور تمہارا کیا نام ہے؟ یہ سمجھے کہ ایسے لوگ حق تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں۔ اسی کی طرف وہ روبہ سفر ہوتے ہیں۔ اور ان کا نام "بندۂ حق" ہوتا ہے۔ یہ فیصلہ کرے کہ مسافر کو آرام کے لیے تنہائی کی ضرورت ہوگی یا مجالست کی۔ اگر وہ خلوت پسند ہے تو اس کے لیے جگہ خالی کر دے۔ اگر مجالست طلب ہو تو بے تکلف محبت اور ہمدردی سے اس کے ساتھ رہے۔ جب وہ تکیہ پر سر رکھ کر سونے کا ارادہ کرے تو اس کے پاؤں دبائے۔ اگر وہ کہے کہ مجھے عادت نہیں تو اصرار نہ کرے تاکہ اسے گراں نہ گذرے۔ دوسری صبح اسے کسی نہایت صاف ستھرے حمام پر لے جائے۔ اس کے کپڑے ناپاک جگہ پر نہ رکھے اور کسی اجنبی کو اس کی خدمت پر مامور نہ کرے۔ خدمت ایسے ہم جنس کے سپرد ہونی چاہیئے جو پورے اعتقاد کے ساتھ اسے ہر نجاست سے پاک کر سکے۔ پیٹھ کھجلائے۔ گھٹنوں، پاؤں کے تلوں اور ہاتھوں کی مالش کرے۔ اس قدر کافی ہے۔ اگر توفیق ہو تو نئے کپڑے بنوا دے ورنہ تکلف نہ کرے۔ اسی کے کپڑے پاک کر کے پہنا دے۔ اگر وہ حمام سے واپس آ کر دو تین روز اور ٹھہرے۔ اور شہر میں کوئی پیر، کوئی جماعت یا کوئی امام ہو تو زیارت کے لیے دریافت کرے چلے تو فبہا ورنہ اصرار نہ کرے کیونکہ طالبِ حق کسی وقت ایسے مقام پر ہوتا ہے کہ اس کا اپنا دل اس کے اختیار سے باہر ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم خواصؒ سے لوگوں نے ان کے سفر کے حالات پوچھے تو آپ نے فرمایا کہ ایک

ص ۳۸۲/۴۷۴

ص ۳۸۳/۴۷۵

دفعہ حضرت خضر علیہ السلام نے میرے ساتھ ہم نشینی کی خواہش کی مگر میں نے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس وقت میرا دل بجز بذاتِ حق کسی چیز کی طرف راغب نہیں تھا۔ اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میری نظر میں کسی اور چیز کی قدر و منزلت ہو تو میں اس کی رعائت سے اپنی توجہ کسی اور طرف کروں۔ یہ قطعاً روا نہیں کہ درویش مسافر کو اہل دنیا کے سلام کے لیے ان کی مہمان نوازیوں کے لیے یا تیمارداریوں کے لیے ساتھ لیے پھرے جس اقامت گزین درویش کو مسافروں سے یہ لالچ ہو کہ ان کو اپنی گدائی کا آلہ کار بنائے اور اپنی غرض سے انہیں جگہ جگہ لیے پھرے تو اس کے لیے یہ بہتر ہے کہ بجائے مسافروں کے ذلیل کرنے کے ابتدا ہی سے ان کی خدمت کرنے کا بیڑا نہ اٹھائے۔

میں (علی بن عثمان الجلابیؒ) اپنے سفر کے دوران میں کسی چیز سے آتنا رنجیدہ اور کبیدہ خاطر نہیں ہوا جتنا جاہل خدمت گذاروں سے۔ جو مجھے بلا تامل ساتھ لے لیتے اور بڑے آدمیوں اور دہقانوں کے گھروں پر لیے پھرتے۔ میں دلی کراہت سے ساتھ ہو لیتا اور بظاہر درگذر سے کام لیتا۔ مگر دل میں عہد کر لیتا کہ اقامت کے بعد میں مسافروں سے کبھی یہ سلوک نہیں کروں گا۔ بے ادبوں کی مصاحبت سے یہی فائدہ ہوتا ہے کہ جو وہ کریں تم اس سے پرہیز کرو۔

اگر مسافر خوش ہو کر چند روز قیام کرے اور کسی دنیوی ضرورت کا اظہار کرے تو درویش کو چاہیئے کہ اس کی ضرورت پوری کر دے۔ تاہم اگر وہ مدعی بے ہمت ہے تو درویش کو اس کی محال ضروریات پورا کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ سالکانِ حق کا وطیرہ نہیں ہوتا۔ سالکِ حق کو کیا ضرورت ہے کہ درویشوں سے ملے اگر اس کا دامن دنیوی ضروریات سے آلودہ ہے۔ اسے بازار میں جا کر خرید و فروخت کرنا چاہیئے۔ یا کسی بادشاہ کی درگاہ پر دربانی اختیار کرنا چاہیئے۔

ص ۳۸۶/۷۷

کہتے ہیں حضرت جنیدؒ اپنے مریدوں میں ریاضت و مجاہدہ میں مشغول تھے۔ ایک مہمان حاضر ہوا۔ اس کے لیے بہت تکلف کیا گیا اور کھانا پیش ہوا۔ اس نے کہا مجھے فلاں چیز کی ضرورت ہے۔ حضرت جنیدؒ نے فرمایا تمہیں اس چیز کے لیے بازار جانا ہوگا۔ تم بازاری آدمی ہو۔ مسجد اور صومعہ سے تمہیں کوئی تعلق نہیں۔

میں دو درویشوں کے ہمراہ ابن المعلا کی زیارت کے لیے جا رہا تھا۔ وہ ایک گاؤں رطہ نامی میں مقیم تھے ہم نے راستے میں یہ فیصلہ کیا کہ ہر شخص اپنے دل میں کوئی بات سوچ لے دیکھیں پیر صاحب ہمارے باطن کی کیفیت سمجھتے ہیں یا نہیں۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ مجھے آپ سے حسین بن منصور کی مناجات اور اشعار ملنے کی امید رکھنی چاہیئے۔ دوسرے نے کہا کہ میں تلی کے مرض میں مبتلا ہوں مجھے شفا حاصل ہو جائے۔ تیسرے نے کہا مجھے حلوۂ صابونی (برفی) چاہیئے۔ جب ہم

لوگ حاضر خدمت ہوئے تو ان کے حکم سے حسین بن منصور کی مناجات اور ان کے اشعار لکھے پڑے تھے۔ وہ میرے سامنے رکھ دیئے۔ دوسرے درویش کے پیٹ پر ہاتھ پھیر دیا اور اس کی تلی کی تکلیف دور ہو گئی۔ تیسرے سے فرمایا صابونی حلوہ بادشاہوں کے درباریوں کی غذا ہے۔ مگر تم نے لباسِ اولیاء اوڑھ رکھا ہے۔ یہ لباس شاہی نوکروں اور دنیاداروں کے مطالبات پر راس نہیں۔ دو میں سے ایک چیز اختیار کرو۔ الغرض صاحبِ اقامت پر صرف اس شخص کی رعایت روا ہے جو رعایتِ حق میں مشغول ہو اور اپنے حصے سے دست بردار ہو، جو درویش اپنے حصے پر اقامت پذیر ہو اس کے حصے پر اور کوئی ہاتھ نہیں مار سکتا۔ کیونکہ درویش ایک دوسرے کے رہنما ہوتے ہیں رہزن نہیں ہوتے جب تک کوئی اپنے حصے پر بضد ہو دوسرے کو مخالفت کرنی چاہیئے۔ جب وہ اپنے حصے سے بے نیاز ہو جائے تو دوسرے پر لازم ہے کہ اس کا حصہ برقرار رکھے۔ تاکہ دونوں راہ طے کرنے والوں میں شمار ہوں اور راہ سے بھٹکے ہوئے نہ کہلائیں۔

اخبارِ نبوی میں آیا ہے کہ پیغمبر صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری رض اور حضرت سلمان فارسی رض کے درمیان برادری قائم کی تھی۔ دونوں اہلِ صفہ کے سردار اور رئیس تھے۔ دونوں اہلِ باطن تھے۔ ایک دن حضرت سلمان رض حضرت ابوذر رض کے گھر پر ملنے کے لیے گئے۔ حضرت ابوذر رض کی زوجہ محترمہ نے شکایت کی کہ آپ کا بھائی نہ دن کو کچھ کھاتا ہے نہ رات کو سوتا ہے۔ حضرت سلمان رض نے کہا کوئی کھانے کی چیز ہو تو لاؤ۔ جب کھانے کو کچھ سامنے آیا تو حضرت سلمان رض نے کہا آپ کو میرے ساتھ موافقت کرنا پڑے گی کیونکہ یہ روزہ فرض نہیں ہے۔ حضرت ابوذر رض نے موافقت کی۔ جب رات ہوئی تو کہا بھائی سوتے ہیں بھی میرے ساتھ موافقت ضروری ہے۔ کیونکہ "تیرے جسم کا بھی تجھ پر حق ہے تیری بیوی کا بھی حق ہے، تیرے پروردگار کا بھی حق ہے"۔ جب دوسرے روز حضرت ابوذر رض بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے تو پیغمبر صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: میں وہی کہتا ہوں جو کل سلمان رض نے کہا تھا۔ ابوذر رض نے اپنے حصے کو ترک کیا ہوا تھا۔ حضرت سلمان رض نے ان کے حصے کو اقامت دی اور اپنا ورد چھوڑ دیا۔ اس بنیاد پر جو کچھ کیا جائے وہ درست اور مستحکم ہو گا۔

ایک ایسا وقت تھا کہ میں عراق میں دنیوی دولت کی طلب اور اس کو فنا کرنے میں نہایت تندہی سے مصروف تھا۔ مجھ پر بہت قرض ہو گیا جس کو کچھ ضرورت ہوتی وہ میری طرف رخ کرتا۔ میں ان لوگوں کی حرص و ہوس کا شکار ہو کر رہ گیا۔

سرداران وقت میں سے ایک سردار نے مجھے لکھا۔ بیٹا! خبردار دل کو خدا سے ہٹا کر ایسے لوگوں کی دل دہی میں مشغول نہ ہو جو اپنے نفس کی خواہشات میں مشغول ہیں۔ اگر کوئی دل اپنے دل سے عزیز تر ہو تو اس کی فراغت میں کوشاں ہونا روا ہے۔ ورنہ اس کام سے دستبردار ہونا چاہیئے کیونکہ خود ذاتِ حق اپنے بندوں کے لیے کافی ہے۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس چیز پر عمل پیرا ہونے سے مجھے فراغت حاصل ہو گئی۔ یہ ہیں احکام مقیموں اور مسافروں کی ہم نشینی سے متعلق۔

ص ۳۸۶/۷۸۳

۲۳
تیئسواں باب

آدابِ سفر

اقامت چھوڑ کر سفر اختیار کرنا ہو تو اس کے آداب کو مدِّ نظر رکھے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ سفر فی سبیل اللہ ہونا چاہیئے۔ نفس کی تابعداری سے روگرداں ہو کر ظاہر کے سفر کی طرح باطن کا بھی سفر کرے یعنی خواہشاتِ نفسانی کو پیچھے چھوڑ دے۔ ہمیشہ بقیدِ وضو رہے اور اپنے اوراد کو ضائع نہ کرے۔ سفر کا کوئی مقصد ہونا چاہیئے یعنی حج بیت اللہ، جہاد یا کسی مقدس مقام کی زیارت، تلاشِ علم یا کسی بزرگ کے مزار کی زیارت۔ اگر ایسا کوئی مقصد مدِّ نظر نہیں تو سفر بیکار ہوگا۔

سفر میں خرقہ، مصلّٰے، لوٹا، رسی، جوتا اور عصا ساتھ رکھنا چاہیئے تاکہ خرقہ سے بدن ڈھانپے۔ مصلّٰے پر نماز پڑھے۔ لوٹے سے وضو کرے اور عصا کی مدد سے ایذا دینے والے جانوروں سے محفوظ رہے۔ ان چیزوں میں اور بھی فوائد ہیں۔ حالتِ وضو میں جوتا پہنے رہے تاکہ مصلّٰے پر آسکے۔ اگر کوئی درویش اقتدائے سنت میں کچھ اور چیزیں مثلاً کنگھی، ناخن تراش، سوئی اور سرمہ بھی ساتھ رکھے تو روا ہے۔ ان چیزوں کے علاوہ اگر اور سامان بھی ساتھ ہو تو پھر یہ دیکھنا پڑے گا کہ درویش فی الوقت کس مقام پر ہے اگر ارادت کا مقام ہے تو ہر چیز کی حیثیت ایک رکاوٹ، ایک بت، ایک دیوار، اور ایک حجاب کی ہے اور صرف نفسانی رعونت اور سرکشی کا اظہار ہے۔ اگر درویش تمکین و استقامت کے مقام پر ہے یعنی وہ ثابت قدم ہے اور نفسانی خواہشات پر کلی اختیار رکھتا ہے تو اسے سب سامان رکھنا روا ہے۔

ص ۳۸۷/۴۷۹

شیخ ابو مسلم فارس بن غالب انصاری رضؓ ایک دفعہ شیخ ابو سعید ابوالخیر فضل اللہ بن محمدؓ سے ملنے آئے دیکھا تو آپ تخت پر چار تکیے لگائے سو رہے ہیں۔ پاؤں ایک دوسرے پر رکھے ہوئے ہیں اور ایک مصری چادر اوڑھ رکھی ہے۔ ان کے اپنے کپڑے میل کی وجہ سے چمڑے کی طرح ہو رہے تھے جسم تکلیف سے سوکھا ہوا تھا۔ رنگ ریاضت سے زرد ہو رہا تھا۔ دل میں کراہت پیدا ہوئی اور سوچا میں بھی درویش ہوں یہ بھی درویش ہے۔ اسے اس قدر آرام میسّر ہے اور میں مشقت سے نڈھال ہو رہا ہوں۔ شیخ ابو سعیدؒ نے نخوتِ باطن کی کیفیت بھانپ لی اور فرمایا۔ "اے مسلم تو نے کس کتاب میں پڑھا ہے کہ خود بین بھی درویش ہوتا ہے؟ سنو میں نے صرف حق تعالیٰ کو دیکھا اور حق تعالیٰ نے مجھے تخت پر بٹھایا تو نے صرف اپنے آپ کو دیکھا اور بجز خاک نشینی کے کچھ نہ پایا۔ ہمارے نصیب میں مشاہدہ ہے اور تیرے نصیب میں مجاہدہ۔ یہ دونوں طریقت کے مقامات ہیں مگر ذاتِ حق ان سے منزّہ ہے اور درویش مقامات و احوال سے فانی اور آزاد۔ شیخ ابو مسلمؒ فرماتے ہیں کہ یہ بات سن کر میرے ہوش اڑ گئے اور تمام عالم میری نظر میں تاریک ہو گیا۔ ہوش بجا ہوئے تو میں معافی کا خواستگار ہوا۔ اور آپ نے مجھے معاف کر دیا۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے جانے کی اجازت دیجیے کیونکہ میں دیدار کا متحمّل نہیں ہو سکتا۔ آپ نے فرمایا ٹھیک ہے اور مثال کے طور پر یہ شعر پڑھا ؎

آنچہ گوشم نتوانست شنیدن بخبر ؎ ہمہ چشمم بعیان یکسرہ دید آن بصر

ترجمہ: "جو چیز میرے کان سن نہ سکے وہ میری آنکھ نے ظاہر دیکھ لیا۔"

مسافر کو ہمیشہ سنت کی اقتدا کرنا چاہیئے اور جب کسی مقیم سے ملاقات ہو تو عزت و احترام سے سامنے آئے، سلام کرے۔ پہلے بائیں پاؤں کا جوتا اتارے کیونکہ یہ سنتِ نبوی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) ہے۔ جب جوتا پہنے تو پہلے دایاں پاؤں جوتے میں ڈالے۔ جب پاؤں دھوئے تو پہلے دایاں اور پھر بایاں دھوئے۔ دو رکعت نماز تحیّت ادا کرے اور پھر درویشوں

ص ۳۸۸/۴۸۰

کی خدمت میں مشغول ہو جائے۔ مقیموں پر کسی شکل میں اعتراض نہ کرے۔ کسی کے ساتھ معاملے میں زیادتی نہ کرے۔ اپنے سفر کے مصائب بیان نہ کرے۔ مجلس میں بیٹھ کر علم کی باتیں یا روایات و حکایات بیان نہ کرے کیونکہ یہ سب چیزیں رعونت پر دلالت کرتی ہیں۔ سب کا دکھ بانٹے اور فی سبیل اللہ اوروں کا بوجھ برداشت کرے یہ چیز برکاتِ خداوندی کا باعث ہے۔ اگر مقیم یا اس کے خادم کوئی بات کہیں اور اس کو سلام یا زیارت کی دعوت دیں تو تابہ امکان ان کی مخالفت نہ کرے۔ بجائے خود اہل دنیا سے روا داری کا قائل نہ ہو۔ عذر یا تاویل سے ٹال دے۔ اپنی کسی محال ضرورت کا بوجھ ان

بر نہ ڈالے۔ راحتِ نفس اور حصولِ خواہش کے لیے امراء کی درگاہوں پر جانا مذموم ہے۔ الغرض مسافر اور مقیم کے جملہ معاملات میں حق تعالیٰ کی رضا جوئی مدنظر رہنا چاہیئے۔ باہمی اعتماد ہو۔ ایک دوسرے کو بُرا نہ کہے۔ عدم موجودگی میں غیبت نہ کرے۔ خدائے برتر غیبت کو نہایت برا کہتا ہے۔ اہلِ حقیقت فعل کو دیکھ کر فاعل پر نظر رکھتے ہیں۔ خلقت بہرحال مخلوقِ حق تعالیٰ ہے۔ اگر کسی میں عیب ہے یا وہ بے عیب ہے۔ حجاب میں ہے یا عینِ مشاہدہ میں۔ عیب جوئی فاعل (حق تعالیٰ) پر اعتراض ہے۔ آدمی ہونے کی حیثیت سے مخلوق پر نظر کرے تو سب سے آزاد ہو جائے اور سمجھ لے کہ سب حجاب میں ہیں، مغلوب، مقہور اور عاجز ہیں۔ ہر فرد ہمیشہ اسی تقویم پر رہتا ہے جس پر اسے پیدا کیا گیا۔ مخلوق کو خدا کی سلطنت میں کوئی تصرف نہیں اور کسی چیز کی اصلیت بدلنے پر بجز بذاتِ حق کوئی قادر نہیں اور توفیق اللہ کے قبضۂ اختیار میں ہے۔

ص ۳۸۹ / ۴۸۱

۲۴

چوبیسواں باب

آدابِ طعام

انسان کے لیے غذا لازمی چیز ہے۔ طبیعتوں کا سکون کھانے پینے سے برقرار رہتا ہے مگر شرطِ مروّت یہ ہے کہ اس میں مبالغے سے کام نہ لیا جائے اور آدمی روز و شب فکرِ خورد و نوش میں غرق نہ رہے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا: من کان همّته ما یدخل جوفه کان قیمته ما یخرج منه "جس شخص کی کوشش ہمیشہ اس چیز پر صرف ہو جو پیٹ میں اترتی ہے اس کی قیمت وہی کچھ ہے جو پیٹ سے نکلتا ہے"۔ سالکانِ حق کے لیے پُرخوری سب سے زیادہ ضرر رساں چیز ہے قبل ازیں بھوک سے متعلق کچھ کہا جا چکا ہے اور یہاں اسی قدر کافی ہے۔ کہتے ہیں حضرت بایزیدؒ سے لوگوں نے پوچھا، آپ بھوک کی بہت تعریف کرتے ہیں؟ فرمایا درست ہے۔ اگر فرعون بھوکا ہوتا تو ہرگز یہ نہ کہتا۔ "میں ہی تمہارا سب سے بڑا خدا ہوں"۔ اگر قارون بھوکا ہوتا تو سرکشی نہ کرتا۔ ثعلبہ بھوکا تھا تو سب اسے قابلِ تعریف

سمجھتے تھے۔ سیر ہو کر اس نے نفاق کا بیج بویا۔ حق تعالیٰ نے کفّار کی نسبت فرمایا: ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ "انہیں چھوڑ دیجیے وہ کھائیں۔ تمتع حاصل کریں۔ تمناؤں میں الجھے رہیں، عنقریب وہ سب کچھ جان لیں گے۔" پھر باری تعالیٰ نے فرمایا: وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ "کفّار دنیا میں تمتع حاصل کرتے ہیں اور چوپایوں کی طرح کھاتے ہیں۔ ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔"

حضرت سہیل بن عبداللہؒ فرماتے ہیں: میں شراب سے بھرے ہوئے پیٹ کو طعام حلال سے پُر کیے ہوئے پیٹ سے بہتر سمجھتا ہوں۔ لوگوں نے پوچھا کیوں؟ فرمایا پیٹ شراب سے بھر جائے تو عقل گل جاتی ہے۔ آتش نفس ختم ہو جاتی ہے اور لوگ پینے والے کے ہاتھ اور زبان سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر طعام حلال سے پیٹ پُر ہو تو لغویت زور مارتی ہے۔ شہوت برانگیختہ ہوتی ہے اور نفسانی خواہشات بیدار ہو جاتی ہیں۔ مشائخ کرام نے ایسے لوگوں سے متعلق کہا ہے: اكلهم كاكل المرضىٰ ونومهم كنوم الغرقىٰ وكلامهم ككلام الثكلىٰ "کھاتے ہیں تو مریضوں کی طرح ۔ غرقابوں کی نیند سوتے ہیں اور ماتم کرنے والی عورتوں کی طرح کلام کرتے ہیں۔"

ص ۳۹۱/۴۸۲

آدابِ طعام کی شرط یہ ہے کہ تنہا نہ کھائیں اور کھاتے وقت ایک دوسرے کے لیے ایثار کریں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: شر الناس من اكل وحده وضرب عبده ومنع رفده "سب سے برا آدمی وہ ہے جو تنہا کھائے، غلام کو پیٹے اور بخشش کرنے سے پہلو تہی کرے۔"

جب دسترخوان پر بیٹھے تو بسم اللہ سے شروع کرے۔ خوان پر رکھی ہوئی چیزوں کو الٹ پلٹ کر نہ دیکھے تاکہ دوسروں کو کراہت نہ ہو۔ پہلے نمکین لقمہ اٹھائے اور ساتھیوں کے ساتھ انصاف کرے۔

حضرت سہل بن عبداللہؒ سے لوگوں نے اس آیت کا مفہوم پوچھا: إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ "بلاشبہ حق تعالیٰ عدل اور نیکی کا حکم فرماتا ہے۔" آپ نے فرمایا۔ عدل یہ ہے کھانے میں اپنے ساتھی کے ساتھ انصاف کرے اور احسان یہ ہے کھانے میں اس کو اپنے آپ سے بہتر سمجھے۔

میرے شیخِ محترم نے کہا مجھے تعجب ہے اس شخص پر جو دعویٰ کرتا ہے ترکِ دنیا کا اور شب و روز کھانے کی فکر میں سرگرداں رہتا ہے۔

کھانا ہاتھ سے کھانا چاہیئے۔ نظر صرف اپنے لقمے پر رکھے۔ پانی اس وقت پیے جب سچی پیاس ہو اور اتنا پیے کہ جگر تر ہو جائے۔ لقمہ چھوٹا بنائے، منہ میں ڈالنے اور چبانے میں جلدی نہ کرے۔ یہ سنّت اور اصولِ صحت کے خلاف ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر الحمد للہ پڑھے اور ہاتھ دھوئے۔ اگر جماعت میں سے دو یا تین یا زیادہ افراد چوری چھپے کسی دعوت پر چلے جائیں اور کچھ کھائیں تو بعض مشائخ کے نزدیک حرام ہے اور حقوقِ صحبت میں خیانت کے برابر ہے: اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ "یہی وہ لوگ ہیں جو پیٹوں میں بجز آگ کچھ نہیں بھرتے"۔

ص ۳۹۱ / ۴۸۳

دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ اگر وہ باہم موافق ایک جماعت ہو تو روا ہے۔ ایک اور گروہ کا خیال ہے کہ اگر ایک آدمی ہو تو بھی جائز ہے کیونکہ تنہائی میں انصاف کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ انصاف ہم نشینوں کی موجودگی میں ہوتا ہے۔ علیحدگی میں حکم صحبت برقرار نہیں رہتا اور وہ اس کے بدلے ماخوذ نہیں ہو سکتا۔

اہم ترین امر یہ ہے کہ درویش کی دعوت کو رد نہ کرے اور دنیادار کی دعوت قبول نہ کرے اس کے گھر نہ جائے اور اس سے کوئی چیز طلب نہ کرے۔ یہ اہلِ طریقت کے لیے باعثِ خفّت ہے۔ اہلِ دنیا درویش کے محرم نہیں ہوتے۔ ساز و سامان کی کثرت سے آدمی دنیادار نہیں ہو جاتا اور اس کے فقدان سے درویش نہیں بن جاتا جو شخص ثروت و غنا پر فقر کو افضل سمجھتا ہو وہ دنیادار نہیں پادشاہ ہی کیوں نہ ہو۔ فقر کا منکر دنیادار ہوتا ہے۔ مفلس ہی کیوں نہ ہو۔

دعوت پر کسی چیز کے کھانے یا نہ کھانے میں تکلّف نہ کرے بتقاضائے وقت جو ملے کھا لے۔ جب صاحبِ دعوت محرم ہو تو شادی شدہ کے لیے روا ہے کہ کھانا ساتھ بھی لے جائے۔ نامحرم ہو تو اس کے گھر جانا ہی روا نہیں۔ بہرصورت کھانا ساتھ نہ لے جانا بہتر ہے۔ حضرت سہل بن عبداللہؒ فرماتے ہیں "کھانا ساتھ اٹھانا ذلّت ہے۔" توفیق اللہ کے قبضۂ اختیار میں ہے۔

۲۵

پچیسواں باب

چلنے پھرنے کے آداب

حق تعالیٰ نے فرمایا: وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا "اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عجز و انکسار سے چلتے ہیں"۔ طالبِ حق کو لازم ہے کہ وہ چلتے وقت یہ سوچے کہ وہ اپنا قدم کس کے لیے اٹھاتا ہے۔ کسی خواہشِ نفس کے لیے یا محض حق تعالیٰ کے لیے، اگر خواہشِ نفس کے لیے گامزن ہے تو توبہ کرے اور اگر حق تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے ہے تو مزید کوشش کرے تاکہ اور خوشنودی حق حاصل ہو۔ ص ۳۹۳ / ۴۸۴

حضرت داؤد طائیؒ نے ایک روز دوا پی۔ لوگوں نے کہا آپ تھوڑی دیر صحن میں ٹہل لیں تاکہ دوا اپنا پورا اثر کرے۔ آپ نے فرمایا میں شرمسار ہوں۔ قیامت کے روز مجھ سے سوال ہوگا کہ اتنے قدم تو نے اپنے نفس کی خاطر کیوں اٹھائے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ "اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے جو کچھ انہوں نے دنیا میں کمایا"۔ درویش کو چاہیئے کہ بیداری کے عالم میں سر مراقبہ میں جھکا کر چلے۔ اپنے برابر اور راستے کے سوا کسی طرف نہ دیکھے۔ اگر راہ میں کوئی ملے تو اپنے کپڑوں کو بچاتے ہوئے اس سے پرے نہ ہٹائے کہ شاید وہ چھو نہ لے، سب مومن اور ان کے کپڑے پاک ہوتے ہیں۔ یہ محض رعونت اور خود نمائی ہے۔ البتہ اگر وہ کافر ہے یا اس پر کوئی نجاست بظاہر نظر آتی ہے تو اپنے آپ کو سمیٹ لینا روا ہے۔ اگر کسی جماعت کے ساتھ چلنے کا اتفاق ہو تو آگے بڑھنے کا قصد نہ کرے کیونکہ زیادتی کی طلب تکبر ہے۔ نہ پیچھے چلنے کا بھی قصد نہ کرے۔ اور حد سے زیادہ تواضع کا مظاہرہ نہ کرے یہ بھی عین تکبر ہے۔ دن کے وقت جوتے کو ناپاکی سے محفوظ رکھے تاکہ نمازرات کے وقت اس کے کپڑوں کو نجاست سے بچائے۔ جب کوئی جماعت یا درویش اس کے ساتھ ہوں تو راہ میں کسی سے بات کرنے کے لیے ٹھہرنا نہیں چاہیئے۔ یہ نہ ہو کہ لوگ اس کا انتظار کریں۔ آہستہ چلے۔ جلد بازی نہ کرے کیونکہ اہلِ حرص کی روش ہے۔ اتنا آہستہ بھی نہ چلے کہ رفتار اہلِ غرور کی رفتار معلوم ہو۔ ہر قدم زمین پر پورا رکھے۔ الغرض چال ایسی ہو ص ۳۹۴ / ۴۸۵

کہ اگر کوئی پوچھے کہاں جارہے ہو تو وہ بلا تکلف کہہ سکے: اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ "بلاشبہ میں اپنے رب کی طرف جارہا ہوں وہ جلد میری رہنمائی فرمائے گا۔" اگر رفتار اس طریق پر نہیں تو چلنا وبال ہے۔ کیونکہ صحیح قدم صحیح قلبی کیفیتوں کا نتیجہ ہوتے ہیں جس کے خیالات حق کے لیے مجتمع ہوں اس کے قدم خیالات کے تابع ہوں گے۔

حضرت بایزیدؒ نے فرمایا کہ درویش کی رفتار بغیر مراقبہ غفلت کا نشان ہے۔ جو کچھ بھی ہے دو قدم میں حاصل ہو جاتا ہے۔ ایک قدم اپنے نصیب کا رکھے اور دوسرا فرمانِ حق کا پہلا قدم اٹھائے۔ دوسرا قدم رکھے۔ طالب کی رفتار مسافت طے کرنے کی علامت ہے مگر قربِ حق قطع مسافت سے حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے قرب کے لیے کوئی مسافت نہیں اور اس لیے طالب کے لیے پاؤں توڑ کر بیٹھے رہنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں۔ اللہ توفیق دینے والا ہے۔

۲۶

چھبیسواں باب

سونے کے آداب سفر و حضر میں

اس موضوع پر مشائخ کبار میں کافی اختلاف ہے۔ ایک جماعت کا خیال ہے کہ سالک کو صرف اس وقت سونا چاہیئے جب نیند کا غلبہ ہو اور وہ بغیر سوئے نہ رہ سکتا ہو۔ کیونکہ پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: النوم اخ الموت "نیند اور موت میں برادری ہے"۔ زندگی نعمت ہے اور موت بلا۔ اور بہر صورت نعمت بلا سے زیادہ بلند مرتبہ ہوتی ہے۔

حضرت شبلیؒ سے روایت ہے: اطلع الحق علی فقال من نام غفل ومن غفل حجب "حق تعالیٰ نے مجھ پر نظر کی اور فرمایا سونے والا غافل ہے اور غافل حجاب میں ہے"۔

ص ۳۹۵/۴۸۶

ایک دوسری جماعت کے عقیدہ کے مطابق سالک اپنے اختیار سے بھی سو سکتا ہے اور حق تعالیٰ کے احکام بجالانے میں بھی احکامِ خداوندی کی رعایت کرے۔ کیونکہ پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: رُفع القلم عن ثلث عن النائم حتی ینتبہ

وعن الصبی حتی یحتلم وعن المجنون حتی یفیق "تین آدمیوں پر احکام جاری نہیں ہوتے۔ ایک سونے والے پر جب تک بیدار نہ ہو۔ دوسرے لڑکے پر جب تک وہ جوان نہ ہو اور تیسرے دیوانے پر جب تک وہ ہوش میں نہ آئے"۔ سویا ہوا آدمی تکلیفِ احکام سے بری ہوتا ہے کیونکہ خلق کو وہ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ وہ بے اختیار ہوتا ہے۔ اس کا نفس اپنی خواہشات سے دور ہوتا ہے۔ اس کے کراماً کاتبین فارغ ہوتے ہیں۔ اس کی زبان دعویٰ سے معذور ہوتی ہے۔ جھوٹ اور غیبت میں وہ مبتلا نہیں ہو سکتا اور خود بینی اور ریا سے پاک ہوتا ہے: لَا یَمْلِکُوْنَ لِاَنْفُسِھِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا یَمْلِکُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَیٰوۃً وَّلَا نُشُوْرًا۔ "نہ وہ اپنی جان کو ضرر پہنچا سکتا ہے نہ فائدہ۔ نہ اسے موت اور زندگی پر اختیار ہوتا ہے اور نہ وہ دوبارہ زندہ ہونے پر قادر ہوتا ہے"۔ اسی بنا پر حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: "شیطان کے لیے گنہ گار کی نیند سے زیادہ کوئی چیز گراں نہیں۔ گنہ گار سوتا ہے تو شیطان کہتا ہے یہ کب بیدار ہو کر پھر حق تعالیٰ کی نافرمانی کرے گا"۔

اس موضوع پر حضرت جنیدؒ اور علی بن سہل اصفہانیؒ میں اختلاف ہے۔ اس بارے میں ایک مزیدار خط حضرت علی بن سہلؒ نے حضرت جنیدؒ کو لکھا۔ وہ میں نے میں وعن تو نہیں سنا۔ مگر مطلب یہ ہے کہ آپ نے خط میں فرمایا: نیند غفلت اور قرار کا دوسرا نام ہے۔ اس سے اعراض لازم ہے کیونکہ محبِ حق کو دن رات قرار نہیں ہوتا۔ اگر وہ سوئے گا تو یقیناً اپنے مقصود کو کھو بیٹھے گا۔ اور اپنے آپ سے اور اپنے روزگار سے غافل ہو جائے گا۔ حق تعالیٰ سے دور بھٹک جائے گا۔

ص ۳۹۶/۴۸۷

چنانچہ باری تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو بذریعہ وحی مطلع فرمایا: یا داود کذب من ادعی محبتی فاذا جنہ اللیل نام حتی "اے داؤد وہ شخص میری محبت کا جھوٹا مدعی ہے جو رات آئی تو سو گیا اور میری یاد سے غافل ہو گیا"۔

حضرت جنیدؒ نے جواباً لکھا کہ ہماری بیداری ہمارا فعل ہے اور نیند حق تعالیٰ کا انعام ہے۔ جو چیز ہمارے اختیار کے بغیر ظہور پذیر ہو وہ یقیناً اس چیز پر فوقیت رکھتی ہے جو ہمارے اختیار سے واقع ہو۔ نیند محبانِ حق پر حق تعالیٰ کی نعمت ہے۔ "اس مسئلہ کا تعلق صحو سکر سے ہے اور اسی سے متعلق تفصیلاً بیان ہو چکا ہے۔ تعجب ہے کہ حضرت جنیدؒ جو صاحبِ صحو تھے یہاں سکر کی تعریف کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ لکھتے وقت مغلوب الحال ہوں اور کیفیتِ وقت کے مطابق بات کی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حقیقت اس کے برعکس ہو۔ خواب عین صحو ہوتا ہے اور بیداری عین سکر۔ کیونکہ نیند انسانی صفت ہے اور جب تک انسانی صفت سایہ فگن ہو انسان کو صحو سے نسبت ہوتی ہے۔ بیداری حق تعالےٰ

کی صفت ہے جب انسان اپنی صفت سے باہر ہو تو مغلوب الحال ہوتا ہے۔ میں نے ایک گروہِ مشائخ کو دیکھا جو حضرت جنید رح کے قول کے مطابق خواب کو بیداری سے افضل سمجھتے تھے۔ کیونکہ اکثر پیغمبروں، اولیاء اور بزرگوں کو مکاشفہ عالم خواب میں ہوا ہے۔ پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ان اللّٰہ تعالیٰ یباھی بالعبد الذی نام فی سجودہ ویقول اللّٰہ تعالیٰ لملائکتہ انظروا یا ملائکتی الی عبدی روحہ فی محل النجویٰ وبدنہ علی بساط العبادۃ "حق تعالیٰ کو اس بندے پر ناز ہے جو سجدے میں سو جائے۔ وہ فرشتوں سے کہتا ہے میرے بندے کو دیکھو اس کی روح میرے ساتھ محوِ راز و نیاز ہے اور اس کا جسم فرشِ عبادت پر ہے"۔ نیز پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: من نام علی طہارۃ یؤذن لروحہ ان یطوف بالعرش ویسجد للّٰہ تعالیٰ "باوضو سونے والے کی روح کو طوافِ عرش کی اور حق تعالیٰ کو سجدہ کرنے کی اجازت ہوتی ہے"۔

ص ۳۹۷/۴۸۸

کہتے ہیں شاہ شجاع کرمانی رح چالیس برس تک متواتر جاگتے رہے۔ جب ایک رات سوئے تو رویتِ حق سے فیض یاب ہوئے۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ اسی امید پر سویا کرتے۔ اسی مضمون پر قیس بن عامر کہتا ہے ؎

وانی لاستنعس ومالی نعسۃ　　لعل خیالا منک یلقی خیالیا

ترجمہ: "مجھے نیند نہیں آتی مگر میں سو جاؤں گا۔ شائد عالمِ خواب میں تیرا خیال میرے دل میں سما جائے"۔

میں نے ایک ایسی جماعت کو بھی دیکھا جو علی بن سہل کی طرح بیداری کو نیند پر ترجیح دیتی تھی۔ کیونکہ رسولوں کی وحی اور اولیاء کی کرامات کا تعلق بیداری سے ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں: "اگر نیند میں کوئی بھلائی ہوتی تو اہلِ جنّت کو بھی نیند ملتی"۔ بہشت میں نہ حجاب ہوگا نہ خواب۔ پس ثابت ہوا کہ خواب ایک حجاب ہے۔ اربابِ لطائف بیان کرتے ہیں کہ آدم علیہ السلام بہشت میں سو گئے تو حوّا ان کے بائیں پہلو سے معرضِ وجود میں آئی اور ان کی تمام مصائب کا باعث ہوئی۔ نیز کہتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو کہا "بیٹے! میں نے خواب دیکھا کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں"۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کہا "یہ اس کی جزا ہے جو اپنے حبیب سے غافل ہو کر سو جائے۔ نہ آپ سوتے نہ آپ کو فرزند ذبح کرنے کا حکم ملتا۔ آپ کی نیند نے آپ کو بیٹے سے محروم کر دیا اور مجھے جان سے۔ میرا درد تو ایک لمحہ کا ہوگا اور آپ کا عمر بھر کا"۔

ص ۳۹۷/۴۸۹

حضرت شبلی رح سے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہر رات ایک کٹورہ نمکین پانی کا اور ایک سلائی اپنے پاس رکھا کرتے تھے۔

نیند غلبہ کرتی تو سلائی پانی میں ڈبو کر آنکھوں میں پھیر لیتے تاکہ نیند کافور ہو جائے۔

میں (علی بن عثمان الجلابی ؒ) نے بخارا میں شیخ احمد سمرقندی کو دیکھا جو چالیس برس سے رات کو نہیں سوئے تھے۔ دن کو تھوڑے وقفہ کے لیے سو جاتے تھے۔

الغرض جب کسی آدمی کو موت پسند ہوتی ہے وہ نیند کو بیداری سے افضل سمجھتا ہے۔ جب زندگی موت سے زیادہ پسندیدہ نظر آئے تو بیداری کو ترجیح دیتا ہے۔ تکلّف سے بیدار رہنے کی کچھ وقعت نہیں۔ وقعت اس بات کی ہے کہ اسے پردۂ غیب سے بیدار رہنے کی توفیق ہو۔ چنانچہ پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم برگزیدۂ حق تھے۔ آپ بلند مقام پر پہنچے تو آپ نے نہ سونے میں تکلف کیا نہ بیداری میں۔ حکم باری تعالیٰ ہُوا: قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا "آپ رات کو عبادت میں قیام کریں مگر رات کا تھوڑا حصّہ یعنی آدھی رات یا اس سے کچھ کم"۔ اس امر کی کوئی قیمت نہیں کہ تکلّف سے سو جائے۔ قیمت اس چیز کی ہے کہ اسے تائیدِ حق سلادے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے اصحابِ کہف کو برگزیدگی دی۔ ان کو اعلیٰ مقام دیا۔ اور لبادۂ کفران کے جسموں سے دور فرمایا۔ انہوں نے نہ سونے میں تکلّف کیا نہ جاگنے میں۔ حق تعالیٰ نے ان کی نگہبانی کی اور ان کی اپنی کوشش کے بغیر ان کی پرورش فرمائی۔ چنانچہ فرمایا: وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ "تم انہیں بیدار تصوّر کروگے حالانکہ وہ سو رہے ہیں اور ہم ان کی دائیں بائیں کروٹ بدلتے رہتے ہیں"۔ اور یہ دونوں صورتیں بے اختیاری کے عالم میں نہیں ہوتیں۔

ص ۳۹۸/۴۹۰

جب بندہ کو وہ مقام حاصل ہو جاتا ہے جہاں اس کا اپنا اختیار نہیں ہوتا۔ ہر چیز اس کی دسترس سے باہر ہوتی ہے وہ تغیر کا متحمل نہیں ہوتا وہ سوئے یا جاگے بہر صورت صاحبِ توفیر ہوتا ہے۔

مرید کے لیے شرطِ خواب یہ ہے کہ ہر ابتدائے خواب کو اپنی عمر کا آخری وقت سمجھے۔ گناہوں سے توبہ کرے، مخالف اور رنجیدہ لوگوں کو خوش کرے۔ اچھی طرح طہارت کرے۔ اور دائیں ہاتھ پر قبلہ رو سوئے۔ کارِ دنیا کی درستی کے بعد اسلام کا شکرِ نعمت کرے اور یہ عہد کرے کہ بیدار ہو کر مرتکبِ معاصی نہیں ہوگا۔ جو بیداری میں اپنا کام پورا کرے اسے نیند یا موت سے کوئی خوف نہیں ہو سکتا۔

کہتے ہیں کہ ایک بزرگ ایک امام کے پاس آیا کرتا تھا۔ امام جاہ و دولت اور سرکشیٔ نفس میں مبتلا تھا۔ بزرگ ہر بار کہتا تھا "مرنا چاہیئے"۔ امام کو یہ بات بری محسوس ہوتی تھی۔ کہ ایک گدا ہمیشہ اس کو یہی بات کہے۔ اس نے

ص ۳۹۹/۴۹۱

سوچا میں کل خود پہل کروں گا۔ چنانچہ جب دوسرے روز وہ بزرگ آیا تو امام نے کہا "مرنا چاہیئے"۔ اس بزرگ نے مصلیٰ بچھایا اور اس پر سر رکھ کر بولا "مر گیا"۔ اسی وقت اس کی جان تن سے نکل گئی۔ امام متنبہ ہوا اور سمجھ گیا کہ بزرگ کا مطلب یہ تھا کہ موت کی تدبیر میری طرح کر۔

میرے شیخ رح مریدوں کو تاکید فرمایا کرتے تھے کہ صرف اس وقت سونا چاہیئے جب نیند کا غلبہ ہو۔ بیدار ہو کر دوبارہ سونے کی کوشش نہ کرو۔ کیونکہ دوسری دفعہ سونا اور بیکاری مریدانِ حق پر حرام ہے۔ اس موضوع پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ اور اللہ بہتر جاننے والا ہے۔

۲۷

ستائیسواں باب

آداب کلام و خاموشی

حق تعالیٰ نے فرمایا: وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا "اس سے زیادہ اچھی کس کی بات ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف دعوت دے اور نیک عمل کرے"۔ نیز فرمایا: قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ "نیک بات کہنا" اور فرمایا: قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ "کہو ہم اللہ پر ایمان لائے"۔ حق تعالیٰ نے اچھے کلام کا اس طرح حکم دیا ہے جس طرح اس کا اقرارِ ربوبیت، اس کی صفت و ثنا اور اس کی درگاہ کی طرف لوگوں کو دعوت دینا۔ بولنے کی طاقت نعمتِ عظمیٰ ہے اور آدمی اس کی وجہ سے دیگر جانوروں سے ممتاز ہے۔

حق تعالیٰ نے فرمایا: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ "ہم نے بنی آدم کو بزرگی عطا کی"۔ مفسرین کرمنا کا مطلب "گویائی عطا کی" بیان کرتے ہیں۔ یاد رکھو گویائی جتنی بڑی نعمت ہے۔ اتنی ہی خرابی کا سرچشمہ ہے۔ پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اخوف ما اخاف علی امتی اللسان "امت سے متعلق میں جس چیز سے زیادہ ڈرتا ہوں وہ زبان ہے"۔ الغرض گفتار کی مثال شراب کی سی ہے جو عقل کو مست کر دیتی ہے اور

ص ۴۰۰ / ۴۹۲

جسے اس کی لت پڑ جائے وہ اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ اہل طریقت نے یہ سمجھ کر کہ گفتار باعثِ آفت ہے بجز ضرورت بات کرنے سے گریز کیا ہے۔ ہر کلام کے آغاز و انجام کو جانچتے ہیں اگر اظہار جانب حق ہو تو اظہار کرتے ہیں ورنہ خاموش رہتے ہیں۔ کیونکہ ان کا ایمان ہے کہ حق تعالیٰ سب اسرار کو جاننے والا ہے اور وہ بدبخت ہیں جو یہ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ حق تعالیٰ نے فرمایا: اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ "کیا وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے اسرار اور ان کی سرگوشیوں کو نہیں سنتے؟ ہم سنتے ہیں اور ہمارے فرشتے لکھتے ہیں"۔ پیغمبر صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: من صمت نجا "جس نے خاموشی اختیار کی اسے نجات حاصل ہوئی"۔

خاموشی میں بے حد فوائد اور کامرانیاں ہیں۔ مشائخ کی ایک جماعت خاموشی کو کلام سے بہتر سمجھتی ہے اور ایک دوسری جماعت کلام کو خاموشی سے افضل سمجھتی ہے۔ بقول حضرت جنیدؒ الفاظ اور عبارت آرائیاں کسی چیز کا دعویٰ کرنے کی دلیل نہیں ہیں اور اثباتِ حقیقت میں دعویٰ بے کار ہے۔ کبھی ایسا وقت بھی ہوتا ہے کہ اختیارِ گفت گو کے باوجود خاموش رہنا پڑتا ہے مثلاً خوف کے مقام پر بات کرنے کا اختیار اور طاقت ہو بھی تو خوف کے مقام پر لب کشائی نہیں ہوتی اور یہ سقوطِ سخن حقیقت معرفت کے لیے وجہِ زیاں نہیں ہوتا۔ مگر کسی حالت میں دعوائے بے حقیقت سے درگزر نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہی منافقت کی جڑ ہے۔ یاد رکھو دعویٰ بغیرِ حقیقت منافقت ہے اور حقیقت بغیرِ دعویٰ اخلاص۔ "جس نے بیان کا سہارا لیا وہ زبان سے بے نیاز نہیں جس کی بنیاد مشاہدہ پر ہے وہ اس راز سے متعلق جو اس کے اور ربّ قدیر کے درمیان زبان سے آزاد ہے یعنی جس کے لیے راستہ کھل جاتا ہے اسے بولنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ کلام کا مقصد غیر کو مطلع کرنا ہوتا ہے اور

ص ۴۰۱ / ۴۹۳

اللہ تعالیٰ کی ذات ہمارے احوال کے تغیّر و تبدّل سے متعلق مطلع ہونے سے بے نیاز ہے۔ غیر اللہ کوئی اس لائق نہیں کہ اسے توجہ دی جائے۔ حضرت جنیدؒ کے اس قول سے یہ چیز اور واضح ہو جاتی ہے۔ "جس کو اللہ کی معرفت حاصل ہوئی اس کی زبان گنگ ہو گئی"۔ کیونکہ عالمِ مشاہدہ میں گفتار حجاب ہے۔

مشہور ہے کہ حضرت شبلیؒ ایک دفعہ حضرت جنیدؒ کی مجلس میں تشریف رکھتے تھے۔ یک بیک اٹھ کر بلند آواز سے نعرہ لگایا "اے میری مراد"۔ اشارہ حق تعالیٰ کی طرف تھا۔

حضرت جنیدؒ نے فرمایا۔ اے ابوبکر! اگر مقصود حق تعالیٰ ہے تو بلند آواز سے نعرہ کیوں لگایا۔ اس کی ذات تو اس سے بے نیاز ہے۔ اگر مقصود وہ نہیں تو مرتکبِ خلاف کیوں ہوا۔ حق تعالیٰ کو تیری گفتار کا علم ہے۔ شبلیؒ نے استغفار کیا۔

وہ لوگ جو کلام کو خاموشی سے بہتر سمجھتے ہیں یہ کہتے ہیں کہ ہمیں اپنا حال بیان کرنے کے لیے حق تعالیٰ کا حکم ہے تاکہ دعویٰ حقیقت پر مبنی ہو۔ اگر کوئی شخص ہزار برس تک دل ہی دل میں عارف اللہ ہو اور ضرورتاً خاموش نہ ہو تو جب تک زبان سے اقرارِ معرفت نہ کرے اس کی حیثیت کافروں کی سی ہوگی حق تعالیٰ نے سب مسلمانوں کو اپنے انعامات اور اپنی نوازشات پر شکر اور حمد و ثنا کا حکم دیا ہے۔ پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے فرمایا: وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ "اپنے رب کی نعمت بیان کر۔" ہمارا بولنا حق تعالیٰ کے حکم کی تعمیل و تعظیم ہے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا: اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ "مجھے پکارو میں پکار کو قبول کروں گا۔" اور نیز فرمایا: اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ "میں پکارنے والے کی سنتا ہوں جب وہ پکارتا ہے۔" اسی طرح بے شمار آیات ہیں جو ہمیں بولنے کا حکم دیتی ہیں۔

ایک شیخ فرماتے ہیں جو شخص اپنا حال بیان نہیں کرسکتا اس کو صحیح حال ہی نصیب نہیں ہوتا۔ کیونکہ حال کا ترجمان خود حال ہی ہوتا ہے (ترجمہ شعر)

"میری زبانِ حال میری زبان سے فصیح تر ہے اور میری خاموشی میری ترجمان ہے۔"

کہتے ہیں ایک روز حضرت شبلیؒ بغداد کے ایک محلہ کرخ سے گزر رہے تھے۔ دیکھا کہ ایک مدعی طریقت کہہ رہا ہے "خاموشی کلام سے بہتر ہے" شبلیؒ نے کہا "تیری خاموشی تیرے کلام سے بہتر ہے، تیرا کلام لغو ہے اور تیری خاموشی مضحکہ خیز ہے۔ میرا کلام خاموشی سے بہتر ہے کیونکہ میری خاموشی حلم ہے اور میرا کلام علم ہے" مطلب یہ کہ اگر میں نہ بولوں تو یہ میری بردباری ہے اور اگر بولوں تو یہ میرے علم کا اظہار ہوگا۔ جب خاموش ہوتا ہوں تو حلیم ہوتا ہوں اور جب بولتا ہوں تو علیم ہوتا ہوں۔

ص ۴۰۲ / ۴۹۳

میں (علی بن عثمان الجلابیؒ) کہتا ہوں کہ کلام دو قسم کا ہوتا ہے۔ اور خاموشی کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک کلام کی بنیاد حق پر ہوتی اور دوسرے کی باطل پر۔ اسی طرح ایک خاموشی تو مقصود حاصل ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے اور دوسری غفلت پر مبنی ہوتی ہے۔ کلام یا خاموشی کے وقت ہر شخص کو اپنا جائزہ لینا چاہیئے۔ اگر کلام کی بنیاد حق پر ہے تو کلام خاموشی سے بہتر ہے ورنہ خاموشی کلام سے بہتر ہے۔ اسی طرح اگر خاموشی مقصود حاصل ہونے اور مشاہدہ کی وجہ سے ہے تو کلام سے بہتر ہے اور اگر یہ حجاب اور غفلت کی وجہ سے ہے تو گفتار بہتر ہے۔ کچھ مدعی جن کے پیشِ نظر چند فضول باتیں، کچھ نفسانی خواہشات اور بے ہودہ عبارت آرائیاں ہوتی ہیں۔ کلام کو خاموشی سے بہتر سمجھتے ہیں۔ اور اسی طرح جہلا کی ایک جماعت جو کوئیں اور مینار میں تمیز نہیں کرسکتی خاموشی کو کلام سے بہتر کہتی ہے۔ یہ دونوں گروہ یکساں ہیں۔ ان کو بولنے دو ان کو خاموش

رہنے دو۔ "خبردار! جو کوئی بولتا ہے وہ یا غلط بولتا ہے یا صحیح"۔ جو تائیدِ غیب سے بولتا ہے وہ غلط نہیں ہو سکتا چنانچہ شیطان خود بولا اور اس نے کہا۔ "میں آدم سے بہتر ہوں"۔ آدم علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے بولنے کا حکم دیا تو انہوں نے کہا "اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا"۔

پس واعیانِ طریقت اپنی گفتار میں مامور اور مجبور ہوتے ہیں اور خاموشی میں شرمسار اور بے اختیار۔ "جن کی خاموشی حیا کی وجہ سے ہو ان کا کلام دلوں کے لیے پیامِ زندگی ہوتا ہے"۔ کیونکہ وہ عالمِ مشاہدہ میں بولتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ گفتارِ بے دیدار ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ جب وہ اپنے آپ میں ہوتے ہیں تو خاموشی کو کلام سے بہتر سمجھتے ہیں۔ اور جب وہ مشاہدہ میں گم ہوں۔ تو لوگ ان کے کلام کو تعویذِ جان بنا لیتے ہیں۔ اسی بنا پر کسی بزرگ نے فرمایا "جب خاموش ہوں تو ان کا سکوت سونا ہوتا ہے اور جب بولیں تو ان کا کلام سونا بنانے کا نسخۂ اکسیر"۔ پس سالک کو چاہیئے کہ جب عبودیت کے مقام پر منہمک ہو تو خاموشی اختیار کرے۔ یہاں تک کہ اس کی طاقتِ گفتار ربوبیت پر مشغولِ ثنا ہو کر سرگرمِ سخن ہو اور اس کا کلام مریدوں کے دلوں کو شکار کرے۔

آدابِ کلام یہ ہیں کہ سالک بجز حکمِ الٰہی نہ بولے۔ اور بجز حکمِ الٰہی کچھ زبان سے نہ نکالے۔

خاموشی کے آداب یہ ہیں کہ خاموشی اختیار کرنے والا جاہل نہ ہو۔ جہالت پر مطمئن نہ ہو اور غفلت میں مبتلا نہ ہو۔ مرید کو چاہیئے کہ رہنماؤں کے کلام پر دخل انداز نہ ہو۔ اس میں تصرف نہ کرے۔ بے سروپا اور سطحی گفتگو نہ کرے جس زبان سے کلمۂ شہادت پڑھا ہے اور اقرارِ توحید کیا ہے۔ اسے جھوٹ اور غیبت کے لیے استعمال نہ کرے۔ مسلمانوں کا دل نہ دکھائے، درویشوں کو ان کا نام لے کر نہ پکارے۔ جب تک اس سے کچھ پوچھا نہ جائے زبان نہ ہلائے۔ درویش کے لیے خاموشی کی شرط یہ ہے کہ باطل پر خاموش رہے اور بولنے کی شرط یہ ہے کہ بجز حق کوئی بات زبان سے نہ نکالے۔ اس اصل کی کئی شاخیں ہیں اور بے شمار لطائف ہیں مگر میں اسی پر اکتفا کرتا ہوں تاکہ کتاب طویل نہ ہو جائے۔ واللہ اعلم۔

ص ۴۰۳/۴۹۶

۲۸

اٹھائیسواں باب

آدابِ سوال و ترکِ سوال

باری تعالیٰ نے فرمایا: لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا "وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے۔ جب کوئی ان سے سوال کرتا ہے تو وہ منع نہیں کرتے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا: وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْھَرْ "سوال کرنے والے کو جھڑکو نہیں"۔ ایک جماعت کا خیال ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا کسی سے سوال نہ کرنا چاہیئے اور بجز اس کے کسی کو حاجت روا نہیں سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ سوال کرنا گویا حق تعالیٰ سے روگردانی ہے اور ہو سکتا ہے کہ روگردانی کرنے والے کو روگردان ہی چھوڑ دیا جائے۔ کہتے ہیں ایک دنیا دار آدمی نے رابعہ عدویہ سے کہا "جس چیز کی بھی ضرورت ہو مانگ میں مہیا کروں گا"۔ انہوں نے جواب دیا: "مجھے اپنے رب سے دنیا مانگتے ہوئے شرم آتی ہے چہ جائیکہ میں اپنے ہم جنس سے کوئی دنیاوی چیز طلب کروں"۔

سنا ہے ایک دفعہ ابومسلم نے ایک حق رسیدہ بزرگ کو چوری کے ایک غلط الزام کی بنا پر جیل میں ڈال دیا۔ اسی رات ابومسلم نے خواب میں پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا۔ آنحضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے فرمایا اے ابومسلم! میں بحکم خداوندی آیا ہوں۔ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تو نے اس کے ایک دوست کو بے جرم قید خانے میں ڈال دیا ہے۔ اسی وقت جا کر اسے رہا کر۔ ابومسلم چونک اٹھا اور ننگے سر، ننگے پاؤں قید خانے میں پہنچا اور دروازے کھول کر درویش کو رہا کر دیا۔ معافی مانگی اور کہا کچھ ضرورت ہو تو حکم دیجیے۔ درویش نے کہا میرا مالک تو ایسا ہے کہ آدھی رات کے وقت ابومسلم کو بستر سے اٹھا کر مجھے مصیبت سے نجات دینے کے لیے بھیج سکتا ہے۔ میں کیوں کسی غیر کے آگے ہاتھ پھیلاؤں؟ ابومسلم رونے لگا اور درویش چلا گیا۔

ص ۴۰۵ / ۴۹۷

ایک دوسری جماعت سمجھتی ہے کہ درویش کے لیے سوال کرنا روا ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ سوال

ہی نہ کرو بلکہ یہ کہا ہے کہ لپیٹ کر سوال نہ کرو اور ضد نہ کرو۔ پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی صحابہ کرامؓ کی ضروریات کے مدنظر سوال کیا اور یہ بھی کہا۔ اپنی ضرورتیں بطریقِ احسن لوگوں سے طلب کرو۔

کچھ اور مشائخ نے تین صورتوں میں سوال کرنے کو جائز قرار دیا ہے۔ ایک تو فراغت دل کے لیے۔ بقول ان کے دو روٹیوں کی قدر و قیمت اتنی نہیں کہ شبانہ روز صرف ان کا انتظار کیا جائے اور بحالتِ اضطرار ہمیں بارگاہِ حق سے اور کوئی حاجت ہی نہ ہو کیونکہ طعام اور اس کا انتظار بذاتِ خود ایک بہت بڑا کام ہے۔ حضرت بایزیدؒ کے پاس حضرت شقیقؒ کا ایک مرید زیارت کے لیے آیا۔ آپ نے حضرت شقیقؒ کا حال پوچھا تو مرید نے عرض کیا کہ آپ لوگوں سے ہٹ کر توکل پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ حضرت بایزیدؒ نے فرمایا جب تو واپس جائے تو اس سے کہنا حق تعالیٰ کو دو روٹی کے لیے آزمانا چھوڑ دیں۔ بھوک لگے تو دو روٹی اپنے ہم جنسوں سے مانگ لیا کریں۔ اپنے توکل کا مسلک بالائے طاق رکھ دیں تاکہ وہ شہر اور ملک تمہاری شومیٔ اعمال سے غرق نہ ہو جائے۔

سوال کی دوسری جائز صورت یہ ہے کہ سوال ریاضتِ نفس کے لیے کیا جائے تاکہ سوال کی ذلت برداشت کریں اس کی تکلیف گوارا کریں۔ دوسروں کی نظر میں اپنی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگائیں۔ اور اس طرح تکبر سے محفوظ رہیں۔ حضرت جنیدؒ نے حضرت شبلیؒ سے فرمایا تیرے سر میں غرور ہے کہ تو خلیفہ اور امیرِ سامرہ کے دربانوں کے سردار کا بیٹا ہے۔ تجھے کوئی چیز حاصل نہیں ہو گی جب تک تو بازار میں نہ گھومے اور ہر کسی سے سوال نہ کرے اور تجھے اپنی صحیح قیمت کا احساس نہ ہو جائے۔ حضرت شبلیؒ نے ایسا ہی کیا۔ بھیک مانگنے کے معاملے میں بھی کساد بازاری بڑھتی گئی اور ۶ سال میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ آپ سارے بازار میں گھوم نکلے اور کسی نے کچھ نہ دیا۔ آپ نے واپس آ کر حضرت جنیدؒ سے بیان کیا۔ آپ نے فرمایا اب تجھے اپنی قیمت کا اندازہ ہو گیا۔ لوگ تجھے کچھ نہیں سمجھتے۔ اپنے دل کو ان کی طرف سے پھیر لے اور کسی قیمت پر بھی ان کی صحبت اختیار نہ کر۔ یہ صرف ریاضتِ نفس کے لیے تھا کسبِ معاش کے لیے نہیں۔

ص ۴۰۵ / ۴۹۸

ذوالنون مصریؒ کہتے ہیں۔ میرا ایک دوست تھا جس کے ساتھ میری خوب موافقت تھی۔ قضا کار وہ فوت ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے اسے عقبیٰ کی نعیم سے سرفراز فرمایا۔ میں نے اسے خواب میں دیکھا اور پوچھا کہو کیا گذری؟ اس نے کہا میرے پروردگار نے مجھے بخش دیا۔ پوچھا کس صلے میں۔ کہا حق تعالیٰ نے فرمایا میرے لیے تو نے کمینے اور بخیل لوگوں سے بہت ذلت اور تکلیف اٹھائی ہے۔ ان کے آگے ہاتھ پھیلایا اور صبر کیا۔ اس بات پر تجھے بخشا جاتا ہے۔

جائز سوال کی تیسری صورت یہ ہے کہ سوال حق تعالیٰ کی عظمت و حرمت کے لیے کیا جائے۔ دنیا کی ہر چیز کا تحقیقی

مالک حق تعالیٰ ہے اور لوگ صرف وکیل اور نگران ہیں۔ درویش اپنے نصیب کی چیز حق تعالیٰ کے وکیل سے طلب کرتے ہیں اور سوال اس سے کرتے ہیں۔ جو شخص حق تعالیٰ کے سامنے اپنی ضرورت کے لیے وکیل کو پیش کرتا ہے۔ حرمت و طاعت میں اس شخص سے بالاتر ہے جو خود حق تعالیٰ سے طلب کرتا ہے اسطرح وکیلوں کے ذریعے سوال حضور و اقبال کا نشان ہے غیبت یا روگردانی کا نہیں۔

ص ۴۰۶ / ۴۹۹

کہتے ہیں حضرت یحییٰ بن معاذؒ کی ایک لڑکی تھی۔ ایک دن اس نے اپنی والدہ سے کوئی چیز مانگی والدہ نے کہا خدا سے مانگو۔ لڑکی نے کہا۔ مجھے شرم آتی ہے کہ میں اپنی ذاتی ضرورت کی چیز حق تعالیٰ سے طلب کروں۔ جو آپ دیں گی۔ وہ بھی تو اسی کا ہے۔ پس سوال کے آداب یہ ہیں:

اگر سوال پورا نہ ہو تو درویش کو زیادہ خوشی ہو۔ لوگوں پر نظر نہ ہو۔ عورتوں اور بازاری لوگوں سے سوال نہ کرے۔ اپنی ضرورت صرف اس آدمی کے سامنے رکھے جس کی کمائی حلال ہونے کا یقین ہو۔ سوال صرف ضرورت کے مطابق ہو۔ آرائش اور خانہ داری کا سامان مہیا نہ کرے۔ وقتی ضرورت کا پابند ہو۔ کل کی ضرورت کو پیش نظر نہ رکھے تاکہ ہمیشہ کی تباہی میں گرفتار نہ ہو۔ حق تعالیٰ کو اپنی گدائی کا جال نہ بنائے۔ اپنی پارسائی کا اظہار نہ کرے کہ لوگ پارسائی کے پیش نظر زیادہ دیں۔ میں نے ایک بلند مرتبہ صوفی کو دیکھا۔ وہ فاقہ میں مبتلا جنگل سے نکل کر راستے کی تکلیف اٹھاتا ہوا کوفہ کے ایک بازار میں آیا۔ ہاتھ پر ایک چڑیا اٹھا رکھی تھی اور پکار رہا تھا کون ہے جو اس چڑیا کے لیے مجھے کچھ دے۔ لوگوں نے پوچھا یہ کیوں کہتے ہو؟ کہا یہی ٹھیک ہے میں یہ نہیں کہتا کہ خدا کے لیے مجھے کچھ دو۔ دنیاوی چیز کے لیے صرف حقیر چیز کی سفارش لائی جا سکتی ہے۔ اس موضوع پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے مگر میں نے بخوفِ طوالت چند ضروری امور بیان کر دیے۔

واللہ اعلم ؞

۲۹

انتیسواں باب

آدابِ نکاح و تجرّد

حق تعالیٰ نے فرمایا: هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ "عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم عورتوں کا لباس ہو"۔ اور پیغمبر صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: تناکحوا تکثروا فانی اباھی بکم الامم یوم القیامۃ ولو بالسقط۔ (ص ۴۰۸/۵۰۰) نکاح کرو اور کثیر التعداد ہو جاؤ۔ مجھے تمہاری کثرت پر قیامت کے دن سب امتوں پر فخر ہوگا چاہے ساقط بچے ہی کیوں نہ ہوں"۔ اور نیز فرمایا: انّ اعظم النساء برکۃ اقلھن مونۃ واحسنھن وجوھا واخصھن مھورًا "عظیم ترین وہ بابرکت عورت ہے جو کفایت شعار، جمیل اور جس کا مہر کم ہو۔ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ جملہ مردوں اور عورتوں کے لیے نکاح مباح ہے جو حرام سے پرہیز نہ کر سکے اس پر فرض ہے۔ اور اس کے لیے جو بال بچوں کے حقوق ادا کر سکے سنّت ہے۔ اہل طریقت میں سے ایک جماعت کہتی ہے کہ نکاح دفع شہوت کے لیے ضروری ہے اور کسبِ حلال دل کی فراغت کے لیے۔ دوسری جماعت کہتی ہے کہ نکاح قیامِ نسل کے لیے ضروری ہے تاکہ اولاد ہو۔ اولاد اگر باپ سے پہلے مر جائے تو شفاعت کرے گی۔ اگر باپ پہلے مر جائے تو اس کے بعد دعاگو رہے گی۔

روایات میں ہے کہ حضرت عمرؓ بن خطاب نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بنتِ پیغمبر صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بیٹی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے دستِ مبارک کے لیے ان کے والد حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے درخواست کی حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ لڑکی خورد سال ہے اور آپ بوڑھے ہو چکے ہیں۔ میرا ارادہ اسے اپنے بھتیجے عبداللہ بن جعفرؓ سے بیاہنے کا ہے۔ حضرت عمرؓ نے پیغام پہنچایا کہ جہان میں بڑی عمر کی عورتیں ہیں مگر ام کلثومؓ کے لیے درخواست کا مقصد اطمینانِ نفس نہیں بلکہ بقائے نسل ہے۔ کیونکہ میں نے پیغمبر صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم سے سنا ہے: کل نسب وحسب ینقطع بالموت الّا حسبی ونسبی دیودی کل سبب ونسب الّا سببی ونسبی" سب حسب و نسب موت

سے کٹ جائیں گے مگر میرا حسب و نسب قائم رہے گا۔ ہر سبب اور نسب منقطع ہو جائے گا مگر میرا سبب اور نسب منقطع نہیں ہوگا۔ میرا سبب تو ہے مگر میری ضرورت یہ ہے کہ میرا نسب بھی قائم رہے۔ اور ہر دو طرف سے حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متابعت میں مستحکم ہو جاؤں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کو حضرت عمرؓ کے نکاح میں دے دیا اور حضرت زید ان کے بطن سے پیدا ہوئے۔

ص ۴۰۹/۵۰۱ پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تنکح النساء علی اربعۃ علی المال والحسب والحسن والدین فعلیکم بذات الدین فانہ ما استفاد امرءٌ بعد الاسلام خیرا من زوجۃ مؤمنۃ موافقۃ یسربھا اذا نظر الیھا فوابید دزوابید "عورت سے نکاح چار مقاصد کی بنا پر کیا جاتا ہے۔ مال، حسب، حسن اور دین۔ نکاح دین دار عورت سے کرو۔ کیونکہ اسلام کے بعد مومن کے لیے فرمانبردار مومن عورت جسے دیکھ کر مسرت حاصل ہو مغتنم ہے"۔ ایمان دار آدمی ایسی عورت کی صحبت میں قوت، استحکام اور پاکیزگی حاصل کرتا ہے اور دنیا میں اسے موانست نصیب ہوتی ہے۔ جملہ برائیاں تنہائی میں ہیں اور سب سعادت صحبت میں۔ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: الشیطان مع الواحد "شیطان تنہا آدمی کے ساتھ ہوتا ہے"۔ یہ حقیقت ہے کہ جب مرد یا عورت تنہا ہوں تو شیطان ہم نشین ہو جاتا ہے۔ وہ نفسانی شہوات کو برانگیختہ کرتا ہے۔ حرمتِ دین کے لیے اور حرام سے محفوظ رہنے کے لیے میاں بیوی کی مجالست سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں بشرطیکہ دونوں میں باہمی موانست اور موافقت ہو۔ کوئی عذاب یا تکلیف ناموافق عورت کی ہم نشینی سے بڑھ کر نہیں۔ درویش کو چاہیئے کہ پہلے خوب غور کرے اور نکاح کرنے اور مجرد رہنے کے حسن و قبح کا تجزیہ کرے تاکہ جس چیز کی خرابیوں کا تدارک وہ کر سکے اسے اپنائے۔

مجرد رہنے میں دو خرابیاں ہیں۔ ایک تو ترک سنت اور دوسری نفسانی خواہشات کا طغیان اور حرام میں مبتلا ہو جانے کا امکان۔ اسی طرح نکاح کرنے میں بھی دو خرابیاں ہیں۔ ایک دل کا غیر اللہ میں مشغول ہونا اور دوسری لذتِ نفسانی کا انہماک۔ یہ مسئلہ گوشہ نشینی اور ہم نشینی سے پیوستہ ہے۔ ہم نشینی کی طرف مائل درویش کے لیے نکاح ضروری ہے اور عزلت پسندوں کے لیے مجرد رہنا کافی ہے۔ پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا سیروا فقد سبق المفردون "تنہا رہنے والے سبقت لے گئے ہیں"۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں: "ہلکے بوجھ والے نجات پا گئے۔ بھاری بوجھ والے ہلاک ہو گئے"۔ حضرت ابراہیم خواصؒ نے فرمایا: میں ایک گاؤں میں کسی بزرگ کی زیارت کے لیے گیا۔ گھر میں داخل ہوا تو دیکھا کہ گھر

ص ۴۰۹/۵۰۲

ایک ولی اللہ کے عبادت کدہ کی مانند پاکیزہ ہے۔ دو محراب ہیں۔ ایک میں وہ بزرگ خود بیٹھے ہوئے ہیں اور دوسرے میں ایک پاکیزہ بڑھیا عورت۔ کثرتِ عبادت سے دونوں کمزور ہیں۔ میری آمد پر دونوں نے بہت خوشی کا اظہار کیا۔ میں تین روز تک ٹھہرا۔ جب واپس لوٹنے کا ارادہ کیا تو اس بزرگ سے پوچھا۔ اس بڑھیا کا آپ سے کیا رشتہ ہے؟ فرمایا رشتہ سے میرے چچا کی بیٹی ہے اور میری بیوی ہے۔ میں نے کہا میں نے تو تین روزہ قیام میں یہی سمجھا کہ وہ بے گانہ ہیں۔ فرمایا پینسٹھ برس سے یہی سلسلہ چلا آ رہا ہے۔ پوچھا کیوں؟ کہا بچپن میں ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ اس کے باپ نے اس کا ہاتھ مجھے دینے سے انکار کر دیا کیونکہ ہماری محبت کا راز اسے معلوم ہو گیا تھا۔ ایک مدت ہم نے غمِ فراق اٹھایا۔ آخر اس کا باپ فوت ہو گیا۔ اور میرے باپ نے جو اس کے تایا بھی تھے اس کی شادی میرے ساتھ کر دی۔ جب ہم پہلی رات ملے تو اس نے کہا دیکھو حق تعالیٰ نے ہمیں کتنی بڑی نعمت عطا کی ہے۔ ہمیں ملا دیا اور ہمارے رنج و الم کو ختم کر دیا۔ میں نے کہا بے شک۔ اس نے پھر کہا ہمیں آج رات اپنی نفسانی خواہشات کو روک کر نفس کو پامال کرنا چاہیے۔ اور نعمتِ حق کا شکرانہ ادا کرنے کے لیے عبادت کرنا چاہیے۔ میں نے کہا بہتر ہے۔ دوسری رات بھی اس نے ایسا ہی کہا۔ تیسری رات میں نے کہا کہ دو راتیں تیرے کہنے پر شکرِ نعمت کیا آج رات میرے کہنے پر سہی۔ چنانچہ اب پینسٹھ برس ہو چکے ہیں۔ ہم نے ایک دوسرے کو چھوا تک نہیں۔ عمر شکرِ نعمت میں گذار رہے ہیں۔

ص ۴۱۰/۵۰۳

جب درویش کسی عورت سے نکاح کرے اور اس کی ہم نشینی اختیار کرے تو چاہیئے کہ جب تک اس پردہ نشین عورت کا نان و نفقہ کسبِ حلال سے مہیا نہ کرے۔ مالِ حلال سے اس کا حق مہر ادا نہ کرلے اور دیگر حقوق الٰہی پورے نہ کرلے لذاتِ نفسانی میں مستغرق نہ ہو۔ ہم بستری سے قبل اپنے اوراد و وظائف ادا کرے۔ حرص و ہوا کو ختم کر دے اور از راہِ مناجات کہے!

بارِ خدایا! تو نے بقائے نسل کے لیے جذبہ موانست پیدا کیا ہے۔ تیری رضا ہے کہ میں اس صحبت کو قبول کروں۔ پروردگار! تو اس میں میرے لیے دو چیزیں ودیعت فرما۔ ایک یہ کہ میں فعلِ حرام سے محفوظ رہوں اور دوسری یہ کہ مجھے ایسا فرزند عطا فرما جو تیرا ولی ہو۔ اور میرے دل کو تیری طرف سے ہٹا کر کسی اور طرف مشغول نہ کر دے۔

حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ کا فرزند بچپن میں جب اپنی والدہ سے کچھ کھانے کو مانگتا تو وہ فرماتیں۔

اپنے خدا سے مانگ۔ لڑکا محراب میں جا کر سجدہ کرتا۔ اور اس دوران میں والدہ چپکے سے کھانا سامنے رکھ دیتی۔ لڑکے کو معلوم بھی نہ ہوتا کہ والدہ نے رکھا ہے۔ اس طرح اسے حق تعالیٰ سے مانگنے کی عادت پڑ گئی۔ ایک روز لڑکا مدرسہ سے آیا تو والدہ گھر پر نہیں تھی۔ اس نے اپنی ضرورت کے لیے سجدہ کیا حق تعالیٰ نے اس کی ضرورت مہیا کر دی۔ والدہ نے یہ صورت دیکھی تو حیرت زدہ ہو گئیں اور پوچھا یہ کھانا کہاں سے آیا۔ لڑکے نے جواب دیا جہاں سے روز آتا ہے۔ اسی طرح حضرت زکریا علیہ السلام جب حضرت مریم علیہا السلام کے پاس آتے تو گرمی کے دنوں میں سردی اور سردی کے دنوں میں گرمی کا میوہ ان کے پاس موجود پاتے اور تعجب سے پوچھتے "یہ میوہ کہاں سے ملا"۔ آپ فرماتیں "یہ اللہ کی طرف سے ہے"۔ پس ضروری ہے کہ کوئی اہتمام سنت درویش کو حرام دنیا اور دل کی مشغولیت میں غرق نہ کر دے۔ درویش کی ہلاکت اس کے دل کی خرابی ہے جیسے دولت مند کی بربادی اس کے گھر اور گھر کے سامان کی خرابی ہے۔ دولت مند کا نقصان پورا ہو جاتا ہے مگر درویش کا نقصان کبھی پورا نہیں ہوتا۔ فی زمانہ یہ امر محال ہے کہ کسی شخص کو ایسی رفیقۂ حیات میسر آئے جو ضرورت سے زیادہ فضول اور محال چیزوں کی طالب نہ ہو یہی وجہ ہے کہ ایک جماعت مجرد اور سبکسار رہنا بہتر سمجھتی ہے اور اس حدیث کی رعایت پیش نظر رکھتی ہے۔ حضور سرورِ کائنات صلعم نے فرمایا کہ آخر زمانہ میں وہ شخص فائدہ میں رہیگا جو خفیف الحاذ ہو لوگوں نے پوچھا کہ اس سے مراد کیا ہے؟ تو فرمایا "جس کے اہل و عیال نہ ہوں"۔ نیز فرمایا "چلو کہ بے اہل و عیال تم سے آگے نکل گئے"۔

ص ۴۱۱/۵۰۲

اہل طریقت کا اس پر اتفاق ہے کہ سالکانِ حق میں مفرد اور تنہا لوگ افضل ہیں بشرطیکہ ان کے دلوں میں خرابی نہ ہو اور وہ ارتکابِ معاصی اور حصول خواہشاتِ نفسانی سے روگرداں ہوں۔ عام لوگ حصول خواہشاتِ نفسانی کے لیے اس حدیث کا سہارا لیتے ہیں: حُبّب الی من دنیاکم ثلث الطیب، والنساء وجعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ "تمہاری دنیا میں سے تین چیزیں مجھے محبوب ہیں خوشبو، عورت اور آنکھ کی ٹھنڈک نماز"۔ چونکہ عورت آنحضور صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کو محبوب تھی اس لیے نکاح کرنا افضل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لی حرفتان الفقر والجہاد "میرے دو کام ہیں فقر اور جہاد"۔ ان چیزوں سے کیوں دور رہتے ہو؟ اگر عورت محبوب تھی تو یہ کام بھی آپ کو محبوب تھے۔ محض اپنی نفسانی رغبت کو محبوبِ پیغمبر کہنا غلط ہے۔ کوئی آدمی پچاس برس تک ہوا و ہوس میں مبتلا رہ کر یہ کہے کہ وہ متابع سنت ہے تو سخت غلطی کا مرتکب ہے۔ الغرض پہلا فتنہ جو بہشت میں ظہور پذیر ہوا وہ عورت کی وجہ سے تھا یعنی فتنۂ ہابیل و قابیل۔ اسی طرح جب حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ دو فرشتوں کو مبتلائے عذاب کرے تو اس کا سبب بھی عورت ہی کو بنایا۔ پیغمبر صلے اللہ علیہ

ص ۴۱۲/۵۰۵

وسلم نے فرمایا: ما ترکت بعدی فتنۃ اضرّ علی الرجال من النساء" میں نے اپنے پیچھے مردوں کے لیے عورت سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں چھوڑا"۔ جو فتنہ ظاہر میں یہ ہے حقیقت میں کیا ہوگا۔

میں (علی بن عثمان الجلابی رح) گیارہ برس تک اس فتنہ سے محفوظ رہا۔ مگر بالآخر قضائے الٰہی سے اس فتنہ کا شکار ہوا۔ میرا دل بن دیکھے ایک پری صفت عورت کے حسن و جمال پر فریفتہ ہوگیا اور میں پورا ایک سال اس آفت میں مبتلا رہا۔ قریب تھا کہ میرا دین برباد ہو جائے مگر حق تعالیٰ نے کمال فضل و کرم سے مجھے ہلاکت سے بچانے کا سامان مہیا فرمایا اور اپنی رحمت سے مجھے نجات عطا فرمائی۔ حق تعالیٰ کی اس نعمتِ عظیم کا شکر ہے۔

المختصر طریقت کی بنیاد تجرد پر ہے۔ نکاح کے بعد حالت بدل جاتی ہے۔ شہوات نفسانی کی آگ ایسی نہیں کہ کسی کوشش سے فرو کی جا سکے۔ کیونکہ خود پیدا کردہ مصیبت کا علاج آدمی خود ہی کر سکتا ہے کسی اور کے بس کی بات نہیں۔ یاد رکھو خواہشِ نفس کا ازالہ دو طرح سے ہو سکتا ہے۔ ایک تو انسان کی اپنی کوشش اور تکلیف ہے۔ دوسری صورت اس کے کسب اور مجاہدہ کے دائرہ امکان سے باہر ہے۔ تکلیف کے تحت فاقہ کشی ہے۔ اور جو انسانی کوشش اور تکلف سے باہر ہے وہ بے قرار رکھنے والا خوف ہے۔ یا سچی محبت ہے جو ہمت اور ارادے پر رفتہ رفتہ اثر انداز ہو کر بالآخر دل کی تسکین کا باعث ہوتی ہے۔ محبت آہستہ آہستہ تمام اعضائے انسانی پر اپنی حکومت قائم کر لیتی ہے اور تمام حواس کو معزول کر کے انسان کو مشغولیت کے مقام پر فائز کر دیتی ہے اور اس کو جملہ ھزلیات سے پاک کر دیتی ہے۔ احمد حمادی سرخسی ماوراء النہر میں مقیم تھے تو لوگوں نے دریافت کیا آپ شادی کرنا چاہتے ہیں؟ کہا نہیں۔ پوچھا کیوں؟ کہا میں یا اپنے آپ سے غائب ہوتا ہوں یا حاضر۔ جب غائب ہوتا ہوں تو مجھے ہر دو جہان کی کوئی چیز یاد نہیں ہوتی۔ جب حاضر ہوتا ہوں تو نفس کو اس منہاج پر رکھتا ہوں کہ اگر ایک روٹی مل جائے تو ہزار حور کے برابر ہو۔ دل کی مشغولیت کارِ عظیم ہے جس طرح بھی حاصل ہو سکے۔

ص ۴۱۳ / ۵۰۶

ایک دوسری جماعت یہ سمجھتی ہے کہ نکاح و تجرد میں ہمارا کوئی دخل نہیں۔ دیکھنا چاہیئے کہ تقدیر الٰہی کے مطابق پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ اگر مجرد رہنا مقدّر ہے تو پاک رہنے کی کوشش لازم ہے اگر نکاح مقدر ہے تو اتباعِ سنّت ضروری ہے اور دل کو غفلت سے بچانا لابدی ہے۔ اگر تائیدِ ربّانی شاملِ حال ہو تو مجرد رہ کر بھی آدمی محفوظ رہتا ہے۔ مثلاً یوسف علیہ السلام زلیخا کے ابتلا میں مصئون رہے۔ جب زلیخا خلوت میں ملی تو آپ مراد حاصل

ص ۴۳۱، ب ۵

کرنے پر قادر تھے مگر روگردانی فرمائی۔ مراد سے بے مراد رہ کر خواہشِ نفس کو مغلوب کرنے اور اپنے عیوب پر نظر رکھنے میں مشغول رہے۔ اسی طرح اگر نکاح میں بھی تائیدِ ربّانی حاصل ہے تو وہ نکاح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح ہوگا ان کو حق تعالیٰ پر مکمل اعتماد تھا۔ انہوں نے گھریلو زندگی کو اپنا واحد مشغلہ نہیں بنایا۔ جب حضرت سارہ کے دل میں رشک پیدا ہوا اور انہوں نے غیرت کا اظہار کیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت ہاجرہ کو لے گئے اور مکّہ کی بے آب وگیاہ وادی میں چھوڑ آئے حق تعالیٰ نے جیسے چاہا ان کی پرورش فرمائی۔

القصّہ آدمی کی ہلاکت نہ نکاح کرنے میں ہے اور نہ مجرّد رہنے میں۔ ہلاکت دراصل اپنے اختیار کو بروئے کار لانے اور خواہشات نفسانی کی متابعت کرنے میں ہے عیال دار کے لیے شرطِ ادب یہ ہے کہ اس کے روزمرّہ کے اوراد و وظائف قضا نہ ہوں۔ احوال ضائع نہ ہوں۔ اوقات برباد نہ ہوں۔ اہل خانہ سے شفقت سے پیش آئے۔ طیب کمائی سے روزی مہیا کرے۔ ان کی ضروریات پورا کرنے کے لیے ظالم فرماں رواؤں کی رواداری نہ کرے تاکہ اس کی اولاد بھی اسی قماش کی پیدا نہ ہو۔

کہتے ہیں کہ احمد بن حرب نیشاپوری کے پاس ایک روز نیشاپور کے رؤسا اور سردار سلام کے لیے حاضر خدمت تھے۔ آپ ان کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں آپ کا بیٹا شراب میں بدمست جھومتا ہوا آیا اور گاتا ہوا لاپروائی کے عالم میں پاس سے گزر گیا۔ سب کو رنج ہوا۔ احمد بن حرب نے پوچھا آپ لوگوں کا حال کیوں متغیر ہوگیا؟ سب نے جواب دیا کہ ہمیں اس لڑکے کے حال پر بے حد افسوس ہوا۔ اس نے آپ کا بھی کچھ خیال نہ کیا۔ فرمایا وہ معذور ہے۔ ایک رات ہمارے گھر میں ہمسایہ کے گھر سے کھانا آیا تھا میں نے اور میری بیوی نے کھایا۔ اسی رات اس لڑکے کا نطفہ قرار پایا۔ ہم پر نیند نے غلبہ کیا اور ہمارے تمام اوراد و وظائف قضا ہوگئے۔ جب صبح ہوئی تو ہم نے جستجو کی اور اس ہمسایہ کے پاس گئے اور پوچھا جو کھانا ہمیں بھیجا تھا وہ کہاں سے آیا تھا۔ معلوم ہوا کہ شادی کی ایک تقریب سے آیا تھا۔ ہم نے مزید تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ وہ کھانا بادشاہ کے گھر سے آیا تھا۔ آدابِ تجرد میں یہ شامل ہے کہ آنکھ ناشائستہ چیزوں پر نہ ڈالے۔ ناقابل شنیدہ چیزوں کو نہ سنے۔ ایسی چیزوں کے متعلق نہ سوچے جو سوچنے کے لائق نہ ہوں۔ نفسانی خواہش کی آگ کو بھوک سے فرو کرے۔ دل کو دنیا اور دنیا کی دلچسپیوں سے بچائے۔ اپنی خواہشِ نفس کو علم اور الہام نہ کہے شیطانی شعبدوں کی تاویل نہ کرے۔ یہی مقبولِ طریقت ہونے کا راستہ ہے۔

ص ۴۶۱، ۵۰۸

یہ صحبت و معاملہ کے آداب ہیں جو مختصراً بیان ہوئے۔ اگرچہ تھوڑے سے معرضِ بیان میں آئے تاہم تھوڑی چیز زیادہ کے لیے دلیلِ راہ ہوتی ہے۔ واللہ اعلم ؛

کشفِ حجاب دہم (اصطلاحاتِ صوفیاء)

صوفیائے کرام کا کلام۔ ان کے الفاظ کی حدود اور حقائق و معانی

خدا تجھے سعادت نصیب کرے۔ اہلِ صنعت اور اربابِ معاملہ کے پاس باہمی رموز بیان کرنے کے لیے ایسے مخصوص الفاظ اور اصطلاحات ہوتی ہیں جن کا مطلب ان کے سوا کوئی نہیں سمجھتا۔ یہ عبارات اور اصطلاحات اس لیے وضع کی جاتی ہیں کہ بات اچھی طرح سمجھائی جاسکے اور مشکل چیز آسان ہوکر مرید پر واضح ہوسکے۔ ایک اور مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ راز کی چیزیں نااہل لوگوں سے چھپائی جاسکیں۔ اس کے لیے واضح دلائل موجود ہیں۔ چنانچہ اہلِ لغت کی اپنی اصطلاحات ہیں۔ مثلاً فعلِ ماضی۔ فعل مستقبل۔ صحیح۔ معتل۔ اجوف۔ لفیف۔ ناقص وغیرہ۔ اہل نحو کی اپنی اصطلاحات ہیں مثلاً رفع۔ نصب۔ جرّ۔ ضمّہ۔ کسرہ۔ جزم۔ منصرف۔ غیر منصرف وغیرہ۔ اہل عروض کی بھی اصطلاحات ہیں مثلاً بحور، دائرہ، سبب، وتد، فاصلہ وغیرہ۔ اہل حساب کی اپنی وضع کی ہوئی اصطلاحات ہیں۔ مثلاً فرد، زوج، ضرب، تقسیم، کعب، جزء، اضافت، تضعیف، تنصیف، جمع، تفریق وغیرہ۔ اہل فقہ کی اپنی اصطلاحات ہیں مثلاً علّت، معلول، قیاس، اجتہاد، دفع، الزام وغیرہ۔ اہل حدیث کی اپنی وضع کردہ اصطلاحات ہیں۔ مثلاً مسند، مرسل، احاد، متواتر، جرح، تعدیل وغیرہ۔ اہل کلام کی اپنی اصطلاحات ہیں مثلاً عرض، جوھر، کل، جزء، جسم، حدوث، تحیّز، توالی وغیرہ۔ اسی طرح صوفیائے کرام نے بھی مطالب کو بیان کرنے یا چھپانے کے لیے کچھ الفاظ مقرر کر رکھے ہیں تاکہ جسے چاہیں اپنا مطلب بتا دیں اور جس سے چاہیں چھپالیں۔ میں ان کلمات میں سے بعض کی پوری تشریح کرتا ہوں اور فرق واضح کرتا ہوں تاکہ تجھے اور اس کتاب کے قارئین کو پوری منفعت ہو اور مجھے نیک دعا حاصل ہو۔

ص ۴۱۵/۵۰۹

حال اور وقت اور ان کا فرق

"وقت" ایک مشہور اصطلاح ہے اور مشائخ کبار نے اس پر بہت کچھ کہا ہے۔ میں بیان کو طول دینا نہیں چاہتا اس لیے صرف وقت اور حال کی کیفیت بیان کروں گا اور دونوں کا فرق واضح کروں گا۔

صوفیائے کرام کے نزدیک وقت ایک ایسی حالت کا نام ہے جس میں درویش گذشتہ اور آئندہ سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اس کے دل پر فیضانِ حق وارد ہوتا ہے اور اس کا باطن اس طرح مجتمع ہو جاتا ہے کہ عالمِ مشاہدہ میں نہ گذشتہ کی یاد آتی ہے نہ آئندہ کا خیال۔ یہ ہر شخص کے بس میں نہیں گو سب نہیں جانتے کہ سابقہ تقدیر کیا تھی اور انجام کیا ہوگا۔ اس کے اہل صرف صاحب وقت ہیں جو کہتے ہیں کہ رفتہ و آئندہ ہمارے احاطۂ ادراک سے باہر ہیں۔ ہمارے لیے یہ وقت خوب ہے اگر ہم ماضی میں مشغول ہوں یا آئندہ کا اندیشہ دل میں لائیں تو ہمارے اور وقت یعنی مشاہدۂ حق کے درمیان پردہ حائل ہو جائے گا اور پردہ صرف پریشانی اور آشفتگی کا باعث ہوتا ہے۔ الغرض جو چیز دسترس سے باہر ہو اس کی بابت سوچنا بے کار ہے۔ حضرت ابو سعید خراز فرماتے ہیں: اپنے عزیز وقت کو سوائے عزیز ترین چیزوں کے کسی چیز پر صرف نہ کرو اور عزیز ترین چیزیں صرف ماضی و مستقبل کے درمیانی وقفے میں رونما ہوتی ہیں۔ آنحضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لی مع اللّٰہ وقت لا یسعنی فیہ ملک مقرب ولا نبی مرسل "مجھے حق تعالیٰ کے ساتھ ایک ایسا وقت ہوتا ہے جب میرے ساتھ نہ کسی مقرب فرشتہ کی اور نہ کسی نبی مرسل کی گنجائش ہوتی ہے۔" یعنی ہزار در ہزار عالم میرے دل سے بعید ہوتے ہیں اور میری نظر میں کسی کی وقعت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ جب شبِ معراج زمین اور افلاک کی دلچسپیاں آپ کو پیش کی گئیں آپ نے کسی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا حق تعالیٰ نے فرمایا: مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی "نہ نظر بھٹکی اور نہ متجاوز ہوئی"۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم عزیز تھے اور عزیز کو بجز عزیز مشغولیت نہیں ہوتی۔

ص ۴۱۶ / ۵۱۰

موحد کے لیے دو وقت ہوتے ہیں ایک "فقد" جس میں مشاہدہ حاصل نہیں ہوتا۔ دوسرا "وجد" جب عالم مشاہدہ ہوتا ہے۔ دونوں حالتوں میں موحد مقہور ہوتا ہے۔ وصل (وجد) وصل حق اور جدائی (فقد) بحکم حق ہوتی ہے۔ اس کے اپنے اختیار یا کسب کا کوئی قابلِ ذکر دخل نہیں ہوتا۔ جب دستِ اختیار کوتاہ ہو تو بندہ جو کچھ دیکھتا یا کرتا ہے۔ وہ وقت کے زیرِ اثر ہوتا ہے۔

ص ۴۱۷ / ۵۱۱

حضرت جنیدؒ کہتے ہیں میں نے ایک درویش کو صحرا میں ایک کیکر کے درخت کے نیچے سخت ریاضت اور مجاہدہ کے عالم میں دیکھا، پوچھا تم اس جگہ کیوں بیٹھے ہو اور اس قدر سختی اور مصیبت کیوں اٹھا رہے ہو؟ اس نے جواب دیا مجھے "وقت" حاصل تھا جو اس جگہ برباد ہو گیا اسی کے غم میں یہاں بیٹھا ہوا ہوں۔ حضرت جنیدؒ نے پوچھا کتنے عرصہ سے بیٹھے ہو؟ کہا بارہ برس سے اور پھر درخواست کی کہ میرے لیے دعا فرمائیں شاید میرا کھویا ہوا وقت مل جائے۔ حضرت جنیدؒ بیان فرماتے ہیں۔ میں نے حج سے فارغ ہو کر اس کے حق میں دعا مانگی۔ دعا قبول ہوئی اور اس کی مراد پوری ہو گئی۔ واپس پلٹے دیکھا تو درویش اسی جگہ بدستور بیٹھا تھا پوچھا تمہارا وقت مل گیا اب کیوں بیٹھے ہو؟ کہا یہ میری وحشت کا مقام تھا۔ میری دولت اسی جگہ گم ہوئی تھی۔ دوبارہ اسی جگہ ملی۔ اب یہ میری محبت کا مقام ہے۔ اسے چھوڑنا روا نہیں۔ آپ سلامتی کے ساتھ تشریف لے جائیں۔ میں اپنی خاک اسی خاک میں ملاؤں گا تاکہ حشر کے دن اسی زمین سے سر اٹھاؤں جہاں میری محبت کی دولت ہے اور جو میری فرحت کا مقام ہے۔ شعر (ترجمہ)

"جو حسین تحفہ حبیب سے آئے وہ عزیز ہوتا ہے جس مقام پر عزت ملے وہ پاکیزہ ہوتا ہے۔"

جو چیز انسانی اختیار سے باہر ہو اور اسے محنت و مشقت سے حاصل نہ کیا جا سکے جو بازار میں فروخت نہ ہوتی ہو چاہیئے کہ اس کے عوض جانِ عزیز بھی پیش کی جائے۔ آدمی کو اس کے حصول یا دفع میں کوئی دخل نہیں۔ اور یہ دونوں پہلو اس کے لیے برابر ہیں۔ اس کی تحقیق میں انسانی اختیار قطعاً باطل ہے۔ مشائخ نے کہا ہے "وقت کاٹنے والی تلوار ہے۔" تلوار کی صفت کاٹنا ہے۔ وقت کی صفت بھی کاٹنا ہے۔ وقت ماضی اور مستقبل کی جڑ کاٹتا ہے۔ گذشتہ کل اور آنے والی کل کا اندازہ ختم کر دیتا ہے۔ تلوار کا وجود خطرناک ہوتا ہے یا بادشاہ بنا دیتی ہے یا ہلاک کر دیتی ہے۔ اگر کوئی ہزار سال تلوار کی خدمت کرے اور اسے اپنے کندھے پر اٹھائے پھرے کاٹ کے وقت وہ اپنے مالک یا غیر کی گردن میں کوئی تمیز نہیں کرتی۔ اس کی صفت قہر ہے اور کسی کے قبضہ میں رہ کر اس کی صفت زائل نہیں ہوتی۔

ص ۴۱۸/۵۱۲

حال ایک واردات ہے جو وقت پر نازل ہو کر اسے اس طرح مزین کر دیتی ہے جیسے روح جسم کو۔ حال وقت کا محتاج ہوتا ہے کیونکہ اس کی صفا اور اس کا قیام حال پر منحصر ہے۔ جب صاحبِ وقت صاحبِ حال ہو جاتا ہے تو تغیر سے آزاد ہو جاتا ہے اور اسے استقامت میسر آجاتی ہے۔ بے حال وقت زوال پذیر رہتا ہے۔ حال میسر آئے تو جملہ کیفیت وقت ہو جاتی ہے اور اس پر زوال نہیں آتا۔ فیضان کی آمد و رفت صرف شکل پذیر ہونے اور نمایاں ہونے کا پہلو ہے۔ حال سے

قبل صاحب وقت پر حال وقتی طور پر نازل ہوتا ہے اور غفلت اس کے جلو میں ہوتی ہے۔ نزولِ حال وقت کو تمکین دیتا ہے۔ صاحبِ وقت پر غفلت روا اور صاحب حال پر ناروا ہے۔

مشائخ رہ نے فرمایا۔ "حال فنون بیان میں زبان کے ساکت ہوجانے کا نام ہے"۔ صاحب حال کی کیفیت اس کے عمل سے نمایاں ہوتی ہے۔ کسی بزرگ نے کہا ہے۔ "حال سے متعلق سوال محال ہے"۔ کیونکہ حال فنائے قال کا نام ہے۔

ص ۴/۱۸ / ۵۱۳ استاد ابو علی دقاقؒ فرماتے ہیں کہ دنیا و عقبیٰ یا مسرت و ہلاکت میں "وقت" وہی ہے جو فی الحال تم پر وارد ہے۔ "حال" کی یہ کیفیت نہیں۔ وہ واردات من اللہ ہے جو اپنے ساتھ ہر چیز کو بہا کر لے جاتی ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام صاحبِ وقت تھے۔ کبھی غمِ فراق میں آنکھیں سفید ہوجاتی تھیں۔ کبھی مسرتِ وصال سے نور واپس آجاتا تھا۔ کبھی گریہ سے بال اور نالہ سے ریشۂ قلم کی طرح ہوجاتے تھے۔ کبھی مسرت سے روح کی طرح لطیف اور فرحت سے سراپا فرحت ہوجاتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام صاحبِ حال تھے۔ نہ غمِ فراق میں مبتلا تھے نہ فرحتِ وصال میں۔ سورج، چاند، ستارے سب کچھ سامنے تھا۔ مگر آپ بہ فیضِ حال سب سے فارغ تھے۔ ہر چیز میں مشاہدۂ حق کرتے اور فرماتے "میں زوال پذیر چیزوں کو دوست نہیں رکھتا"۔ صاحبِ وقت کے لیے دنیا کبھی جہنم ہو کر رہ جاتی ہے کیونکہ وہ مشاہدۂ حق سے محروم ہوجاتا ہے۔ اور حبیب کے حجاب سے اس کا دل وحشت میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ پھر کبھی دولتِ مشاہدہ پا کر وہ بہشت کی طرح شگفتہ ہوجاتا ہے۔ اس کے برعکس صاحبِ حال کے لیے حجاب اور مشاہدے کا عالم برابر ہوتا ہے کیونکہ وہ ہمیشہ محل مشاہدہ پر ہوتا ہے۔ الغرض حال مطلوبِ حق کی صفت ہے اور وقت طالبِ حق کی۔ طالبِ حق یعنی صاحب وقت باہوش و تمکین ہوتا ہے۔ مطلوبِ حق (صاحبِ حال) مجذوبِ حق اور مدہوشِ حق ہوتا ہے۔ دونوں مقام ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ اصطلاحاتِ صوفیہ میں مقام و تمکین بھی ہیں جن کا ذکر آئندہ باب میں ہو رہا ہے۔

مقام و تمکین اور ان کا فرق

مقام سے مراد طالب کا حقوقِ مطلوب کو سخت کوشش اور صحیح نیت سے ادا کرنا ہے۔ ہر مرید کے لیے

ص ۴/۱۹ / ۵۱۴ ایک مقام ہوتا ہے جو ابتدائے طلب میں باعثِ طلب ہوتا ہے۔ طالبِ حق ویسے تو ہر مقام سے بہرہ ور ہوتا ہے اور وہ ہر مقام سے گزرتا ہے مگر اس کا قیام صرف ایک مقام پر ہوتا ہے کیونکہ مقام و ارادت کا تعلق جبلّت اور فطری

ترکیب سے ہے۔ فعل اور عمل سے نہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ "سب کے لیے ایک معین مقام ہوتا ہے"۔ آدم علیہ السلام کا مقام توبہ تھا۔ نوح علیہ السلام کا زہد ابراہیم علیہ السلام کا تسلیم حضرت موسیٰ کی انابت داؤد علیہ السلام کا غم عیسیٰ علیہ السلام کا امید یحیٰی علیہ السلام کا خوف اور ہمارے پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر۔ ویسے تو ہر طالب ہر جگہ سے استفادہ کرتا ہے مگر بالآخر اس کا رجوع اپنے اصل کی طرف ہوتا ہے۔ مکتبہ حارثیہ کے تحت میں مقامات سے متعلق کچھ بیان کر چکا ہوں۔ اور حال و مقام کا فرق ظاہر کر چکا ہوں۔ مگر یہاں بھی کچھ بیان کرنا ضروری ہے۔ راہِ حق کے تین پہلو ہیں۔ مقام، حال اور تمکین۔ باری تعالیٰ نے پیغمبروں کو بھیجا تاکہ وہ راہ حق دکھائیں۔ اور مقامات کو ظاہر کریں۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی تشریف لائے۔ ہر ایک اپنے مقام کے ساتھ۔ پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد پر ہر مقام کو حال نصیب ہوا اور اسے وہ جگہ ملی جو انسان کی کسب و کوشش کے دائرہ امکان سے باہر تھی۔ یہاں تک کہ دین پایۂ تکمیل کو پہنچا اور نعمتِ حق کا اتمام ہوا اور حق تعالیٰ نے فرمایا ص ۴۲۰/۵۱۵ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا "آج کے دن دین تمہارے لیے کامل کر دیا گیا۔ تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے دینِ اسلام پسند کیا"۔ اس کے بعد اہلِ تمکین سر منظر آئے۔ اگر تمام احوال معرضِ بیان میں لاؤں اور تمام مقامات کی شرح کروں تو اپنے مقصد سے بہت دور جا پڑوں گا۔

تمکین سے مراد محلِ کمال اور درجہ اعلیٰ پر اہلِ حقیقت کی اقامت ہے۔ اہل مقام اپنے مقامات بدلتے رہتے ہیں۔ مگر تمکین کے درجہ سے نکلنا محال ہوتا ہے۔ مقام مبتدیوں کا درجہ ہے اور تمکین منتہی لوگوں کی قرارگاہ ہے۔ ابتدا سے نہایت کی طرف تو جا سکتے ہیں مگر نہایت سے آگے کوئی گذرگاہ نہیں۔ مقامات سلوکِ حق کی منزلیں ہیں اور تمکین درگاہِ حق کا قیام ہے۔ دوستانِ حق جادہ پیمائی کے دوران خود سے غایب اور منزل روی میں خود سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ ان کا باطن مشغولِ حق ہوتا ہے۔ مشغولیتِ حق میں اسباب و علل کی موجودگی وجہ آفت اور سامانِ پریشانی ہوتی ہے۔

دورِ جاہلیت میں شعرا اپنے ممدوح کی مدح عملاً کرتے تھے۔ اپنے اشعار کچھ دن نہیں سناتے تھے۔ جب شاعر اپنے ممدوح کے حضور پہنچ جاتا تھا تو وہ تلوار نکال کر اپنے گھوڑے کے پاؤں کاٹ دیتا تھا اور تلوار توڑ دیتا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ گھوڑے کی ضرورت بارگاہ تک مسافت طے کرنے کے لیے تھی۔ اور شمشیر اس لیے تھی کہ بارگاہ تک رسائی حاصل کرنے میں سد باب ہونے والے حاسدوں سے راستہ صاف کیا جائے۔ بارگاہ تک پہنچ کر مسافت ختم ہو گئی۔ شمشیر کی ضرورت بھی نہ رہی۔ کیونکہ اب بارگاہِ ممدوح کو چھوڑنے کا خیال ہی نہیں۔ چند روز گذرنے کے بعد

ص ۴۲۱/۵۱۶
شاعر اپنے اشعار پیش کرنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہی حکم تھا چنانچہ جب آپ قطعِ منازل و مقامات کے بعد محل تمکین پر پہنچے تو جملہ اسبابِ تغیر ساقط ہو گئے۔ اور حق تعالیٰ نے فرمایا: فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ وَأَلْقِ عَصَاكَ "اپنے جوتے اتارو اور لاٹھی پھینک دو" کیونکہ یہ چیزیں مسافت کے اسباب ہیں۔ اور بارگاہِ وصل میں سامانِ مسافت کی آفت کے لیے جگہ نہیں۔ محبت کی ابتدا طلبِ حق ہے اور انتہا قرار بحق ہے۔ پانی جب تک دریا میں ہوتا ہے اس میں روانی ہوتی ہے۔ سمندر میں پہنچ کر وہ قرار پذیر ہو جاتا ہے۔ اس کا ذائقہ بھی بدل جاتا ہے۔ پانی کا ضرورت مند سمندر کی طرف نہیں آتا صرف جواہرات کے طالب ادھر کا رخ کرتے ہیں تاکہ جان پر کھیل کر طلب کا بوجھ پاؤں میں باندھے اور سر کے بل سمندر میں غوطہ لگائے یا جواہرات پائے یا اپنی جانِ عزیز گنوائے۔

ایک شیخ رح فرماتے ہیں "تمکین تلوین کو چھوڑ دینا ہے"۔ تلوین بھی صوفیائے کرام کی ایک اصطلاح ہے حال و مقام کی طرح۔ معانی میں ایک دوسرے کے نزدیک ہیں۔ تلوین کا مطلب متغیر ہونا ہے۔ ایک حال سے دوسرے حال میں جانا۔ صاحبِ تمکین یا متمکن سے وہ سالک مراد ہے جو متردد نہ ہو اور اپنے جملہ سامان کے ساتھ بارگاہِ حق میں باریاب ہو۔ وسوسۂ غیر سے پاک ہو۔ کوئی معاملہ اس کے ظاہر کو بدل نہ سکے۔ اور کوئی حال اس کے باطن پر اثر انداز نہ ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام متلون تھے۔ جمالِ حق کی ایک جھلک میں بے ہوش ہو گئے جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا: وَخَرَّ مُوسَىٰ صَعِقًا "موسیٰ غش کھا کر گر گئے"۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم متمکن تھے۔ مکہ معظمہ سے عین تجلّے میں قَابَ قَوْسَيْنِ تک تشریف لے گئے مگر نہ متغیر ہوئے نہ متبدل۔ یہ اعلیٰ درجہ تھا۔

تمکین کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کا تعلق "شاہدِ حق" سے ہو اور دوسری یہ کہ تمکین کی نسبت "خود" سے ہو۔ "خود" کی نسبت والا باقی الصفت ہوتا ہے اور شاہد حق کے تعلق والا فانی الصفت۔ فانی الصفت، محو، صحو، محق، فنا، بقا، وجود، اور عدم سے باہر ہوتا ہے کیونکہ ان صفات کے لیے موصوف کی ضرورت ہے اور جب موصوف مستغرق ہو تو ہر صفت اس سے ساقط ہو جاتی ہے۔ اس موضوع پر بہت کچھ ہے مگر میں اسی پر اکتفا کرتا ہوں اور توفیق اللہ کی طرف سے ہے۔
ص ۴۲۲/۵۱۷

محاضرہ و مکاشفہ

محاضرہ لطیف آیات کے پیش نظر حضورِ دل حاصل ہونے کو کہتے ہیں اور مکاشفہ باطن کے تحیر کا نام ہے

جو جلوہ حقیقت کو دیکھ کر رونما ہو۔ محاضرہ کا تعلق آیات کے دیکھنے سے ہے اور مکاشفہ کا شواہدات کے دیکھنے سے۔ محاضرہ کی علامت دوامی تفکّر ہے آیات کے سامنے اور مکاشفہ کی علامت دوامی تحیّر ہے۔ حق تعالیٰ کی بے انتہا عظمت کے روبرو۔ افعالِ حق میں متفکّر رہنے اور جلالِ حق میں متحیّر رہنے میں فرق ہے متفکر دوستی کے محل میں ہوتا ہے اور متحیّر محبّت کے مقام پر۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آسمانوں کے ملکوتی نظام کو دیکھا اور غور کیا تو ان کا دل حاضر ہوا اور وہ افعالِ حق کو دیکھ کر طالبِ فاعل (حق تعالیٰ) ہوئے۔ اور ان کے حضورِ قلب نے فعل ہی کو دلیل فاعل بنا دیا۔ اور آپ نے کمالِ معرفتِ الٰہی کے عالم میں فرمایا: اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا "میں نے اپنا رُخ زمینوں اور آسمانوں کے خالق کی طرف کر لیا"۔

ص ۴۲۲/۵۱۸

جب خدا تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم ملکوت کی سیر کیلیے بلایا تو آپ نے ماسوا اللہ کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ نہ آپ نے عالم ملکوت تک لیجائے جانے پر نظر کی نہ مخلوق کو نظر میں رکھا نہ اپنے آپ کو دیکھا جس کے نتیجہ میں آپ پر ذات خداوندی کی حقیقت اور کھلی پس اس کشف کی حالت میں آپکا شوق و قلق اور زیادہ ہوا۔ دیدار کی طلب ہوئی دیدار نہ ہوا۔ قرب چاہا وہ بھی ممکن نہ ہوا۔ وصل کا ارادہ کیا اس کا بھی امکان نہ تھا جس قدر دوست کی پاکیزگی دل پر نقش جماتی گئی۔ دیدار و قرب و وصل کا شوق بڑھتا گیا۔ نہ اعراض (پیچھے ہٹنے) کا مقام تھا نہ اقبال (آگے بڑھنے) کا حیران ہو گئے پس جہانتک وفا اور دوستی کا تقاضا تھا حیرت نے تذبذب میں ڈالا اور جہاں تک محبت کا تقاضا تھا قرب و وصل سے دوئی ثابت ہوتی تھی جو شرک تھی چنانچہ حیرت ہی سرمایہ بنی اس لیے کہ وفا کی صورت میں حیرت (شک) ہستی ذات کے بارے میں تھی جو شرک ہے اور محبت کی صورت میں حیرت کیفیت ذات کے متعلق تھی جو توحید ہے اسی لیے حضرت شبلیؒ فرمایا کرتے تھے "اے حیرت زدوں کے رہنما میری حیرت کو اور بڑھا"۔ مشاہدہ میں حیرت کی زیادتی زیادتِ درجات کا باعث ہوتی ہے۔

مشہور ہے کہ جب حضرت ابو سعید خرازؒ نے ابراہیم سعد علویؒ کی معیت میں ایک دوستِ حق کو لبِ دریا دیکھا تو پوچھا راہِ حق کیا ہے؟ اس نے جواب دیا دو راہیں ہیں ایک خاص لوگوں کی راہ اور ایک عام لوگوں کی۔ کہا اس کی شرح فرمائیے اس نے کہا راہِ عام تو وہی ہے جس پر آپ گامزن ہیں۔ یہ راہ چند اسباب پر اختیار کی جاتی ہے۔ اور ایسے ہی چند اسباب رد کر دیے جاتے ہیں۔

خاص لوگ وہ ہیں جو مسبب الاسباب کو دیکھتے ہیں اسباب پر نظر نہیں رکھتے۔ اس حکایت کی شرح اوپر بیان ہو چکی ہے اور میرا مقصد اس سے زیادہ نہیں۔ توفیق اللہ کی طرف سے ہے۔

قبض و بسط

ص ۴۲۳/۵۱۹ قبض و بسط دو حالتیں ہیں جو انسانی اختیار سے باہر ہیں۔ نہ کوشش سے حاصل ہو سکتی ہیں اور نہ تکلف سے دور کی جا سکتی ہیں۔ حق تعالیٰ نے فرمایا: "وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ" اللہ قبض و بسط پر قادر ہے"۔ قبض سے مراد عالم حجاب میں دل کا انقباض ہے اور بسط کا مطلب حالتِ کشف میں دل کی کشائش ہے۔ دونوں چیزیں بلا کوششِ انسانی من اللہ ہیں۔ عارفوں کے لیے قبض کا مقام وہی ہے جو مریدوں کے لیے خوف کا اور بسط ان کے لیے ایسے ہی ہے جیسے امید مریدوں کے لیے۔

یہ معانی میں ایک گروہ صوفیا کے مطابق مشائخ کی ایک جماعت کے خیال میں قبض کا مقام بسط سے بلند تر ہے۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ کلام حق میں قبض کا ذکر بسط سے پہلے ہے۔ اور دوسرے یہ کہ قبض میں گداز و قہر ہوتا ہے اور بسط میں نوازش و لطف۔ گدازِ بشریت اور قہرِ نفسانی پرورش و لطف سے فاضل تر ہے کیونکہ پرورشِ نفس ایک بڑا حجاب ہے۔ ایک دوسری جماعت یہ سمجھتی ہے کہ بسط کا مقام قبض سے بلند تر ہے کیونکہ کلامِ حق میں قبض کے ذکر کا تقدم بسط کے افضل تر ہونے کی دلیل ہے۔ عربی زبان کے عرف و عادت کے مطابق جو چیز درجہ میں کم ہو اس کا ذکر پہلے کیا جاتا ہے جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا: "فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ وَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ" لوگوں میں کچھ اپنی جان پر ظلم کرنے والے ہیں۔ کچھ میانہ رو ہیں اور کچھ اللہ کے حکم سے نیکیوں میں سبقت کرنے والے ہیں"۔ اور نیز فرمایا: "اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ" حق تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاک رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے"۔ نیز فرمایا: "يَا مَرْيَمُ اقْنُتِي لِرَبِّكِ وَاسْجُدِي وَارْكَعِي مَعَ الرَّاكِعِيْنَ" اے مریم! اپنے رب کی فرماں بردار ہو اور سجدہ کر اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ ص ۴۲۴/۵۲۰ رکوع کر"۔ اور یہ بھی ہے کہ بسط میں فرحت ہوتی ہے اور قبض میں ہلاکت۔ عارفوں کی فرحت حصولِ معرفت کے سوا کچھ نہیں ہوتی اور ہلاکت مطلوب سے دوری کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ وصل کا مقام فراق کی منزل سے بہر صورت ارفع و اعلیٰ ہوتا ہے۔

میرے شیخ فرمایا کرتے تھے کہ قبض و بسط دو حقیقتیں ہیں جو حق تعالیٰ کی طرف سے دل پر وارد ہوتی ہیں۔ جب بھی کوئی حقیقت وارد ہوتی ہے تو باطن اس سے مسرور ہوتا ہے اور نفس مقہور یا باطن مقہور ہوتا ہے اور نفس مسرور۔ ایک آدمی کے لیے اس کے باطن کا انقباض نفس کے لیے کشائش کا باعث ہوتا ہے۔ دوسرے کے لیے باطن کی کشائش اس کے نفس

کے انقباض کا ذریعہ ہوتی ہے جو کوئی اس سے زیادہ کہتا ہے وہ تضییع اوقات کرتا ہے۔ اسی بنا پر حضرت بایزیدؒ نے فرمایا: "دل کا انقباض نفس کی کشائش کرتا ہے اور دل کی کشائش نفس کے انقباض کا باعث ہوتی ہے"۔ مقبوض نفس خلل سے محفوظ ہوتا ہے اور کشادہ باطن لغزش سے مصئون رہتا ہے۔ غیرت دوستی کا دستور ہے اور انقباض غیرت حق کا نشان ہے اور دوست دوست پر عتاب کیا ہی کرتا ہے۔ بسط عتابِ دوست کی علامت ہے۔ مشہور ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام ہنستے نہیں تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام روتے نہیں تھے۔ حضرت یحییٰؑ عالمِ انقباض میں تھے اور حضرت عیسیٰؑ عالمِ انبساط میں۔ جب ایک دوسرے سے ملتے تو حضرت یحییٰ علیہ السلام فرماتے اے عیسیٰؑ کیا تو جدائی کے خوف سے بے نیاز ہے؟ حضرت عیسےٰ علیہ السلام فرماتے کیا تو رحمتِ حق سے ناامید ہے؟ نہ تیرا رونا تقدیر ازلی کو مٹا سکتا ہے اور نہ میرا ہنسنا قضا کو واپس لوٹا سکتا ہے۔ قبض، بسط، طمس، محبت، محو، صحو، محق، عجز، جمد سب اللہ کی طرف سے ہے وہی ہوتا ہے جو لکھا جا چکا ہے۔

انس و ہیبت

ص ۴۲۵ / ۵۲۱

اللہ تجھے سعادت دے۔ انس و ہیبت سالکانِ حق کے احوال میں شامل ہیں۔ جب حق تعالیٰ بندے کے دل پر اپنے جلال کا پرتو ڈالتا ہے تو "ہیبت" اسے مقدر ہوتی ہے۔ جب اپنے جمال کی تجلی سے سرفراز کرتا ہے۔ تو انس نصیب ہوتا ہے۔ اہلِ ہیبت اس کے جلال کے سامنے تکلیف میں ہوتے ہیں۔ اور اہلِ انس جمالِ حق کے مشاہدہ میں مسرور ہوتے ہیں۔ ایک دل اس کے جلال سے دوستی کی آگ میں جلتا ہے۔ دوسرا اس کے جمال سے انوارِ مشاہدہ میں تابناک ہوتا ہے دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔

ایک گروہِ مشائخ کہتا ہے کہ ہیبت درجۂ عارفان ہے اور انس درجۂ مریدان۔ کیونکہ جو بھی بارگاہِ حق میں اور اوصافِ حق کی تنزیہہ میں مستحکم ہوتا ہے۔ اس پر ہیبت زیادہ طاری ہوتی ہے۔ اس کی طبیعت انس سے نفور رہتی ہے کیونکہ انس ہم جنس سے ہوتا ہے اور یہ محال ہے کہ بندہ حق تعالیٰ کا ہم جنس یا ہم شکل ہو سکے۔ اس لیے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ ہو سکتا ہے کہ حق تعالیٰ کو خلق کے ساتھ انس ہو۔ اگر انس ممکن ہے تو صرف اس کے ذکر سے ہو سکتا ہے مگر ذکرِ حق بذاتِ خود غیرِ حق چیز ہے کیونکہ وہ بندہ کی صفت ہے۔ محبت میں کسی غیر از محبوب چیز میں الجھنا سراسر غلط خیال، بے بنیاد دعوٰی اور جھوٹے پندار کی دلیل ہے۔ ہیبت، عظمت حق کے مشاہدہ سے طاری ہوتی ہے، عظمت، حق تعالیٰ کی

صفت ہے۔ جس بندے کا عمل از خود برائے خود ہو اور جس کا عمل اپنی فنا سے بقائے حق کے اثبات پر مرکوز ہو۔ دونوں میں بہت فرق ہے۔ حضرت شبلیؒ سے متعلق مشہور ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں ایک عرصہ اسی خیال میں مبتلا رہا کہ محبتِ الٰہی میں سرشار ہوں اور مشاہدۂ حق میں مجھے "انس" حاصل ہے۔ اب معلوم ہوا کہ انس سوائے ہم جنس کے ہو ہی نہیں سکتا۔

ص ٣٢٦ ب / ٥٢٢

ایک جماعت کے خیال میں ہیبت "فراق اور عقوبت" سے تعلق رکھتی ہے۔ اور انس وصل و رحمت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لیے دوستانِ حق کو ہیبت سے محفوظ رہنا چاہیئے اور انس کو اپنانا چاہیئے۔ انس محبت کا مقتضی ہوتا ہے اور جس طرح مجانست کے لیے مجالست محال ہے۔ اسی طرح انس کے لیے بھی ناممکن ہے۔

میرے شیخؒ فرمایا کرتے تھے۔ مجھے تعجب ہوتا ہے اس شخص پر جو یہ کہتا ہے کہ حق تعالیٰ سے انس ناممکن ہے حق تعالیٰ تو خود فرماتا ہے: وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ۔ یٰعِبَادِیْ لَا خَوْفٌ عَلَیْكُمُ الْیَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ۔ "جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق سوال کریں۔ پس تحقیق میں قریب ہوں۔ اے میرے بندو! آج تم پر کوئی خوف و حزن نہیں"۔

بندہ جب حق تعالیٰ کا فضل و کرم دیکھتا ہے تو اس کی دوستی اختیار کرتا ہے۔ دوستی ہو تو انس پیدا ہوتا ہے کیونکہ دوست کی ہیبت بیگانگی اور انس یگانگی کا نشان ہے۔ انسانی فطرت یہ ہے کہ اسے اپنے منعم سے انس ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ کے ہم پر اتنے انعامات ہیں اور ہمیں اس کی وہ معرفت حاصل ہے کہ ہیبت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

میں (علی بن عثمانؒ الجلابی) کہتا ہوں کہ باوجود اختلاف کے دونوں گروہ راستی پر ہیں۔ کیونکہ ہیبت کا غلبہ نفس کی ہوا و ہوس اور اس کی بشریت کو فنا کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ انس باطنی طور پر طاری ہوتا ہے اور معرفتِ حق ودیعت کرتا ہے۔ حق تعالیٰ اپنے جلال کی تجلیوں سے اپنے دوستوں کے نفس کو فانی کرتا ہے اور اپنے جمال کے نور سے ان کے باطن کو بقا عنایت کرتا ہے۔ پس اہلِ فنا ہیبت کو مقدم سمجھتے ہیں اور ارباب بقا انس کو فضیلت دیتے ہیں۔ اس سے قبل فنا اور بقا کے بیان میں اس کی شرح کر چکا ہوں۔

قہر و لطف

قہر اور لطف بھی دو اصطلاحیں ہیں۔ جن کے ذریعے صوفیائے کرام اپنی کیفیت روزگار بیان کرتے ہیں۔

"قہر" کا مطلب تائیدِ حق سے اپنی آرزوؤں کو فنا کرنا اور اپنے مقاصدِ نفسانی کو روکنا ہے بغیر کسی ذاتی مراد کے"۔ لطف" کے معنی بقائے باطن، دوامِ مشاہدہ اور استقامتِ حال بحکمِ تائیدِ ربانی ہے۔

ص ۴۲۷/۵۲۳

ایک گروہ کہتا ہے کہ بزرگی تائیدِ حق سے مراد حاصل ہونے میں ہے۔ دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ بزرگی یہ ہے کہ حق تعالیٰ انسان کو سوائے اپنی مراد کے ہر مراد سے نامراد کر دے۔ اور اسے مغلوبِ نامرادی رکھے۔ یہاں تک کہ تشنگی کے عالم میں اگر وہ دریا میں چلا جائے تو دریا خشک ہو جائے۔

مشہور ہے کہ بغداد میں دو درویش تھے۔ دونوں فقر میں بلند مرتبہ تھے۔ ایک اہلِ قہر اور دوسرا اہلِ لطف میں شامل تھا۔ دونوں میں لگاوٹ تھی۔ ایک دوسرے کی کیفیت کو کمتر سمجھتے تھے۔ ایک کہتا تھا کہ لطفِ خداوندی سب چیزوں سے افضل ہے۔ کیونکہ اس کا فرمان ہے: اَللّٰہُ لَطِیْفٌ بِعِبَادِہٖ "اللہ اپنے بندوں پر لطف فرمانے والا ہے"۔ دوسرا کہتا تھا۔ قہر کا مقام بہت بلند ہے۔ کیونکہ خدا کا فرمان ہے: وَھُوَ الْقَاھِرُ فَوْقَ عِبَادِہٖ "وہ (حق تعالیٰ) اپنے بندوں پر قاہر ہے"۔ اس مسئلہ پر مدت تک دونوں کے درمیان بہت شدید مباحثہ رہا۔ آخر الامر صاحبِ لطف درویش نے مکہ معظمہ کا عزم کیا مگر وہاں پہنچنے سے پہلے ایک جنگل ہی میں قیام کر لیا۔ اور مجاہدہ میں مشغول ہو گیا کئی برس گزر گئے اور کسی کو اس کی کوئی خبر نہ ملی۔ ایک دفعہ کوئی شخص مکہ معظمہ سے بغداد آ رہا تھا راستے میں اس درویش سے ملاقات ہو گئی۔ درویش نے کہا کہ اگر تمہارا جانا بغداد ہو تو میرے دوست سے محلہ کرخ سے مل کر یہ بات کہنا کہ اگر محلۂ کرخ کی دلچسپیاں جنگل میں دیکھنے کا خیال ہو تو میرے پاس آ جاؤ وہ شخص بغداد پہنچا اور درویش کو پیغام دے دیا مگر درویش نے کہا جب تم واپس جاؤ تو میری جانب سے کہہ دینا کہ یہ کوئی قابلِ ناز چیز نہیں کہ ہولناک جنگل کو تمہارے لیے محلۂ کرخ کی طرح بنا دیا گیا تاکہ تم درگاہ سے دور نہ بھاگ جاؤ۔ قابلِ ناز چیز یہ ہے کہ میرے لیے محلہ کرخ کو اس کی خوبصورتیوں کے باوجود ہولناک جنگل کی طرح بنا دیا اور اس میں خوش و خرم ہوں۔

ص ۴۲۸/۵۲۴

حضرت شبلیؒ نے اپنی مناجات میں کہا۔ "یا الٰہی! اگر تو آسمان کو میرے گلے کا طوق اور زمین کو میرے پاؤں کی زنجیر بنا دے اور سارا عالم میرے خون کا پیاسا ہو جائے تو بھی میں تجھ سے روگردانی نہیں کروں گا"۔ میرے شیخؒ نے فرمایا ایک سال صحرا میں اولیائے کرام کا اجتماع ہوا۔ میرے مرشد حضرت حصریؒ مجھے ہمراہ لے گئے۔ میں نے دیکھا کچھ لوگ تختِ ہوا میں اڑاتے ہوئے آ رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کو تختوں پر لایا جا رہا تھا کچھ اڑتے ہوئے آ رہے تھے۔ حضرت حصریؒ نے کسی طرف توجہ نہ دی۔ میں نے ایک جوان کو بحالِ تباہ آتے ہوئے دیکھا۔ اس کا جوتا پھٹا ہوا تھا۔ عصا ٹوٹا ہوا تھا۔ پاؤں

بیکار ہو چکے تھے سر ننگا تھا جسم سوختہ انجیف اور کمزور تھا۔ وہ سامنے آیا ہی تھا کہ حصریؒ اچھل پڑے اور اس کو تھام کر بلند جگہ پر بٹھایا۔ مجھے بہت تعجب ہوا مجلس کے اختتام پر میں نے حصریؒ سے پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ وہ اولیائے کرام میں ایک ایسا ولی ہے جو ولائت کے تابع نہیں بلکہ ولایت اس کے تابع ہے۔

الغرض جو چیز ہم خود اختیار کرتے ہیں وہ ہمارے لیے مصیبت ہوتی ہے۔ مجھے صرف اس چیز کی آرزو ہے جس میں حق تعالےٰ مجھے مصیبت سے محفوظ رکھے اور نفس کے شر سے بچائے۔ قہر میں مجھے تمنائے لطف نہ ہو۔ اور اگر لطف میسر آئے تو ارادت قہر نہ ہو کیونکہ ہمیں اس کے اختیار میں کوئی دخل نہیں۔

نفی و اثبات

مشائخ کرام صفاتِ بشریت کو مٹانے اور تائیدِ حق کو ثابت کرنے کو نفی اور اثبات کا نام دیتے ہیں۔ نفی سے مراد نفیِ صفتِ بشریت لیتے ہیں اور اثبات سے اثباتِ قوتِ حقانیت۔ کیونکہ محو کا مطلب کلیت کو مٹانا ہے اور کلیت کے مٹنے کا تعلق صرف صفات سے ہو سکتا ہے ذات سے نہیں۔ ذات برقرار رہتی ہے جب تک کلیت موجود ہو۔ پس لازم ہے کہ ستودہ خصائل کے اثبات سے مذموم صفات کی نفی کی جائے۔ یعنی طلبِ حق میں اثباتِ حق سے دعوائے دوستیِ حق کی نفی کی جائے۔ کیونکہ دعویٰ نفسانی رعونت کا ایک پہلو ہے۔ عادتاً جب صوفیائے کرام اوصافِ بشریت کے معاملے میں مغلوبِ حق ہوتے ہیں تو کہتے ہیں۔ یہ صفاتِ بشریت کی نفی اور بقائے حق کا اثبات ہے۔ اس سے قبل فقر و صفوت اور فنا و بقا کے باب میں اسی موضوع پر بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ مراد حق تعالیٰ کے اختیار کا اثبات اور انسانی اختیار کی نفی ہے۔ اسی بنا پر کسی بزرگ نے کہا ہے۔ "بندے کے حق میں حق تعالیٰ کا اختیار اپنے علم کے ساتھ بہتر ہے اس اختیار سے جو بندے کو اپنے نفس کے حق میں ہو بغیر مشیتِ ایزدی کے علم کے"۔ محبت صرف محبوب کے اختیار کا اثبات اور محبت کرنے والے کے اختیار کی نفی ہے۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔

ص ۴۲۹/۵۲۵

حکایات میں ہے کوئی شخص دریا میں غرق ہو رہا تھا۔ کسی نے پوچھا کیا تم بچنا چاہتے ہو جواب دیا نہیں۔ اس نے پھر پوچھا تو کیا ڈوبنا چاہتے ہو۔ جواب دیا نہیں اس نے کہا عجیب بات ہے نہ بچنا چاہتے ہو نہ ڈوبنا۔ جواب دیا مجھے ہلاکت اور نجات سے کیا کام! میں وہی چاہتا ہوں جو حق تعالیٰ چاہتے ہیں۔

مشائخ نے فرمایا ہے کہ کمترین مقام اپنے اختیار کی نفی ہے۔ اختیارِ باری تعالیٰ ازلی ہے۔ اور اس کی نفی محال ہے۔ انسانی اختیار عارضی ہے اور اس کی نفی روا ہے۔ عارضی اختیار کو پامال کر دینا چاہیئے تاکہ ازلی اختیار حاصل ہو۔ جب موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر تشریف لے گئے تو آپ نے عالمِ انبساط میں دیدارِ حق کی آرزو کی اور اپنے اختیار کو بروئے کار رکھ کر درخواست کی: رَبِّ اَرِنِیْ: "اے میرے رب مجھے دیدار دے"۔ حق تعالیٰ نے فرمایا: لَنْ تَرَانِیْ: "تو دیکھ نہیں سکے گا"۔ عرض کی باری خدایا! دیدار حق ہے اور میں مستحق ہوں۔ انکار کیوں؟ حکم ہوا دیدار حق ہے مگر دوستی میں اختیار باطل ہے۔ ص ۴۲۹/۵۲۶

اس موضوع پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے مگر میرا مقصد صرف یہ ہے کہ ان اصطلاحات کا مطلب بخوبی واضح ہو جائے۔ توفیق من اللہ ہے جمع و تفرقہ اور غیبت و حضور کا ذکر مکاتبِ تصوّف میں ہو چکا ہے جہاں صحو و سکر اور اس کی مختلف اشکال معرضِ بیان میں آ چکی ہیں۔ بیان کا صحیح مقام بھی وہی تھا ضرورتاً یہاں بھی کچھ بیان کر دیا تاکہ ہر کسی کا طریق کار سامنے آ جائے، واللہ اعلم۔

مسامرہ و محادثہ

مسامرہ اور محادثہ کاملانِ طریقت کے دو احوال کا نام ہے۔ محادثہ گفتگوئے باطن ہے جس میں زبان خاموش رہتی ہے۔ مسامرہ اخفائے باطن میں مسرت دائمی محسوس کرنے کو کہتے ہیں۔ عام معانی کے لحاظ سے مسامرہ رات میں اور محادثہ دن میں کوئی وقت ہوتا ہے جب ظاہری اور باطنی سوال و جواب ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رات کی مناجات کو مسامرہ اور دن کی دعاؤں کو محادثہ کہتے ہیں۔ دن کا حال عالمِ کشف اور رات کا عالمِ ستر کہلاتا ہے۔

محبّتِ حق میں مسامرہ کا مقام محادثہ سے بلند تر ہے۔ مسامرہ کی نسبت آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ حق تعالےٰ نے چاہا تو حضرت جبریل علیہ السلام کو بھیجا اور وہ آپ کو رات کے وقت مکّہ معظمہ سے براق پر "قاب قوسین" تک لے گئے۔ رازونیاز ہوا۔ آپ نے سخنِ حق سنا۔ گفتگو سے عاجز ہوئے اور عرض کیا: لَا اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْکَ "میں تیری ثنا کا حقہ نہیں کر سکتا"۔

محادثہ کا تعلق موسیٰ علیہ السلام سے ہے۔ جب ان کو حضورِ حق کی تمنا ہوئی تو چالیس روز کے وعدہ اور انتظار کے بعد ایک روز آپ طور پر آئے اور ہم کلامی سے فیض یاب ہوئے۔ عالمِ انبساط میں دیدار کی التجا کی مقصد حاصل نہ ہوا اور آپ بے ہوش ہو گئے۔ ہوش میں آئے تو عرض کی: تُبْتُ اِلَیْکَ "میں توبہ کرتا ہوں"۔

یہ فرق تھا اس ذاتِ گرامی میں جس کو بارگاہِ حق میں لایا گیا: سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا "پاک ہے وہ ذات

حق جس نے اپنے بندے کو وقتِ شب سیر کرائی۔" اور حضرت موسیٰ علیہ السلام میں جو بارگاہ میں حاضر ہوئے: وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰی لِمِیْقَاتِنَا: "اور جب موسیٰ (علیہ السلام) مقامِ وعدہ پر آئے"۔

پس رات دوستوں کی خلوت اور دن بندوں کی بندگی کا وقت ہے۔ بندہ حد سے گزرے تو قابلِ زجر ہوتا ہے۔ دوست محدود نہیں کیونکہ دوست جو کچھ بھی کرتا ہے، وہ عین رضائے دوست ہوتا ہے توفیق اللہ کے اختیار میں ہے۔

علم الیقین، حق الیقین اور عین الیقین

مندرجہ بالا تمام عبارات کا اطلاق علم پر ہوتا ہے۔ علم جس میں یقین شامل نہ ہو اور جو معلوم چیز کی حقیقت اور صحت پر مبنی نہ ہو علم نہیں کہلا سکتا۔ جب علم حاصل ہوتا ہے تو غیب عین نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ قیامت کے روز اہلِ ایمان حق تعالیٰ کو اسی صورت میں دیکھیں گے جس صورت میں آج دنیا میں اس کو جانتے ہیں۔ اس کے خلاف ہوگا تو یا حشر میں رویت صحیح نہیں ہوگی یا ان کا آج علم صحیح نہیں۔ یہ دونوں چیزیں خلاف توحید ہیں۔ کیونکہ توحید حق کا اثبات یہی ہے کہ آج مخلوق کا علم درست ہو اور کل حشر کے روز رویت صحیح ہو اور توحید سے متعلق علم یقین، عین یقین ہو جائے اور حق یقین علم یقین ہو جائے۔

بعض لوگ کہتے ہیں عین الیقین رویت میں علم کا جذب ہو جانا ہے۔ یہ محال ہے کیونکہ رویت علم حاصل کرنے کا ذریعہ ہے جیسے سمع وغیرہ جس طرح علم "سمع" میں جذب نہیں ہو سکتا اسی طرح رویت میں بھی جذب نہیں ہو سکتا۔

ص ۴۳۱/۵۲۸

صوفیار کے نزدیک علم الیقین دنیوی معاملت سے متعلقہ احکام و اوامر کو جاننا ہے۔ عین الیقین سے مراد عالمِ نزع اور سفرِ آخرت کا علم ہے اور حق الیقین کا مطلب حشر کے دن رویتِ باری اور اس کی کیفیت سے مستفید ہونے کا نام ہے۔ الغرض علم الیقین علمار کا مقام ہے کیونکہ وہ شرعی احکام و امور پر ثابت قدم ہوتے ہیں۔ عین الیقین عارفانِ حق کا درجہ ہے۔ کیونکہ وہ ہر وقت موت کے لیے مستعد رہتے ہیں۔ حق الیقین محبانِ حق کا مقامِ فنا ہے کیونکہ وہ کل موجودات سے روگرداں رہتے ہیں۔ علم الیقین کی بنیاد مجاہدہ پر ہے۔ عین الیقین کی محبتِ حق پر اور حق الیقین کی مشاہدہ حق پر۔ پہلی چیز عام ہے دوسری خاص اور تیسری خاص الخاص۔

علم و معرفت

علمائے اصول علم و معرفت میں کوئی فرق نہیں کرتے اور دونوں کو ایک چیز تصور کرتے ہیں۔ البتہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ

کے لیے صرف عالم کا لفظ استعمال ہو سکتا ہے عارف کا نہیں۔ اس موضوع پر کوئی صریح نص موجود نہیں۔ مشائخ طریقت اس علم کو معرفت کہتے ہیں جس میں عمل اور حال شامل ہوں اور صاحبِ علم اسے معرضِ بیان میں لائے۔ اس کے برعکس وہ علم جو حال سے الگ اور عمل سے خالی ہو محض علم ہے اور اس کو جاننے والا عالم۔ الغرض جو کوئی معانی اور حقیقت کا عالم ہو عارف کہلاتا ہے اور جو صرف عبارت کو ذہن میں رکھے بغیر فہم حقیقت کے وہ عالم ہوتا ہے۔ صوفیائے کرام جب اپنے ہم عصروں کی تحقیر کرنا چاہتے ہیں تو انہیں دانش مند کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ عوام اس کو برا سمجھتے ہیں حالانکہ مراد تحصیلِ علم کی برائی نہیں ہوتی بلکہ علمِ بے عمل کو برا کہنا مقصود ہوتا ہے۔ "عالم اپنی ذات پر قائم ہوتا ہے اور عارف اپنے رب پر۔" اس موضوع پر کشفِ حجابِ معرفت کے تحت بہت کچھ کہا جا چکا ہے یہاں اسی قدر کافی ہے۔

ص ۴۳۲/۵۲۹

شریعت اور طریقت

یہ بھی دو اصطلاحاتِ صوفیا میں شامل ہیں۔ شریعت سے مراد حالِ ظاہر کی صحت اور حقیقت سے مراد حالِ باطن کی درستی ہے۔ دو گروہ اس معاملے میں غلطی کے مرتکب ہیں۔ ایک علمائے ظاہر ہیں جو دونوں میں فرق نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ شریعت بذاتِ خود حقیقت اور حقیقت شریعت ہے۔ دوسرا گروہ ملحدین کا ہے جو دونوں کو علیحدہ علیحدہ قائم سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں جب حقیقت بروئے کار ہو تو شریعت کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ عقیدہ مشبّہین، قرامطہ، شیعہ اور دیگر وسوسہ ڈالنے والے لوگوں کا ہے اس بات کی دلیل کہ احکامِ شریعت حقیقت سے جدا ہیں یہ لائی جاتی ہے کہ ایمان کے معاملے میں دل کی تصدیق زبان کے قول سے جدا ہے اور اس بات کی دلیل کہ دونوں در اصل ایک ہیں یہ ہے کہ محض دل کی تصدیق بغیر زبانی قول کے ایمان نہیں ہوتا اور قول بغیر تصدیق بے معنی ہوتا ہے۔ قول اور تصدیق کا فرق ظاہر ہے۔ پس حقیقت عبارت ہوتی ہے ایسے معنی سے جس میں کوئی تغیّر و تبدّل روا نہ ہو۔ پیدائشِ آدم سے فنائے عالم تک اس کی حیثیت یکساں رہتی ہے۔ جیسے معرفتِ حق اور خلوص نیت پر مبنی اعمال۔ شریعت عبارت ہے ایسے معنی سے جس میں تغیّر و تبدّل روا ہوتا ہے جیسے احکام و اوامر۔ شریعت فعلِ انسانی ہے اور حقیقت حق تعالیٰ کی پرورش ہے اور اس کی حفاظت اور تقدّس۔ شریعت کی اقامت حفاظتِ حقیقت پر منحصر ہے۔ اسی طرح حقیقت کی اقامت کا انحصار شریعت پر ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھنا چاہیے کہ جسم میں جب تک جان ہے انسان زندہ ہے جب جان نکل جائے تو تن مردار ہے اور جان کی حیثیت ہوا سے زیادہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ جسم و جان کی اہمیت باہم ملاپ سے ہے۔ بالکل یہی عالم شریعت و حقیقت کا ہے۔ شریعت بغیر حقیقت ریا اور حقیقت بغیر شریعت منافقت ہے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا

ص ۴۳۳/۵۳۰

وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا" جو لوگ ہمارے لیے کوشش کرتے ہیں ہم انہیں اپنا راستہ دکھا دیتے ہیں"۔ مجاہدہ شریعت ہے اور ہدایت حقیقت۔ شریعت احکام ظاہر کی حفاظت ہے بندہ کے لیے اور حقیقت بندے کے احوال باطن کی حفاظت ہے حق تعالیٰ کی طرف سے۔ شریعت کسب انسانی ہے اور حقیقت انعام خداوندی۔

اصطلاحات کی دوسری قسم وہ عبارات ہیں جو کلام صوفیاء میں استعارۃً استعمال ہوتی ہیں۔ ان کی تفصیل اور شرح مشکل ہوتی ہے اور میں یہاں مختصراً بیان کرتا ہوں۔ انشاء اللہ العزیز

حقّ: سے مراد حق تعالیٰ کی ذات پاک ہے۔ کیونکہ یہ اسمائے باری تعالیٰ میں ایک اسم ہے جیسے فرمایا: ذَالِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْحَقُّ" یہ بات اس لیے کہ اللہ حق ہے"۔

حقیقت: وصلِ حق کے مقام پر اقامت اور محل تنزیہہ پر استقامت کا نام ہے۔

خطرات: دل میں تصرفات کا گذر

وطنات: عرفانِ حق میں جو کچھ باطن میں رونما ہو۔

طمس: اس چیز کی اصلیت کی نفی جس کی یاد باقی رہے

رمس: کسی چیز کی اصلیت کی نفی بمعہ اس کے اثرات کے

علائق: کمتر درجہ کے اسباب جن میں الجھ کر طالب اپنے مقصود سے بے بہرہ ہو جائے۔

وسایط: وہ اسباب جن کے ذریعہ مقصود حاصل ہو

زوائد: دل میں انوارِ حق کی شدت

فوائد: باطن کا اس چیز کو پالینا جس کی ضرورت ہو

ملجاء: تحصیل مقصود کا اعتماد

منجاء: دل کا محلِ آفت سے فرار

کلیّت: انسانی اوصاف کا کلیات میں جذب ہو جانا

لوائح: نفیٔ مراد سے اثبات

لوامع: دل میں طلوع انوار بقائے حصول کے ساتھ

طوالع: دل میں انوارِ معارف کا ظہور

طوارق: رات کی مناجات میں دل پر بشارت یا زجر کا نزول

لطیفہ: دقیق نکات کا اشارہ

سرّ: رازِ دوستی کا اخفا

نجویٰ: آفات کو غیر سے چھپانا

اشارہ: غیر کو مقصود کی خبر دینا بغیر زبان ہلائے۔

ایما: بغیر بیان یا اشارہ کے کنایۃً مخاطب کرنا۔

وارد: حقیقت یعنی معانی کا دل پر وارد ہونا۔

انتباہ: غفلت کا دل سے نکلنا

اشتباہ: حق و باطل میں تذبذب

قرار: حقیقتِ حال سے تردد کا دور ہونا

انزعاج: عالمِ وجد میں دل کی حرکت

یہ معانی ہیں صوفیاء کرام کے بعض الفاظ کے۔ واللہ اعلم۔ تیسری قسم

ص ۴۳۴ / ۵۳۱

ان اصطلاحات کی ہے جو صوفیا توحید حق اور اپنا اعتقاد بیان کرنے میں بغیر استعارہ استعمال کرتے ہیں۔ یہ حسب ذیل ہیں:

عالم: اس سے مراد مخلوقات خدا و ندِ عالم ہے۔ کہتے ہیں اٹھارہ ہزار یا پچاس ہزار عالم ہیں۔ اہل فلسفہ کے نزدیک دو عالم ہیں علوی اور سفلی۔ علمائے اصول کہتے ہیں کہ عرش سے تحت الثریٰ تک ایک عالم ہے الغرض عالم مجموعہ ہے مخلوقات کی مختلف اقسام کا۔ اہل طریقت بھی عالمِ ارواح اور عالمِ نفوس کے قائل ہیں مگر ان کا مطلب وہ دو عالم نہیں جو اہل فلسفہ تسلیم کرتے ہیں۔ اہل طریقت کا مطلب اجتماعِ ارواح اور اجتماع نفوس ہے۔ ص ۴۳۴ / ۵۳۲

مُحدَث: جس کا وجود بعد میں ظاہر ہوا ہو۔ یعنی جو پہلے نہ تھا اور بعد میں وجود میں آیا۔

قدیم: جس کا وجود ہمیشہ سے تھا اور رہے گا۔ یہ سوائے ذاتِ حق کے اور کچھ نہیں۔

ازل: وُہ جس کی ابتدا نہ ہو

ابد: وہ انتہا جس کی انتہا نہ ہو

ذات: کسی چیز کی اصلیت اور حقیقت

صفت: وہ چیز جو قابلِ بیان ہو بغیر اپنے وجود کے۔ یعنی جس کا اپنا وجود نہ ہو۔ صرف موصوف کی موجودگی میں صورت پذیر ہو۔

اسم: علامت جو مسمّیٰ سے جدا گانہ ہو

تسمیہ: مسمّیٰ سے متعلق خبر

نفی: کسی چیز کے عدم کا اعلان

اثبات: کسی چیز کے وجود کا اقرار

شیئان: وہ چیزیں جن کا وجود ایک دوسرے پر منحصر ہو

ضدّان: وہ چیزیں جن کا وجود ایک دوسرے کے منافی ہو

غیران: ایک چیز کا وجود دوسری چیز کی فنا

جوہر: کسی چیز کا اصل جو بذاتِ خود قائم ہو۔

عرض: جو چیز جوہر کے ساتھ وابستہ ہو

جسم: اجزائے پریشان کا اجتماع

سوال: طلب کرنا (کسی چیز کی حقیقت)

جواب: سوال کے مضمون کے متعلق اطلاع

حسن: جو چیز امر حق کے مطابق ہو۔

قبیح: جو امرِ الٰہی کے خلاف ہو

سفہ: او امرِ حق کا ترک کرنا۔

ظلم: کسی چیز کو ایسے مقام پر رکھنا جو اس کا اہل نہ ہو۔

عدل: کسی چیز کو اس کا مناسب مقام دینا۔

مَلِک: جس کا کوئی فعل قابل اعتراض نہ ہو۔

یہ ہیں مختصراً وہ اصطلاحات جن کا علم طالبِ حق کے لیے ضروری ہے۔

چوتھی قسم ان اصطلاحات پر مشتمل ہے جن کی شرح ضروری

ہے۔ یہ صوفیائے کرام میں مستعمل ہیں مگر ان کا مطلب عام لغوی معانی سے قدرے مختلف ہوتا ہے۔

خاطر

خاطر (خیالِ گذراں) سے صوفیاء کا مطلب ایسا خیال ہوتا ہے جو دل میں رونما ہو اور جلد ہی کسی دوسرے خیال کے آتے ہی ختم ہو جائے اور صاحبِ خیال کو اسے دور کرنے کی قدرت حاصل ہو۔ ایسی حالت میں درویش حق تعالیٰ کی طرف سے رونما ہونے والے امور میں پہلے خیال کا اتباع کرتے ہیں کہتے ہیں حضرت خیر النّساج رح کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ حضرت جنید رح دروازے پر کھڑے ہیں۔ آپ نے اس خیال کو دور کرنے کا خیال کیا مگر دوسرے خیال کی تردید میں پھر وہی خیال رونما ہوا۔ آپ نے بار دیگر کوشش کی مگر پھر وہی ہوا۔ آپ باہر نکلے تو حضرت جنید رح استادہ تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ اے خیر! اگر تم پہلے خیال کا اتباع کرتے ہوئے رسمِ درویشی بجالاتے تو مجھے اتنی دیر کھڑا ہونا نہ پڑتا۔ مشائخ رح اس پر کہتے ہیں کہ اگر خاطر وہی تھی جو خیر النّساج رح پر وارد ہوئی تو حضرت جنید رح کا اس سے کیا تعلق تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت جنید رح چونکہ خیر النّساج رح کے پیر تھے۔ اس لیے اپنے مرید کے کل احوال سے باخبر تھے۔

ص ۴۳۵/۵۳۳

واقع

واقع سے مراد وہ چیز ہے جو دل پر وارد ہو اور خاطر کے برعکس دیرپا ہو اور طالب اسے دور کرنے پر قادر نہ ہو چنانچہ عام محاورہ میں کہا جاتا ہے "میرے دل میں خیال گذرا اور میرے دل پر ایک چیز وارد ہوئی"۔ خیالات تو ہر دل میں گذرتے ہیں مگر واقعات صرف اس دل میں صورت پذیر ہوتے ہیں جو صرف حقانیت کا مسکن ہو۔ جب راہِ حق میں مرید کو کوئی رکاوٹ پیش آتی ہے تو اسے "قید" کا نام دیتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ اسے واقع پیش آ رہا ہے۔ اہلِ لغت واقع سے مراد کسی مسئلہ میں الجھن پیدا ہونا لیتے ہیں۔ جب صحیح حل مل جائے اور مشکل دور ہو جائے تو کہتے ہیں واقع حل ہو گیا۔ اہلِ طریقت کے نزدیک واقع حل نہیں ہوتا۔ اگر حل ہو جائے تو وہ خاطر ہے واقع نہیں۔ کیونکہ واقع نہایت اہم چیز ہوتی ہے اور ہر وقت اس کی حیثیت نہیں بدل سکتی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اختیار

اہلِ طریقت کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ اختیارِ حق کو اپنے اختیار پر فائق سمجھا جائے یعنی خیر و شر جو

کچھ بھی من اللہ ہو اسے کافی تصور کیا جائے۔ حق تعالیٰ کے اختیار کو اختیار کرنا بھی اختیارِ حق سے حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ جب تک حق تعالیٰ بندے کو بے اختیار نہ کرے وہ اپنا اختیار چھوڑنے کا اہل نہیں ہوتا۔ حضرت بایزیدؒ سے کسی نے پوچھا امیر کسے کہتے ہیں۔ فرمایا جسے اپنا کوئی اختیار حاصل نہ ہو اور صرف اختیارِ حق ہی اس کا اختیار ہو۔ حضرت جنیدؒ بخار میں مبتلا تھے۔ آپ نے دعا فرمائی۔ باری تعالیٰ! مجھے خیریت عطا فرما۔ آپ کے باطن سے ندا آئی۔ میری فرماں روائی میں دخل دینے والا تو کون ہے؟ میں اپنی سلطنت کا انتظام تجھ سے بہتر سمجھتا ہوں۔ میرے اختیار پر راضی ہو اور اپنے اختیار کا اظہار نہ کر۔ واللہ اعلم۔

ص ۴۳۶ / ۵۳۴

امتحان

اس سے مراد اولیاء کے دلوں کا مختلف مصائب میں ابتلا ہے جو من جانب اللہ ظہور میں آتی ہے۔ مثلاً خوف، غم، قبض، ہیبت وغیرہ۔ چنانچہ باری تعالیٰ نے فرمایا: اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِیْمٌ "وہ لوگ جن کے دل پرہیزگاری کے لیے مبتلائے آزمائش ہیں بڑی بخشش اور اجر کے مستحق ہیں"۔ یہ درجہ بہت ارفع ہے، واللہ اعلم۔

بلا

بلا سے مراد اولیاء کا تکلیفوں، بیماریوں اور غموں کے ذریعہ جسمانی ابتلا ہے۔ قرب بقدرِ شدتِ مصیبت حاصل ہوتا ہے مصیبت اولیاء کا لباس، برگزیدہ لوگوں کا گہوارہ اور انبیاء کی غذا ہے۔ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نحن معاشر الانبیاء اشد الناس بلاءً "ہم جماعت انبیاء سب سے زیادہ مبتلائے بلا ہوتے ہیں"۔ نیز فرمایا: اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الاولیاء ثم الامثل فالامثل "سب سے زیادہ مبتلائے بلا انبیاء ہوتے ہیں پھر اولیاء پھر جو زیادہ بزرگ ہوتے ہیں اور پھر جو زیادہ بزرگ ہوتے ہیں"۔ الغرض بلا وہ ابتلا ہے جو مومن کے دل و جان پر نازل ہوتی ہے جس کی حقیقت دراصل نعمتِ حق ہوتی ہے اور بظاہر ایک راز پوشیدہ۔ اس ابتلاء کو برداشت کرنا مومن کے لیے باعثِ ثواب ہوتا ہے۔ کفار پر نازل ہونے والی مصیبت بلا نہیں ہوتی۔ وہ ان کی بدبختی ہوتی ہے اور بدبختی سے انہیں نجات حاصل نہیں ہوتی۔ بلا کا مقام امتحان سے بلند تر ہے امتحان کا اثر فقط دل پر ہوتا ہے اور بلا کا جسم اور دل دونوں پر۔ واللہ اعلم۔

ص ۴۳۷ / ۵۳۵

تحلّی

کسی ستودہ اقوال اور عمدہ خصال قوم کے ساتھ مشابہت پیدا کرنا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لیس الایمان بالتحلّی والتمنّی لکن ماوقر فی القلوب وصدقہ العمل "مشابہت پیدا کرنے اور کسی جیسا بننے کی تمنّا کرنے سے ایمان حاصل نہیں ہوتا۔ ایمان وہ ہے جو دل میں قرار پائے اور اس کی تصدیق عمل سے کی جائے"۔ الغرض اپنے آپ بغیر حقیقی عمل کے کسی جماعت کے ساتھ مشابہت دینا تحلّی ہے۔ جو لوگ وہ کچھ دکھائی دینے کی کوشش کرتے ہیں جو وہ نہیں ہوتے بہت جلد رسوائی کا منہ دیکھتے ہیں اور ان کی حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے۔

تجلّی

مقبل دلوں پر انوارِ حق کا نزول جس کی بدولت ان کے دل کی آنکھ دیدارِ حق سے بہرہ یاب ہو جاتی ہے اس دلی رؤیت حق اور عینی رؤیت میں فرق ہے۔ دلی رؤیت پانے والا چاہے تو دیدارِ حق کرے چاہے نہ کرے یا کبھی کرے اور کبھی نہ کرے عینی رؤیت میں یہ نہیں ہوگا بہشت میں عینی رؤیت کے ہنگام اگر دیدِ حق نہ کرنا چاہیں تو یہ ممکن نہیں ہوگا تجلّی پر پردہ ہو سکتا ہے۔ رؤیت پر حجاب روا نہیں، واللہ اعلم۔

تخلّی

تخلّی سے مراد ان اشتغال سے روگرداں ہونا ہے جو مانع قربِ حق ہوں۔ مثلاً دنیا جس سے ہاتھ اٹھا لینا چاہیئے۔ عقبیٰ جس کی محبت سے دل خالی ہونا چاہیئے۔ خواہشِ نفس کی پیروی جسے چھوڑ دینا چاہیئے صحبت خلق جس سے اپنے آپ کو علیحدہ کر لینا چاہیئے اور اس کا خیال دل سے نکال دینا چاہیئے۔

ص $\frac{۴۳۸}{۵۳۶}$

شرود

آفات، حجابات اور اضطراب سے نجات حاصل کرنے کو شرود کہتے ہیں۔ طالبِ حق کی جملہ آفت حجاب سے ہوتی ہے۔ اہل طلب کی کشفِ حجاب میں کوشش، پردے دور کرنے میں سعی اور اس مقصد کے لیے ان کا وسائل سے متعلّق سب کچھ شرود کے تحت آتا ہے جو طالبِ حق ابتدا میں زیادہ بے قرار ہو وہ انتہا میں زیادہ صاحبِ تمکین ہوتا ہے۔

مقصود

مقصود سے مراد طلبِ حقیقت کے لیے صحیح قصد کرنا ہے۔ اہل حقیقت کا قصد حرکت وسکون سے بے نیاز ہوتا ہے

طالبِ حق حالتِ سکون میں بھی صاحبِ قصد ہوتا ہے۔ یہ چیز عام قاعدہ کے خلاف ہے کیونکہ ہر قاصد کے لیے بظاہر قاصد ہونے کا اثر ہوتا یا باطن میں کوئی نشان ہوتا ہے۔ اس کے برعکس دوستانِ حق بغیر سبب کے صاحبِ طلب ہوتے ہیں اور بغیر حرکت کے صاحبِ قصد۔ ان کی تمام صفات قصد ہوتی ہیں۔ وہ انتہائی قصد کرتے ہیں اور جب دوستی حاصل ہو تو ہمہ تن قصد ہوتی ہے۔

اصطناع

اس لفظ سے مراد یہ ہے کہ حق تعالیٰ بندے کی تہذیبِ نفس کے لیے اس کے جملہ نصیب کو ختم کر دے اور اس کی تمام لذّاتِ نفسانی پر زوال مسلّط کر دے۔ بندے کے نفسانی اوصاف "تغیّر" پذیر ہو جاتے ہیں اور وہ اپنی صفات کے زوال اور "تغیّر" سے متاثر ہو کر بے خود ہو جاتا ہے۔ یہ درجہ صرف پیغمبروں کے لیے ہے مگر بعض مشائخ اولیاء کے لیے بھی روا سمجھتے ہیں واللہ اعلم۔

اصطفاء

اصطفاء یہ ہے کہ حق تعالیٰ بندہ کے دل کو اپنی معرفت کے لیے مخصوص کر کے نورِ معرفت سے معمور کر دے۔ اس درجہ کے لیے خاص و عام، مومن، گنہ گار، طاعت گزار، ولی، نبی سب برابر ہیں۔ حق تعالیٰ نے فرمایا: ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ "پھر ہم نے برگزیدہ لوگوں کو کتاب دی ان میں سے کچھ ظالم ہیں، کچھ میانہ رو اور کچھ نیکیوں میں سبقت کرنے والے ہیں۔" ص ۴۳۸/۵۳۷

اصطلام

تجلیٔ حق کا غلبہ جو کسی لطیف ابتلاء کے ذریعہ انسانی ارادہ کو کالعدم کر دیتا ہے۔ قلب ممتحن (دلِ آزمودہ) اور قلب مصطلم (دل برباد) کے معانی ایک ہیں۔ گو صوفیاء عام طور پر اصطلام کو زیادہ خاص اور لطیف امتحان تصوّر کرتے ہیں۔

رین

یہ ایک قسم کا حجابِ دل ہے جو ایمان کے سوا کسی چیز سے دور نہیں ہوتا۔ یہ کفر اور ضلالت کا پردہ ہے۔ حق تعالیٰ نے کفّار کی نسبت فرمایا: كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ "ایسا نہیں بلکہ جو کچھ وہ کرتے ہیں وہ ان کے دلوں پر ایک قسم کا زنگ (حجاب) ہو گیا ہے۔" ایک جماعت کا خیال ہے کہ رین وہ حجاب ہے جو کسی طرح دور نہیں ہو سکتا کیونکہ کافر ایمان قبول نہیں کرتا اور جو کرتا ہے وہ علمِ الٰہی میں مومن ہی ہوتا ہے۔

غین

ایسا حجاب جو توبہ سے دور ہو جائے یہ خفیف بھی ہو سکتا ہے اور غلیظ بھی۔ غلیظ حجاب اہلِ غفلت اور کبیرہ گناہوں

کے مرتکب ہونے والوں پر ہوتا ہے۔ حجابِ خفیف سب کے لیے ہو سکتا ہے ولی ہو یا نبی۔ آنحضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
"میرے دل پر خفیف سا پردہ آجاتا ہے اور میں دن میں سو بار استغفار کرتا ہوں"۔ حجابِ غلیظ کے لیے توبہ اور حجابِ خفیف کے لیے
رجوع الی اللہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ توبہ کا مطلب معاصی سے بندگی کی طرف پلٹنا ہے۔ اور رجوع کا مطلب اپنے آپ سے حق
تعالیٰ کی طرف لوٹنا ہے تو بہ جرم سے ہوتی ہے جرم عام بندوں کے لیے احکامِ حق کی خلاف ورزی کا نام ہے اور دوستانِ حق کے
لیے مرضیٔ حق کی مخالفت کا۔ عوام کا گناہ نافرمانی ہے اور دوستانِ حق کا گناہ یہ ہوتا ہے کہ ان کو اپنی ہستی کا احساس ہو۔ اگر کوئی شخص
غلط کاری کو چھوڑ کر راہِ راست اختیار کرے تو اسے تائب (توبہ کرنے والا) کہتے ہیں اور اگر کوئی خوب سے خوب تر کی طرف رجوع
کرے تو اسے آئب کہتے ہیں۔ یہ سب کچھ بابِ توبہ میں بیان ہو چکا ہے۔

ص ۴۳۹/۵۳۸

تلبیس

کسی چیز کو اس کی حقیقت سے مختلف پیش کرنے کو تلبیس کہتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے فرمایا: وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِم مَّا
يَلْبِسُونَ (بتحقیق ہم ان پر وہ شبہ ڈالتے ہیں جو وہ شبہ کرتے ہیں)۔ "یہ صفت بجز ذاتِ حق کسی کو زیبا نہیں جو کافر
کو بصورت مومن اور مومن کو بصورت کافر رکھتی ہے جب تک اظہارِ حقیقت کا وقت نہیں آتا۔ صوفیا میں سے جب کوئی اچھی
خصلتوں کو مذموم خصائل سے چھپاتا ہے تو کہتے ہیں وہ تلبیس کر رہا ہے۔ اس صورت کے سوا کسی اور جگہ اس لفظ کا استعمال نہیں
ہوتا۔ ریا اور نفاق کو تلبیس نہیں کہتے حالانکہ دراصل تلبیس وہی ہے۔ تصوف میں تلبیس صرف فعلِ حق کی اقامت کے لیے مستعمل ہے۔

شُرب

صوفیائے کرام بندگی کی مٹھاس، کرامت کی لذت اور محبت کی راحت کو شرب کا نام دیتے ہیں۔ بغیر لذتِ شرب
کے کوئی کام نہیں ہوتا۔ جسم کے لیے شرب پانی سے ہے اور دل کے لیے راحت و حلاوت سے۔ میرے شیخ رح فرمایا کرتے تھے
کہ بے شرب مرید اور باشرب عارف ارادت اور معرفت سے بے گانہ ہوتے ہیں۔ مرید کے لیے شرب ضروری ہے تاکہ وہ ارادت
میں حقِ طلب بجا لائے۔ عارف کے لیے شرب کی ضرورت نہیں مبادا بدونِ حق اسے کسی چیز سے شرب حاصل ہو۔ اور وہ شرب
اگر نفس سے تعلق رکھتا تو وہ (عارف) قربِ حق سے محروم ہو جائے۔

ذوق

ص ۴۴۰/۵۳۹

ذوق بھی شرب کی طرح ہوتا ہے فرق یہ ہے کہ شرب صرف راحت و لذت کے لیے مستعمل ہے اور ذوق راحت و رنج

دونوں پر عائد ہوتا ہے۔ چنانچہ کسی عارف نے کہا ہے "میں نے مٹھاس چکھی میں نے رنج و راحت کا مزہ چکھا"۔ شرب سے متعلق کہا "میں نے وصل و محبت کا ساغر پیا" وغیرہ۔ جب حق تعالیٰ نے شرب کا ذکر کیا تو فرمایا: كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْئًا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ "کھاؤ پیو خوش گوار ..... " ذوق کا ذکر کیا تو کہا: ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ "چکھ! تحقیق تو کریم اور غالب ہے"۔ دوسری جگہ فرمایا: ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ "دوزخ کو چکھو"۔

یہ تھے صوفیا میں موجہ اصطلاحات کے احکام اور معانی۔ اگر سب بیان کروں تو کتاب طویل ہونے کا احتمال ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کشفِ حجابِ یازدہم سماع

ظاہر ہے کہ حصولِ علم کے لیے پانچ ذرائع ہیں۔ سننا، دیکھنا، چکھنا، سونگھنا اور چھونا۔ یہ حق تعالیٰ کے عطا کردہ پانچ دروازے ہیں جن کے ذریعہ ہر قسم کا علم انسانی باطن میں داخل ہوتا ہے۔ آواز اور خبر کا تعلق سننے سے ہے مختلف رنگوں اور اجسام کا دیکھنے سے، تلخ و شیریں کا چکھنے سے، بو اور خوشبو کا سونگھنے اور سختی و نرمی کا چھونے سے۔ ان پانچ حواس میں سے چار کے لیے اپنا اپنا مخصوص مقام ہے اور ایک حس ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے۔ سننے کا مقام کان ہیں، دیکھنے کا آنکھ، چکھنے کا کام دہن اور سونگھنے کا ناک۔ مگر چھونے کی حس تمام اعضا میں پھیلی ہوئی ہے۔ آدمی صرف آنکھ سے دیکھتا ہے۔ کان سے سنتا ہے، ناک سے سونگھتا ہے اور کام و دہن سے چکھتا ہے۔ مگر چھونے کے معاملے میں اس کا سارا جسم سرد و گرم اور سخت و نرم میں تمیز کر سکتا ہے از روئے قیاس یہ ممکن ہے کہ جس طرح قوت لامسہ سارے اعضا میں موجود ہے اسی طرح باقی حواس کی قوتیں بھی سارے اعضا میں پائے جائیں لیکن فرقہ معتزلہ کے نزدیک ہر حس اپنے مخصوص مقام کے سوا کسی دوسرے عضو میں نہیں ہو سکتی۔

ص ۴۴۱/۵۴۰
معتزلہ کے

اس خیال کی تردید میں چھونے کی حس کا حوالہ کافی ہے۔ اگر پانچ حواس میں سے ایک یعنی لمس کا کوئی مخصوص مقام نہیں تو یہی چیز باقی چار حواس کے لیے بھی روا ہو سکتی ہے۔ بہرحال یہ موضوع بحث نہیں: تاہم اس قدر بیان کر دینا ضروری تھا۔

ایک حس یعنی سماعت کو چھوڑ کر باقی چار حواس میں سے ایک حس دیکھتی ہے۔ دوسری سونگھتی ہے۔ تیسری چکھتی ہے اور چوتھی چھوتی ہے۔ اس عجائب خانۂ کائنات کو دیکھ کر، خوش آئند اشیاء کو سونگھ کر، عمدہ نعیم کو چکھ کر اور نرم و ملائم چیزوں کو چھو کر عقل کی رہنمائی کے اسباب پیدا ہوتے ہیں اور ان حواس کے ذریعے عقل کے سامنے روشن ہو جاتا ہے کہ کائنات

حادث ہے کیونکہ اس میں تغیّر و تبدّل رونما ہوتا رہتا ہے اور تغیّر و تبدّل حادث ہونے کی دلیل ہے۔ اس کائنات کا کوئی خالق ہے۔ جو اس کا جز و نہیں کیونکہ تمام عالم مکوَّن (تکوین دیا گیا) ہے اور مکوِّن (تکوین دینے والا) خالقِ اکبر ہے۔ کائناتِ عالم اجسام ہے اور اس کی ذات پاک مجسم کرنے والی ہے۔ حق تعالیٰ قدیم ہے اور تمام کائنات حادث۔ اس کی ذات لامتناہی ہے اور تمام عالم متناہی۔ وہ قادرِ مطلق ہے۔ علیم ہے۔ ہر جگہ اسی کا تصرف ہے۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ اسی نے آیاتِ صادقہ دے کر پیغمبر بھیجے۔ ... مگر ان پیغمبروں پر ایمان اس وقت لازم ہوا جب معرفتِ حق کے کلمات اور باقی احکاماتِ شرع و دین ان کی زبان سے گوشِ سماعت نے سنے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ سنت والجماعت سماعت کو دیکھنے سے افضل سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی یہ کہے سماعت سننے کا مقام ہے اور دیکھنا نظر کا۔ دیدارِ حق اس کا کلام سننے سے افضل تر ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ از روئے احادیث نبوی (علیہ الصلوٰۃ والسّلام) بہشت میں مومنوں کو دیدارِ حق ہوگا۔ دیدار کی عقلی دلیل کشف سے بہتر نہیں ہو سکتی۔ ہم نے پیغمبر صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم سے سُن لیا کہ بہشت میں رؤیتِ حق ہوگی اور نگاہوں کے حجاب اٹھ جائیں گے ظاہر ہے کہ سننا دیکھنے سے افضل تر ہے۔ علاوہ ازیں احکاماتِ شرعی سماعت پر منحصر ہیں۔ وہ قائم ہی سماعت پر ہیں۔ جملہ انبیائے علیہم السلام نے پیغامِ حق زبانی دیا اور جنہوں نے سنا وہ گرویدہ ہو گئے۔ پھر ظہورِ معجزات ہوا اور معجزات کے دیکھے جانے کا علم بھی سننے ہی سے ہوا۔

ص ۴۴۴/۴۴۵

ان دلائل کے ہوتے ہوئے جو فضیلتِ سماعت کا انکار کرتا ہے وہ یقیناً تمام شریعت کا منکر ہے۔ اور احکام کو دیدہ و دانستہ چھپانے والا ہے۔ اب میں سماع سے متعلق جملہ امور مختصراً معرضِ بیان میں لاتا ہوں۔ انشاء اللہ العزیز۔

۳۰

تیسواں باب

قرآن حکیم کا سننا اور اس سے متعلقہ امور

قابل سماعت چیزوں میں دل کے لیے فوائد ہیں باطن کے لیے زوائد ہیں اور کانوں کے لیے لذت ہیں بلند ترین مقام حق تعالیٰ عزّ اسمہ کے کلام پاک کا ہے۔ سب اہلِ ایمان کو قرآن حکیم سننے کا حکم ہے اور سب کفّار اور جنّ کلامِ حق سننے کے لیے مکلّف ہیں۔ منجملہ معجزات قرآن پاک کا ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ اسے پڑھ کر طبیعت ملول نہیں ہوتی۔ اس میں انتہا درجہ کی رقّت ہے۔ کفارِ قریش رات کے وقت چھپ کر آتے تھے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تلاوت فرماتے ہوئے سنتے تھے۔ اور متعجب ہوتے تھے۔ مثلاً نضر بن حارث جو اپنے زمانے میں نہایت فصیح تسلیم کیا جاتا تھا۔ عتبہ بن ربیع جو بلاغت کے لحاظ سے جادو بیان تھا اور ابوجہل بن ہشام جو خطابت اور منطق میں یدِطولیٰ رکھتا تھا وغیرہ۔ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک رات کوئی سورۃ تلاوت فرما رہے تھے عتبہ بے خود ہو گیا اور ابوجہل سے بولا یہ انسانی کلام نہیں ہو سکتا۔ حق تعالیٰ نے جنوں کو حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بھیجا۔ انہوں نے کلامِ حق سنا۔ چنانچہ باری تعالیٰ نے فرمایا: فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا "جنوں نے کہا ہم نے عجیب و غریب کلام سنا۔" پھر باری تعالیٰ نے جنوں کا یہ قول بیان فرمایا کہ قرآن روحانی بیماریوں میں مبتلا دلوں کی حق تعالیٰ کی طرف رہنمائی کرتا ہے: یَّهْدِیْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ؕ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا "یہ قرآن نیکی کی راہ دکھاتا ہے۔ ہم ایمان لائے اور کسی کو حق تعالیٰ کا شریک نہیں بنائیں گے۔" پس قرآن کی ہر نصیحت جملہ نصیحتوں سے بہتر ہے۔ اس کا ہر لفظ جملہ الفاظ سے زیادہ بلیغ ہے۔ اس کا ہر حکم جملہ احکام سے زیادہ لطیف ہے۔ اس کی ہر نہی جملہ منہیات سے زیادہ مؤثر ہے۔ اس کا ہر وعدہ جملہ وعدوں سے زیادہ دل کش ہے۔ اس کا خوف ہر خوف سے زیادہ جانگداز ہے۔ اس کا ہر قصّہ جملہ قصص سے زیادہ اثر انگیز ہے۔ اس کی ہر مثال جملہ امثال سے زیادہ فصیح ہے۔ ہزاروں دل اس کا شکار ہیں۔ ہزاروں جانیں اس کے لطیف مضامین کے تأثر سے پامالِ بلا ہیں۔ ذلیل کو عزت اور عزیز کو ذلّت دیتا ہے۔

ص ۴۴۳ / ۵۴۲

قبولِ اسلام سے پہلے حضرت عمرؓ نے جب یہ سنا کہ ان کی بہن اور ان کا بہنوئی مسلمان ہو گئے ہیں تو طیش میں آ کر تلوار

کھینچ لی۔ اور محبت کو بالائے طاق رکھ کر ان کو قتل کرنے کے ارادہ سے گھر سے نکلے۔ حق تعالیٰ نے سورہ طٰہٰ کے پردہ میں ان کی گھات میں لشکر بٹھا رکھا تھا۔ آپ جب ہمشیرہ کے دروازے پر آئے تو وہ پاکدامن سورہ طٰہٰ کی یہ ابتدائی آیت پڑھ رہی تھی: طٰہٰ مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰٓی اِلَّا تَذۡکِرَۃً لِّمَنۡ یَّخۡشٰی "اے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم نے قرآن اس لیے نہیں اتارا کہ اس کی وجہ سے تو تکلیف اٹھائے۔ یہ ڈرنے والوں کے لیے پیغام ہے"۔ حضرت عمرؓ کی جان کلام کی باریکیوں کا شکار ہو گئی اور آپ کا دل لطیف حقائق میں کھو گیا۔ صلح کا راستہ اختیار کیا۔ عداوت کا جامہ اتار پھینکا۔ مخالفت سے دستبردار ہو کر موافقت پر اتر آئے۔

ص ۴۴۲/۵۳۲

مشہور ہے کہ جب صحابہؓ نے حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے یہ آیت پڑھی تو آپ بے ہوش ہو گئے: اِنَّ لَدَیۡنَآ اَنۡکَالًا وَّجَحِیۡمًا وَّطَعَامًا ذَا غُصَّۃٍ وَّعَذَابًا اَلِیۡمًا "ہمارے پاس طوق و سلاسل اور آتشِ جہنم ہے۔ گلے میں اٹک جانے والا کھانا اور دردناک عذاب ہے"۔ حضرت عمرؓ کے سامنے جب یہ آیت پڑھی گئی تو آپ نعرہ مار کر بے ہوش ہو گئے۔ آپ کو اٹھا کر گھر پہنچایا اور آپ کامل ایک ماہ تک صاحب فراش رہے: اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ لَوَاقِعٌ "بے شک تیرے رب کا عذاب ضرور آئے گا اور کوئی اس کو ٹالنے والا نہیں"۔

کہتے ہیں کسی شخص نے حضرت عبداللہ بن حنظلہؓ کے سامنے یہ آیت پڑھی: لَھُمۡ مِّنۡ جَھَنَّمَ مِھَادٌ وَّمِنۡ فَوۡقِھِمۡ غَوَاشٍ "کفار کے لیے آتشِ جہنم کے بستر اور اسی کے بالاپوش ہوں گے"۔ آپ رونے لگے۔ راوی کہتا ہے میں سمجھا کہ شاید انتقال کر گئے۔ تھوڑی دیر بعد آپ کھڑے ہوئے تو لوگوں نے بیٹھنے کی درخواست کی تو فرمایا اس آیت کی ہیبت مجھے بیٹھنے نہیں دیتی۔ حضرت جنیدؒ کے سامنے کسی نے یہ آیت پڑھی: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لِمَ تَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ "اے ایمان والو! وہ بات کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں"۔ تو آپ نے فرمایا: "بارِ خدایا! ہم جو کچھ کہتے ہیں تیرے حکم سے کہتے ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں تیری توفیق سے کرتے ہیں۔ ہمارا قول و فعل کہاں"۔

حضرت شبلیؒ سے منقول مشہور ہے کہ کسی نے آپ کے سامنے یہ آیت پڑھی: وَاذۡکُرۡ رَّبَّکَ اِذَا نَسِیۡتَ "یاد کر اپنے رب کو جب تو بھول جائے"۔ آپ نے فرمایا۔ ذکر کی شرط بھول جانا ہے (اپنے آپ کو) اور سارا عالم ذکر میں ناکام ہے۔ یہ کہا اور نعرہ مار کر بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش آیا تو فرمایا مجھے حیرت ہے ایسے دل پر جو کلامِ حق سن کر اپنی جگہ برقرار ہے اور اس جان پر جو کلامِ حق سن کر نکل نہ جائے۔ ایک بزرگ سے روایت ہے کہ وہ یہ آیت پڑھ رہے تھے: وَاتَّقُوۡا یَوۡمًا تُرۡجَعُوۡنَ فِیۡہِ اِلَی اللّٰہِ "ڈرو! اس دن سے جس دن تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے"۔ ہاتفِ غیب کی آواز آئی آہستہ پڑھو اس آیت

کی ہیبت سے چار پر یال جان بحق ہو گئی ہیں۔ ایک درویش نے کہا میں نے گذشتہ دس برس میں صرف اتنا قرآن پڑھا یا سنا ہے جتنا نماز کے لیے ضروری تھا۔ لوگوں نے سبب پوچھا تو فرمایا اس خوف سے کہ مجھ پر اتمام حجت نہ ہو جائے۔

ص ۴۲۵/۵۴۴

میں ایک روز شیخ ابوالعباسؒ کے پاس حاضر ہوا آپ یہ آیت پڑھ رہے تھے اور رو رہے تھے: ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ "حق تعالیٰ نے ایک ایسے غلام کی مثال بیان کی ہے جو کسی اور کی ملکیت ہے اور اسے کسی کام کی قدرت نہیں۔ میں یہ سمجھا کہ آپ انتقال فرما گئے۔ ہوش میں آئے تو میں نے پوچھا محترم یہ کیا حالت ہے۔ آپ نے فرمایا گذشتہ گیارہ سال سے میرا ورد اسی آیت تک پہنچا ہے اور میں اس سے آگے نہیں نکل سکا۔

میں نے حضرت ابوالعباس عطاؒ سے پوچھا آپ ہر روز کتنا قرآن پڑھتے ہیں۔ فرمایا پہلے شبانہ روز دو بار قرآن ختم کیا کرتا تھا اب چودہ برس میں سورۂ انفال تک پہنچا ہوں۔

سنا ہے حضرت ابوالعباس قصابؒ نے ایک قاری سے قرآن پڑھنے کو کہا۔ اس نے پڑھا: يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ "اے عزیز (مصر) ہمیں اور ہمارے اہل وعیال کو فاقہ کشی نے تنگ کر رکھا ہے اور ہم قلیل سرمایہ لے کر آئے ہیں"۔ آپ نے فرمایا اور پڑھو۔ قاری نے پڑھا: قَالُوْۤا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ "انہوں نے (یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے) کہا اگر اس (بن یامین) نے چوری کی ہے تو کچھ بعید نہیں کیونکہ اس کا بھائی بھی پہلے چوری کر چکا ہے"۔ ابوالعباسؒ نے فرمایا اور پڑھو۔ قاری نے پڑھا: لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ "آج تم پر کوئی گرفت نہیں اللہ تمہیں بخش دے"۔ اس کے بعد آپ نے دعا کی بار خدایا! میں ظلم میں یوسف (علیہ السلام) کے بھائیوں سے کم نہیں تو کرم میں یوسف علیہ السلام سے بڑھ کر ہے میرے ساتھ وہ کر جو یوسف نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کیا تھا۔

بایں ہمہ سب مسلمانوں کے لیے اطاعت پذیر ہوں یا گناہ گار۔ قرآن حکیم سننے کا حکم ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا: وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ "جب قرآن پڑھا جا رہا ہو تو سنو اور خاموش رہو تا کہ تم رحم کے مستحق بنو"۔ جس حال میں کوئی قرآن پڑھے لوگوں کو خاموشی اور توجہ سے سننے کا حکم دیا اور نیز فرمایا: فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ "خوشخبری ہے ان کے لیے جو ہمارا کلام سنتے ہیں"۔ اور احسن چیزوں پر عمل کرتے ہیں یعنی اوامر بجا لاتے ہیں۔

ص ۴۴۴ / ۵۴۵

نیز فرمایا: اَلَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ "وہ لوگ کہ جب اللہ کا ذکر ہو تو ان کے دل خوف زدہ ہو جائیں"

پھر فرمایا: اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُھُمْ بِذِکْرِ اللّٰہِ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ "ایمان والے اللہ کے ذکر سے مطمئن ہوتے ہیں اور یاد رکھو دلوں کو اطمینان صرف اللہ کے ذکر سے حاصل ہوتا ہے"۔ ایسی اور بہت سی آیات ہیں جو اس بات پر زور دیتی ہیں۔ اس کے برعکس ان لوگوں کی مذمت فرمائی ہے۔ جو کلام حق کو کما حقہٗ نہیں سنتے اور کانوں سے دل میں نہیں اتارتے۔ چنانچہ فرمایا: خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَعَلٰی سَمْعِھِمْ وَعَلٰی اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَۃٌ "اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں میں مہر لگا دی اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے"۔ نیز فرمایا کہ اہل جہنم یوں کہیں گے: لَوْ کُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا کُنَّا فِیْ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ "اگر ہم (دنیا میں) قرآن کو سنتے اور سمجھتے تو آج جہنم میں نہ ہوتے"۔ پھر فرمایا: وَمِنْھُمْ مَنْ یَّسْتَمِعُ اِلَیْکَ وَجَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِھِمْ اَکِنَّۃً اَنْ یَّفْقَھُوْہُ وَفِیْ اٰذَانِھِمْ وَقْرًا "ان میں سے کچھ لوگ سنتے ہیں مگر ان کے دلوں پر پردے ہیں وہ سمجھ ہی نہیں پاتے ان کے کان بہرے ہیں"۔ پھر فرمایا: وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَھُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ "ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو کہتے ہیں ہم نے سنا مگر وہ نہیں سنتے"۔ ایسی اور بہت سی آیات ہیں۔

روایت ہے کہ پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن مسعود رض سے فرمایا "مجھے قرآن پڑھ کر سناؤ"۔ حضرت عبداللہ نے عرض کی "قرآن تو آپ پر نازل ہوا ہے میں آپ کو کیا سناؤں"۔ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا میں دوسروں سے سننا پسند کرتا ہوں۔ یہ اس امر کی بیّن دلیل ہے کہ سننے والا اپنے حال میں پڑھنے والے سے کامل تر ہوتا ہے۔ کیونکہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا میں دوسرے آدمی سے سننا پسند کرتا ہوں۔ قاریؔ حال یا غیر حال کے عالم میں پڑھتا ہے مگر سننے والا ہمیشہ عالم حال میں سنتا ہے۔ بولنے میں ایک قسم کے تکبر کا شائبہ ہوتا ہے اور سننے میں تواضع کا پہلو۔

ص ۴۴۶ / ۵۴۶

نیز پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "مجھے سورۂ ہود نے بوڑھا کر دیا"۔ کہتے ہیں کہ آنحضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ اس لیے فرمایا کہ سورۂ ہود کے آخر میں یہ کلمات ہیں: "فَاسْتَقِمْ کَمَآ اُمِرْتَ" "ثابت قدم رہو جیسا کہ حکم دیا گیا ہے"۔ آدمی امورِ حق پر ثابت قدمی کے معاملے میں عاجز ہے کیونکہ وہ توفیقِ خداوندی کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ جب حکم ہوا کہ "ثابت قدم رہو" تو آپ متحیّر ہوئے کہ اس حکم پر کس طرح قائم رہا جائے۔ اسی کلفت کی وجہ سے قوّت جواب دینے لگی اور کلفت بڑھتی گئی یہاں تک کہ ایک روز آپ کھڑے ہونے لگے تو ہاتھ زمین پر ٹیک کر زور لگایا۔ حضرت ابوبکر رض نے کہا

یارسول اللہ (صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم) یہ کیا آپ تو ابھی جوان اور تندرست ہیں۔ آپ نے فرمایا سورۂ ہود نے مجھے بوڑھا کردیا۔ اس کے مذکورہ احکام نے مجھے اتنا خوف زدہ کیا ہے کہ میری قوت جواب دے رہی ہے۔

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے: کنت فی عصابۃ فیہا ضعفاء المہاجرین وان بعضہم یستتر بعضا من العری وقاری یقرء علینا ونحن نستمع لقراءتہ قال فجاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتی قام علینا فلما راٰہ القاری سکت قال فسلم فقال ماذا کنتم تصنعون قلنا یارسول اللہ کان قاری یقرء علینا ونحن نستمع لقراءتہ فقال النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم الحمد للہ الذی جعل فی امتی من اُمرتُ ان اصبر نفسی معہم قال ثم جلس وسطنا لیعدل نفسہ فینا ثم قال بیدہ ھکذا فتحلق القوم فلم یعرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منہم احد قال وکانوا ضعفاء المہاجرین فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ابشروا صعالیک المہاجرین بالفوز التام یوم القیامۃ تدخلون الجنۃ قبل اغنیاء بنصف یوم کان مقدارہ خمسمائۃ عام" میں صحابہؓ کی ایک جماعت میں بیٹھا تھا جو کمزور اور لاغر مہاجرین پر مشتمل تھی۔ برہنگی سے بچنے کے لیے سب ایک دوسرے کی آڑ لیے ہوئے تھے۔ قاری قرآن پڑھ رہا تھا اور ہم سن رہے تھے۔ کہ اچانک پیغمبر صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم تشریف لائے قاری خاموش ہو گیا۔ آپ نے سلام کرکے پوچھا کیا کررہے ہو ہم نے جواب دیا حضور صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم! قرآن پڑھا جارہا تھا اور ہم سن رہے تھے۔ آپ نے فرمایا اللہ کا شکر ہے میری امت میں ایسے آدمی شامل ہیں جن کے ساتھ ہیں صبر کرنے پر مامور ہوں۔ اس کے بعد آپ ان کے درمیان تشریف فرما ہوئے، اس طرح کہ آپ خصوصیت سے نظر نہیں آرہے تھے ایک حلقہ میں سب برابر ہو گئے۔ پھر فرمایا اے گروہِ مہاجرین! روزِ قیامت تمہیں کامرانی کی بشارت دیتا ہوں تم لوگ بہشت میں اپنے دولت مند بھائیوں سے نصف دن پہلے داخل ہو جاؤ گے اور نصف دن پانچ سو سال کے برابر ہوگا۔

مندرجہ بالا حدیث کچھ اختلاف سے بھی مروی ہے مگر یہ اختلاف صرف لفظی ہے معانی کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں۔

فصل

زرارہ بن ابی اوفی رضؓ ایک جلیل القدر صحابی تھے۔ ایک مرتبہ آپ امامت فرمارہے تھے۔ آپ نے ایک آیت پڑھی جس کے جلال کی تاب نہ لاکر ایک چیخ ماری اور جان بحق ہو گئے۔

حضرت ابو جہین رحمہ اللہ بزرگ تابعین میں شامل تھے۔ ان کے سامنے ایک آیت پڑھی گئی تو آپ چیخ مار کر رحلت فرما گئے۔ حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نواحِ کوفہ میں ایک گاؤں سے گزر رہے تھے ایک عورت کو نماز میں کھڑے دیکھا۔ اس پر نیکی کے آثار نمایاں تھے۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئی تو ابراہیم نے تکریماً سلام کیا۔ عورت نے پوچھا کیا تم قرآن جانتے ہو؟ جواب دیا ہاں۔ کہا کچھ پڑھو۔ ابراہیم نے ایک آیت پڑھی۔ عورت نعرہ مار کر بے ہوش ہو گئی اور اس کی روح پرواز کر گئی۔

ص ۴۴۸/۵۴۸

احمد بن ابی الحواری رحمہ اللہ نے صحرا میں ایک نوجوان کو دیکھا جو موٹے کپڑے کی گدڑی پہنے ایک کنوئیں پر کھڑا تھا۔ نوجوان نے کہا اے احمد! وقت پر آ گئے۔ مجھے اس وقت سماع کی ضرورت ہے تاکہ جان سپردِ حق کر سکوں۔ حضرت احمد رحمہ اللہ کو اشارۂ حق ہوا اور انہوں نے یہ آیت پڑھی: اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا "تحقیق وہ لوگ جنہوں نے کہا اللہ ہمارا رب ہے اور اس پر استقامت کی"۔ جوان نے کہا بخدا آپ نے وہی آیت پڑھی جو اس وقت فرشتے میرے سامنے پڑھ رہے تھے۔ یہ کہا اور جان بحق تسلیم ہو گیا۔

اس موضوع پر اور بھی بہت کچھ ہے سب کچھ بیان کروں تو مقصد فوت ہو جائے گا۔ اسی پر اکتفا کرتا ہوں اور توفیق حق تعالیٰ کے قبضۂ اختیار میں ہے۔

۳۱
اکتیسواں باب

شعر سننا اور اس سے متعلقہ امور

شعر سننا مباح ہے پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اشعار سنے ہیں۔ صحابہ کرام نے بھی اشعار سنے ہیں اور کہے ہیں۔ آنحضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ان من الشعر لحکمة "بلاشبہ بعض اشعار حکمت ہیں"۔ نیز فرمایا: الحکمة ضالة المؤمن حیث وجدها فهو احق بها "حکمت مومن کی کھوئی ہوئی چیز ہے جہاں ملے وہ اس کا زیادہ حق دار ہے" یہاں شعر سے مراد وہ شعر ہے جس میں حکمت ہو اور حکمت مومن کا حق ہے جہاں بھی ہو۔ پھر آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "اہل عرب میں سب سے سچا کلام لبید شاعر کا قول ہے ؎

ص ۴۵۰/۵۴۹

الاکل شئ ما خلا اللہ باطل   وکل نعیم لا محالۃ زایل

ترجمہ: سنو اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے اور ہر نعمت رو بہ زوال ہے۔

عمرو بن الشرید اپنے والد سے روایت کرتے ہیں: قال استنشدنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم هل تروی من شعر امیۃ بن ابی الصلت شیئا فانشدته مائة قافية فجعلت كلما مررت على بيت قال هيه فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کاد ان یسلم فی شعرہ" رسولِ حق (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھے شعر پڑھنے کا حکم دیا اور پوچھا کیا امیہ ابن ابی الصلت کے اشعار سنا سکتے ہو؟ میں نے سو شعر سنائے۔ ہر شعر کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے اور سناؤ۔ آخر میں فرمایا امیہ اپنے اشعار میں قریب قریب مسلمان تھا۔" آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرامؓ سے ایسی کئی روایات ہیں۔ مگر عام لوگوں میں کچھ غلط فہمیاں موجود ہیں۔ ایک جماعت ہر قسم کے اشعار سننا حرام سمجھتی ہے اور اسی بنا پر باقی برادرانِ اسلام پر نکتہ چینی میں مصروف رہتی ہے۔ دوسری جماعت ہر قسم کے اشعار کو جائز سمجھتی ہے۔ اور شبانہ روز حسنِ محبوب اور زلفِ جاناں پر غزل سرائی سننے میں مشغول رہتی ہے۔ دونوں جماعتیں ایک دوسرے کے خلاف دلایل پیش کرتی ہیں۔ میرا مقصد ان کی تردید یا تائید نہیں میں اسی قدر کافی سمجھتا ہوں۔ صوفیائے کرام کا طریق الگ ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شعر کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا: کلام حسنہ حسن وقبیحہ قبیح "شعر وہ کلام ہے کہ اس کا مضمون اچھا ہو تو شعر اچھا ہے اور برا ہو تو شعر برا ہے" یعنی جس چیز کو نثر میں سننا حرام ہے مثلاً غیبت، بہتان، فحش، الزام تراشی، اور کلماتِ کفر۔ اس کا نظم میں بھی سننا حرام ہے جس چیز کو نثر میں سننا حلال ہے مثلاً وعظ و حکمت، آیاتِ حق میں استدلال، شواہدِ حق پر تبصرہ۔ اسے

ص ۴۵۱/۵۵۰

نظم میں بھی سننا مباح ہے۔ الغرض جس طرح ایسے حسن و جمال کو دیکھنا جو محلِ آفت ہو حرام و ممنوع ہے، بالکل اسی طرح ایسے حسن و جمال سے متعلق نظم و نثر میں سننا بھی حرام و ممنوع ہے اور اس کی تعریف سننا بھی حرام ہے۔ جو تعریف سننے کو حلالِ مطلق سمجھتا ہے اسے لازماً دیکھنے اور چھونے کو بھی حلال سمجھنا چاہیئے۔ اور یہ صریح کفر و بے دینی ہے۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ میں چشم و گیسو اور رخ و خال کی تعریف میں صدائے حق سنتا ہوں اور حق کا طالب ہوں تو دوسرا کہہ سکتا ہے کہ میں ان چیزوں کو دیکھنے میں صرف حق کو دیکھتا ہوں اور اسی کا طالب ہوں کیونکہ آنکھ اور کان دونوں محلِ آفت اور منبعِ علم ہیں۔ اسی طرح ایک تیسرا کہہ سکتا ہے کہ میں حسین جسم کو چھوتا ہوں کیونکہ اور لوگ اس کے دیکھنے اور سننے کو جائز سمجھتے ہیں۔ میں بھی طالبِ حق ہوں۔ سب حواس ادراک معانی میں برابر کی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس طرح شریعت کلیۃً باطل ہو جائے گی۔ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان "دونوں

آنکھیں مرتکب زنا ہوتی ہیں " ختم ہو جائے گا۔ نامحرموں کو چھونے پر بھی کوئی ملامت نہ رہے گی اور شرعی حدود ساقط ہو جائیں گی۔ یہ صریح گمراہی کا مقام ہے۔ جب جاہل لوگ حال مست سماع کرنے والے صوفیاء کو دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ شاید یہ لوگ نفسانی خواہشات میں مبتلا ہیں۔ انہوں نے بھی سماع کو جائز سمجھ لیا اور کہا کہ اگر جائز نہ ہوتا تو صوفی لوگ اختیار نہ کرتے۔ جہلاء نے تقلید میں صوفیاء کے ظاہر کو اختیار کر لیا اور باطن سے کنارہ کش رہے اور اس طرح خود بھی ہلاک ہوئے اور اپنے ساتھ اوروں کو بھی ہلاکت میں ڈال دیا۔ یہ اس زمانے کی سب سے بڑی آفت ہے۔ اپنی جگہ پر اس کی پوری تشریح آئے گی۔ انشاء اللہ العزیز۔

۳۲

تینتیسواں باب

سماعِ اصوات و نغمات

ص ۴۵۳/۴۵۱

پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا : زینوا اصواتکم بالقرآن " قرآن پڑھتے وقت اپنی آوازوں کو سنوارو"۔ باری تعالیٰ نے فرمایا : یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ " وہ پیدائش میں جو چاہتا ہے زیادہ کرتا ہے"۔ تفسیر کرنے والے اس سے مراد عمدہ آواز لیتے ہیں۔ پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا : من اراد ان یستمع صوت داؤد فلیستمع صوت ابی موسیٰ الاشعری " جو حضرت داؤد کی آواز سننے کی تمنا رکھتا ہو وہ ابو موسیٰ اشعری کی آواز سنے"۔ احادیث میں ہے کہ اہل بہشت کے لیے روضۂ بہشت میں سماع ہوگا اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ ہر درخت سے اصوات و نغمات سنائی دیں گے جب مختلف قسم کی آوازیں باہم ملتی ہیں تو طبیعتوں پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یہ سماع انسانوں اور حیوانوں میں عام ہے۔ روح ایک لطیف چیز ہے۔ سریلی آواز میں بھی صد گونہ لطافت ہوتی ہے۔ جب روح ایک سریلی آواز کو سنتی ہے تو جنسی میلان (لطافت کا لطافت کی طرف) رونما ہوتا ہے۔ اطباء اور دیگر مدعیانِ تحقیق نے اس موضوع پر بہت کچھ کہا ہے اور صوت و آہنگ پر ضخیم کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان کے آثارِ فن آج ہمارے سامنے گانے بجانے کے آلات کی

صورت میں موجود ہیں جو لوگوں نے ہواؤ ہوس اور لہو ولعب کی طلب کی تسکین کے لیے شیطانی روش پر وضع کئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اسحاق موصلی ایک باغ میں گا رہا تھا۔ ایک بلبل نغمہ سرا اس کی راگنی سن کر خاموش ہوگیا۔ کچھ دیر سنتا رہا۔ پھر تڑپ کر درخت سے نیچے گرا اور مرگیا۔ اس قسم کی اور کئی حکایات ہیں۔ مقصود بیان کرنا صرف اس امر کا ہے کہ الحان وسرود جملہ جانداروں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم خواص فرماتے ہیں کہ میں ایک بار عرب کے ایک قبیلہ کے سردار کے ہاں مہمان تھا۔ ایک حبشی کو دیکھا طوق و زنجیر میں جکڑا ہوا خیمے کے دروازے پر دھوپ میں پڑا ہوا ہے۔ مجھے ترس آیا۔ ارادہ کیا کہ سردار سے اس کی سفارش کروں۔ چنانچہ جب کھانا سامنے آیا اور سردار تکریماً خود بھی شریک طعام ہونے کے لیے آگیا۔ تو میں نے کھانے سے انکار کر دیا۔ عربوں کے نزدیک یہ چیز سخت ناگوار ہے۔ سردار نے انکار کا سبب پوچھا میں نے کہا میرا انکار اس امیدِ کرم کی بنا پر ہے جو میں سردار سے رکھتا ہوں۔ جواب ملا "میرا سب مال و متاع حاضر ہے کھانے سے انکار نہیں ہونا چاہیئے" میں نے کہا مجھے مال و متاع کی ضرورت نہیں صرف یہ غلام چاہیئے۔ سردار نے کہا "پہلے اس کا جرم سمجھ لو پھر غلام کو چھوڑ دیا جائے گا۔ غلام کیا سب املاک تمہارے قبضۂ اختیار میں ہے"۔ میں نے جرم پوچھا تو سردار نے بیان کیا۔ یہ غلام حدی خوان ہے اور نہایت درجہ خوش الحان ہے میں نے اسے کچھ اونٹ دے کر غلہ لادلانے کو بھیجا۔ اس نے ہر اونٹ پر دو اونٹوں کا بوجھ لاد دیا۔ راستہ بھر حدی خوانی کرتا رہا اور اونٹ دوڑتے رہے۔ تھوڑے ہی عرصے میں وہ یہاں آگیا۔ جب بوجھ اتارا گیا تو سب اونٹ ایک ایک کر کے ہلاک ہوگئے۔ مجھے سخت تعجب ہوا اور میں نے کہا سردار! یقیناً یہ سب سچ ہے مگر مجھے اس کا ثبوت چاہیئے۔ ہم یہ بات کر ہی رہے تھے کہ چند اونٹ صحرا سے کنوئیں پر پانی پینے کے لیے آئے شتربانوں کے بیان کے مطابق یہ اونٹ تین روز سے پیاسے تھے۔ سردار نے حبشی غلام کو حدی خوانی کا حکم دیا۔ اونٹ اس کی آواز سن کر ایسے مست ہوئے کہ کسی نے پانی کو منہ تک نہ لگایا اور تھوڑی ہی دیر میں جنگل میں منتشر ہوگئے۔ اس کے بعد سردار نے غلام کو مجھے دے دیا۔

ص ۴۵۴/۵۵۲

ص ۴۵۴/۵۵۳

یہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ شتربان اور گدھوں والے گاتے ہیں تو ان کے جانوروں پر سرور کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ خراسان اور عراق میں رات کے وقت ہرن پکڑنے والے ایک طشت بجاتے ہیں۔ ہرن اس کی آواز سن کر اپنی جگہ پر ساکت ہو جاتے ہیں اور پکڑ لیے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں ہرن کے شکاری جنگل میں گاتے ہیں۔ ہرن سریلی آوازوں کے کیف میں جھوم کر ان کی طرف آتے ہیں۔ شکاری ان کو گھیرے میں لے کر گاتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہرن آنکھیں بند کر کے

سو جاتے ہیں اور پکڑ لیے جاتے ہیں۔ چھوٹے بچے گہوارے میں رو رہے ہوں اور کوئی انہیں سریلی آواز میں لوری سنائے تو وہ خاموش ہو جاتے ہیں اور لوری سنتے ہیں۔ اطبا ایسے بچوں کی نسبت کہتے ہیں کہ وہ صحیح الحس ہیں اور بڑے ہو کر زیرک و صاحبِ فہم ہوں گے۔ کہتے ہیں۔ ایران کا کوئی بادشاہ وفات پا گیا۔ اس کا بچہ صرف دو سال کا تھا۔ وزرا نے ارادہ کیا کہ بچے کو تخت نشین کر دیا جائے۔ حکیم بوذرجمہر سے مشورہ کیا گیا۔ اس نے کہا ٹھیک ہے مگر دیکھنا چاہیئے کہ بچہ صحیح الحس ہے یا نہیں؟ وزرا نے تدبیر پوچھی۔ بوذرجمہر کے حکم کے مطابق گویّوں نے گانا شروع کیا۔ بچہ سرور میں آکر ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ بوذرجمہر نے کہا۔ اس بچے سے مملکت کی خیر و فلاح کی توقع رکھنی چاہیئے۔ الغرض نغمات کا تأثر حکماء کے نزدیک ایک مسلمہ چیز ہے اور اس پر کسی مزید دلیل کی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی شخص نغمات و سرود یا ساز کو دل پذیر نہیں سمجھتا تو یقیناً وہ جھوٹ بولتا ہے اور نفاق سے کام لیتا ہے یا وہ صاحبِ احساس نہیں اور اس لیے انسانیت اور تصوف سے خارج ہے۔

ص ۴۵۵ / ۵۵۴

کچھ لوگ رعایتِ حکم حق تعالیٰ کی بنا پر منع کرتے ہیں مگر فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ اگر کھیل تماشا مقصود نہ ہو اور الحان فسق و فجور میں مبتلا نہ کرے تو اس کا سننا مباح ہے۔ اس پر کثیر اخبار و آثار موجود ہیں۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے قالت کانت عندی جاریۃ تغنّی فاستاذن عمرؓ فلما احسّتہ فرّت فلما دخل عمرؓ تبسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم فقال لہ عمرؓ ما اضحکک یا رسول اللہ قال کانت عندنا جاریۃ تغنّی فلما سمعت حسّک فرّت فقال عمرؓ لا ابوح حتی اسمع ما کان سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم فدعا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الجاریۃ فاخذت تغنّی ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یستمع "میرے پاس ایک کنیز گا رہی تھی کہ حضرت عمرؓ نے اندر آنے کی اجازت طلب کی جب کنیز کو علم ہوا اور ان کی آہٹ سنی تو بھاگ گئی۔ جب حضرت عمرؓ اندر داخل ہوئے تو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسکرا دیئے۔ حضرت عمرؓ نے مسکرانے کا سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا ایک کنیز گا رہی تھی تمہارے پاؤں کی آہٹ سن کر بھاگ گئی۔ عمرؓ نے عرض کی میں یہاں سے نہیں جاؤں گا جب تک وہ چیز نہ سن لوں جو حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سنی تھی۔ آنحضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کنیز کو بلایا وہ گانے لگی اور حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سنتے رہے۔"

اسی قسم کی اور بہت سی روایتیں ہیں۔ شیخ عبد الرحمٰن سلمیؒ نے سب کو اپنی کتاب "السّماع" میں جمع کر دیا ہے اور سماع کے مباح ہونے کا فیصلہ دیا ہے۔ مشائخ کرام کا مقصود جداگانہ ہے۔ فقہا نہ اباحت عوام کا کام ہے۔

صوفیاء کے لیے اباحت وہ ہے جو اعمال کے لیے سود مند ہو۔ اہل ہوش کو لازم ہے کہ ایسے امور کے در پے ہوں جو سود مند ہو۔

میں مرو میں تھا۔ اہل حدیث کے آئمہ میں سے ایک مشہور امام نے مجھ سے کہا کہ اس نے سماع کی اباحت پر ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ میں نے کہا یہ تو دین میں ایک بڑی مصیبت پیدا ہو گئی۔ ایک امام نے ایسی چیز کو مباح قرار دے دیا جو تمام برائیوں کی اصل ہے۔ امام نے پوچھا اگر مباح نہیں تو تم کیوں سنتے ہو؟ میں نے کہا اس کے لیے متعدد وجوہ ہیں۔ یک طرفہ قطعی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ اگر سماع کی تاثیر دل پر مباح ہے تو سماع بھی مباح ہے۔ اگر حرام ہے تو سماع بھی حرام ہے۔ الغرض ہر وہ چیز جو بظاہر فسق آلودہ ہے اور باطن پر اس کا تاثر مختلف شکلوں میں رونما ہوتا ہے۔ ایک قطعی فیصلے کے تحت نہیں آسکتی۔ واللہ اعلم :

ص ۴۵۶/۵۵۵

۳۳

تینتیسواں باب

احکامِ سماع

معلوم ہونا چاہیے کہ اصولِ سماع مختلف طبائع کے لیے ایک نہیں ہو سکتا۔ طبیعتوں کے رجحان مختلف ہوتے ہیں اور یہ ظلم ہے کہ ہر شخص کے لیے سماع ایک ہی اصول کے تابع فرمان سمجھا جائے۔ سماع سننے والے دو جماعتوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں، اوّل وہ لوگ جو معانی پر کان رکھتے ہیں اور دوئم وہ جو صرف آواز پر جھومتے ہیں۔ دونوں کے اچھے اور برے پہلو ہیں۔ خوش الحانی طبیعت میں خروش پیدا کرتی ہے۔ اگر طبیعت حق آشنا ہے تو خروش بھی حق ہو گا اور اگر باطل پرست ہے تو خروش بھی باطل ہو گا۔ لہٰذا اگر طبیعت میں فساد ہے تو سماع کا اثر بھی فساد ہی ہو گا۔ اس کی مثال حضرت داؤد علیہ السلام کی حکایت ہے جب باری تعالیٰ نے آپ کو مامور فرمایا تو خوش الحانی عطا فرمائی اور آپ کے گلو کو ساز بنا دیا۔ پہاڑ جھومنے لگتے تھے جنگلی جانور اور پرندے کوہ و بیابان میں آپ کے نغمات سے مسحور ہو جاتے تھے چلتے ہوئے دریا تھم جاتے تھے۔ اڑتے ہوئے پرند

گر پڑتے تھے۔ جس جنگل میں آپ نغمہ سرا ہوتے تھے وہاں مہینہ بھر جاندار کچھ کھاتے پیتے نہیں تھے۔ بچے دودھ نہیں مانگتے تھے رونا چھوڑ دیتے تھے۔ لوگ سن کر پلٹتے تو سننے والوں میں سے کئی لوگ کلام آواز اور الحان کی شدتِ کیفیت کی وجہ سے مُردہ پائے جاتے۔ ایک دفعہ تو سات سو کنیزیں جاں بحق ہوگئیں اور بارہ ہزار بوڑھے مر گئے۔ مشیتِ ایزدی ہوئی۔ کہ ہوس پرست سماع کرنے والوں اور حق آشناؤں میں امتیاز قائم ہو۔ ابلیس کا طبعی اضطراب روبکار آیا۔ اور اس نے انسان کو وسوسوں میں مبتلا کرنے کا ارادہ کیا۔ اپنی حیلہ سازیوں کے لیے اجازت طلب کی۔ اجازت مل گئی۔ اس نے مزامیر اور طنبور کو شکل دی۔ اور داؤد علیہ السلام کے مقابل مجلس آراستہ کرلی۔ اہلِ سماع دو جماعتوں میں تقسیم ہوگئے۔ اہلِ شقاوت شیطانی مزامیر پر لٹو ہوگئے اور اہلِ سعادت حضرت داؤد علیہ السلام کے حضور سرنگوں رہے۔ اہلِ معنی کے سامنے نہ حضرت داؤدؑ کا الحان تھا اور نہ دوسری جماعت کے مزامیر۔ وہ رو بحق تھے۔ الحانِ داؤدی ان کے لیے سرچشمہ ہدایت تھا اور مزامیرِ ابلیسی سراسر فتنہ و شر۔ وہ سب سے الگ ہوگئے اور تعلقات سے اعراض کیا۔ ان کی نظر نے غلط کو غلط اور درست کو درست دیکھ لیا۔ جس کسی کو سماع اس منہاج پر میسّر آئے مباح ہے۔ مدعیوں کی ایک جماعت کہتی ہے کہ ہمارے لیے سماع اس کی ظاہری صورت سے مختلف ہوتا ہے۔ یہ قطعاً محال ہے۔ کمالِ ولایت یہی ہے کہ ہر چیز وہی کچھ نظر آئے جو وہ اصل میں ہے۔ اگر ایسا نہیں تو نظر کا قصور ہے کیا معلوم نہیں کہ پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اَللّٰهُمَّ اَرِنَا حَقَائِقَ كُلِّ الْاَشْيَاءِ كَمَا هِيَ "اے اللہ! تو جملہ اشیاء کی وہی حقیقت دکھا جو ہے"۔

جب صحیح نظری یہی ہے کہ ہر چیز اپنے اصلی روپ میں نظر آئے تو درست سماع بھی یہی ہے کہ جو کچھ سنا جائے وہ وہی ہو جو سنایا جا رہا ہے۔ مزامیر پر فدا ہونے والے ہوائے نفس اور ہوس میں مبتلا ہوتے ہیں۔ وہ اصلیت سے دور ہٹ کر سنتے ہیں ورنہ وہ سماع کی جملہ برائیوں سے نجات پاتے۔ گمراہی میں مبتلا لوگوں نے کلام حق سنا تو گمراہ سے گمراہ تر ہوگئے۔ نضر بن الحارث نے کلامِ پاک سن کر کہا هٰذَا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ "یہ پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں"۔ عبداللہ بن سعد بن ابی کاتبِ وحی تھا اس نے کہا "فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ"۔ ایک جماعت نے لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ کو رویت باری کی نفی کی دلیل بنا لیا۔ ایک دوسری جماعت نے "ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ" کو جہت و مکان کا ثبوت سمجھ لیا۔ ایک تیسری جماعت نے وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا کو حق تعالیٰ کی آمد پر عاید سمجھا۔ چونکہ ان کی جبلّت میں گمراہی تھی۔ ان کے لیے کلامِ حق کا سننا سود مند نہ ہوا۔ توحید پرست کسی شاعر کے شعر پر نظر کرتا ہوا شاعر کی طبیعت کو آراستہ کرنے والے خالقِ اکبر کو دیکھتا ہے،

ص ۴۵۷/۵۵۶

ص ۴۵۸/۵۵۷

فعل کی بلندی فاعل کی طرف دلیلِ راہ بنتی ہے۔ اہلِ ضلالت قرآنِ حکیم سن کر بھی بھٹک گئے۔ اور اہلِ حق کلامِ باطل سن کر راہِ ہدایت پہ گامزن رہے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے جس کا انکار کھلا مکابرہ ہے اللہ ہی زیادہ عالم ہے۔

فصل

سماع سے متعلق مشائخِ کبار کے بے شمار لطیف مقالات ہیں۔ جو اس کتاب کے احاطۂ تحریر میں نہیں آسکتے۔ تاہم میں ان میں سے کچھ معرضِ بیان میں لاتا ہوں تاکہ تو مکمل طور پر مستفید ہو سکے توفیق اللہ کے قبضۂ اختیار میں ہے۔

ذوالنون مصریؒ نے فرمایا: السماع وارد الحق یزعج القلوب الی الحق فمن اصغیٰ الیہ بحق تحقق ومن اصغیٰ الیہ بنفس تزندق "سماع فیضانِ حق ہے۔ جو دلوں کو رو بحق کرتا ہے جس نے حقیقت کو مدنظر رکھا وہ حق کی طرف گامزن ہوا جس کے سامنے ہوائے نفس رہی وہ بھٹک گیا۔" مراد یہ نہیں کہ سماع وصل حق کا سبب بن جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سننے والا صرف حقیقت پر نظر رکھے۔ آواز میں الجھ کر نہ رہ جائے تاکہ فیضانِ حق سے بہرہ ور ہو۔ ذکرِ حق دل کو ابھارتا ہے اس لیے تابعِ حق کو مشاہدہ حاصل ہو گا اور نفس کا پرستار حجاب میں رہ جائے گا اور تاویلوں میں پھنس جائے گا۔ زندقہ فارسی زبان کا لفظ ہے معرب شکل ہیں۔ فارسی زبان میں زندقہ کا مطلب تاویل ہے۔ اسی وجہ سے وہ اپنی مذہبی کتاب کی تفسیر کو ژند و پاژند کہتے ہیں۔ اہلِ لغت نے آتش پرستوں کو زندیق کا نام دے دیا۔ کیونکہ بقول ان کے مسلمانوں کے ہر قول کی تاویل ہو سکتی ہے جو قول کی ظاہری صورت سے مختلف ہوتی ہے۔ تنزیل دیانت میں داخل ہونے کا نام ہے اور تاویل باہر نکلنے کو کہتے ہیں۔ آج کل مصر میں شیعہ فرقہ کے لوگ جو انہیں آتش پرستوں کے پس ماندگان ہیں۔ یہی کچھ کہتے ہیں اور لفظ زندیق ان کے لیے اسمِ علَم ہو گیا ہے۔ القصہ مطلب ذوالنونؒ کا یہ ہے کہ اہلِ حقیقت سماع میں رو بحق ہوتے ہیں اور اہلِ ہوس دور دراز کی تاویلوں میں الجھ کر گمراہ ہو جاتے ہیں۔

ص ۲۶۰ / ۵۵۹

شبلیؒ کا قول ہے السماع ظاہرہ فتنۃ وباطنہ عبرۃ فمن عرف الاشارۃ حل لہ استماع العبرۃ والا فقد استدعی الفتنۃ وتعرض للبلیۃ "سماع بظاہر فتنہ ہے اور باطناً عبرت۔ جو اداشناس ہے اس کے لیے عبرت کا سننا مباح ہے ورنہ سراسر طلب فتنہ ہے اور مصیبت کو دعوت دینا ہے۔" مطلب یہ ہے کہ اگر دل گرویدۂ حق نہیں تو سماع بلا اور آفت کا موجب ہے۔

ابو علی رود باریؒ سے سماع سے متعلق کسی نے سوال کیا تو آپ نے جواباً فرمایا: لیتنا تخلصنا منه راسا براس کاش ہم سماع سے سر بسر بچ نکلیں۔ کیونکہ انسان ہر چیز کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ اور جب وہ کوئی حق ادا نہیں کرتا تو اسے اپنی خطا کا احساس ہوتا ہے اور وہ پھر سمجھتا ہے کہ کاش اسے کلی رہائی نصیب ہوتی۔

ایک شیخ بزرگ فرماتے ہیں "سماع باطن میں پوشیدہ چیزوں کو دیکھنے کے لیے باطن کو ابھارتا ہے" تاکہ پیوستہ حاضرِ حق رہے۔ مریدوں کے لیے غیبتِ اسرار سخت قابلِ ملامت چیز ہے۔ دوست غائب ہونے کے باوجود دل میں حاضر ہونا چاہیئے۔ اگر دل سے بھی غائب ہے تو دوستی کا کوئی وجود نہیں۔

میرے شیخِ طریقتؒ نے فرمایا "سماع اہل عجز کا زادِ سفر ہے جو منزل پر پہنچ گیا اسے سماع کی ضرورت نہیں" کیونکہ مقامِ وصل پر سننے کی ضرورت نہیں رہتی سننا خبر کا ہوتا ہے اور خبر غائب سے متعلق ہوتی ہے۔ عالمِ مشاہدہ میں سننے کا کوئی مقام ہی نہیں رہتا۔

حضرت حصریؒ فرماتے ہیں: ایش تعمل بالسماع ینقطع اذا انقطع ممن یستمع منه ینبغی ان یکون سماعك متصلا غیر منقطع "اس سماع کو کوئی کیا کرے جو منقطع ہو جانے والا ہو جیسے گانے والا ختم کرے تو اس کا اثر بھی زایل ہو جائے سماع تو متصل اور غیر منقطع ہونا چاہیئے۔" یہ گلشنِ محبت میں اجتماعِ ہمت کی طرف اشارہ ہے۔ اس مقام پر ساری کائنات عارف کے لیے سماع مہیا کرتی ہے اور یہ بہت بڑا درجہ ہے۔

واللہ اعلم

۳۴

چونتیسواں باب

سماع سے متعلق اختلافات

سماع سے متعلق مشائخ اور اہل حقیقت میں اختلاف ہے۔ ایک جماعت کا خیال ہے کہ سماع غیبت کا سبب ہے۔ کیونکہ عالم مشاہدہ میں سماع ممکن نہیں۔ وصل دوست میں دوست کی نظر دوست پر ہوتی ہے اور اسے سماع کی پروا نہیں ہوتی سماع خبر کا ہوتا ہے اور خبر عالم مشاہدہ میں دوری اور پردہ کے برابر ہوتی ہے۔ سماع بتدی لوگوں کا ذریعہ ہے جس کے ساتھ وہ غفلت اور پراگندگی کو چھوڑ کر جمعیت خاطر حاصل کرتے ہیں جنہیں پہلے ہی سے جمعیت خاطر حاصل ہو وہ سماع سے پراگندہ خاطر ہو جاتے ہیں دوسری جماعت کا خیال ہے کہ سماع حاضری کا ذریعہ ہے کیونکہ محبت فنائے کُل اور محویت کا تقاضا کرتی ہے۔ جب تک دوست کلّی طور پر دوست میں مستغرق نہ ہو جائے۔ اس کی محبت ناقص ہوتی ہے۔ دل کے لیے مقام وصل محبت ہے۔ باطن کے لیے مشاہدہ، روح کا وصل اور جسم کا خدمت۔ اسی طرح ضروری ہے کہ کان کے لیے بھی کچھ ہو جیسا کہ دیدار آنکھ کا مقدر ہے کسی شاعر نے ہزلیہ انداز میں شراب کی طلب میں کیا خوب کہا ہے ؎

ص ۴۶۲/۵۶۱

الا فاسقنی خمرا وقل لی ھی الخمر ۝ ولا تسقنی سرا اذا امکن الجھر

ترجمہ: "اے دوست! مجھے شراب پلا اور منہ سے کہہ کہ یہ شراب ہے۔ مجھے چھپ کر نہ پلا ظاہر پلانا بھی تو ممکن ہے۔"

یعنی مجھے شراب دے جسے میری آنکھ دیکھ لے۔ میرا ہاتھ چھو لے۔ میری زبان چکھ لے۔ میری ناک سونگھ لے ہاں ایک حس بے نصیب رہ جائے گی یعنی سماع منہ سے بھی کہہ کہ یہ شراب ہے تاکہ کان کو بھی اس کا حصہ مل جائے۔

یہ بھی کہتے ہیں کہ سماع حضوری کا ذریعہ ہے کیونکہ غائب منکر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انکار کرنے والے اس کے اہل نہیں ہوتے۔ مختصر یہ کہ سماع بالواسطہ بھی ہوتا ہے اور بلاواسطہ بھی۔ جو کچھ قاری سے سنا جائے وہ وجہ غیبت ہوتا ہے اور جو باری تعالیٰ سے سنا جائے وہ ذریعۂ حضوری۔ اسی بنا پر کسی بزرگ نے کہا ہے کہ مجھے مخلوقات سے کوئی سروکار نہیں کہ ان کی بات سنوں یا ان کے متعلق کوئی بات کروں بجز کلام اہل حق۔ واللہ اعلم

۳۵

پنتیسواں باب

سماع میں صوفیاء کے مقامات

معلوم ہونا چاہیئے کہ صوفیوں کے لیے درجہ بدرجہ سماع کے مقام ہیں جن کے مطابق وہ سماع سے مستفید ہوتے ہیں۔ چنانچہ طالب کے لیے سماع ندامت حاصل کرنے کے لیے مدد دیتا ہے۔ اہل شوق کے لیے شوقِ دیدار کا سبب بنتا ہے۔ اہل یقین کے لیے یقین کی تائید کرتا ہے۔ مرید کے لیے تحقیقِ بیان، محبّ کے لیے تعلقات سے بیزاری اور فقیر کے لیے کلّی نومیدی کا باعث ہوتا ہے۔ دراصل سماع آفتاب کی مانند ہے کہ وہ تمام چیزوں پر چمکتا ہے مگر ہر چیز کو اپنے ظرف کے مطابق حرارت، ذوق اور مشرب حاصل ہوتا ہے۔ ایک چیز جل جاتی ہے۔ دوسری روشن ہو جاتی ہے کوئی تپش سے پگھل جاتی ہے کسی پر صرف نوازش کرم ہوتی ہے۔ از روئے تحقیق اہل سماع کو تین درجوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ایک مبتدی دوسری متوسط اور تیسرے کامل۔ میں اب ہر ایک کے بارے میں شرح حال کے لیے ایک فصل تحریر کرتا ہوں۔ تاکہ بات قاری کے فہم کے قریب تر ہو جائے۔

ص ۴۶۴ / ۵۶۲

فصل

جاننا چاہیئے کہ سماع فیض حق ہے اور انسانی نفس کو ہزل اور لہو سے پاک کرتا ہے۔ مبتدی کی طبیعت کسی عالم میں بھی فیضانِ حق کے قابل نہیں ہوتی وردِ فیض سے طبیعت میں سوز و گداز اور اضطراب پیدا ہوتا ہے۔ کچھ لوگ بے ہوش ہو جاتے ہیں کچھ ہلاک ہو جاتے ہیں اور کوئی بھی ایسا نہیں ہوتا جو کم و بیش حدِ اعتدال سے نہ گزر جائے۔ یہ چیز عین مشاہدہ ہے۔ مشہور ہے کہ روم کے کسی شفاخانہ میں لوگوں نے ایک عجیب چیز ایجاد کی تھی وہ اسے انگلیون کہتے ہیں بلکہ یونانی ہر عجیب چیز کو اسی کے نام سے پکارتے ہیں، یہ ایک قسم کا اک تارہ سا ہوتا ہے۔ ہفتے میں دو مرتبہ مریضوں کو اس کے پاس لے جا کر بجانا شروع کر دیتے ہیں اور بیماری کے مطابق اس کی آواز کان میں پہنچاتے ہیں اور جب کسی کو ہلاک

کرنا مقصود ہو تو زیادہ دیر تک سناتے ہیں یہاں تک کہ وہ ہلاک ہو جائے۔ موت کا وقت مقرر ہے مگر بہر حال اس کا کوئی
سبب ہوتا ہے طبیب لوگ اسے ہمیشہ سنتے ہیں اور ان پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا کیونکہ وہ ان کی طبیعت کے موافق نہیں
ہوتا۔ اسی طرح سماع بھی مبتدیوں کی طبیعت کو موافق نہیں آتا۔ میں نے ہندوستان میں دیکھا کہ زہر قاتل میں ایک کیڑا
پیدا ہوتا ہے۔ اس کی زندگی وہی زہر ہوتا ہے کیونکہ اس کی اصلیت ہی زہر ہے۔ اور ترکستان میں میں نے اسلام کی سرحد
پر ایک شہر میں دیکھا۔ ایک پہاڑ میں آگ لگ گئی وہ جل رہا تھا اور اس کے پتھروں سے نوشادر اُبل رہا تھا۔ اس میں
ایک چوہا تھا جب وہ آگ سے باہر نکلا تو مر گیا۔ مطلب یہ ہے کہ مبتدی لوگوں کا اضطراب درد و فیضان کے عالم میں اس
وجہ سے ہوتا ہے کہ ان کی جسمانی ترکیب بالکل مختلف ہوتی ہے جب یہ بار بار ہو تو مبتدی کو سکون مل جاتا ہے چنانچہ
جب حضرت جبرائیل علیہ السلام حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس وحی لے کر آئے تو حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو
تاب دیدار نہ ہوتی جب آپ کامل ہو گئے تو اگر ایک ساعت بھی حضرت جبریل علیہ السلام نہ آتے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ
وسلم بے چین ہو جاتے۔ اس کے بے شمار شواہد ہیں جو سماع میں مبتدیوں کے اضطراب اور منتہی لوگوں کے سکون کی دلیل ہے۔

حضرت جنید رحؒ کا ایک مرید سماع میں بہت مضطرب رہتا تھا۔ اور دوسرے درویشوں کو اسے سہارا دینا پڑتا تھا۔ دوسرے
درویشوں نے حضرت جنید رحؒ کے پاس شکایت کی تو حضرت جنید رحؒ نے کہا کہ اگر اس کے بعد سماع میں اضطراب کا مرتکب ہوا
تو اسے ہم نشینی سے خارج کر دیا جائے گا۔ ابو محمد جریری رحؒ فرماتے ہیں کہ میں نے سماع میں ایک شخص کو دیکھا کہ اس کے لب
بند تھے اور اس کے جسم کے ہر بال سے چشمہ ابل رہا تھا۔ دوسرے دن دیکھا تو اسی طرح بے ہوش تھا جب بھی میں اُسے
دیکھتا تو وہ لب بند کیے خاموش بیٹھا ہوتا لیکن اس کے جسم کے ہر بال سے چشمہ اُبل رہا ہوتا یہاں تک کہ اس کے ہوش و حواس
جاتے رہے۔ یہ مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ یہ سماع کا اثر تھا یا اپنے پیر کی توقیر اس کے دل میں غالب تھی۔

ص ۴۶۶ / ۵۶۴

کہتے ہیں کہ ایک شخص نے سماع کا نعرہ لگایا پیر نے خاموش رہنے کا حکم دیا وہ سر بزانو ہو گیا جب غور سے دیکھا گیا
تو وہ مرا ہوا تھا۔ میں نے شیخ ابو مسلم سے سنا کہ ایک درویش سماع میں بہت مضطرب ہوتا تھا کسی شخص نے اس کے سر پر
ہاتھ رکھ کر کہا کہ بیٹھ جاؤ وہ بیٹھتے ہی مر گیا۔

جنید رحؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک درویش کو دیکھا کہ وہ سماع میں جان بحق ہو گیا۔ دُراج سے روایت ہے کہ وہ ابن القرطی
کے ساتھ دجلہ کے کنارے کنارے بصرہ اور اُبلہ کے درمیان جا رہے تھے۔ کسی جگہ ایک محل کی چھت پر کوئی شخص

بیٹھا تھا اور ایک لونڈی اس کے سامنے گا رہی تھی اور یہ شعر پڑھ رہی تھی:

فی سبیل اللہ ودّ　　کان منی لک ابذل

کل یوم تتلوّن　　غیر ھذا بک اجمل

ترجمہ: میں تجھے فی سبیل اللہ محبت کرتا تھا تیرا ہر روز نیا روپ کیا بھلا معلوم ہوتا تھا۔

ایک جوان محل کے نیچے گدڑی پہنے ہوئے لوٹا لیے کھڑا تھا۔ اس نے کہا اے کنیز خدا کے لیے یہ بیت دوبارہ گا میری زندگی ایک سانس کے برابر باقی ہے۔ شاید بیت سننے سے ختم ہو جائے لونڈی نے شعر دوبارہ پڑھا۔ جوان نے ایک نعرہ مارا اور جان بحق ہو گیا۔ مالک نے لونڈی کو کہا کہ تو آزاد ہے۔ آپ نیچے اترا اور اس جوان کے کفن و دفن میں مصروف ہو گیا اور تمام اہل بصرہ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی۔ اس کے بعد اس شخص نے اعلان کیا کہ میں فلاں خاندان کا فرد ہوں اپنی تمام ملکیت اللہ کی راہ میں وقف کرتا ہوں اور اپنے تمام غلاموں کو آزاد کرتا ہوں۔ اس کے بعد وہ وہاں سے چلا گیا اور اس کے متعلق کسی کو کوئی خبر نہ مل سکی۔ مطلب یہ ہے کہ سماع کے عالم میں غلبۂ حال ایسا ہونا چاہیئے۔ جو بدکاروں کو بدکاری سے نجات دے اس زمانے میں تو ایسے گمراہ موجود ہیں جو بدکاروں کے سماع میں شامل ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم راہِ حق میں سماع کرتے ہیں۔ فاسق اور فاجر لوگ ان کے ہم خیال ہو کر زیادہ فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور یہی ان کی ہلاکت کا باعث بن جاتا ہے۔ حضرت جنیدؒ سے پوچھا گیا کہ اگر حصولِ عبرت کے لیے گرجا میں چلے جائیں اور مراد صرف اہلِ شرک کی ذلت کو دیکھنا ہو اور اسلام کی نعمت پر شکر ادا کرنا ہو۔ تو کیا یہ جائز ہے۔ آپ نے فرمایا اگر تم گرجے میں جا کر کچھ لوگوں کو اپنے ساتھ بارگاہِ حق میں لا سکتے ہو تو کوئی حرج نہیں ورنہ جانا جائز نہیں۔

ص ۴۶۶/۵۶۵

مختصر یہ کہ اگر مرد عبادت خانے سے خرابات میں چلا جائے تو خرابات بھی اس کے لیے عبادت خانہ ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی خرابات سے نکل کر صومعہ میں آ جائے تو صومعہ بھی اس کے لیے خرابات بن جاتا ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں بغداد میں ایک درویش کے ساتھ جا رہا تھا ہم نے ایک مغنی کو یہ گاتے ہوئے سنا ؎

مُنی ان تکن حقا تکن احسن المنی　　والا فقد عشنا بھا زمنا رغدا

ترجمہ: "آرزو اگر حق ہے تو خوب ہے ورنہ آرزو میں ہم نے ایک زمانہ بسر کیا جو گزر گیا۔"

درویش نے ایک نعرہ مارا اور جان بحق ہو گیا۔ اسی طرح ابو علی رودباریؒ فرماتے ہیں۔ میں نے ایک درویش کو دیکھا۔

جو ایک گانے والی کی آواز میں محو تھا۔ میں نے بھی سنا تو وہ ایک سوز و گداز سے لبریز آواز میں گا رہا تھا ؎

اَمُدُّ کفی بالخضوع　　　الی الذی جاد بالصنیع

ترجمہ: "میں اس کی طرف عاجزی سے اپنا ہاتھ بڑھاتا ہوں جو مجھ پر احسان کرنا چاہے۔"

ص ۲۶۷/۵۶۶

اس درویش نے ایک نعرہ مارا اور گر گیا جب میں اُس کی طرف بڑھا تو وہ مر گیا تھا۔ ایک شخص کہتا ہے کہ میں ابراہیم خواص کے ساتھ جا رہا تھا۔ ایک وادی میں میرے دل میں موج طرب اٹھی اور میں نے پڑھا ؎

صحّ عند الناس انی عاشق　　　غیر ان لم یعرفوا عشقی لمن

مالیس فی الانسان شئ حسن　　　الا واحسن منہ صوت حسن

ترجمہ: "یہ تو معلوم ہے کہ میں عاشق ہوں مگر لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ میں کس پر عاشق ہوں۔ انسان میں حسین آواز سے زیادہ کوئی چیز حسین نہیں۔"

حضرت ابراہیم نے کہا کہ یہ شعر پھر پڑھو۔ میں نے پھر پڑھا تو آپ نے وجدانی کیفیت میں پتھر پر پاؤں مارے میں نے دیکھا کہ قدم اس طرح گڑ گئے جیسے موم ہیں۔ آپ بے ہوش ہو گئے جب ہوش آیا تو کہا کہ میں ابھی باغ بہشت میں تھا مگر تو نہیں دیکھ سکتا۔ ایسی اور بہت سی حکائتیں ہیں جن کی یہ کتاب متحمل نہیں ہو سکتی۔ میں نے خود دیکھا کہ ایک درویش آذربائی جان کی پہاڑیوں میں چلا جا رہا تھا اور یہ اشعار پڑھ رہا تھا ؎

واللہ ما طلعت شمس ولا غربت　　　الّا وانت منی قلبی و وسواس

ولا جلست الی قوم احدثہم　　　الا وانت حدیثی بین جلّاس

لما ذکرتک محزوناً ولا طربا　　　الا وحبّک مقرون بانفاس

ولا ھممت بشرب الماء من عطش　　　الا رأیت خیالا منک فی الکاس

فلو قدرت علی الاتیان زرتکم

حبواً علی الوجہ و مشیاً علی الراس

ترجمہ: "بخدا کوئی صبح اور کوئی شام نہیں ہوتی جب تو میرے دل اور میرے خیالوں میں نہ ہو۔ میں کسی کے پاس گفتگو کرنے کو نہیں بیٹھتا جب تک میرے ہم نشینوں میں تیرا ذکر نہ ہو۔ میں نے تیرا ذکر رنج و خوشی کے عالم میں نہیں کیا۔

مگر اس وقت جب تیری محبت میری سانس میں ملی ہوئی ہو۔ میں نے پیاس میں کبھی پانی نہیں پیا جب تک تیرا خیال پیالے میں نہ ہو۔ اگر مجھے طاقت ہوتی تو میں منہ کے بل گھسٹتے ہوئے اور سر کے بل تیرے دیدار کو آتا۔"

اس کے بعد اس کی حالت متغیر ہوگئی۔ تھوڑی دیر بیٹھا اور پھر پتھر سے پیٹھ لگا کر جان بحق ہوگیا۔ اللہ اس پر رحمت کرے۔

فصل

مشائخ کبار کا ایک گروہ قصائد اور قرآن کو ایسے الحان کے ساتھ پڑھنے کو کہ اس کے حروف اپنے مخرج سے خارج ہوجائے قابل اکراہ سمجھتا ہے۔ اپنے مریدوں کو پرہیز کا حکم دیا ہے خود پرہیز کیا ہے اور پرہیز میں مبالغہ کیا ہے ان لوگوں کی کئی جماعتیں ہیں اور ہر جماعت اپنے اپنے خیال کے مطابق اسے مکروہ سمجھتی ہے۔ ایک گروہ تو وہ ہے جو روایات کی بنا پر اور سلف کی متابعت کے طور پر حرام سمجھتا ہے۔ چنانچہ نبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حسان بن ثابت رضؓ کی کنیز کو گانے پر تنبیہ کی۔ حضرت عمر رضؓ نے ایک صحابی کو درّے لگائے کیونکہ وہ گاتا تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا اعتراض امیر معاویہ رضؓ پر اس وجہ سے تھا کیونکہ اس نے گانے والی لونڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ آپ نے اپنے صاحبزادے حسن رضؓ کو اس حبشی عورت کو دیکھنے سے منع کیا جو گا رہی تھی اور آپ نے فرمایا کہ وہ شیطان کی رفیقہ ہے۔ اسی طرح اور بھی بہت ساری چیزیں ہیں جو اشعار و قصائد کے گانے کی تحریم پر دلالت کرتی ہیں اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ گانے کو مکروہ سمجھنے کے لیے سب سے بڑی دلیل اجماع امت ہے ایک گروہ نے تو اس کو مطلق حرام کہا ہے۔ اسی بارے میں ابوالحارث رحؒ سے روایت ہے کہ وہ سماع کے متعلق بہت زور دیا کرتے تھے۔ ایک رات کوئی شخص ان کے عبادت خانے پر آیا اور کہا کہ اللہ والوں کی ایک جماعت جمع ہے اور وہ شیخ کے دیدار کے مشتاق ہیں اگر تشریف لائیں تو کرم ہوگا۔ شیخ نے کہا میں آ رہا ہوں اور باہر نکل کر اس کے پیچھے ہولیے تھوڑی دور جا کر کچھ لوگ ملے جو حلقہ باندھے ہوئے تھے اور ایک بوڑھا آدمی ان کے درمیان تھا۔ انہوں نے بے حد تعظیم کی اور بوڑھے نے کہا اگر اجازت ہو تو کچھ شعر سناؤں شیخ نے یہ بات مان لی اور وہ لوگ نہایت خوش الحانی میں اشعار پڑھنے لگے ایسے اشعار جو شعراء فراق و ہجر میں لکھا کرتے تھے۔ سب لوگ وجد کی حالت میں کھڑے ہوگئے۔ نعرہ مارنے لگے اور اشارے کرنے لگے۔ ابوالحارث رحؒ کو ان کے حال پر بہت تعجب ہوا اگر یہ مجلس نشاط گرم رہی یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ اس وقت اس بوڑھے نے کہا اے شیخ آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ میں کون ہوں اور یہ گروہ کن لوگوں کا ہے۔ شیخ

ص ۴۶۸/۵۶۷

ص ۴۶۹/۵۶۸

اس طرح بیٹھنے اور گانے میں مجھے دو فائدے ہیں۔ ایک تو میں اپنے فراق کی مصیبت میں روتا ہوں اور اپنی عزت و توقیر کے دنوں کو یاد کرتا ہوں۔ دوسرے یہ کہ عابد لوگوں کو راہِ حق سے دور کرتا ہوں اور غلط راستے پر ڈالتا ہوں۔ ابو الحارثؒ فرماتے ہیں کہ سماع کا شوق اسی وقت میرے دل سے ختم ہو گیا۔

میں (علی بن عثمان الجلابیؒ) نے شیخ ابو العباس الاشقانیؒ سے سنا آپ نے فرمایا کہ میں ایک دن ایک مجمع میں تھا کچھ لوگ سماع کر رہے تھے میں نے دیکھا کہ کچھ جنّ برہنہ ناچ رہے ہیں۔ سب لوگ ان کی طرف دیکھ رہے تھے اور جوش کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

ایک اور جماعت سماع کی اس وجہ سے قائل نہیں مبادا ان کے مرید مصیبت اور بیکاری میں مبتلا ہو جائیں ان کی تقلید سے روگردان ہوں توبہ کا خیال چھوڑ دیں گناہوں میں مشغول ہو جائیں۔ خواہشات نفسانی ان کے ارادوں کو توڑ دے یہ لوگ سماع کے قائل نہیں نہ اہل سماع میں بیٹھتے ہیں۔ حضرت جنیدؒ سے روایت ہے کہ آپ نے ایک مرید کو اس کی توبہ کی ابتدا میں فرمایا۔ اگر سلامتی چاہتے ہو تو توبہ کی پاس داری کرو اور سماع سے جو صوفی لوگ کرتے ہیں نفرت کرو اور اپنے آپ کو تا حین شباب اس کا اہل نہ سمجھو۔ بڑھاپے میں اپنی وجہ سے لوگوں کو گنہگار نہ کرو۔

ص ۴۷۰/۵۶۹

ایک اور جماعت کے خیال میں سماع کرنے والوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک لہو و لعب کرنے والے اور دوسرے اللہ سے تعلق رکھنے والے پہلی قسم کے لوگ یعنی لاہی مکمل فتنہ ہوتے ہیں اور خوف میں مبتلا رہتے ہیں۔ اللہ سے تعلق رکھنے والے یعنی الٰہی اپنے مجاہدہ اپنی ریاضت اور قطع تعلقات کی بنا پر فتنوں سے بچے رہتے ہیں انہیں کوئی خوف نہیں ہوتا۔ ہم الٰہی ہیں لاہی نہیں۔ لہٰذا سماع کا ترک ہمارے لیے بہتر ہے اور ہم اسی چیز میں مشغول رہنا چاہتے ہیں جو ہمارے وقت کے موافق ہو۔ ایک دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ جب عام لوگوں کے لیے سماع میں فتنہ ہے اور ہمارے سماع کی وجہ سے لوگ بے دین اور محجوب ہوتے ہیں تو ہم عوام الناس کو نصیحت کرتے ہیں اور از راہِ غیرت خود کنارہ کرتے ہیں یہ طریق بھی بہت خوب ہے۔ ایک اور جماعت نے کہا کہ پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: من حسن اسلام المرء ترك ما لا يعنيه "آدمی کا اچھا اسلام یہ ہے کہ وہ ان باتوں کو چھوڑ دے جن کی اس کو ضرورت نہیں یعنی اس چیز سے روکش ہو جائے جس سے روکش ہونا لازم ہے کیونکہ غیر ضروری اور بے سود باتوں میں مشغول ہونا وقت کو ضائع کرنا ہے۔ اپنے احباب کا قیمتی وقت ان کے ساتھ مل کر برباد نہ کرو کچھ خاص صوفیاء نے کہا ہے کہ سماع کی حیثیت خبر کی ہے اور اس کی لذت حصول مراد یہ بچوں کا کھیل ہے۔ مشاہدہ میں خبر کی کوئی قیمت نہیں ہوتی صرف مشاہدہ سے کام رکھنا چاہیئے یہ مشاہدہ سے متعلق احکام ہیں جو مختصراً بیان کر دیئے ہیں اب صوفیوں کے وجد، وجود اور تواجد سے متعلق کچھ بیان ہوگا۔ توفیق اللہ کی طرف سے ہے۔

۳۶

چھتیسواں باب

وجد، وجود، تواجد

ص ۴۶۲ / ۵۶۰

وجد اور وجود مصدر ہیں ایک کا مطلب غم اور دوسرے کا پا لینا۔ فاعل دونوں کا ایک ہوتا ہے اور بصورت مصدر ان میں فرق نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے "وجد یجد وجوداً و وجداناً جب پا لیا" تو "وجد یجد وجداً" جب مغموم ہوا تو پھر وہی "وجد یجد جدۃً" جب امیر ہو گیا "وجد یجد موجودۃً" جب غصہ میں آ گیا۔ ان میں فرق مصادر کی وجہ سے ہے افعال کی وجہ سے نہیں۔ صوفیا کے نزدیک وجد اور وجود سے دو حالتوں کا اثبات ہے جو سماع میں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ ایک حال غم سے قریب ہوتا ہے اور دوسرا تحصیل غم کے قریب۔ غم کی حقیقت محبوب سے دوری اور مراد کا گم ہو جانا اور حصول مراد کا حاصل کرنا ہے۔ حزن اور وجد میں فرق یہ ہے کہ حزن اس غم کو کہتے ہیں جو اپنے مقدر کا ہو اور وجد اس غم کو جو غیر کی جانب سے محبت کے طور پر ملے۔ یہ تغیر سب طالب سے نسبت رکھتے ہیں، باری تعالیٰ کی ذات اقدس ہر تغیر سے بالاتر ہے۔ وجد کی کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی کیونکہ وہ بظاہر غم ہوتا ہے اور غم کو قلم بیان نہیں کر سکتا۔ الغرض وجد طالب اور مطلوب کے درمیان ایک راز ہے جسے بیان کرنا مکاشفہ میں غیبت کے برابر ہے کیفیت وجود کی طرف اشارہ یا اس کی نشان دہی درست نہیں کیونکہ یہ مشاہدہ میں طرب کے برابر ہے اور طرب کو طلب کے ذریعے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ وجود محبوب کی طرف سے محب کے حق میں ایک فیض ہے جسے اشارتاً بتانا ناممکن ہے میرے نزدیک وجد کی ایک غمناک کیفیت ہے جو فرحت یا سنجیدگی سے یا غم سے یا خوشی سے رونما ہوتی ہے۔ اور وجود دل سے غم کا دفع ہونا اور مقصود کا پا لینا ہے۔ اہل وجد یا تو غلبہ شوق سے مضطرب ہوتا ہے یا مشاہدہ سے سکون حاصل کر کے کیفیت کشف حاصل کرتا ہے یعنی یا تو رنج یا نالہ و گریہ سے مضطرب ہوتا ہے یا خوشی اور سرور سے سکون پذیر ہوتا ہے۔ صوفیائے کرام میں اس بات پر اختلاف ہے کہ وجد کامل تر ہے یا وجود۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ وجود مریدوں کی اور

وجد عارفوں کی صفت ہے۔ چونکہ عارفوں کا مقام مریدوں سے بلند تر ہوتا ہے اس لیے عارفوں کی صفت بھی مریدوں سے بلند تر اور کامل تر ہوتی ہے جو چیز معرضِ حصول میں آسکتی ہے وہ دائرہ ادراک میں آسکتی ہے اور جنسی صفت سے موصوف ہوتی ہے۔ ادراک موجود ہوتا ہے اور خدا کی ذات کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ الغرض جو کچھ طالب نے پالیا وہ بجز تشرب کچھ بھی نہیں جو کچھ نہیں پایا طالب کو اس سے کچھ تعلق نہیں وہ اس کی طلب سے عاجز ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ وجد مریدوں کا سوز ہے اور وجود محبوں کا تحفہ۔ محبوں کا مقام مریدوں سے بالاتر ہے اس لیے تحفے کا سکون سوز سے کامل تر ہے۔ اسے ایک حکایت سے واضح کیا جا سکتا ہے حکایت یہ ہے کہ ایک دن حضرت شبلیؒ اپنے حال کے جوش میں حضرت جنیدؒ کی خدمت میں آئے آپ کو غمگین دیکھ کر پوچھا اے شیخ کیا بات ہے۔ حضرت جنیدؒ نے فرمایا "جس نے طلب کیا وہ مغموم ہوا" حضرت شبلیؒ نے فرمایا نہیں بلکہ "جو مغموم ہوا اس نے طلب کیا"۔ مشائخ نے اس سے متعلق بہت کچھ کہا ہے۔ جنیدؒ کا اشارہ وجد کی طرف تھا اور شبلیؒ کا وجود کی طرف۔ میرے نزدیک حضرت جنیدؒ کا قول زیادہ ثقہ تھا۔ کیونکہ جب انسان سمجھ لیتا ہے کہ خالق اس کی جنس سے نہیں ہے تو اس کا غم والم اور دراز ہو جاتا ہے۔ اس موضوع پر اس کتاب میں اور جگہ ذکر ہو چکا ہے۔ مشائخ کا اتفاق ہے کہ علم کا غلبہ وجد کے غلبہ سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے کیونکہ وجد کے عالم میں واجد خطرہ میں ہوتا ہے مگر علم کی قوت ہو تو عالم امن کے مقام پر ہوتا ہے ان سب چیزوں سے مراد یہ ہے کہ تمام حالات میں طالب کو علم اور شریعت کا تابع ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اگر وہ وجد سے مغلوب ہو جائے گا۔ تو وہ قابل خطاب نہیں رہے گا اور جب وہ قابل خطاب نہیں رہے گا تو عذاب وثواب سے بھی آزاد ہو گا۔ اس عالم میں اس کی شکل ایک دیوانہ سی ہو جائے گی اور اولیاء اللہ اور مقربین سے اُسے کوئی تعلق نہیں ہو گا جب علم کا غلبہ ہو تو بندہ اللہ کے اوامر اور نواھی کی پناہ میں ہوتا ہے اور عزت وعظمت سے بہرہ ور۔ جب حال کی قوت علم پہ غالب ہو تو بندہ حدود خداوندی سے خارج ہو کر رہ جاتا ہے اور قابلِ خطاب نہیں رہتا یا مغرور ہوتا ہے یا معذور اور بالکل یہی چیز حضرت جنیدؒ کے اس قول میں ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ راستے دو ہیں یا علم وعمل یا ایسی روش جو بغیر علم کے ہو۔ علم بے عمل بھی ہو تو عزت وشرف ہوتا ہے اور عمل نیک بھی ہو تو جہالت کی وجہ سے ناقص ہوتا ہے۔ اسی بنار پر حضرت بایزیدؒ نے فرمایا "اہل ہمت کا کفر اہل آرزو کے اسلام سے بلند تر ہے"۔ یعنی اہل ہمت کے لیے کفران اور ناشکری ممکن نہیں۔

ص ۴۷۳/۵۷۲

حضرت جنیدؒ نے حضرت شبلیؒ کی نسبت فرمایا۔ "شبلیؒ مست ہیں اگر ہوش میں آجائیں تو ایک ایسا امام بن جائیں جن سے فایدہ اٹھایا جا سکتا ہے"۔

ص ۴۷۴/۵۷۳

حکایت ہے کہ حضرت جنیدؒ، محمد بن مسروقؒ اور ابو العباس بن عطاؒ ایک جگہ جمع تھے۔ قوال ایک شعر پڑھ رہا تھا اور تمام افراد سرگرم تواجد تھے حضرت جنیدؒ بالکل ساکن بیٹھے تھے پوچھا اے شیخ تیرے نصیب میں سماع میں سے کچھ نہیں انہوں نے یہ آیت پڑھی تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ "تو پہاڑوں کو دیکھے گا تو خیال کرے گا کہ وہ منجمد ہیں۔ حالانکہ وہ بادلوں کی طرح تیزی سے چل رہے ہیں۔"

تواجد وجد لانے میں ایک تکلف ہوتا ہے اور یہ انعامات وشواہدِ حق کو دل کے حضور پیش کرتا ہے اور وصل کا خیال اور انسانی آرزوؤں کا موج زن ہونا ہے۔ ایک گروہ اس معاملے میں پابندِ رسوم ہے وہ صوفیار کی ظاہری حرکات اور ان کے رقص کی ترتیب اور ان کے اشارات کی تقلید کرتے ہیں اور یہ حرام محض ہے۔ ایک اہل حقیقت کا گروہ ہے کہ وہ ان حرکات اور رسوم سے صوفیار کے احوال اور ان کے مقام کی طلب کرتے ہیں۔

حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جو کسی قوم سے مشابہت پیدا کرتا ہے وہ اسی میں سے ہوتا ہے" نیز حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جب تم قرآن پڑھو تو روؤ اگر خود بخود رونا نہ آئے تو تکلف سے روؤ" اور یہ حدیث تواجد کے مباح ہونے پر گواہ ہے۔ اسی بنار پر کسی بزرگ نے کہا ہے کہ ہزار میل جھوٹ کے ساتھ چلو تو ایک قدم صداقت کا آتا ہے۔ اس معاملہ میں بہت کچھ مواد ہے۔ لیکن میں اسی پر اکتفا کرتا ہوں اور توفیق اللہ کے قبضے میں ہے ؛

۳۷

سینتیسواں باب

رقص اور اس سے متعلق امور

شریعت اور طریقت میں رقص کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ وہ دانشمندوں کے نزدیک باتفاق رائے جب اچھی طرح بھی کیا جائے تو کھیل تماشہ ہوتا ہے اور جب بے ہودہ طور پر کیا جائے تو بجز لغویت کچھ بھی نہیں۔ مشائخ کرام میں سے کسی بھی بزرگ نے بھی رقص کو قابلِ تعریف نہیں سمجھا اور کسی طرح کا مبالغہ نہیں کیا اور جو دلائل اہل حشو معرض بیان میں لاتے ہیں وہ بالکل باطل ہیں۔ اور چونکہ اہل وجد کی حرکات اور ان کا عمل برابر ہوتے ہیں۔ اس لیے اکثر بے ہودہ لوگ اس رقص کی تقلید کرتے ہیں۔ اور مبالغہ کی حد تک پہنچ جاتے ہیں اور رقص کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں۔ میں نے ایک جماعت کو دیکھا جن کے نزدیک تصوّف بجز رقص کچھ بھی نہیں وہ اسی پر کاربند ہو گئے۔ ایک اور گروہ اس کی حقیقت سے منکر ہے الغرض ناچنا اور رقص کرنا شرعاً اور عقلاً قابلِ مذمّت ہے۔ اور یہ ناممکن ہے کہ لوگوں پر افضلیت کے دعوٰی دار ایسی حرکات کے مرتکب ہوں۔ جب سبک سری کا غلبہ ہوتا ہے۔ تو ایک قسم کا خفقان رونما ہوتا ہے اور پابندیٔ رسوم اٹھ جاتی ہے۔ وہ اضطرابی کیفیت وہ رقص اور وہ ناچنا کسی صورت میں بھی طبع پر در نہیں ہوتا۔ درحقیقت وہ صرف جانگدازی ہے اور جو اُسے رقص کہتا ہے وہ حقیقت سے بہت دور ہے۔ اور یہ ایک ایسی کیفیت ہے جسے زبان سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جس نے چکھا نہیں وہ سمجھ نہیں سکتا۔

ص ۴۷۶/۵۷۴

نوجوانوں کی طرف دیکھنا

نوجوانوں کو دیکھنا اور ان کے ساتھ مجالست کرنا منع ہے اور اس کو جائز سمجھنے والا کافر ہے۔ اور جو کچھ اس بارے میں بطور دلائل لایا جائے اس کی بنیاد باطل جہالت پر ہے۔ میں نے جہلا کی ایک جماعت کو دیکھا جو اسی تہمت کی بنا پر اہل طریقت سے روگرداں ہو گئی۔ اس نے اپنا ایک نیا مذہب بنا لیا۔ مشائخ کرام ان سب باتوں کو آفت سمجھتے ہیں۔ یہ حلولی لوگوں کا مذہب ہے اللہ تعالیٰ ان پر رحمت کرے۔ اللہ بہتر جاننے والا ہے ؛

ص ۴۷۷/۵۷۵

۳۸

اڑتیسواں باب

جامہ دری

معلوم ہونا چاہیئے کہ کپڑوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا صوفیار کی عادت ہے اور بڑی بڑی مجلسوں میں جہاں بزرگ مشائخ تشریف فرما ہوں یہ لوگ بھی پہنچ جاتے ہیں۔ میں نے علمار کے گروہ کو دیکھا جو اس کے قطعاً منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ درست کپڑے کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا جائز نہیں۔ یہ فساد ہے اور ناممکن ہے کہ فساد سے درستی حاصل ہو۔ بلاوجہ کیوں لوگ اپنے درست کپڑوں کو پھاڑیں اور پھر ان کو سی کر خرقے بنالیں۔ کرتے کی آستین، آگا پیچھا، تریز اور جیب پھاڑ کر علیحدہ علیحدہ کرلیں اور پھر ان کو درست کریں۔ اگر ایک شخص کپڑے کے سو ٹکڑے کر کے جوڑتا ہے اور دوسرا پانچ ٹکڑے کر کے جوڑتا ہے تو دونوں میں کوئی فرق نہیں کیونکہ ہر ٹکڑے میں مومن کے دل کی راحت کا ساماں ہوتا ہے جو ایک ٹکڑے کو دوسرے ٹکڑے کے ساتھ جوڑنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اگرچہ جامہ دری کے لیے تصوّف میں کوئی جواز موجود نہیں۔ سماع کے وقت صحت حال کی صورت میں جامہ دری نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ وہ صرف بے جا کے برابر ہوگی لیکن اگر سننے والا مغلوب ہوجائے وہ قابلِ خطاب نہ رہے اور بے خبر ہوجائے تو اسے معذور سمجھنا چاہیئے۔ جب کسی پر ایسی حالت طاری ہوجائے اور کوئی جماعت اس کی موافقت میں جامہ دری کرے تو وہ جائز ہے۔ اہل طریقت کے خرقے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جس کو سماع کے دوران میں درویش خود پھاڑے دوسرے وہ کہ کچھ لوگ اپنے پیر اور مقتدا کے حکم سے کسی کے کپڑے پھاڑیں کسی جرم سے استغفار کی حالت میں یا وجد میں بے خودی کے عالم میں۔ ان سب خرقوں میں مشکل ترین خرقہ سماعی ہوتا ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک مجروح اور دوسرے درست۔ جامۂ مجروح کے لیے دو چیزیں شرط ہیں یا تو اسے سی کر واپس کیا جائے یا کسی اور درویش کی نذر کردیا جائے، یا تبرکاً ٹکڑے ٹکڑے کرکے بانٹ دیا جائے۔ اگر درست ہو تو یہ دیکھنا پڑے گا کہ سماع کرنے والے درویش کی مراد کیا تھی اگر اس کی مراد قوال کو دینا ہے تو اُس کو ملے اگر مراد جماعت کو دینا ہے تو اس کو ملے اگر بغیر کسی مقصد کے گرا ہے تو یہ فیصلہ پیر پر موقوف ہے کہ وہ کیا حکم دیتا ہے۔ جماعت کو دیا جائے، ٹکڑے ٹکڑے کردیا جائے یا قوّال کو دیا جائے۔ اگر قوّال کو دینا مقصود ہے تو باقیوں کی موافقت کی شرط نہیں کیونکہ

ص ۴۷۹ / ۵۷۶

خرقہ اس کے اہل کی طرف نہیں جا رہا۔ درویش نے اختیار سے یا مجبوری سے دیا ہے اور دوسروں کی موافقت ضروری نہیں۔ اگر جماعت کو دینے کی غرض ہو تو باقی رفقار کی موافقت ضروری ہے۔ پیر کو نہیں چاہیئے کہ درویشوں کا کپڑا قوالوں کو دے دے۔ لیکن یہ روا ہے کہ کوئی دوست خرقہ میں سے کوئی چیز اُس قوال کو دے دے اور باقی کپڑا اُس درویش کو واپس کر دے، یا سب ٹکڑے ٹکڑے کر کے تقسیم کر دے۔ اگر خرقہ غلبہ کی حالت میں پھینکا ہے تو اس میں مشائخ کا اختلاف ہے۔ اکثر کہتے ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث کے مطابق قوال کو ملنا چاہیئے:

"جس مسلمان سپاہی نے جنگ میں کافر کو قتل کیا تو مقتول کا سامان قاتل سپاہی کو ملے گا۔"

اگر خرقہ قوال کو نہ دیا جائے تو طریقت کی شرط ٹوٹ جائے گی۔ ایک گروہ کہتا ہے اور مجھے اس سے اتفاق ہے کہ جس طرح قاتل کے متعلق بعض فقہار کے نزدیک امام کے حکم کے بغیر مقتول کا کپڑا قاتل کو نہیں دیتے۔ اسی طرح یہاں بھی پیر کے حکم کے بغیر کپڑا قوال کو نہیں دینا چاہیئے۔ اگر پیر کسی کو بھی نہ دینا چاہے تو یہ قابل اعتراض نہیں۔

۳۹
انتالیسواں باب

آدابِ سماع

سماع کی چند شرائط ہیں جب تک ضرورت نہ ہو نہ کیا جائے اور اس کو عادت میں شامل نہ کر لیا جائے۔ سماع دیر دیر کے بعد کرنا چاہیئے تاکہ اُس کی عظمت کم نہ ہو جائے۔ سماع کے وقت پیر کا موجود ہونا ضروری ہے۔ سماع کی جگہ عوام سے خالی ہونی چاہیئے۔ قوال بھی شریعت کا احترام کرنے والے ہوں، دل دنیا کے مشاغل سے خالی ہو اور طبیعت لہو اور لعب اور تکلّف سے متنفّر ہو۔ دل میں جب تک سماع کی طاقت نہ ہو اس کا سننا اور اس میں مبالغہ کرنا ضروری نہیں۔ جب قوت رونما ہو تو اُس کو رد نہیں کرنا چاہیئے۔ اسی قوت کی متابعت میں رہنا چاہیئے۔ اگر وہ حرکت کا تقاضا کرے تو حرکت کرنی چاہیئے اور اگر حرکت کا اقتضار نہ کرے تو ساکن رہنا چاہیئے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ حرکت، وجد اور قوت طبع میں فرق

برقرار رکھا جائے۔ سننے والے کو قبولِ حق کے ظرف کے مطابق فیضان ہوتا ہے اور وہ اسی قدر داد دے سکتا ہے جب اس کا غلبہ دل پر طاری ہو تو تکلفاً اس کو دور کرنے کی کوشش نہ کرے جب غلبہ کم ہو رہا ہو تو تکلفاً جذب کرنے کی کوشش نہ کرے اور حرکت کی حالت میں کسی سے سہارے کی توقع نہ رکھے اگر کوئی سہارا دے تو منع نہ کرے۔ سماع میں کسی کو دخل انداز نہیں ہونا چاہیئے اور صاحب وجد کی کیفیت کو شوریدہ نہیں کرنا چاہیئے اور اس کی حالت میں تصرف جائز نہیں رکھنا چاہیئے صاحب وجد کی نیت کو نہیں تولنا چاہیئے کیونکہ اس میں آزمانے والے کے لیے بہت پراگندگی اور بے برکتی ہے اگر قوال اچھا گا رہا ہے تو اسے یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ تو اچھا گا رہا ہے۔ اگر وہ بُرا گا رہا ہے یا ناموزوں شعر سنا رہا ہے تو طبیعت کو پراگندہ نہیں کرنا چاہیئے۔ اور اُسے نہیں کہنا چاہیئے کہ اس سے بہتر گا۔ طبیعت میں اُس کی نسبت خصومت نہیں پیدا ہونی چاہیئے اس کو درمیان میں ص ۴۸۰/۵۷۸ نہیں رکھنا چاہیئے بلکہ بہ حوالہ حق چھوڑ دینا چاہیئے اور اچھی طرح سے سننا چاہیئے۔ اگر ایک جماعت پر سماع طاری ہو جائے اور کسی ایک کو اس سے کچھ حصہ نہ ملے تو محروم رہنے والے کے لیے جائز نہیں کہ وہ دوسروں کی کیفیت سکر کو اپنے صحو کے انداز سے دیکھے اُسے اپنے وقت پر مطمئن رہنا چاہیئے تاکہ اُسے بھی حصہ ملے اور وہ بھی برکات سے فیض اٹھائے۔ میں (علی بن عثمان الجلابی) اس بات کو عزیز رکھتا ہوں کہ مبتدی سماع نہ سنے تاکہ اس کی طبیعت پراگندہ نہ ہو جائے سماع میں بہت بڑے خطرے اور خرابیاں بھی ہیں عورتیں چھتوں کے اوپر سے اور مکانوں سے درویشوں کو سماع کی حالت میں دیکھتی ہیں اور اس سے اہل سماع پر سخت حجابات پڑ جاتے ہیں چاہیئے کہ جوانوں میں سے کسی کو وہاں نہ بٹھائیں۔ کیونکہ جاہل صوفیا نے ان تمام باتوں کو طریق بنا لیا ہے اور صداقت سے دستبردار ہو گئے ہیں۔ میں ان جملہ باتوں سے جو اس قسم کی خرابیوں سے مجھ پر گذری ہیں استغفار کرتا ہوں اور باری تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ میرے ظاہر اور باطن کو خرابیوں سے محفوظ رکھے نیز میں اور پڑھنے والوں کو اس کتاب کے حقوق کی رعایت کی وصیت کرتا ہوں اور توفیق حق تعالیٰ کے قبضۂ اختیار ص ۴۸۱/۵۷۸ میں ہے وباللہ التوفیق والحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ محمد وآلہ اجمعین وسلم تسلیماً کثیراً۔

وکتبہ الراجی الی رحمۃ اللہ المنین اضعف المساکین بہاؤ الدین ذکریا عفی اللہ عنہ وعن سائر المسلمین وجعل یومہ خیراً من امسہ الی یوم الدین من امر اللہ فی شہور ۷۷۲ھ

مترجم: اللّٰھم اغفر لمن ترجمہ احتساباً

احقر العباد: ایف۔ ڈی گوہر بی۔ اے
پی۔ آر۔ ایس (ریٹائرڈ)

کاتب: (۱) حکیم محمد شفیع۔ ادارہ کتابت چوک دال گراں۔ لاہور
(۲) موضع مہاراج کے چھٹہ متصل رسول نگر ضلع گوجرانوالا

۵ ذی قعدہ ۱۳۹۰ھ م ۳ جنوری ۱۹۷۱ء
بوقت عصر اختتام یافت